خُطباتِ حکیمُ الاُمّتؒ

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد ۔ ۹

فضائلِ صبر و شکر

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

عنوانات و ترتیب

منشی عبدالرحمٰن خان رحمہ اللہ

تصحیح و تزئین	تخریج احادیث
صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ	مولانا زاہد محمود قاسمی

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240

فضائلِ صَبر و شُکر

تاریخ اشاعت .... رجب المرجب ۱۴۳۰ھ

ناشر .... ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت .... سلامت اقبال پریس ملتان

انتباہ

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ.... چوک فوارہ.... ملتان — مکتبہ الفاروق۔ مصریال روڈ چوہڑ ہڑپال۔ راولپنڈی
ادارہ اسلامیات........ انارکلی........ لاہور — دارالاشاعت........ اُردو بازار........ کراچی
مکتبہ سید احمد شہید........ اردو بازار........ لاہور — مکتبۃ القرآن........ نیوٹاؤن............ کراچی
مکتبہ رحمانیہ........ اُردو بازار .... لاہور — مکتبہ دارالاخلاص.... قصہ خوانی بازار...... پشاور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K (ISLAMIC BOOKS CENTERE
119-121- HALLIWELL ROAD BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل ''خطبات حکیم الامت''، مکمل ۳۲ جلدوں میں شائع کر چکا ہے۔

بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ خطبات میں آنے والی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے اور فارسی اشعار وغیرہ کا ترجمہ ہو جائے۔

بتوفیقہ تعالیٰ ادارے نے زر کثیر خرچ کر کے یہ کام کیا۔ محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب نے تخریج احادیث اور حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے فارسی اشعار کے ترجمہ وغیرہ کے کام انجام دیئے۔

اس طرح الحمدللہ یہ جدید ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین۔

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ

رجب المرجب ۱۴۳۰ھ بمطابق جولائی 2009ء

اجمالی فهرست

فہرست مضامین

الصبر

صبر کے متعلق یہ وعظ ۲۴ شوال ۱۳۳۱ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا جو اڑھائی گھنٹے میں ختم ہوا۔ مولانا محمد عبداللہ صاحبؒ نے قلمبند فرمایا۔ حاضرین کی تعداد ۱۰۰ تھی۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدً عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ.

اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ. بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ. وَالصّٰبِرِيۡنَ فِي الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيۡنَ الۡبَاۡسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ۝ (البقرہ آیت نمبر ۱۷۷)

(ترجمہ: اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں، تنگدستی میں اور بیماری میں اور قتال میں یہ لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ) موصوف ہیں اور یہی لوگ ہیں جو سچے (متقی) کہے جا سکتے ہیں۔

تمہید: یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے اس میں ایک خاص مضمون مذکور ہے جس کا حاصل اجمال یہ ہے کہ اس میں حق تعالیٰ نے بعض مصائب کے بعض آداب کا ذکر فرمایا ہے۔ شریعت مقدسہ نے ہماری ہر حالت کے متعلق ہم کو ایک دستور العمل تعلیم فرمایا ہے خواہ وہ کوئی حالت ہو ان میں سے ایک حالت مصیبت کی بھی ہے اس کے متعلق بھی ایک دستور العمل ہے کہ اس حال میں کیا کرنا چاہئے یہ حاصل ہے اس مضمون کا۔ وجہ اس بیان کی یہ ہے کہ اس وقت ہم لوگ دو حالتوں میں مبتلا ہیں ایک تو امساک باراں،

کہ جس کی وجہ سے خشک سالی ہے اس کے متعلق تو لوگوں کا دستور العمل یہ ہے کہ حکایت کرتے ہیں اور رائے دیتے ہیں حکایت تو یہ کہ بارش نہیں ہوئی اور رائے یہ بڑی ضرورت ہے۔ ہونا چاہئے۔

صاحبو! عاقل بالغ کے ہر فعل کی کوئی غایت ہوتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس حکایت سے کیا مقصود ہے اور یہ رائے کس کو دی جاتی ہے اور کس کو سناتے ہو اور اگر کسی کو نہیں سناتے تو کیا اس حکایت کے الفاظ قرآن مجید کے الفاظ ہیں کہ جن کا زبان سے نکالنا موجب ثواب ہے اور یہ ظاہر ہی ہے کہ کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہو گی تو وہ غرض بجز اس کے شکایت ہو اور کچھ نہیں اور ظاہر ہے کہ خالق اس حالت کا حق تعالیٰ شانہ، ہیں تو یہ شکایت ان کی ہوئی اور ان کو ہی رائے دی جاتی ہے۔ ادھر یہ مقدمہ بھی مسلم ہے کہ کسی امر کی شکایت اس کے نامناسب ہونے اور اس کے مباشر کے نامناسب فعل کے مرتکب کہنے کو مستلزم ہے اس لئے کہ جب آپ کسی فعل کے نامناسب ہونے کو بیان کریں گے تو اس سے اس کے مباشر کو مرتکب امر نامناسب کہنا ضرور لازم آئے گا یہ وہ بات ہے کہ اگر قصداً وعمداً ہو تو کفر ہے۔ لیکن چونکہ یہ لازم بدوں التزام ہے اس لئے فتوے تو کفر کا نہ دیا جاوے گا۔ مگر ہاں سخت بے ادبی و گستاخی وجسارت سے اس کو ضرور تعبیر کیا جاوے گا۔ اگر کسی کے ڈھیلا مارو اور نیت چوٹ لگنے کی نہ ہو تو چوٹ لگے ہی گی خواہ نیت ہو یا نہ ہو۔ پس وہ امور جن کی وجہ گستاخی اور بے ادبی ہو ماہیت تو ان کی حقیقت میں جرم ہی ہے۔ اور باعث عتاب ہے جو سمجھدار ہیں ان پر تو اس سے بھی خفیف کلمات پر عتاب ہو گیا ہے ایک بزرگ ایک جنگل میں رہا کرتے تھے ایک روز بارش ہوئی براہ رحم کہنے لگے کہ اگر یہ بارش کھیتوں میں ہوتی تو اچھا ہوتا ان پر عتاب ہوا۔

ایک اور بزرگ کا قصہ ہے کہ بارش ہوئی تو کہنے لگے کہ کیا موقعہ پر بارش ہوئی ہے دیکھئے بظاہر یہ لفظ شکایت کے لئے تو کیا موضوع ہوتا بلکہ مدح وتحسین کیلئے ہے لیکن معاً عتاب ہوا کہ او بے ادب بے موقع کس روز ہوئی تھی چونکہ وہ صاحب فہم وبصیرت تھے ان پر عتاب ہوا۔ کم فہموں پر عتاب نہ سہی لیکن کیا آپ کو بے ادبی و بے تمیزی کی بات گوارا ہے ایک کلمہ تو یہ تھا جس کا حاصل اعتراض اور شکایت ہے۔

دوسرا اس سے زیادہ قبیح ہے وہ کیا ہے؟ کہ بڑی ضرورت ہے یہ خدا تعالیٰ کو نعوذ باللہ ناواقف جانتے ہیں اور وجہ اس کی جہل ہے شریعت کو سیکھتے نہیں اول تو شریعت کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے اور بھی ہیں تو بس شریعت نام صرف نماز روزہ کا جانتے ہیں۔

طریق شکوہ

صاحبو! شریعت وہ قانون ہے کہ اس نے ہماری کوئی حالت نہیں چھوڑی کہ اس کے متعلق

دستور العمل نہ بیان فرمایا ہوالحاصل ایک حالت تو ہماری یہ تھی کہ جس کے متعلق ہمارا یہ برتاؤ ہے جو بیان کیا گیا میں اس کے متعلق شریعت کا دستور العمل بیان کرنا چاہتا ہوں۔

دوسری وہ حالت ہے جس میں ہم مبتلا ہیں مرض ہے چنانچہ بخار کی کثرت ہے اس کے متعلق ہمارا دستور العمل ایک تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ شکایت کرتے ہیں اور بھی جو جو اوپر عرض کیا وہ یہاں بھی سمجھ لیا جاوے دوسرے یہ ہے کہ مرض کی صرف دوا کرتے ہیں خیر دوا کرنا تو بہتر ہے دوا کی ممانعت نہیں ہے لیکن شکایت تو یہ ہے کہ صرف دوا ہی پر کیوں اکتفا کرتے ہیں اور بھی جو کرنے کا کام ہے وہ کیوں نہیں کرتے ہاں بجائے اس کے شکوہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میاں مصیبت میں پھنس گئے اظہار مرض میں بھی دو حیثیتیں ہیں ایک تو یہ ہے کہ کسی نے حال دریافت کیا اس وقت تو جو اپنی حالت ہے وہ بیان کرنا چاہئے پوچھنے پر بھی اپنی کیفیت بیان نہ کرنا یہ بھی ایک قسم کا کبر ہے اس لئے کہ پوچھنے والا شفقت سے حال پوچھتا ہے اور یہ گویا کہتے ہیں کہ ہم نہیں کہتے اپنے نزدیک تو انہوں نے بڑا توکل اور استقلال کیا لیکن حقیقت میں ایک مسلمان کی دل آزاری اور اہانت کی اور پوچھنے پر بیان کرنا حضورؐ کی سنت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا فرمایا بخار ہے اور ایسا بخار ہے جس قدر دو آدمیوں کو ہوتا ہے اس لئے کہ ثواب بھی مجھ کو دونا ملتا ہے یاد رکھو اپنے چاہنے والے کا اکرام چاہئے اور حال اپنا بیان کرنا بھی اکرام ہے ضرور بیان کر دو لیکن لہجے میں شکایت نہ ہونا چاہئے یہاں تک تو معقول بلکہ مامور بہ ہے دوسری حیثیت یہ ہے کہ شکایت کے عنوان سے اظہار کریں میاں سخت مصیبت ہے سخت آفت میں پھنس گئے جانے کس بات میں پکڑے گئے تو یہ برا ہے اور بعض مرتبہ بات ایک ہی ہوتی ہے لیکن لہجے کے اختلاف سے حکم اس کا مختلف ہو جاتا ہے ایک لہجہ تو ہوتا ہے ناراضی اور شکایت کا وہ قلب کو سخت ناگوار ہوتا ہے بعض لوگوں سے تو ان کا حال پوچھ کر پچھتانا پڑتا ہے کہ ہم سبب ہو گئے شکایت کے بس یہی امر قابل شکایت ہے اور ایک لہجہ ہوتا ہے رضامندی کا اور اپنی عاجزی اور بے بسی کا اس کا مضائقہ نہیں۔

رضا اور لذت

اس مقام پر ایک شبہ ہوتا ہے وہ یہ کہ اپنی تکلیف اور بیماری کس کو خوش لگتی ہے ناگوار ہی ہوتی ہے پھر بیماری اور رضامندی کا اجتماع کیسے ممکن ہے بات یہ ہے کہ دو چیزیں ہیں علیحدہ علیحدہ رضا

اور لذت۔ رضا اور شے ہے اور لذت اور چیز ہے رضا کے لے لذت کا ہونا ضروری نہیں جیسے کسی شخص کے دمل ہو اور ڈاکٹروں نے یہ تجویز کیا کہ بغیر شگاف کے اچھا نہ ہوگا تو وہ مریض بخوشی چیرنے کی اجازت دیتا ہے عین شگاف دینے کی حالت میں وہ راضی بھی ہے اور تکلیف بھی اس کو ہوتی ہے اس لئے کہ سمجھتا ہے کہ اس کا انجام میرے لئے بہتر ہے۔

اسی طرح جس بندہ نے یہ سمجھ لیا کہ مرض اور مصیبت کا آنا میرے لئے رحمت ہے اور اس میں تہذیب نفس ہے وہ دل سے اس پر راضی ہے گو اس پر تکلیف ہو اس کی زبان سے کبھی شکایت کا کلمہ نہ نکلے گا بلکہ بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو بیماری میں مسرت ہوتی ہے۔

یہاں تھانہ بھون میں ایک خان صاحب تھے بہت بوڑھے تھے اور اکثر بیمار رہتے مگر کیسی ہی سخت تکلیف ہمیں ہوتے اور کوئی پوچھتا کہ خان صاحب کیسا مزاج ہے بس ہنس دیتے اور کہتے کہ اللہ کی رحمت ہے یہ ہے رضا مندی کا لہجہ۔

ایک تیری حالت اور ہے وہ یہ کہ نہ ناراضی اور نہ رضا مندی یہ لب ولہجہ مباح ہے پوری رضا تو ہم لوگوں کو کہاں نصیب ہے مگر ناراضی کے لہجہ وکلمات سے تو احتراز ضروری ہے الحاصل زیادہ شکایت ان لوگوں کی ہے جو شکایت اور ناراضی کا لہجہ اور کلمات اختیار کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہ تعجب سے یوں کہتے ہیں کہ خدا جانے ہم کس گناہ میں پکڑے گئے گویا اپنے کو تمام گناہوں سے بری سمجھتے ہیں۔

صاحبو! ہمارا تو مصیبت میں مبتلا ہو جانا تعجب نہیں ہاں نعمت ہم کو کوئی ملے یہ زیادہ عجیب ہے اس لئے کہ ہر وقت گناہ میں رہتے ہیں سوال اور تعجب تو اس پر ہونا چاہئے کہ خدا جانے ہم سے کیا نیکی ہوئی جو ہم کو نعمتیں مل رہی ہیں اور مصیبت پر تو کچھ بھی تعجب نہ ہونا چاہئے۔

غرض یہ دو حالتیں ہوئیں امساک باراں اور مرض بس ان دونوں کے متعلق میں دستور العمل بتانا چاہتا ہوں اور ان کے علاوہ ایک تیسری حالت اور ہے علاوہ اس کے اس لئے کہا کہ یہ دو حالتیں تو من اللہ تھیں اور یہ تیسری حالت من العبد ہے کہ کسی قسم کی شدت اور تکلیف اپنے بنی نوع سے پہنچے جس کے بہت سے افراد ہیں فرد اعظم ان کا قتل وقتال ہے پس یہ کل تین حالتیں ہوئی۔ کمی بارش مرض قتل وقتال اور ان اقسام کو اگر دائر بین النفی والاثبات کیا جاوے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ مصائب کی دو قسمیں ہیں آفاقی اور نفسی اور آفاقی کی دو قسمیں ہیں سماوی اور غیر سماوی بہر حال یہ تین حالتیں ہیں اور ان ہی تینوں کے متعلق دستور العمل بتانا منظور ہے۔

ترجمہ قرآن کی اہمیت

اس دستور العمل کو اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں بیان فرمایا سبحان اللہ کیا بلیغ کلام ہے کہ بہت سہل اور پھر مختصر عنوان میں بیان فرمادیا اور کیوں نہ ہو جب کہ کلام الملوک ملوک الکلام مسلم ہے تو یہ تو احکم الحاکمین کا کلام ہے یہاں سے ایک بات سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ چونکہ حق تعالیٰ تمام بادشاہوں کے بادشاہ اور تمام حاکمین کے حاکم ہیں اس لئے قرآن مجید میں بھی شاہی طرز کا کلام ہے اور اسی سے یہ امر بھی مستنبط ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا اگر اردو میں ترجمہ ہو تو شاہی کلام کے طرز کا ہونا چاہئے سلاطین کے محاورات کی اس میں رعایت ضروری ہے بازاری اور عام محاورات سے پاک ہونا ضروری ہے اس سے معلوم ہوا کہ بعض بعض ترجمے جو اس زمانہ میں جاہلوں نے بغرض تجارت شائع کئے ہیں اور اس اس طرز کی رعایت نہیں کی گئی انہوں نے قرآن مجید کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھا ان کا نصب العین تجارت اور روپیہ کمانا ہے بس یہ دیکھ لیا کہ ٹھیٹھ اردو کے محاورات کو لوگ پسند کرتے ہیں اس لئے محاورہ کے ایسے پیچھے پڑے کہ قرآن شریف کا جو اصلی مذاق ہے اس سے بہت دور ہو گئے حقیقت میں غرض دنیوی بہت بری بلا ہے مولانا فرماتے ہیں

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد ‏ ‏ صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

چوں دہد قاضی بدل رشوت قرار ‏ ‏ کے شناسد ظالم از مظلوم راز

جب غرض درمیان میں آگئی تو ہنر پوشیدہ ہو جاتا ہے اور دل آنکھوں تک سو پردے پڑ جاتے ہیں جب قاضی کا دل رشوت لینے کو چاہے گا تو مظلوم سے ظالم کو کیسے پہچانے گا۔

یعنی جب حاکم کی نیت پہلے سے رشوت لینے کی ہو جائے گی تو اس کو حق نظر نہ آوے گا اگر کوئی کہے کہ ہم نے سنا ہے کہ ایک عہدہ دار تھے وہ مدعی و مدعا علیہ دونوں سے رشوت ٹھہرا لیا کرتے تھے اور دونوں سے لے لیتے تھے پھر مقدمہ کے اندر بہت غور و خوض کر کے حق ہی کرتے جس کی ڈگری ہو گئی اس کا روپیہ رکھ لیتے تھے گو کم ہو اور دوسرے کا واپس کر دیتے تھے گو زیادہ ہو دیکھو وہ رشوت بھی لیتے تھے اور پھر بھی حق ان کو واضح ہو جاتا تھا۔

جواب یہ ہے کہ اول تو خلاف شریعت کرنے میں ایسی ظلمت ہوئی ہے کہ نور فہم اس سے جاتا رہتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ فیصلہ کرتے ہیں وہ حق ہی ہو دوسرے اگر غور کیا جاوے تو وہ اس غرض میں بھی ایک گونہ بے غرض تھے چنانچہ قلیل و کثیر کو نہ دیکھتے تھے پس اگر ان کو مقدمات میں حق

نظر آجاتا تھا تو وہ اس بے غرضی کا اثر تھا اور غرض تو حجاب عن الحق ہے پس یہ مترجم صاحب بھی اپنی غرض کے ایسے پیچھے پڑے کہ علاوہ مسائل میں غلطی کرنے کے خود قرآن کے طرز مذکور کو چھوڑ دیا چنانچہ یمھون کا ترجمہ ان حضرت نے کیا ہے ٹامک ٹوئیے مارا کرتے تھے بتلائیے یہ کون سا محاورہ ہے بازاری بلکہ زنانہ اور زنانہ بھی کیسا عام جہلا عورتوں کا محاورہ ہے بادشاہ تو درکنار ادنیٰ شائستہ آدمی ایسا محاورہ نہ بولے گا چنانچہ اس ترجمہ کے دیکھنے سے پہلے میں نے بھی یہ لفظ کہیں نہیں سنے لیکن لوگ اس ترجمہ پر فدا ہیں خیر یہ مضمون تو کلام الملوک ملوک الکلام پر بطور تفریع کے میں نے بیان کر دیا تھا۔

صبر کی تین حالتیں

میں اس کو بیان کر رہا ہوں کہ حق تعالیٰ نے مختصر لفظوں میں تینوں حالتوں کے متعلق دستور العمل بیان فرما دیا چنانچہ ارشاد ہے۔

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال میں۔

ان تینوں حالتوں کی فہرست میں کچھ تطویل ہے بھی لیکن دستور العمل صرف ایک حکمت میں ہے وہ کیا وَالصّٰبِرِیْنَ یعنی ان تینوں میں تعلیم صبر کی فرمائی ہے صبر کی حقیقت تو میں بعد میں بیان کروں گا اول بَاْسَآءِ۔ ضراء۔ باس۔ ان تینوں لفظوں کی تفسیر میں کلام کرتا ہوں باس۔ کی تفسیر میں کچھ اختلاف نہیں باقی بَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ کے مدلول میں اختلاف ہے کہ ان دونوں سے کیا مراد جو میرے نزدیک راجح ہے وہ بیان کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ باساء کے معنی شدت کے ہیں اب رہی یہ بات کہ کون سی شدت مراد ہے فقر و فاقہ کی یا مرض کی۔ ضراء، کی تفسیر اگر مرض، سے کی جاوے جیسا کہ مشہور ہے تو۔ باساء سے مراد فقر و فاقہ ہوگا لیکن یہ تفسیر میرے نزدیک مرجوح ہے میں کہتا ہوں کہ ضراء کے معنی تو فقر و فاقہ کے ہیں اور باساء، کا مدلول مرض ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عباد متقین کی فضیلت میں دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔

یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ: یعنی وہ لوگ خرچ کرتے ہیں خوشی اور ناخوشی ہیں۔

اب اس مقام پر دیکھنا چاہئے کہ خوشی اور ناخوشی سے کیا مراد ہے اور وہ کون سی ناخوشی ہے جو خرچ کرنے کی ہمت کو گھٹا دیتی ہے سو ظاہر ہے کہ وہ ناداری اور فقر و فاقہ ہی ہے نہ کہ مرض اس لئے کہ مرض کی حالت میں خرچ کرنے کی ہمت گھٹتی نہیں بلکہ خرچ کرنا بہت آسان ہے۔ دو وجہ

سے اول تو اس وجہ سے کہ آدمی کو خیال ہوتا ہے خرچ کروں گا تو بیماری سے چھوٹ جاؤں گا۔ دوسرے یہ کہ بیماری کی حالت مایوسی کی ہوتی ہے مال سے تعلق کم ہو جاتا ہے اس لئے آدمی سمجھتا ہے کہ جو خرچ کردوں گا وہ میرا ہے اور جو رہ جائے گا وہ پرایا ہے پس سراء وضراء سے مراد تندرستی اور بیماری کی خوشی و ناخوشی مراد نہیں ہے بلکہ سراء۔ سے مراد فراخی اور ضراء سے مراد تنگ دستی وفقر و فاقہ ہے اس لئے کہ تنگ دستی کی حالت میں خرچ کرنا بڑی ہمت کی بات ہے پس جب کہ ضراء سے مراد فقر و فاقہ ہوا تو باساء سے مراد اس کا مغائر ہونا چاہئے وہ کیا ہے مرض پس حاصل آیت کا یہ ہوا کہ صبر کرنے والے ہیں مرض اور فقر و فاقہ میں اور قتال کے وقت بھی جہاں پیش آجاوے حاصل اور ملخص کیا ہوا کہ ناگواری کی حالتوں میں صبر کرنے والے ہیں یہ تو مجملاً دستور العمل ہو گیا۔

صبر کی تعریف

اب اس کے بعد دیکھنا چاہئے کہ صبر کس کو کہتے ہیں شکوہ شکایت کا مذموم ہونا تو لفظ صبر ہی سے معلوم ہو گیا ہوگا اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں رہا بعض اور امور میں اشتباہ باقی ہے اس وقت اس کا زائل کرنا ضروری ہے۔

سوایک شبہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ میں نے باساء کا مدلول مرض لیا ہے تو مرض میں صبر کرنے کے معنی شاید کوئی یہ سمجھے کہ دوادارو بھی نہ کرے اس کا کرنا بھی صبر کے خلاف ہے تو یاد رکھو کہ تداوی صبر کے خلاف نہیں شریعت نے اس کا مکلف نہیں کیا کہ دوانہ کرو تدبیر نہ کرو یہ شبہ صبر کی حقیقت نہ جاننے سے ہوا ہے صبر کے معنی استقلال کے ہیں تو دوا کرنا یا تدبیر کرنا بے استقلالی کا فرد نہیں ہے۔ حضورؐ نے خود تدبیر اور دوا فرمائی ہے چنانچہ پچھنے لگوائے ہیں زخم پر مہندی رکھی ہے۔ بارش کی کمی میں دعا فرمائی ہے اور زیادتی بارش میں کمی بارش کی دعا فرمائی ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے حضورؐ خطبہ پڑھ رہے تھے کہ ایک اعرابی کھڑا ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہؐ! جاعت الاموال وھلک الاموال فادع اللہ لنا۔ آپ نے دعا فرمائی اللھم اسقنا (اے اللہ بارش نازل فرما) (سنن النسائی ۳:۱۵۹، ۱۶۰) چنانچہ بادل آئے اور برسنا شروع ہوئے اور ایک ہفتہ تک برستے رہے دوسرے ہفتے میں وہی اعرابی یا کوئی اور کھڑا ہوا کہ یا رسول اللہ گھر گر گئے اور کام بند ہو گئے دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ بارش روک دیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی۔

اللھم حوالینا ولا علینا اللھم علی الاکام والا ودیۃ وعلی الظراب وعلی الجبال او کما قال :(اے اللہ اے اللہ ہمارے آس پاس برسایئے اور ہمارے اوپر نہیں، اے اللہ ٹیلوں پر اور نیستانوں پر اور پہاڑوں پر اور نالوں پر)(الصحیح المسلم الإستسقاء ۹:۸، سنن النسائی ۳:۶۰)

چنانچہ اسی وقت بادل پھٹ گیا اور چاروں طرف بادل تھے اور بیچ میں سے صاف تھا۔

پس دعا بھی ایک تدبیر ہے اور احسن التدبیر سے لوگ اس کو تدبیر نہیں سمجھتے چنانچہ اپنی مہمات میں لوگ جہان بھر کی تدابیر کرتے ہیں اور افسوس ہے کہ جو اصلی تدبیر ہے یعنی دعا اس سے غافل ہیں حالانکہ دنیا کے قصوں میں اس پر نہایت اہتمام سے عمل کرتے ہیں۔

مثلاً ایک شخص انٹرنس پاس ہے اور وہ چاہتا ہے کہ کہیں میرا روزگار ہو جاوے تو ہر عاقل اس کو یہ تدبیر بتلاوے گا کہ صاحب کلکٹر کے یہاں یا کمشنر کے یہاں درخواست دو تو دیکھئے اس کو وہی تدبیر بتلاتے ہیں جو دعا کا حاصل ہے تعجب ہے کہ صاحب کلکٹر کے یہاں درخواست کرنے کو تدبیر سمجھیں اور احکم الحاکمین کے یہاں درخواست کرنے کو تدبیر سے خارج کر دیں اور اس کی طرف التفات نہ کریں اور یہ تو بہت موٹی بات ہے عقل کا بھی مقتضا ہے۔ جو شے جس کے قبضہ میں ہوتی ہے وہ اسی سے مانگی جاتی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات قابض غیر مالک تک سے مانگتے ہیں۔

میرٹھ میں شیخ الٰہی بخش صاحب بڑے رئیس تھے ان کا دستر خوان بڑا وسیع ہوتا تھا اور سب کو ساتھ کھلایا کرتے تھے مگر شیخ صاحب کے سامنے جو کھانا ہوتا تھا وہ اچھا ہوتا تھا ایک منشی صاحب نے باورچی سے کہا کہ میاں ہم کو بھی میاں صاحب کے کھانے میں سے کچھ دینا چنانچہ اس نے ایک طشتری نکال دیا اور ان کے سامنے طشتری دستر خوان پر رکھی گئی شیخ صاحب نے دیکھ لیا اور کسی بہانے سے اپنے پاس والوں کو اپنی طرف سے سرکنے کو کہا تو ہر ایک حصہ طعام کے سامنے اس کا جلیس ہو گیا اسی طرح ان منشی صاحب کا حصہ دوسرے کے سامنے ہو گیا تو شیخ صاحب کیا کہتے ہیں کہ منشی جی اس طشتری کو بھی اپنے سامنے کر لیجئے رغبت سے منگائی بس کٹ گئے۔

تو دیکھو قابض سے مانگنا ایسا امر فطری ہے کہ باوجود اسکے غیر مالک ہونے کے اس سے مانگا اور ذلیل بھی ہوئے اور اس حکایت سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ان منشی صاحب کو جو خیانت سوجھی تو باورچی سے مانگا اور مالک سے نہ مانگا اگر مالک سے مانگتے تو ندامت نہ اٹھاتے پس جو شے مانگو مالک حقیقی سے مانگو اور جو مالک نہیں ہے وہ کیا دے گا حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کفار سے دریافت فرمائیے کہ تم کو آسمان اور زمین سے کون رزق دیتا ہے۔

آگے ارشاد ہے۔ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ...... یعنی یہ کہیں گے اللہ دیتا ہے اور اس جواب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے حق تعالیٰ کی ملکیت اور رزاقیت کا عقیدہ ایسا فطری ہے کہ کافر بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے جو شے فطری ہوتی ہے اس کو آدمی کتنا ہی ان کار کرے لیکن وہ زبان پر آتی ہی ہے۔

ایک ملحد کہتا ہے کہ میں خدا کا منکر تھا اور اس انکار پر میں نے بڑے بڑے لیکچر دیئے لیکن میرے دل نے زبان کی کبھی موافقت نہیں کی اس لئے میں نے اس عقیدے سے توبہ کرلی اور خدا کا قائل ہوگیا۔

پس جب قابض سے مانگنا فطری تدبیر ہے گو کہ وہ مالک بھی نہ ہو تو اگر وہ مالک بھی ہو تو اس سے مانگنا تدبیر کیوں نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ حقیقی مالک و قابض ہر شے کا ہے تو اس سے مانگنا یہ بھی تدبیر ہے۔

دعا کی حقیقت وصورت

دعا کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک درخواست ہے اور جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی یہاں بیان کرنا ضرور ہے جب دعا ایک درخواست ہے تو دیکھنا چاہئے کہ جب کسی حاکم سے درخواست کرتے ہیں تو اس وقت کن امور کی رعایت کرتے ہیں حاکم جب سامنے ہو اور کوئی درخواست زبانی یا تحریری تم پیش کرو تو اس وقت تمہاری کیا حالت ہوتی ہے کہ دل اور آنکھ اور زبان سب حاکم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اگر درخواست دینے کے وقت ادھر ادھر دیکھے یا بے التفاتی کرتے تو وہ گستاخ اور بے ادب شمار کیا جاتا ہے اور حاکم یہ جانتا ہے کہ اس کو یہ شے مطلوب نہیں ہے اس لئے اس کی طرف کوئی التفات نہ کرے گا پس اگر دعا میں درخواست ہونے کی حیثیت کا لحاظ کیا جاتا تو آداب دعا کو مہمل نہ چھوڑتے۔

اب تو یہ حالت ہے زبان سے تو کہہ رہے ہیں۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً الخ۔ (اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما کر) اور آنکھ کہیں ہے دل کہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کی نظر تو چونکہ دل پر ہے اس لئے دل کا پھرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے درخواست دینے کے وقت حاکم کی طرف سے منہ پھیر لینا اور کیا حالت ہے کہ دعا کرتے ہیں اور دل میں یہ ہے کہ ہماری دعا کیا قبول ہوگی۔

صاحبو! اگر درخواست دینے کے وقت درخواست کے اخیر میں لکھ دو یا کہہ دو کہ ہم کو اس درخواست کے منظور ہونے کی امید نہیں ہے تو وہ درخواست یقیناً واپس ہو جائے گی حیرت ہے کہ حکام مجازی کی درخواست میں تو یہ ظاہر کرتے ہو کہ ہم کو سرکار کی توجہ سے پوری امید ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے اور حاکم حقیقی کے یہاں درخواست کی منظوری میں شک کرتے ہو افسوس صد افسوس دعا کو اگر درخواست سمجھتے تو بس یہ سمجھنا ہی تمام آداب دعا کی تکمیل کے لئے کافی وافی تھا۔

الحاصل دعا بھی ایک تدبیر ہے اور صبر کے منافی نہیں ہے آپؐ نے خود دعا فرمائی چنانچہ قحط میں دعا فرمانے کا قصہ میں نے خود بیان کیا ہے۔

ایک معرکہ میں حضورؐ تشریف لے گئے اور دو زرہ آپ پہنے ہوئے تھے۔ اوروں کے پاس تو ایک ایک زرہ ہی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو زرہ تھی کوئی ناواقف ہوتو یہ کہے کہ حضورؐ (نعوذ باللہ) بڑے ڈرپوک تھے کہ سب کے پاس تو ایک ایک زرہ تھی یا بالکل نہ تھی اور آپ نے دو زرہ پہنی تھیں حالانکہ یہ اظہار ہے اپنے عجز کا ہاں غلبہ حال کا قصہ جدا ہے غلبہ حال میں تو بعض اوقات دعا بھی چھوٹ جاتی ہے لیکن باوجود غلبہ حال نہ ہونے کے تدبیر نہ کرنے کا گویا یہ مطلب ہے کہ اے اللہ ہم ایسے مضبوط ہیں کہ ہم کو تدبیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ صبر کے یہ معنی نہیں ہیں۔

صبر اور تدبیر

صبر کے معنی جزع وفزع نہ کرنا اور مستقل رہنا اور تنگی اور کراہت نہ ہونا اسی استقلال کا فرد نباہ کرا اور جم کر دوا کرنا بھی ہے پس جو شے استقلال کا محل ہو اس کو استقلال کے خلاف نہ کہا جائے گا۔ الحاصل جب دوا کی اور دوا پر نظر نہ ہوئی تو یہ صبر توکل کے خلاف نہیں ہے۔

اس تقریر سے یہ شبہ تو جاتا رہا مگر ایک شبہ شاید کوئی کرے کہ گو صبر منافی نہیں لیکن ادنیٰ درجہ کا صبر ہے اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ دوا و تدبیر چھوڑ دے میں کہتا ہوں کہ کمال صبر یہ ہے دوا کرے اور پھر خدا پر نظر ہو اور دوا کو چھوڑ کر پھر خدا پر نظر رکھنا کون سا کمال ہے اس وقت تو خواہ مخواہ خدا پر نظر ہوگی۔

ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں آیا اور اس نے عرض کیا کہ میں اونٹ کو باندھ دوں یا خدا پر بھروسہ کروں حضور نے فرمایا۔ اعقلھا ثم توکل۔ یعنی باندھ دے اور پھر بھروسہ کر اس کو مولانا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

گفت پیغمبر باواز بلند　برتوکل زانوئے اشتر بہ بند

گر توکل مے کنی در کار کن　کسب کن پس تکیہ برجبار کن

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز سے فرمایا۔ توکل پر اونٹ کا گھٹنہ باندھ دو اگر توکل کرتا ہے تو کام میں توکل کر یعنی پہلے کوشش کر پھر خدا پر بھروسہ کر۔

پس کمال یہی ہے کہ کسب تدبیر ہو اور تدبیر پر نظر نہ ہو۔

اس میں شبہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دوا کرے اور دوا پر نظر نہ ہو بات یہ ہے کہ نظر کی دو قسمیں ہیں ایک نظر مذموم اور ایک نظر غیر مذموم۔ نظر مذموم تو یہ ہے کہ اس پر تو نظر ہوگی

کہ دوا پی ہے اور فلاں حکیم تجویز کیا گیا ہے اور فلاں فلاں اس میں اجزا ہیں اور جب سے میں یہ دوا پیتا ہوں اس وقت سے مرض میں فلاں امر کی کمی ہے اور اس سے پہلے یہ زیادتی تھی مگر باوجود اس کے عقیدہ یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ کا حکم نہ ہوتا تو شفا نہ ہوتی۔

اگر کوئی اس پر یہ شبہ کرے کہ یہ تو کوئی فضیلت کی بات نہیں اس میں سب مسلمان برابر ہیں ایسی نظر تو سب کو حاصل ہے۔

جواب یہ ہے کہ نظر نظر میں فرق ہے عقیدہ تو سب کا ہے فرق اتنا ہے کہ عوام کو تو صرف اس کا عقیدہ ہی ہے اور استحضار نہیں اور خواص کو عقیدہ بھی ہے اور اس کا استحضار بھی ہے یعنی ہر وقت ہر کام حرکت میں اس کا استحضار ہے کہ موثر حقیقی ذات وحدہٗ لاشریک ہے اور یہی درجہ مطلوب ہے پس یہ ثابت ہو گیا کہ تداوی کمال صبر کے بھی خلاف نہیں بلکہ اس سے اس دعویٰ کی بھی گنجائش ہو سکتی ہے کہ تداوی ترک تداوی سے افضل ہے اس لئے کہ بڑا معیار ہمارے لئے حضورؐ نے بیان جواز کے لئے تداوی نہیں کی اس لئے اگر ایسا ہوتا تو گا ہے اس کا صدور ہوتا مرض میں علاج کرنا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عادت مستمرہ تھی ہاں اس کی گنجائش ہے کہ دوا نہ کرتے گا گنہگار نہ ہوگا لیکن افضل دوا کرنا ہے البتہ اگر کوئی حال غالب ہو تو دوسری بات ہے افضلیت کے درجہ کا مکلف ہونا اس سے ساقط ہو جائے گا بہ نظر اس کی خصوصیت حال کے یوں کہہ دیں گے کہ اس شخص کے لئے ترک تداوی ہی افضل ہے۔

غلبہ حال اور تدبیر

اس قسم کے اولیاء اللہ بھی گزرے ہیں کہ انہوں نے غلبہ حال میں دوا اور کوئی تدبیر نہیں کی بلکہ بعض سے مصیبت کی تمنا بھی منقول ہے اور یہ ایک گونہ غلبہ حال تھا مگر اس کو پسند نہیں کیا گیا۔

چنانچہ ایک صحابی بیمار تھے حضورؐ عیادت کے لئے تشریف لے گئے انہوں نے فرمایا اے اللہ! آخرت میں جس قدر عذاب کرنا ہو یہاں ہی کر لے وہاں کے عذاب کا تحمل نہیں سو عارض سے انہوں نے تمنا کی حضورؐ نے فرمایا:

سلوا اللہ العافیۃ ولا تسئلوا البلاء او کمال قال(سنن الترمذی :۳۵۹۴،بغیر ھذا السیاق).

(یعنی اللہ سے عافیت مانگو اور مصیبت مت مانگو۔)

حقیقت میں عافیت بڑی چیز ہے آدمی کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ جب عافیت جاتی رہے گی تو میری کیا حالت ہوگی۔

ایک قصہ ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم بعد غزوہ بدر کے تمنا کیا کرتے تھے کہ کوئی غزوہ ہو تو ہم قتل وقتال کریں اور اللہ کی راہ میں جان دیں جب غزوہ احد ہوا تو اس میں ہزیمت ہوئی اس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ

یعنی۔ موت کے ملنے سے پہلے تم اس کی تمنا کیا کرتے تھے اب تو تم نے اس کو دیکھ لیا اور تم صاف دیکھ رہے ہو اب کیوں بھاگتے ہو۔

بہر حال تمنا مصیبت سے عدم تمنا کو اور وقوع کے وقت تدبیر کو ترجیح دی گئی ہے اور اس تدبیر کو خلاف صبر نہیں سمجھا گیا خصوص موت کی تمنا مصیبت سے بچنے کے لئے تو نری بزدلی کی دلیل ہے اس لئے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصائب موجودہ پر اس شخص سے صبر نہیں ہوسکتا جو شخص جان کر کنوئیں میں گرتا تھا میں پہلے ایسے شخص کو بہادر سمجھتا تھا ایک دوست نے اس غلطی کو رفع کیا اور یہ کہا کہ ایسا شخص بڑا بزدل اور بے صبر ہے اس لئے کہ مصائب پر اس سے صبر نہیں ہوسکا اس لئے جان دیتا ہے۔

بے صبری کی علامت

بعض لوگ بعض مصائب سے تنگ آ کر حکام وقت کو برا بھلا کہتے ہیں یہ بھی علامت ہے بے صبری کی پسندیدہ تدبیر نہیں ہے اور حدیث شریف میں اس سے ممانعت بھی آئی ہے فرماتے ہیں۔ لا تسبوا الملوک۔ یعنی بادشاہوں کو برا مت کہو ان کے قلوب میرے قبضہ میں ہیں میری اطاعت کرو میں ان کے دلوں کو تم پر نرم کر داں گا یاد رکھو جو مصیبت آتی ہے سب منجانب اللہ ہوتی ہے فرماتے ہیں۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی کوئی مصیبت نہیں آتی مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔

اور جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے تو اس کا علاج یہی ہے کہ ادھر رجوع کرے اور پھر جو پیش آوے خیر سمجھے اس لئے کہ

ہر چہ آں خسر کند شیریں بود (محبوب جو کچھ بھی کرتے وہ شیریں ہے) اور اس لئے

ہر چہ از دوست پر سونیکوست (حقیقی دوست کی طرف سے جو ہوگا وہ بہترین ہے)

اور شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

از خداداں خلاف دشمن دوست   کہ دل ہر دور رصرف اور ست

دوست دشمن کے خلاف کو خدا تعالیٰ کی طرف سے شمار کرو کیونکہ دونوں کے دل اسی کے تصرف میں ہیں۔

ہاں اذن شرعی سے تدبیر کرنا جائز ہے اپنی رائے سے تدبیر کرنا بھی خلاف شریعت ہے آج کل میں دیکھتا ہوں کہ بعض نوجوانوں کے اندرولولے ہیں۔ بعض واقعات کی تدبیر اس کو سمجھتے ہیں کہ کوئی شورش ہو۔ گڑبڑ ہو خدانخواستہ اگر کوئی شورش ہوگی بھی تو سب سے پہلے ہٹنے والے یہی ہوں گے۔ صاحبو۔

عافیت اور امن کو غنیمت سمجھو اور عارف اور امن ہی کو مانگو ہاں اگر کوئی مصیبت خود بخود ہی پیش آجاوے تو اس میں صبر استقلال سے کام لو۔ یہی سنت ہے۔

حضورؐ کی عادت شریف یہی تھی کہ خود کسی حادثہ کی تمنا نہ فرماتے تھے حرب کا موقع تھا تو جو اس کے مناسب تدبیریں ہیں وہ کرتے تھے چنانچہ غزوہ بدر میں پہلے میں نے بیان کیا ہے کہ حضورؐ کے بدن مبارک پر دو زرہیں تھیں دیکھئے یہ تدبیر ہی تھی اور اس تدبیر سے حضورؐ کی شجاعت اور مستقل ہونا زیادہ معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ جو ڈرے گا وہ بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ کرے گا اس لئے چاہے گا کہ اچھا ہے جلدی سے قصہ ختم ہو اور شجاع تدبیر کرتا ہے اس لئے کہ جانتا ہے کہ جان رہے گی تو اور واقعات میں بھی جان بازی کریں گے۔

حضرت ضرار بن ازورؓ تو کفار میں ننگے گھس جاویں اور حضورؐ معرکہ کے دن دو زرہیں پہنیں اگر کوئی یہ نہ بتلاوے کہ دوسرا حضورؐ کا فعل ہے اور یہ سوال کیا جاوے کہ ان دونوں میں کون زیادہ افضل ہے تو ظاہر میں تو یہی جواب دیں گے کہ پہلا شخص بڑا بہادر ہے کہ اپنی جان کی بھی پروانہ کی لیکن تقریر سابق سے واضح ہو گیا ہوگا کہ ننگا گھس جانا اتنی بہادری کی بات نہیں جس قدر کہ اپنے بچاؤ کی تدبیر کر کے واقعہ میں جانا ہے۔

رومیؒ و تبریزیؒ

اسی قسم کا سوال شمس تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا رومی علیہ الرحمۃ سے کیا تھا اور مولانا رومی نے اسی قسم کا جواب دیا تھا قصہ اس کا یوں ہوا تھا کہ حضرت شمس تبریزؒ مولانا عراقی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر ہیں اور دونوں ایک بزرگ کے مرید ہیں دونوں شیخ کی خدمت میں اپنے حالات و واردات بیان کرتے تھے مولانا عراقی بڑے شاعر تھے اپنے واردات نظم میں بیان کرتے تھے اور شمس تبریز شاعر نہ تھے ایک روز شیخ نے کہا کہ شمس تبریزؒ تم ایسی نظم بیان نہیں کرتے شمس تبریزؒ نے مغموم ہو کر فرمایا کہ حضرت مجھ کو ایسی نظم نہیں آتی فرمایا کہ مغموم مت ہو تمہارے اتباع میں ایک ایسا شخص ہوگا کہ علوم اولین و آخرین کے کھول دے گا۔ چنانچہ جب اس بشارت کا وقت آیا تو حضرت شمس تبریز کو الہام ہوا کہ جلال الدین کی (یہ نام ہے مولانا رومیؒ کا جن کی مثنوی شریف

ہے) جا کر تربیت کرو مولانا رومیؒ بڑے عالم تھے علوم اور کتب کی خدمت میں دن رات مشغول رہتے تھے بیٹھے کتاب دیکھ رہے تھے کہ شمس تبریز آئے اور بیٹھ گئے مولانا سے پوچھا کہ یہ تمہارے سامنے کیا ہے مولانا نے فرمایا کتابیں ہیں۔ حضرت شمس تبریزؒ نے فرمایا کہ میاں یہ تو علم قال ہی ہے کچھ علم حال بھی حاصل کرو اور یہ کہہ کر تمام کتابیں سامنے حوض تھا اس میں پھینک دیں یہ شور مچانے لگے انہوں نے سوکھی کتابیں حوض میں سے نکال کر دے دیں آگ تو اسی وقت لگ گئی پھر شمس تبریز غائب ہو گئے اور ان پر علوم کا دریا کھل گیا پھر ایک روز مولانا گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے تھے کہ شمس تبریز نے آ کر باگ پکڑ لی اور پوچھا کہ مولانا ایک شخص تو یہ کہتا ہے۔

سبحانی ما اعظم شانی میں پاک ہوں میری شان کتنی بڑی ہے

اور ایک یہ کہتا ہے۔

ما عرفناک لحق معرفتک ہم نے آپ کو پہچاننے کے حق کے مطابق نہیں پہچانا۔

ان میں کون بڑھا ہوا ہے؟ مولانا نے جواب دیا کہ دوسرے کے معرفت بڑھی ہوئی ہے اس لئے کہ اول کی معرفت تو ختم ہو کر رک گئی اور دوسرے کی معرفت ترقی پذیر ہے پس مولانا رومیؒ کا یہ جواب بھی ایسا ہے۔

پس زرہ پہننا اور تدبیر کر کے معرکہ میں جانا زیادہ شجاعت کی دلیل ہے اور بے تدبیری سے آنا کم شجاعتی کی علامت ہے کہ اس نے سوچ لیا کہ جان دینا ہے چل کر جان دے دیں گے پس اس جملہ تقریر سے معلوم ہوا کہ تدبیر کہ تداوی بھی اس کا فرد ہے افضل ہے اور قوت کی دلیل ہے تدبیر نہ کرنے سے۔

عوام وخواص کا فرق

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عوام بھی ان تدبیر نہ کرنے والوں سے افضل ہو جاویں اس لئے کہ خواص تدبیر کرتے ہیں لیکن ان کی نظر اس پر نہیں ہوتی نظر صرف خالق پر ہے بخلاف عوام کے کہ ان کی نظر اول تدبیر پر ہوتی ہے لیکن ظاہر میں دونوں تدبیر میں مشغول ہیں پس ظاہری حالت بیشک دونوں کی یکساں ہے اور یہی وجہ ہے کہ کاملین عوام سے ممتاز نہیں ہوتے اور عوام ان کو نہیں پہچانتے اور اسی بنا پر کفار نے انبیاء کی تکذیب کر دی اور یہ کہہ دیا۔

ما انتم الا بشر مثلنا تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو۔

مولانا اسی مضمون کو فرماتے ہیں۔

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد   کم کسے زابدال حق آگاہ شد

گفت اینک مابشر ایشاں بشر ماوایشاں بستہ خوابیم و خور

ساری دنیا اسی وجہ سے گمراہ ہوگئی ہے کہ ایسے لوگوں سے بہت کم آگاہ ہوئے جنہوں نے کہا یہ بھی آدمی ہیں، ہم بھی آدمی ہیں، یہ بھی کھاتے، سوتے ہیں، ہم بھی کھاتے اور سوتے ہیں۔

ایں ندا نیستند ایشاں از عمیٰ درمیاں فرقے بودبے منتہا

کار پاکاں را قیاس از خود مگر گرچہ ماند درنوشتن شیر و شیر

اندھے پن کی وجہ سے یہ نہ جانا کہ ہمارے اور انکے اندر بے انتہا فرق ہے پاک لوگوں کو اپنے اوپر قیاس کر کے اپنے جیسا نہ سمجھ لیا کرو کیونکہ لکھنے میں شیر (جانور) اور شیر (دودھ) ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔

بڑے بڑے بزرگوں کی نسبت ہم نے عوام کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ ہاں عالم میں مگر درویشی دوسری ہی شے ہے درویشی اس کو سمجھتے ہیں کہ ایک بڑی سی تسبیح ہو اور رنگے کپڑے ہوں کسی سے بات نہ کرتے ہوں صاحبو اگر درویشی یہی ہوتی ہے تو جس کا جی چاہتا درویش بن جاتا ہے تو نام تقویٰ طہارت کا ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق رودلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے بھائی عالم تھے حضرت شیخ کو نحومیر شروع کرائی اس میں مثال آئی۔ ضرب زید عمروا۔ یعنی مارا زید نے عمرو کو استاد سے پوچھا کہ زید نے عمرو کو کیوں مارا استاد نے کہا کہ مارا نہیں۔ محض فرضی مثال ہے فرمایا کہ میں ایسی کتاب نہیں پڑھتا جس میں اول سے ہی تعلیم کذب کی ہو بہر حال اگر مارا ہے تو ظلم ہے اور اگر نہیں مارا تو جھوٹ ہے میں ایسی کتاب کو نہیں پڑھتا جس میں ظلم یا کذب کی تعلیم ہو۔ ہمارے اکابر کی تو یہ حالت تھی کہ شائبہ کذب سے بھی وحشت ہوئی۔

آج کل کے صوفی

آج کل کے صوفی ایسے ہیں کہ ریا سے بھی ان کو وحشت نہیں ہوتی۔ جو سراسر خلاف تقویٰ ہے تسبیح رکھیں گے تو ایسی کہ اگر کسی کے ماریں تو اچھی خاصی چوٹ لگے لباس پہنیں گے تو ایسا کہ دور ہی سے معلوم ہو جاوے کہ حضرت شاہ صاحب ہیں گویا کہ شاہ صاحب کے لئے بھی وردی کی ضرورت ہے بغیر وردی کے درویش نہیں مولانا ایسی ہی جامہ ریائی کے باب میں فرماتے ہیں۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی بیغش باشد اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

(صوفی کی موجودہ حالت اگر بالکل درست نہ ہو تو وہ صوفی نہیں ہے خواہ خرقہ پہن لے اے شخص بہت سے خرقے آگ میں جلانے کے قابل ہیں)

کیسی وردی کیسا اظہار یہاں تو جلنا اور مرنا اور کھپنا ہے ایک صاحب نے فرمایا۔

افروختن و سوختن و جامہ دریدن　　پروانہ زمن شمع زن گل زمن آموخت

پروانے نے مجھ سے جلنا سیکھا شمع نے مجھ سے روشن ہونا سیکھا اور پھول نے مجھ سے کپڑے پھاڑنا سیکھا۔

بادہ درجوشش گدائے جو ماست　　چرخ درگردش اسیر ہوش ماست

شراب اپنے جوش میں ہمارا گدا ہے اور آسمان اپنی گردش میں ہمارا اسیر ہے ان میں تو جوش عشق ہونا چاہئے اس کے ساتھ تصنع اور بناوٹ کا کیا کام یاد رکھو درویشی کی کوئی ظاہری صورت نہیں ہوتی بلکہ کامل وہی ہے جو کسی پہلو سے عوام سے ممتاز نہ ہوالہامی مقولہ ہے۔

اولیائی تحت قبائی لا یعرفھم سوای

میرے اولیا میرے قبا کے نیچے ہیں میرے سوا انہیں کوئی نہیں جانتا

اور اسی واسطے عوام صحابہ رضی اللہ عنہم کو درویش نہیں سمجھتے تھے اس لئے کہ ان کی حالت بالکل عوام کے مشابہ تھی ان کی شان یہ تھی۔

لیوث النہار ورھبان اللیل دن کو شیر اور رات کو زاہد شب زندہ دار۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ابوبکرؓ کثرت صلوۃ صیام سے نہیں بڑھے بلکہ ان کے قلب میں ایک شے ہے جس کی وجہ سے ان کو فضیلت ہے ایک عالم تاریخ سے نقل کرتے تھے کہ ان کی بیوی سے پوچھا گیا کہ حضرت ابوبکرؓ گھر میں کیا کرتے تھے کہا کچھ نہیں اتنی بات تھی کہ شب کو مراقب بیٹھ جاتے تھے اور تھوڑی دیر میں ایک آہ کرتے تھے جس میں سے جلے ہوئے گوشت کی بو آتی تھی غرض حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کوئی ظاہری وضع یا حالت ممتاز نہ تھی۔

اسی طرح کاملین عوام سے کم ممتاز ہوتے ہیں اور عوام ہی کی طرح دوا دارو بھی کرتے ہیں پس تدبیر کرنا اور مرض میں دوا دارو کرنا توکل اور صبر اور درویشی کے کسے طرح منافی نہیں اسی واسطے شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مجھ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں پر مجبور ہو کر فرمایا اور میرا جی نہ چاہتا تھا۔

اول یہ کہ ان مذاہب اربعہ کی تقلید کرنے کو میرا جی نہ چاہتا تھا مگر مجھ کو حضورؐ نے مذاہب اربعہ سے خارج ہونے کو منع فرمایا۔

دوسرے یہ کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صحابہ سے افضل جاننے کو جی چاہتا تھا اس سے روکا اور افضلیت شیخین پر مجبور کیا۔

تیرے ترک اسباب میری اصلی خواہش تھی مجھ کو حضورؐ نے
تشبث بالا سباب اسباب کو مضبوطی سے پکڑے رکھنے پر مجبور فرمایا۔

اسباب ظاہرہ اور سنت

پس اسباب ظاہرہ کو اختیار کرنا سنت ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ اس میں شہرت سے بھی بچانا ہے ترک اسباب ظاہرہ میں شہرت بہت ہوتی ہے اس لئے نفس اس طرف جاتا ہے نفس ایسا شریر ہے کہ اگر اپنے لئے کوئی مجاہدہ تجویز بھی کرتا ہے تو ایسا جس میں شہرت ہوتی ہے عام لوگ اس کو بزرگ سمجھتے ہیں جو روٹی کھانا چھوڑ دے اگرچہ روٹی سے زیادہ مقوی چیز کھالے اسی واسطے محققین نے آج کل ایسے مجاہدوں کو پسند نہیں کیا بلکہ یہ کہتے ہیں کہ خوب کھاؤ پیو اور سوؤ ہاں کام کرو۔

اس میں ایک یہ بھی مصلحت ہے کہ جب خوب کھائے پئے گا اپنے کو سمجھے گا کہ ہم بڑے نمک حرام ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں کھاتے ہیں اور کام اس درجہ کا نہیں کرتے اور ایسے شخص کو اگر کچھ ترقی بھی محسوس نہ ہو تو حق تعالیٰ کی شکایت اس کے دل میں نہ آوے گی اس لئے کہ اپنے آپ کو مقصر سمجھے گا اور جانے گا کہ ہم کام ہی کیا کرتے ہیں جو ہم کو کچھ ملے اور اگر اس کے حال پر فضل ہو گیا تو تھوڑی سی حالت کو بھی بہت بڑی نعمت جانے گا اور اپنا استحقاق کچھ نہ جانے گا۔

بخلاف اس شخص کے جو مجاہدات شاقہ اور ریاضات نا قابل برداشت برداشت کرتا ہے کہ اگر اس کو کچھ ملے گا تو اس کو اپنے مجاہدہ کا ثمرہ سمجھے گا اور نعمت و فضل پر اس کی نظر نہ ہوگی اور اگر کوئی امر قلب میں نہ پائے گا تو اس کے جی میں ضرور کسی درجہ میں یہ آوے گا کہ افسوس ہے میں اس قدر تو مجاہدے کرتا ہوں پھر بھی محروم ہوں اور بزرگوں نے یہ فرمایا ہے

زنہار از طاعتے کہ مرا العجب آرد (ایسی نیکی نہ کرو جس سے عُجب پیدا ہو)

غرض حضورؐ کے ہم شکل رہنے میں اتباع سنت میں بڑے بڑے فائدے اور حکمتیں ہیں پس تدبیر کا اختیار کرنا صبر کے منافی تو کیا ہوتا اور اس کا مکمل ہے پس تداوی کے جو صبر کے خلاف ہونے کا اشتباہ تھا وہ تو زائل ہو گیا۔

دوا اور دعا

لیکن اس کے مقابلہ میں دوا کے متعلق ایک کوتاہی کا سمجھنا اور ضروری ہے وہ یہ کہ بعضے جو دوا کرتے

وہ اس کو ایسا موثر سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ سے گویا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا اس سے درخواست بھی شفا کی نہیں کرتے پس دوا کو تو موثر سمجھتے ہیں اور دعا کو کسی درجہ میں موثر نہیں جانتے مجھے تعجب ہوتا ہے ان لوگوں سے جو کہتے ہیں کہ یہ دوا بڑی قیمتی ہے اس کے اجزا بڑے عمدہ ہیں یہ خالی نہ جاوے گی صاحبو جن لوگوں نے ان اجزا کی یہ خاصیت لکھی وہ خود طب کی کتابوں میں خاصیت لکھنے کے بعد لکھتے ہیں:

باذن خالقها باذن ربها خدائے غالب کی اجازت سے اللہ کی اجازت سے

اور اگر ان کے لکھنے کا تم کو یقین نہیں آتا تو مشاہدہ بھی کر لیجئے کہ جب وقت ناکامی کا آجاتا ہے تو ساری دوائیں رکھی رہ جاتی ہیں بلکہ اطبّاع خود متعجب اور حیران رہ جاتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ کوئی دقیقہ ہم نے نہیں چھوڑا اور اثر نہیں ہوتا مولانا علیہ الرحمۃ کنیزک کے قصہ میں فرماتے ہیں:

از سرکنگبیں صفر افزود   روغن بادام خشکی مے نمود
از ہلیلہ قبض شد اطلاق رفت   آب آتش را مدد شد ہمچو نفت
ہرچہ کردند از علاج و از دوا   رنج افزوں گشت و حاجت ناروا

قضا جب آجاتی ہے تو سکنجبین صفرا بڑھاتی ہے اور روغن بادام خشکی کرتا ہے ہلیلہ اسہال کی بجائے قبض کرنے لگتا ہے اور پانی پٹرول کی طرح آگ کا مددگار بن جاتا ہے جتنا بھی ان لوگوں نے دوا اور علاج کیا بیماری بڑھتی گئی اور ضرورت پوری نہ ہوئی۔

آخرت ایک طبیب الٰہی آئے اور انہوں نے کہا۔

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند   آن عمارت نیست ویراں کردہ اند
رنجش از صفرا و از سودا نہ بود بوئے   ہر ہیزم پدید آیدز دور
بے خبر بود ند از حال دروں   استعیذ الله ممّا یفترون

اس نے کہا جس قدر دوا ان لوگوں نے کی اس عمارت کو ویران ہی کیا بیماری صفرا اور سودا سے تھی ہی نہیں لکڑی کا دھواں دور ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے اندرونی حال سے بے خبر تھے اللہ کی پناہ کس قدر وہ جھوٹے تھے۔

خیر اس قصہ میں تو تشخیص میں غلطی ہوئی تھی بعض مرتبہ تشخیص بھی صحیح ہوتی ہے لیکن مریض جاں بر نہیں ہوتا کوئی طبیب تھے دستوں کے علاج میں کامل تھے جب وقت آیا تو دستوں ہی میں مبتلا ہوئے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جو طبیب جس مرض کے علاج میں کافی کامل ہوتا ہے اس کی موت اسی مرض میں ہوتی ہے حق تعالیٰ اس عجز اور بے کار ہونا تدبیر کا دکھلا دیتے ہیں القصہ اطبا جمع ہوئے اور

نسخہ لکھا گیا اس نے دیکھا کہا کہ میں نے یہ دوائیں سب کھائی ہیں بلکہ اس سے زیادہ موثر دوا کھائی مگر کچھ نہیں ہوا اور کہا کہ ایک پانی کا طشت لاؤ چنانچہ منگایا گیا ایک پڑیا نکال کر اس میں ڈالی گئی وہ جم گیا کہا میں نے تو یوں یہ دوا کھائی مگر معلوم ہوتا ہے کہ وقت آ گیا چنانچہ اسی مرض میں خاتمہ ہو گیا۔

کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ منجمد شرائط دوا کی تاثیر کے یہ ہے کہ طبیعت قوی ہو اگر طبیعت میں قوت نہ ہوگی اور علاج گو تشخیص صحیح سے فائدہ نہ ہوگا میں کہتا ہوں کہ طبیعت کی تقویت کی بھی آخر کوئی دوا ہے۔ اسی کی تدبیر کرو کہ طبیعت کو قوت پہنچے یوں کیوں نہیں کہتے کہ جو خدا تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے وہ ہوتا ہے۔

ماشاء الله كان وما لم يشألم يكن جو اللہ چاہتا ہے ہو جاتا ہے جو وہ نہیں چاہتا نہیں ہو سکتا۔

دوا میں خاصیت بھی ان کی ہی رکھی ہوئی ہے جب حکم ہوتا ہے جب ہی وہ اپنا فعل کرتی ہے اور طبیعت میں قوت بھی اسی صرف سے ہے تعجب ہے کہ سب چیز یاد رہتی ہے اسی کو کیوں بھول گئے پس دعا پر تو اتنا تکیہ ہو اور خالق دوا سے اتنی غفلت۔ اے طبیبو اور اے مریضوں یاد رکھو کہ دوا ضرور کرو مگر بھروسہ حق تعالیٰ پر رکھو اور ساتھ کے ساتھ دعا بھی کیا کرو۔

میرٹھ میں ایک حکیم سلامت علی صاحب تھے بڑے مقدس آدمی تھے جس وقت نبض دیکھتے تھے اول پڑھتے تھے۔

سُبْحٰنَکَ لَاعِلْمَ لَنَآ اِلَّامَا عَلَّمْتَنَا ط اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ

تو پاک ہے ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا آپ نے ہم کو بتلایا علیم و حکیم تو ہی ہے۔

جیسے سہارنپور میں ایک سب جج تھے رشوت بالکل نہ لیتے تھے اور نہ مدعی مدعا علیہ سے خلوت میں بات کرتے تھے ان کا بھی معمول تھا کہ تجویز لکھنے سے پہلے یہی آیت پڑھ لیتے تھے ان کے ساتھ ایک شخص نے عجیب قصہ کیا وہ یہ کہ وہ ایک مرتبہ مسجد میں نماز پڑھنے آئے نماز پڑھ کر وظیفہ میں مشغول تھے ایک مقدمہ والے کو کیا سوجھی کہ بعد نماز کے ان کے پاس بیٹھ کر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگا اے اللہ آپ کو معلوم ہے فلاں شخص نے مجھ پر ظلم ظاہر کیا ہے غرض دعا میں پکار پکار کر پورا کچا چٹھا اپنا سب جج کو سنا دیا اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کی گویا سب جج سے کی بیچارے سب جج صاحب کہنے لگے بھائی اب یہ لوگ میری مسجد کی نماز بھی چھڑائیں گے۔

غرض یہ سب جج اور وہ حکیم صاحب اول **سُبْحٰنَکَ لَاعِلْمَ لَنَآ** پڑھتے اور وہ حکیم صاحب پھر مریض سے یوں بھی فرماتے ہیں کہ جب دوا بن کر تیار ہو جاوے تو میرے پاس لے آئیو جب دوا آئی تو

اس پر بھی کچھ پڑھ کر دم فرماتے اب تو اگر کوئی طبیب ایسا کرنے لگے تو اس کا مذاق اڑانے کا خوف ہو تو وہ چپکے چپکے دعا کر لیا کریں لیکن دعا ضرور کریں اور اس عارف کے سبب دعا کے خفی کرنے کی اصل یہی ہے۔
وہ یہ کہ قرآن شریف میں حضرت زکریا علیہ السلام کا قصہ آیا ہے کہ انہوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیدا ہونے کی دعا آہستہ کی تھی چنانچہ ارشاد ہے

اِذْنَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ چپکے دعا اس لئے کی کہ لوگ ہنسیں نہیں اس لئے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال تھی اور بی بی بانجھ تھیں پس اگر لوگوں کے ہنسنے کا خوف ہو تو چپکے چپکے دعا کر لیا کرو۔
ہمارے حضورؐ کی سنت تو یہ ہے کہ اگر لوگ ہنسیں تو پکار کر دعا کرنا چاہئے اس لئے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب حضورؐ نے فارس اور روم کے فتح ہونے کی خبر دی تو کفار ہنسے تو اللہ تعالیٰ نے پکار کر دعا کرنے کی تعلیم فرمائی۔ فرماتے ہیں

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِیَدِکَ الْخَیْرُ ط اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ

یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہئے اے اللہ اے مالک ملک آپ سلطنت جس کو چاہیں دیں اور جس سے چاہیں چھین لیں اور جس کو چاہیں عزت دیں اور جس کو چاہیں ذلت دیں آپ ہی کے قبضہ میں ہے خیر بے شک آپ ہر شے پر قادر ہیں آپ رات کو دن میں داخل کرتے ہیں جس دن بڑھ جاتا ہے اور دن کو رات میں داخل کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے رات بڑھ جاتی ہے پس جب رات کو دن بنا دینا اور دن کو رات بنا دینا آپ کے قبضہ میں ہے تو ضعیف کو قوی بنا دینا اور قوی کو ضعیف کر دینا آپ کو کیا مشکل ہے اور زندہ کو بے جان سے نکالتے ہیں اور بے جان کو زندہ سے نکالتے ہیں اور جس کو آپ چاہتے ہیں بے حساب رزق دیتے ہیں۔
یہ ایسی ہی چیز کی دعا ہے جس پر زیادہ ہنسی ہوئی ہوگی مگر قیامت تک پکار پکار کر پڑھی جاوے گی۔
بہر حال ایسے وقت پکار کر دعا کرنا حضورؐ کی سنت ہے اور آہستہ دعا کرنا زکریا علیہ السلام کی سنت ہے جس پر چاہو عمل کرو خواہ پکار کر دعا کرو خواہ آہستہ اور زکریا علیہ السلام کی سنت من وجہ حضورؐ کی سنت ہے اس لئے

کہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قرآن شریف میں نقل فرما کر اس پر انکار نہیں فرمایا اور یہ قاعدہ ہے کہ قصص اولین اگر بلا انکار اللہ ورسول نقل فرمادیں تو وہ ہمارے لئے بھی حجت ہیں غرض جس طرح ہو دعا کرو۔

تعویذ گنڈے

آج کل یہ جزو تو بالکل متروک ہی ہو گیا۔ ہاں بجائے اس کے ایک تیسرا جزو نکلا ہے کہ بعض لوگ نہ دوا کریں نہ دعا کریں بس جھاڑ پھونک تعویذ گنڈے پر کفایت کرتے ہیں سرسام ہو۔ دورہ بخار ہو، زکام ہو ہر بات کا تعویذ مانگتے ہیں یاد رکھو تعویذ کے دو درجے ہیں ایک درجہ میں تو اس پر اکتفا کرنا مضائقہ نہیں اور اکتفا سے مراد دوا نہ کرنا ہے نہ کہ دعا نہ کرنا اور وہ عوارض ہیں جن کی دوا سے تدبیر نہ ہو سکے اور اصل میں تعویذ ان ہی میں کیا جاتا ہے اور دوسرے درجہ میں دوا ضروری ہے اور یوں اگر تمام امراض میں بھی کرو تو خیر نا جائز تو نہیں ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے نام میں برکت ہے لیکن تعویذ کے ساتھ دوا بھی کرو اب تو یہ خبط ہو گیا ہے کہ ہر بات کیلئے تعویذ کی درخواست کرتے ہیں ایک پہلوان کا میرے پاس بمبئی سے خط آیا کہ کوئی ایسا تعویذ کر دو کہ میں کشتی میں مغلوب نہ ہوں میرا جی تو چاہتا نہ تھا کہ تعویذ نہ لکھوں مگر خیر اس کی خاطر سے میں نے یہ تعویذ لکھ دیا۔

یا ذالبطش الشدید انت الذی لا یطاق انتقامہ

اے سخت پکڑ والے خدا تو وہ ہے جس کے انتقام کی کوئی طاقت نہیں رکھتا

ایک عورت آئی کہ میرا لڑکا شرارت بہت کرتا ہے کوئی تعویذ دے دو میں نے کہا کہ اس کا تعویذ تو ڈنڈا ہے تھوڑے دنوں میں یہ بھی کہنے لگیں گے کہ کوئی ایسا تعویذ دو جس سے روٹی بھی کھانا نہ پڑے آپ سے پیٹ بھر جایا کرے میرا دل ان تعویذوں سے بہت گھبراتا ہے چار ورق کا خط لکھنا مجھ کو آسان ہے مگر دو لکیریں تعویذ کی کھینچ دینا مشکل ہے اور میں تعویذوں کو حرام نہیں کہتا لیکن ہر جائز سے رغبت ہونا بھی تو ضروری نہیں ہے۔

بعض لوگ طاعون کا تعویذ اور نقش مانگتے ہیں صاحبو۔ طاعون میں تعویذ تو جب کارآمد جب کہ طاعون باہر سے آیا ہو طاعون تو تمہارے گھر کے اندر ہے اور اندر ہونے سے یہ نہ سمجھو کہ طاعون چوہوں سے ہوتا ہے چوہوں بے چاروں سے کیا طاعون آتا ایک اور چوہا ہمارے اندر ہے وہ طاعون کا اصلی سبب ہے اس چوہے کا نام نفس ہے جو رات دن ہم سے گناہ کراتا ہے اور گناہوں ہی سے دبا آتی ہے یہ معنی ہیں اندر ہونے کے جب یہ ہے تو پھر تعویذوں سے کیا ہوتا ہے جو اصلی سبب ہے یعنی معصیت اس کا علاج کرو اس کی تو ایسی مثال ہے کہ چور گھر کے اندر اور باہر سے کنڈی اور قفل لگادو۔ مولانا فرماتے ہیں۔

در بہ بست و دشمن اندر خانہ بود　　حیلہ فرعون زیں افسانہ بود

دروازہ بند کر دیا حالانکہ دشمن گھر کے اندر موجود تھا فرعون کا حیلہ اس افسانہ کی بنا پر تھا۔

تدبیر و تقدیر

تو صاحبو۔ ان خارجی تدبیروں سے کیا ہوتا ہے جب کہ طاعون اندر موجود ہے ایک پٹھانوں کی بستی تھی اس میں دو بھائی رہتے تھے ان کی ماں بیمار تھی دونوں نے صلاح کی موت کو اندر نہ آنے دو۔ دونوں بھائی دونوں دروازوں پر بیٹھ گئے صبح کو ماں کو مرا پایا ہر شخص نے دوسرے پر الزام رکھا کہ تیرے دروازے سے موت آئی غرض تکرار بڑھا اور لڑ کر وہیں ڈھیر ہو گئے یہاں بھی موت اس وقت اندر تھی اور یہ باہر کی تدبیریں کر رہے تھے۔

ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ اگر کسی کو ایسی کوٹھڑی میں بند کر دیں کہ وہ چاروں طرف سے بند ہو تو رزق کہاں سے آوے گا فرمایا جہاں سے موت آوے گی یعنی اللہ تعالیٰ موت کی طرح رزق کو بھی اندر پیدا کر دیتا ہے سبحان اللہ کیا جواب دیا ہے۔

اس رزق کے آنے کو ایسی حالت میں کوئی بعید نہ سمجھے ایسا واقعہ بھی ہوا ہے حضرت مریم علیہا السلام جب حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت میں تھیں تو جب حضرت زکریا علیہ السلام تشریف لاتے تو تازہ پھل مریم علیہا السلام کے پاس دیکھتے تو پوچھتے؟ یٰمَرْیَمُ اَنّٰی لَکِ هٰذَا اے مریم یہ کہاں سے آئے؟ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ یعنی مریم علیہا السلام فرماتیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہے بیشک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بغیر حساب کے رزق دیتے ہیں۔

اس آیت کی اسی وقت ایک عجیب تفسیر سمجھ میں آئی ہے کہ مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ ان الله یرزق من یشاء. حق تعالیٰ کا مقولہ ہے لیکن اگر اس کو قالت کے تحت میں داخل کر کے مریم علیہا السلام کا مقولہ بنایا جاوے تو حضرت مریمؑ کے کمال فہم کی دلیل ہو گی کہ جزئیہ کے بعد کلیہ بھی بیان کر دیا۔

تو صاحبو طاعون ان تدبیروں سے نہیں جاتا طاعون تو ایک مرض ہے جو گناہوں کی وجہ سے مسلط ہوتا ہے گناہ چھوڑ دیجئے طاعون دفعہ ہو جائے گا۔ تعویذوں کو میں علی الاطلاق منع نہیں کرتا۔

ممنوع تعویذ

البتہ بعض تعویذ بھی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ قابل منع کرنے کے ہیں ایک تعویذ یہ مشہور ہے:

لی خمسة اطفی بها جرا الوباء الحاطمه　　المصطفیٰ والمرتضی وابنا هما والفاطمه

میرے پاس پانچ تن ایسے ہیں جن سے میں وبا کی حرارت کو توڑتا ہوں۔ جناب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جناب مرتضیٰؓ ان کے دونوں بیٹے اور حضرت فاطمہؓ۔

یہ حضرات پنجتن کے نام مبارک ہیں اگر کچھ تاویل نہ کی جائے تو اس کا مضمون شرک ہے اور اگر تاویل کی جاوے کہ ان کے توسل سے یہ اللہ تعالیٰ سے سوال اور دعا ہے تو دعا کا ادب یہ ہے کہ نثر میں ہو نظم میں کیسی دعا اور پھر یہ کہ توسل ہی ہے تو صحابہؓ اور بھی تو ہیں ان کا نام کیوں نہیں آیا یہ کسی شیعی کی تصنیف ہے ان کو اور حضرات سے بغض ہے اس لئے ان کو چھوڑ دیا۔ اور طرفہ یہ ہے کہ جن کی دوستی میں اوروں سے بغض ہے بغض فرق شیعہ کو خود ان سے بغض ہے حضرات شیخین سے تو اس لئے کہ انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ان کا حق کیوں نہ دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس لئے کہ انہوں نے اپنا حق وصول کیوں نہ کیا۔

چنانچہ کسی جاہل غالی کی حکایت ہے کہ ایک شیعی سنیوں کی مسجد میں نماز کے لئے آیا مسجد میں محراب کے اوپر لکھا دیکھا۔

چراغ و مسجد و محراب و منبر　　ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و حیدر

چھری لے کر چڑھ گیا کہ ہم تو تمہارے واسطے جان اپنی کھوتے پھریں اور تم کو جب دیکھتے ہیں ان ہی کے ساتھ بیٹھا دیکھتے ہیں۔

اس مقام پر ایک اور بات بھی قابل سمجھنے کے ہے شیعہ تو عموماً اور سنی بھی بہت سے نادعلی کا مضمون چاندی کے تعویذ پر نقش کرا کر بچوں کے گلے میں ڈالتے ہیں تو یاد رکھو نادعلی کا مضمون بھی شرک ہے اس کو چھوڑنا چاہئے اس لئے کہ وہ مضمون یہ ہے:

ناد علیا مظهر العجائب　　تجده عونا لک فی النوائب

کل هم وغم سینجلی بنبوتک یا محمد　　وبولایتک یا علی یا علی یا علی

علیؓ کو پکارو جو مظہر العجائب ہے وہ ہر مصیبت میں تمہاری مدد کرے گا غم والم اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری نبوت اور اے علی تمہاری ولایت سے ختم ہو جائے گا

یہ معلوم نہیں کون سی بحر ہے نہ بحر طویل نہ قصیر اس کی ایسی مثال ہے کہ لکھنو میں نواب کی حویلی میں کچھ اشعار کندہ تھے ایک شعر میں کچھ زیادتی تھی ایک ظریف نے یہ لکھ دیا۔

ایک مصرعہ کی بڑھ گئی ہے دم جناب نواب ذوالفقار الدولہ بہادر

ایک شخص تھے جب کوئی شعر سنتے تو کہا کرتے کہ ایسا شعر تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کسی نے کہا کہ حافظ شیرازیؒ کی غزل ہے جسکا مقطع یہ ہے:

غزل گفتی ودر سفتی بیا خوش بخواں حافظ که برنظم تو افشاد فلک عقد ثریا را

اے حافظ تو نے غزل کہی اور موتی پروئے آؤ اسے خوش الحانی سے پڑھو تا کہ تمہاری نظم پر آسمان ثریا کو نثار کرے۔ ایسا شعر کہو تو آپ کہتے ہیں۔

ظہیر برنظم تو آفتاب نثار شود اگرچہ حافظ شیرازی در دیوان خود

گفتہ است کہ برنظم تو افشاند فلک عقد ثریا را

ظہیر تیری نظم پر آفتاب قربان ہوا گرچہ حافظ شیرازی نے اپنے دیوان میں کہا ہے کہ تمہاری نظم پر آسمان ثریا کو نثار کرے ایسے ہی شاعر کوئی نادعلی کے بھی مصنف ہیں کہ اول کے مصرعے تو چھوٹے چھوٹے اور مصرعہ اخیرہ اتنا طویل غرض بعضے سنی بھی بڑے شوق سے گلے میں ڈالتے ہیں سو یہ جائز نہیں ہے۔

اگر ایسا ہی گلے میں ڈالنے کا شوق ہے تو حدیث صحیح میں جو دعائیں آتی ہیں وہ لکھ کر گلے میں ڈالے چنانچہ وہ دعائیں یہ ہیں۔

اعوذ بکلمات اللّٰہ التامات من شر ما خلق بسم اللہ ارقیک من کل داء یوذیک اللّٰہ یشفیک(الترغیب والترھیب ۲: ۴۵۷، بغیر ھذا السیاق)

مگر چاندی کا تعویذ نہ ہو تعویذ گنڈوں کے بارے میں التقی فی احکام الرقی، ایک ایسا رسالہ دیا ہے بقدر ضرورت اس میں اس کے احکام ہیں اس کو ضرور دیکھ لو۔

غرض عرض کی کل تین تدبیریں ہیں۔ دوا، دعا، تعویذ: دوا اول تو ضرور کرو اور تیسری بھی احیانا بعض امراض میں ہو تو مضائقہ نہیں۔ یہ نہ کرو کہ دوا و تعویذ پر اکتفا کرلو اور دعا کو بالکل چھوڑ دو۔ یہ تو مرض کا دستور العمل ہوا۔

فقر وفاقہ

دوسری حالت ضراء یعنی فقر وفاقہ کی ہے اس کے لئے بھی بعض لوگوں نے دستور العمل بنا رکھا ہے تعویذ کراتے پھرتے ہیں عملیات پڑھتے ہیں۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ کا نام دنیا کے لئے پڑھنا گو جائز ہو مگر ادب کے خلاف ہے بعض لوگ دست غیب کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ دست غیب نہیں بلکہ دست عیب ہے اس لئے کہ جن پرایا مال لا کر دیتے ہیں۔ اس لئے حرام ہے بعض

لوگ اس میں ہیں کہ کہیں سے خزانہ مل جاوے بعض کیمیا کی ہوس میں ہیں یاد رکھو۔ صحیح تدبیر اور سچی کیمیا یہ ہے کہ جو اسباب اپنے امکان میں ہیں ان کے لئے محنت و مزدوری کرے اور جو قدرت سے باہر ہے جیسے قحط وغیرہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے۔

ایک بڑا سبب رزق کی کمی کا نافرمانی ہے حدیث شریف میں ہے

ان العبد لیحرم الرزق بخطیئۃ یعملھا (الدرمنثور ۶ : ۳۴۳)

یعنی بے شک بندہ رزق سے محروم ہو جاتا ہے گناہ کے سبب سے اور اسی طرح فرمانبرداری برکت کا سبب ہے یہ مطلب نہیں کہ دس روپے اگر رکھے ہوں تو بیس ہو جاویں گے۔ مطلب یہ ہے کہ تھوڑے سے کام چل جاوے گا۔ اور ضائع نہ جاوے گا۔

بعضے لوگ بارش کے لئے بھی تعویذ کرتے ہیں کسی نے اس کے لئے چہل کاف یاد کر رکھا ہے اور یہ چہل کاف حضرت سیدنا غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہیں عملیات کے اندر اگر وہ حد شرعی میں ہوں کوئی خرابی تو نہیں مگر لوگوں کا عقیدہ عملیات کے ساتھ اچھا نہیں اس لئے بالکل ہی چھوڑ دیں تو اچھا ہے بجائے ان کی مسنون تدبیریں اختیار کریں بارش روکنے کے حروف بھی مشہور ہیں اگر ان عملیات کے بعد بارش ہو جاوے یا رک جاوے تو تعجب نہیں ہے اس لئے کہ بارش کرنے والے اور روکنے والے تو اللہ تعالیٰ ہیں۔ وہ جب چاہیں روک دیں مگر اس سے اس میں تعویذ کا دخل ثابت نہیں ہوتا البتہ جو امور تدبیر کے متعلق ہیں ان میں باذن خالق، تدبیر کو نافع سمجھنا یا تدبیر کرنا کچھ مضائقہ نہیں۔

باقی اگر تدبیر پر یہ شبہ ہو کہ یہ بھی خدا تعالیٰ کو ایک گونہ رائے دینا ہے سو جان لینا چاہئے کہ تدبیر کرنا درخواست کے مرتبہ میں ہے درخواست کرنا اور شے ہے اور رائے دینا دوسری شے ہے۔ مثلاً سرکار سے ہم درخواست کریں کہ فلاں جگہ پل بناؤ تو جائز ہے اور بلا استفسار تجویز کریں۔ اور رائے دیں تو گستاخ بنیں گے اور یہاں ہی سے یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ دعا کرنا کیوں مشروع ہوا حالانکہ اس میں بھی یہی شبہ ہوتا ہے کہ دعا کرنے والا گویا یہ کہتا ہے یوں ہو تو مناسب ہے۔

بات یہ ہے کہ تجویز کرنا ہے برا۔ اور دعا تو اپنی ایک خواہش اور حاجت اور افتقار ظاہر کرنا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر ایسا نہ ہوگا تو اس پر راضی ہوں گے اور اسی کو حکمت کے موافق سمجھیں گے اس نکتہ کو مہمل چھوڑنے کی وجہ سے بعض لوگوں نے دعا چھوڑ دی ہے ہاں جن پر کوئی حال غالب ہے وہ معذور ہیں اور اگر حال غالب نہ ہو تمکین کی حالت ہے تو سمجھے گا دعا رضا کے خلاف نہیں

ہے اس لئے کہ اگر درخواست کے موافق کام نہ ہوگا تو اسی پر راضی رہوں گا اور اسی دقیقہ کو کہ تدبیر مقادم قضا معلوم ہوتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا تھا کہ یارسولؐ اللہ یہ دعا اور رقیہ کیا قضا کو رد کر دیتی ہیں، فرمایا ذلک من القدر۔ یعنی یہ چیزیں بھی قضا میں داخل ہیں پس علاج اور تدبیر اور دعا تقدیر کے ہٹانے والی نہیں ہیں بلکہ یہ عین موافقت ہے قدر کی بات تو ہے مختصر سی مگر حضور نے بڑے سخت اشکال کا جواب دیا غرض ضراء کی حالت کا یہ دستور العمل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مرض میں چھوڑنے کی شے شکوہ وشکایت اور بے صبری کی باتیں ہیں کرنے کے کام ہیں یہ کہ جم کر اور استقلال سے دوا اور دعا کرو احیانا جھاڑ پھونک کا اور تعویذ گنڈے جو حد شریعت کے اندر ہوں کرلو مضائقہ نہیں۔

فقر وفاقہ کی حالت کا دستور العمل یہ ہے کہ اگر فقر وفاقہ آفت سماویہ سے ہے مثلاً قحط ہے امساک باراں ہے اس کی تدبیر تو دعا ہے اور اگر اس کی سستی سے ہے تو اس کی تدبیر محنت ومزدوری وسعی ہے اور دونوں کی مشترک تدبیر جو تدابیر خاصہ سابقہ کے ساتھ مثل شرط کے ہے اصلاح اعمال ہے۔

اب تیسری حالت ہے باس یعنی قتل وقتال کی سوگو اس وقت اس کے دستور العمل بتانے کے چنداں ضرورت نہیں لیکن اگر کسی وقت واقع ہو تو اس کے اندر چھوڑنے کا کام یہ ہے کہ شورش و غدر سے اجتناب کرے اور کرنے کا کام یہ ہے کہ تدبیر وصبر واستقلال سے کام لے۔

یہ ہے تین حالتوں کے متعلق دستور العمل جو حق تعالیٰ نے مختصر کلمہ والصابرین میں بیان فرما دیا ہے آگے ارشاد ہے۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ

یعنی یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو متقی ہیں۔ صدق صرف قول کے ساتھ خاص نہیں بلکہ صدق اصل میں قلب کی صفت ہے جس کا اثر قول وفعل وحال سب میں ظاہر ہوتا ہے اور تقویٰ بھی گو صفت قلب کی ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

الا ان التقویٰ ھھنا واشار الی الصدر (الصحیح لمسلم کتاب البر واصلہ: ۳۲، سنن الترمذی: ۱۹۲۷، مسند أحمد: ۲:۲۷۷)

آگاہ رہو کہ تقویٰ یہاں ہے اور اپنے سینے کے طرف اشارہ فرمایا لیکن اس کا زیادہ ظہور افعال جوارح سے ہوتا ہے۔

ظاہر و باطن

خلاصہ یہ ہے کہ مقبول وہ ہے جس کا باطن بھی اچھا ہو اور ظاہر بھی اور ایسا ہی شخص قابل تعلق پیدا کرنے کے بھی ہے۔ جب کسی سے تعلق پیدا کرو تو ظاہر کو بھی دیکھ لو کہ ظاہر عنوان باطن کا ہے یعنی اس کے قول و فعل میں صدق بھی اور وہ متقی ہو ایک علامت اسی کے تابع یہ ہے کہ اچھے لوگوں کا اس طرف میلان ہو آج کل لوگوں میں یہ خبط ہے کہ ظاہر پر بالکل ہی نظر نہیں کرتے بلکہ جس قدر ظاہر کسی کا خلاف شریعت ہو اس کا زیادہ ولی سمجھتے ہیں حالانکہ باطن کے کمال پر ظاہر ہی سے استدلال کیا جاتا ہے اگر ظاہر بے کار ہے تو گنا کیوں کھاتے ہو گڑ کھالینا کافی ہے اور جس کے نزدیک ظاہر کوئی شے نہیں تو ماں اور بیوی میں بھی اس کو فرق نہ کرنا چاہئے اس لئے کہ جب ظاہر پر نظر ہی نہیں تو ماہیت انسانیہ میں تو سب برابر ہیں سب حیوان ناطق ہیں مولانا رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد　　　موسیٔ باموسیٔ درجنگ شد
چوں بہ بیرنگی و سی کاں داشتی　　　موسیٰ و فرعون دارند آشتی

جب بے رنگی رنگ میں مقید ہو جاتی ہے۔ موسیٰ، موسیٰ کے ساتھ لڑنے لگ جاتا ہے اور جب بیرنگی آجائے تو موسیٰ و فرعون میں بھی صلح ہو جاتی ہے جب اطلاق تقیدات کے اندر آگیا تو اگر تقیدات اٹھا دو تو اطلاق رہ گیا جس میں سب برابر ہیں پھر احکام میں فرق کیوں کرتے ہو۔

اور عجیب تر سنو۔ بعضے ان احکام میں بھی فرق نہیں کرتے پھر وہ اس کو قضیہ عقل بھی بتلاتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص اپنی ماں سے بدکاری کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ میں جب سارا اس کے اندر سے نکلا ہوں تو اگر میرا ایک جز و اس کے اندر چلا گیا تو کیا حرج ہے۔

ایک شخص پاخانہ کھایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ جب میرے اندر ہی سے نکلا ہے تو اگر پھر میرے ہی اندر چلا جاوے تو کیا حرج ہے۔ ایسے ہی آج عقل پرست لوگ ہیں۔ ایسی ہی عقل کی نسبت مولانا فرماتے ہیں۔

آزمودم عقل دور اندیش را　　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

''میں نے اپنی دوراندیش عقل کو آزما لیا اور اس کے بعد اپنے آپ کو دیوانہ بنا لیا۔''

اور ایسے دیوانے کی نسبت فرماتے ہیں۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد　　　مرعسس را دیدہ درخانہ نہ شد

''دیوانہ وہ ہے جو دیوانہ نہ ہو۔ جاسوس کو اندروں خانہ دیکھنے کا کیا حق ہے''

بس ایسی عقل سے خدا بچائے جو حق سے بعید کر دے۔ اصل یہ ہے کہ وہاں تو انقیاد و اطاعت کا کام ہے۔ نری عقل جو مطیع و منقاد نہ ہو محض بیکار ہے مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

فہم و خاطر تیز کر دن نیست راہ　　　جز شکستہ می نگیر و فضل شاہ

ہر کجا پستی است آب آنجا رود　　　ہر کجا دردے دوا آنجا رود

''عقل کو تیز کرنا کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ شکستہ ہی پر فضل فرماتے ہیں جہاں پستی ہوگی پانی وہاں جائے گا۔ جہاں درد ہوگا دوا وہیں کامیاب ہوگی۔ یعنی راستہ یہی ہے کہ شریعت کے سامنے بالکل شکستہ اور پست ہو جاؤ۔

حاصل تمام تقریر کا یہ ہوا کہ صدق کے ساتھ متصف ہو جاؤ جس کو بعنوان دیگر یوں سمجھئے کہ ظاہر و باطن دونوں کو جمع کر لو۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کی نسبت ارشاد فرمایا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ط وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ

یہ حاصل ہے دستور العمل کا۔ ہم کو چاہئے کہ اس دستور العمل پر عمل کریں

اور اولئک الذین صدقوا میں داخل ہو جاویں۔

اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمادیں۔ آمین۔

حقیقت الصبر

صبر کی حقیقت کے متعلق یہ وعظ ۲۴ محرم ۱۳۴۲ھ بروز جمعہ شیخ رشید احمد صاحب متصل عدالت والی مسجد تھانہ بھون کے مکان پر تخت پر بیٹھ کر ان کی اہلیہ کی تعزیت کے طور پر بیان فرمایا۔ اڑھائی گھنٹے میں ختم ہوا۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔ مجمع ۳۰ آدمیوں کا تھا۔ عورتیں اس کے علاوہ پردہ میں تھیں۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدً عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمۡ۔

اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔
وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡھُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ۔ قَالُوۡٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡھِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَرَحۡمَۃٌ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُھۡتَدُوۡنَ (البقرہ آیت نمبر ۱۵۶، ۱۵۷)

(ترجمہ: آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو حقیقۃً اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں ان لوگوں پر خدا تعالیٰ کی طرف سے خاص رحمتیں بھی ہیں اور عام رحمتیں بھی، یہی وہ لوگ ہیں جن کو حقیقت حال تک رسائی ہوگئی)

تمہید: شاید اس آیت کو سن کر کسی کو یہ شبہ ہوا ہوگا کہ اس وقت کسی خاص مصیبت کے متعلق صبر کی تعلیم کی جائے گی۔ اور وجہ اس شبہ کی یہ ہے کہ ''انا اللہ'' اکثر ایسے ہی مواقع میں پڑھا جاتا ہے جہاں کوئی موت کا واقعہ ہو گیا ہو۔ مگر میرا مقصود اس وقت یہ نہیں ہے گو اگر یہ مقصود ہو تب بھی غلط نہیں کیونکہ بعض واقعات اس گھر میں ایسے بھی ہوئے ہیں۔ مگر مجھ کو صرف مضمون تعزیت کا بیان مقصود نہیں کیونکہ اس کا

بیان بار ہا ہو چکا ہے مصیبت کے وقت صبر کی ضرورت کو سامعین بارہا سن چکے ہیں پھر ماشاء اللہ گھر والے خود سمجھدار ہیں۔ان کو اس بات کے سمجھانے کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ میں اس وقت ایسا مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں جو شاید ابھی تک کانوں میں نہ پڑا ہوگا۔اور آج کل اس کی بہت ضرورت ہے۔

اس مضمون کا تعلق صرف مصیبت موت اقرباء سے مخصوص نہیں۔ بلکہ ہر قسم کی مصیبت سے اس کو تعلق ہے۔ مصائب بعض خاص ہوتی ہیں جن کا اثر ایک شخص یا چند اشخاص تک محدود ہو۔ بعض عام ہوتی ہیں جن کا تعلق عام طور پر سب مسلمانوں سے ہو۔ یہ مضمون دونوں قسموں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس وقت مسلمانوں پر عام مصائب کا بھی ورود ہے۔ اس لئے اس مضمون کی بہت ضرورت ہے اور میری عادت یہی ہے کہ اکثر ضرورت کے موافق بیان کیا کرتا ہوں۔ اور ایسے ہی مضامین کو بیان کے لئے اختیار کیا جاتا ہے جن کی طرف توجہ کم ہے چنانچہ اس وقت ایسا ہی مضمون مجھ کو بیان کرنا ہے۔ میں اول اجمالاً تعیین مقصود کئے دیتا ہوں تا کہ پھر تفصیل کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ نیز سامعین کو تمہید سے اس مضمون کا اشتیاق بھی پیدا ہو گیا ہوگا۔ تو دیر تک ان کو منتظر رکھنا بھی مناسب نہیں۔

ظاہر و باطن پر حالات کا اثر

یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ انسان کی حالت یکساں نہیں رہا کرتی۔ بلکہ اس پر مختلف حالات کا ورود ہوتا رہتا ہے کبھی گوارا واقعات پیش آتے ہیں کبھی ناگوار، گوارا واقعات کا اثر تو یہ ہے کہ اس سے دل میں نشاط و انبساط ہوتا ہے فرحت و سرور کا غلبہ ہوتا ہے یہ تو باطنی اثر ہے اور ظاہری اثر یہ ہے کہ اس حالت میں انسان جو کام کرنا چاہتا ہے خوشی خوشی کر لیتا ہے۔ ہر کام میں دل لگتا ہے بلکہ کام کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور جو شخص جس کام کا پابند ہے اس کو پابندی کے ساتھ کرتا رہتا ہے۔ نشاط اور انبساط کی حالت میں دنیا اور دین دونوں کے کام بخوبی چلتے رہتے ہیں۔ گو کوئی شخص سستی و کاہلی یا غفلت و لاپروائی کی وجہ سے کچھ نہ کرے مگر اس حالت کا اثر یہی ہے کہ اگر کام کرنا چاہے تو کر سکتا ہے صرف ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بعد کوئی مانع نہیں ہوتا۔

ناگوار واقعات کی خاصیت یہ ہے کہ ان سے دل میں انقباض اور بستگی پیدا ہو جاتی ہے۔ رنج و غم کا غلبہ ہوتا ہے۔ طبیعت پژمردہ مرجھائی سی رہتی ہے یہ تو باطنی اثر ہے اور ظاہری اثر یہ ہوتا ہے کہ پریشانی بڑھ کر افعال میں اختلال ہو جاتا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ ہر وقت قلب پر ایک فکر سوار ہے جو ہر کام میں ساتھ رہتی ہے جس کی وجہ سے اول تو کچھ کام ہی نہیں ہوتا اور جو ہوتا

ہے تو انتظام کی پابندی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ غرض دین و دنیا دونوں کاموں میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ رنج و غم فکر و پریشانی حدوث ارادہ عمل سے بھی مانع ہوتا ہے اور بقاء ارادہ کو بھی مانع ہوتا ہے۔

اس وقت مجھے اختلال امور دنیا سے تو چنداں بحث نہیں کیونکہ اول تو اس کا ضرر مقابلہ دین کے اشد نہیں۔ دوسرے امور دنیا کے اختلال کا ضرر امر محسوس ہے اس کی طرف چند روز میں خود بخود توجہ ہو جاتی ہے مثلاً کسی کے گھر میں دکان ہے روزانہ دو چار روپے آتے تھے۔ اب پریشانی میں دکان کے بند ہونے سے وہ آمدنی بند ہوگئی تو دو چار دن کے بعد اس ضرر کا احساس خود بخود ہو جاتا ہے وعلیٰ ہذا۔ جو شخص دنیا کمانے کا جو طریقہ بھی اختیار کئے ہوئے ہے اس کے بند ہونے کا ضرر اسے جلد ہی محسوس ہو جاتا ہے اس لئے مجھے اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔

دین پر مصیبت کا اثر

میں اس وقت اعمال دین کے اختلال پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ مصیبت کا اثر دین پر یہ پڑتا ہے کہ معمولات میں اختلال ہو جاتا ہے انسان مصیبت سے پہلے جن اوراد کا پابند ہوتا ہے مثلاً ذکر و شغل یا نماز و تلاوت قرآن وغیرہ کا۔ مصیبت کے وقت ان سب میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض تو فرائض و واجبات کو بھی ناغہ کر دیتے ہیں اور جو دیندار کہلاتے ہیں وہ فرائض و واجبات کو تو ترک نہیں کرتے۔ مگر معمولات زائدہ کو وہ بھی ناغہ کر دیتے ہیں اور ناگوار واقعات کا اثر بہت سخت ہے کیونکہ یہ دین کا ضرر ہے اور مسلمان کے نزدیک دین دنیا سے مقدم ہے اس لئے اس کا ضرر بھی دنیا سے اشد ہے اور اس پر متنبہ کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ دین کا ضرر امر محسوس نہیں فرض نماز یا تہجد یا ذکر، تلاوت قرآن کے ناغہ کرنے سے کوئی ظاہری آمدنی بند نہیں ہوتی۔ تو اس کے ضرر کا احساس بھی جلدی نہیں ہوتا۔ نیز اس ضرر پر کوئی عزیز یا خیر خواہ بھی متنبہ نہیں کرتا۔

حتیٰ کہ مشائخ و معلمین کی بھی یہ عادت ہے کہ جب ان کے کسی مرید وغیرہ پر مصیبت آتی ہے تو اس کو صرف جزع و فزع نہ کرنے کی تعلیم دیتے ہیں اور عام طور پر صبر و شکر کی تعلیم اس معنی میں کی جاتی ہے کہ (جزع و فزع نہ کرو) اس پر نظر نہیں ہوتی کہ اس ناگوار واقعہ سے ان امور میں خلل پڑ گیا ہے جن کا یہ پہلے سے پابند تھا۔ ان طاعات و عبادات میں بھی گڑبڑی ہوگئی ہے جو پہلے سے مامور بہ ہیں نہ اس ضرر پر اس کو متنبہ کیا جاتا ہے۔

منشأ غلطی کا یہ ہے کہ طاعات معمول بہا کی پابندی کو عموماً حقیقت صبر سے خارج سمجھا جاتا ہے اور

اس کے خلل کو نقصان صبر پر محمول نہیں کیا جاتا۔ بس جو شخص مصیبت کے وقت جزع وفزع نہ کرے اس کو بڑا صابر اور مستقل مزاج سمجھتے ہیں گو اس کے معمولات میں کیسا ہی خلل ہو گیا ہو۔ یہ ایک عام سی غلطی ہے جس پر عوام تو کیا خواص کی بھی نظر نہیں۔ اس لئے میں اس وقت اس پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ لوگوں کی نظر ناگوار واقعات کے صرف پہلے اثر پر ہے جو قلب پر واقع ہوتا ہے۔ دوسرے اثر پر جو اعمال پر واقع ہوتا ہے بالکل نظر نہیں کی جاتی۔۔۔ دوسروں کی تو کیا شکایت خود صاحب واقعہ کو بھی اس پر نظر نہیں ہوتی۔ اگر کسی وقت کسی کی نظر ہوئی بھی تو صرف اس قدر کہ پریشانی میں فرائض و واجبات میں اگر خلل آنے لگا تو دینداروں کو اس وقت کچھ تنبہ ہو جاتا ہے۔ مگر سنن و مستحبات کے اختلال پر ان کو بھی بہت کم تنبیہ ہوتا ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ سنن زوائد و مستحبات کے متعلق یہ اعتقاد جما ہوا ہے کہ ان کے کرنے میں ثواب اور نہ کرنے میں گناہ نہیں۔ اس لئے ان کے ناغہ ہونے کو سہل بات سمجھتے ہیں۔ حالانکہ نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنن زائدہ اور مستحبات کا یہ حکم قبل شروع کے ہے۔ اور شروع کے بعد ان کا حکم بدل جاتا ہے۔

چنانچہ ایک حکم تو عین وقت اشتغال کے ساتھ مختص ہے۔ وہ یہ کہ شروع کرنے کے بعد مستحب کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور ایک حکم عام ہے جو وقت اشتغال کے ساتھ مختص نہیں۔ وہ یہ کہ جس مستحب کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور ایک حکم عام ہے جو وقت اشتغال کے ساتھ مختص نہیں۔ وہ یہ کہ جس مستحب کو معمول بنالیا جائے اور کچھ عرصہ تک اس پر مواظبت کر لی جائے۔ اب اس کا ناغہ کرنا اور مواظبت کو چھوڑ دینا مکروہ ہے۔ اور اس کی دلیل ایک حدیث بخاری کی ہے جو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا۔

یا عبد الله لا تکن مثل فلان کان یقوم من اللیل ثم ترکه (الصحیح لمسلم کتاب الصیام :۱۸۵، مشکوٰۃ المصابیح:۱۲۳۳) یعنی اے عبداللہ! تم فلاں شخص کی طرح نہ ہو جانا جو رات کو (نماز کیلئے) اٹھا کرتا تھا پھر چھوڑ دیا۔"

اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کی اس حالت پر ناگواری اور کراہت ظاہر فرمائی ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک مستحب کو معمول بنا کر ترک کر دینا مذموم و مکروہ ہے۔

(قلت بوب علیه البخاری مایکره من ترک قیام اللیل من کان یقومه قال الحافظ ای اذ اشعر ذلک بالاعراض عن العبادة قال وفیه استحباب الدوام علی ما اعتاده المؤمن الخیر من غیر تفریط ویستنبط منه کراهة قطع العبادة وان لم تکن واجبةاھ (ص۳۰ ج۳ فتح الباری ۱۲ جامع)

میں کہتا ہوں اس پر بخاری نے یوں باب باندھا ہے ''جو شخص رات کو اٹھا کرتا تھا اسلیئے ترک قیام مکروہ ہے حافظ نے فرمایا جبکہ خیال یہ گذرے کہ وہ عبادت سے اعراض کر رہا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ اس سے نیکی کی عادت پر مداوت کا مستحب ہونا نکلتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مداومت اگر چہ واجب نہ ہو تب بھی اسکا چھوڑنا جائز نہیں۔

پابندی کے اثرات

اسی لئے بزرگوں کا ارشاد ہے کہ فرائض وواجبات کے علاوہ نوافل وغیرہ کا اتنا ہی پابند ہو جس کو نباہ سکے ورنہ شروع ہی نہ کرے۔اس سے بڑی بے برکتی ہوتی ہے اور انسان کی عادت یہ ہے کہ جب ایک کام کا پابند ہو پھر اس میں فتور ہونے لگے تو اس کا خلل ممتد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس عمل پر تو پھر عمر بھر بھی پابندی نصیب نہیں ہوتی اور اس سے گزر کر دوسرے اعمال میں بھی اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے کہ آج تو تہجد میں فتور ہے کچھ دنوں میں صبح کی نماز کی پابندی بھی نہ رہے گی۔ پھر وقت کی پابندی بھی نہ رہے گی۔نماز قضا ہونے لگے گی اور یہ سارا فساد ایک مستحب کی پابندی چھوڑنے سے ہوا۔

اس کے علاوہ ترک پابندی میں ایک اور خرابی اس سے بھی سخت ہے وہ یہ کہ شریف طبائع کا خاصہ ہے اور مسلمان سب شریف ہی ہیں کہ جب وہ کسی سے ایک خاص قسم کا برتاؤ شروع کرتے ہیں تو جب تک اس برتاؤ کا نباہ ہوتا رہے اس وقت تک تو ان کے دل میں تعلق بھی بڑھتا رہتا ہے اور جب وہ برتاؤ چھوٹ جاتا ہے تو سب سے پہلے اس صاحب برتاؤ ہی کے دل میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے پھر جب دوسرے کو بھی اس کی رکاوٹ کا احساس ہو جاتا ہے وہ بھی رکنے لگتا ہے۔

مثلاً ایک دوست کے ساتھ آپ کا ہمیشہ سے یہ برتاؤ ہو کہ جب آپ اس سے ملنے جائیں کچھ ہدیہ اور تحفہ ساتھ لے جائیں۔ پھر کبھی ایسا اتفاق ہو کہ خالی ہاتھ چلے گئے تو ہر شخص اپنے دل میں غور کرے کہ اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی۔ یقیناً خالی ہاتھ جاتے ہوئے دل رکے گا۔اور ایک قسم کی شرمندگی اس پر طاری ہوگی گو دوسرے کو اس کے خالی ہاتھ آنے کی طرف التفات بھی نہ ہوا ہو مگر اس کے دل میں خود بخود یہ وسوسے دوڑیں گے کہ آج میرے خالی ہاتھ آنے سے دوست کو ضرور کچھ خیال ہوگا وہ اپنے دل میں کہتا ہوگا کہ بس اب وہ تعلق نہیں رہا۔وہ محبت نہیں رہی چاہے اس کے دل میں کچھ بھی نہ آیا ہو۔مگر یہ اپنے معمول کے خلاف کرنے سے ان اوہام میں ضرور مبتلا ہوتا ہے اور یہ طبعی بات ہے۔

بس رکاوٹ کا بیج تو آج ہی سے بویا گیا۔اس کے بعد یہ ہوگا کہ ایک دفعہ تو خالی ہاتھ بھی چلا

گیا تھا۔ اب مہینے گزر جاتے ہیں کہ جانے کا نام بھی نہیں لیتا۔ دور ہی سے خط کے ذریعے سے بات چیت کر لیتا ہے پھر کچھ عرصہ کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ بھی بند ہو جاتا ہے اور دوسرے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص مجھ سے رکنے لگا۔ اب وہ بھی اس سے رکنے لگتا ہے اور محبت مبدل بعدم محبت ہو جاتی ہے پھر عدم محبت کے بعد کبھی عداوت تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

اسی طرح جب کوئی شخص تہجد یا ذکر و شغل شروع کرتا ہے تو جب تک وہ ان کا پابند رہے اس وقت تک اس کے دل میں حق تعالیٰ سے تعلق اور محبت کی ترقی ہوتی رہتی ہے اور جب پابندی چھوٹی تو پہلے اسی کی طبیعت میں افسردگی اور پژمردگی پیدا ہو جاتی ہے۔

حق تعالیٰ سے اس کو ایک قسم کی ندامت سی آتی ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب حق تعالیٰ کے یہاں میرا وہ رتبہ نہیں رہا ہوگا جو پابندی اعمال کے وقت تھا یہاں تک کہ بعض دفعہ یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ میں مردود و مطرود ہو گیا تو پہلے خود اس کے دل میں حق تعالیٰ سے حجاب اور رکاوٹ پیدا ہوتی ہے پھر سچ مچ ادھر سے بھی بُعد و حجاب ہو جاتا ہے۔

ترک معمول کے نتائج

پس ترک معمول سے اول اس کے دل میں افسردگی کا پیدا ہونا یہ پہلا حجاب ہے اور محبت کا خاصہ ہے کہ اس کو نشاط و انبساط سے ترقی ہوتی ہے اور افسردگی سے اس میں کمی آتی ہے۔ جب ایک دفعہ دل میں افسردگی اور پژمردگی پیدا ہو جاتی ہے تو تعلق سابق میں ضرور کمی آتی ہے۔ پھر یہ خیال پیدا ہونا کہ میں مردود و مطرود ہو گیا۔ دوسرا حجاب ہے اس وقت اس کے دل میں سے محبت نکل جاتی ہے اور قلب خالی ہو جاتا ہے پہلے درجہ میں تو حق تعالیٰ کی طرف سے حجاب نہ ہوا تھا۔ مگر اب ادھر سے بھی حجاب ہو گیا۔

پھر جب مردودیت کا خیال جم کر اس کے قلب سے محبت حق نکل جاتی ہے تو واجبات و فرائض میں بھی کوتاہی کرنے لگتا ہے اور معاصی پر اقدام کرنے لگتا ہے اور دل میں سمجھتا ہے کہ میں مردود تو ہو ہی گیا۔ پھر لذات نفس میں کیوں کمی کروں۔ یہ تیسرا حجاب ہے۔ اس وقت محبت مبدل بعداوت ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد بعض اوقات کفر کی سرحد سے قریب ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ ایمان تک سلب ہو جاتا ہے۔

میرٹھ میں ایک کوتوال تھے وہ بہت ظلم کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ میں جہنم میں تو جاؤں ہی گا۔ پھر رشوت اور ظلم میں کمی کیوں کروں۔ یہ حالت سخت حجاب کی دلیل ہے۔ مگر نہ معلوم کس بزرگ کی توجہ کا اثر ہوا یا کون سا عمل ان کا قبول ہو گیا کہ ان کا خاتمہ اور انجام اچھا ہوا۔

ورنہ ہیچ از دل بے رحم تو تقصیر نبود (دل بے رحم نے کوئی تقصیر ایسی نہ تھی جسے نہ چھوڑا ہو)

انہوں نے تو اپنی طرف سے خاتمہ برا ہونے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ حق تعالیٰ ہی نے دستگیری فرمالی اور اس تمام حالت کا منشا اور سرچشمہ وہی افسردگی ہے جو اول اول معمولات سابقہ میں کوتاہی کرنے سے قلب میں پیدا ہوتی ہے۔

حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ نے ''فوائد الفواد'' میں حجابات کی سات قسمیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ غفلت واعراض بھی ہے جس کا اثر افسردگی ہے اور بقیہ چھ درجے ہیں۔ حجاب۔ تقاضل۔ سلب مزید۔ سلب قدیم۔ تسلی اور عداوت۔

یعنی اول اعراض ہوتا ہے اگر معذرت وتوبہ نہ کی حجاب ہو گیا۔ اگر پھر بھی اصرار رہا تقاضل ہو گیا۔ اگر اب بھی استغفار نہ کی تو عبادت میں جو ایک زائد کیفیت ذوق وشوق کی تھی وہ سلب ہوگئی۔ یہ سلب مزید ہے اگر اب بھی اپنی بے ہودگی نہ چھوڑی تو جو راحت وحلاوت کہ زیادتی کے قبل اصل عبادت میں تھی وہ بھی سلب ہوگئی۔ اس کو سلب قدیم کہتے ہیں۔ اگر اس پر بھی توبہ میں تقصیر کی تو جدائی کو دل سے گوارا کرنے لگا۔ یہ تسلی ہے۔ اگر اب بھی وہی غفلت رہی تو محبت مبدل بہ عداوت ہوگئی نعوذ باللہ منہا۔

اس لئے مستحبات معمولہ کو ترک کرنا سہل بات نہیں۔ اس کا اثر بہت دور تک پہنچ جاتا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ آدمی جس قدر مستحبات ونوافل زیادہ کرتا ہے وہ اسی قدر مقرب ہوتا ہے پھر تقرب کے بعد حق تعالیٰ سے بے التفاتی کرنا سخت بات ہے حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہمارے مذاق کے موافق معاملہ فرماتے ہیں۔

غائب کا ظاہر پر اثر

عالم ظاہر عالم غیب کا نمونہ ہے۔ پس جیسا ہمارا مذاق یہ ہے کہ جس کو اپنے سے تعلق زیادہ نہیں ہوتا۔ اس کی بے التفاتی زیادہ ناگوار نہیں ہوتی اور تعلق بڑھا کر جو التفاتی وبے اعتنائی کرتا ہے اس پر زیادہ غصہ آتا ہے ایسے ہی حق تعالیٰ کے ساتھ جن کو معمولی تعلق ہے ان کی غفلت وبے اعتنائی پر زیادہ قہر نہیں ہوتا اور جو تعلق بڑھا کر مقرب بن کر غفلت وبے التفاتی کا برتاؤ کرتے ہیں ان پر زیادہ قہر ہوتا ہے۔

پس جو لوگ مستحبات ونوافل پر مواظبت کر کے پھر ترک مواظبت اختیار کرتے ہیں وہ درباری بن کر دربار سے غیر حاضر ہوتے ہیں اور بادشاہ کا درباری اگر دربار سے بلا وجہ، بلا عذر کے غیر حاضر ہونے لگے تو اس پر بہ نسبت غیر درباری کے زیادہ عتاب ہوگا۔ اور اگر ترک مواظبت علی المستحبات سے گزر کر وہ فرائض وواجبات میں بھی کوتاہی کرنے لگے۔ معاصی پر بھی اقدام کرنے لگے تو اس کی

ایسی مثال ہے جیسے کوئی مقرب شاہی بن کر نافرمانی اور گستاخی کرنے لگے اور ظاہر ہے کہ مقرب کی گستاخی پر جس قدر عتاب ہوگا ایک غیر مقرب مثلاً دیہاتی یا گنوار کی گستاخی پر اتنا عتاب نہ ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ناگوار واقعات کا یہ اثر بہت سخت ہے کہ ان سے بعض اوقات اعمال میں تقلیل ہونے لگتی ہے۔ لوگ مصائب کا حق صرف اتنا سمجھتے ہیں کہ ایسے مواقع پر جزع وفزع نہ کیا جائے اور اسی کو کمال صبر سمجھتے ہیں۔ اس پر کسی کی نظر نہیں کہ ناگوار واقعات کا یہ بھی ایک حق ہے کہ اس وقت اعمال سابقہ میں کمی نہ کی جائے اس کو تو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھتے حالانکہ معمولات ترک کرنے کا ضرر بہ نسبت جزع وفزع کے ضرر کے بہت زیادہ ہے کیونکہ جزع وفزع کا اثر محدود غیر ممتد ہے اور اس میں انسان کی کسی قدر معذور بھی شمار ہوسکتا ہے اور تقلیل اعمال کا ضرر ممتد ہے جو بہت دور تک پہنچتا ہے اور اسی لئے مصیبت کے وقت معمولات پر جمار ہنا صبر جزو اعظم ہے۔

مصائب اور حواس

اسی مضمون پر تنبہ کرنے کے لئے میں نے اس آیت کی تلاوت کی ہے جس میں حق تعالیٰ نے ہم کو مصیبت کے ہلکا کرنے کا ایک طریقہ بتلایا ہے جس پر عمل کرنے سے یہ اثر تقلیل فی الاعمال ظاہر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ناگوار واقعات سے اعمال میں تقلیل کا سبب فرط غم اور غلبہ حزن ہے بس اگر کسی تدبیر سے غم اور رنج کو ہلکا کر دیا جائے تو اس کا یہ اثر بھی ظاہر ہوگا۔

قاعدہ ہے کہ ازالہ سبب سے مسبب کا ازالہ ہوجاتا ہے اس آیت سے اوپر بعض مصائب کا ذکر ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ

''اور البتہ ہم تم کو ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف سے یعنی تم کو دشمنوں کی طرف سے اندیشہ اور خوف بھی پہنچے گا اور جوع سے یعنی کسی وقت تم پر فاقہ بھی آئے گا اور اموال ونفوس اور ثمرات کے نقصان سے یعنی کسی وقت تمہارا مال بھی ضائع ہوگا۔ جانیں بھی ضائع ہوں گی اور ثمرات بھی ضائع ہوں گے۔

ثمرات کی ایک تفسیر تو پیداوار ہے۔ مطلب یہ کہ کسی وقت تمہاری کھیتوں اور باغات کی پیداوار پر آفت آئے گی اور گو اموال میں یہ بھی آگئے تھے۔ مگر چونکہ زمینداروں کے نزدیک یہ اعزا الاموال ہیں۔ اور مدینہ والے اکثر زمیندار تھے اس لئے ثمرات کو مستقلا بیان فرمادیا۔ اور ایک

تفسیر ثمرات کی اولاد ہے کیونکہ وہ ماں باپ کے جگر کے ٹکڑے ہیں۔اسی لئے اولاد کو ثمرات الفواد کہا جاتا ہے اور گو وہ نفوس میں داخل ہو سکتے ہیں مگر یہاں بھی تخصیص کی وہی وجہ ہوگی جو ثمرات بمعنی پیداوار کو اموال کے بعد ذکر کرنے کی وجہ تھی یعنی چونکہ اولاد اعز النفوس ہیں اور ان کے مرنے کا غم زیادہ ہوتا ہے اسلئے ان کو جدا بیان کر دیا کہ کسی وقت تمہاری اولاد بھی ہلاک ہوگی۔

اس میں ایک تو یہ بتلا دیا کہ تم پر یہ واقعات وارد ہوں گے۔ دوسرے یہ بھی بتلا دیا کہ ان واقعات سے ہم تمہارا امتحان لیں گے۔ یہی ایک لفظ ایسا ہے کہ اگر اور بھی کچھ نہ ہوتا تو اسی سے مصیبت ہلکی ہوگئی۔ کیونکہ امتحان کا لفظ سنتے ہی مخاطب کو فکر ہو جاتی ہے کہ مجھے اس امتحان میں پاس ہونے کی کوشش کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ فیل ہو جاؤں۔ اور قاعدہ ہے کہ انسان امتحان کے وقت اپنے حواس وعقل کو مجتمع رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ پس یہ سن کر یہ واقعات بطور امتحان کے آئیں گے۔ ہر شخص اس کی کوشش کرے گا کہ ان مواقع میں اپنے عقل وحواس کو مجتمع رکھے از خود رفتہ نہ ہو جائے کیونکہ امتحان کے وقت بد حواس ہو جانے سے آدمی فیل ہو جاتا ہے اور مصیبت کے وقت عقل وحواس کا قائم رکھنا بھی اس کے اثر کو بہت کم کر دیتا ہے۔ پس لنبلونکم میں اس پر تنبیہ کر دی گئی ہے کہ مصائب کے وقت بد حواس نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ ان کو امتحان سمجھ کر کامیاب ہونے کی کوشش کرنا چاہئے۔

راحت کا خاصہ

پھر اس میں صیغہ جمع متکلم اختیار فرمایا جس سے عظمت ابتلا پر دلالت ہے کیونکہ معلوم ہو گیا کہ یہ امتحان حق تعالیٰ خود لیں گے اور جیسا ممتحن عظیم الشان ہوتا ہے ویسا ہی امتحان بھی عادۃً مہتم بالشان ہوتا ہے۔ گو واقع میں حق تعالیٰ کی طرف سے امتحان عظیم نہ ہو آسان اور سہل ہی ہو مگر مخاطب کو بتلا دیا کہ وہ ابتلا عظیم کے لئے تیار رہے اور اس میں بھی حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ پہلے سے ہم کو مطلع فرما دیا کہ تم کو ایسے ایسے واقعات پیش آئیں گے۔ اس صورت میں تکلیف کی کلفت تو ہوگی مگر دفعۃً ایذا پہنچنے کی جو تکلیف ہوتی ہے وہ نہ ہوگی۔

اسکی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو پہلے سے کہہ دیا جائے کہ تمہارا آپریشن کیا جائے گا۔ اس صورت میں اس کو اپریشن کی تکلیف تو ہوگی مگر دفعۃً کلفت پہنچنے کا صدمہ نہ ہوگا کیونکہ پیشگی اطلاع سے وہ اس کیلئے تیار رہے گا۔

لوگ آیت **لاتقنطوا** کو آیت رحمت سمجھتے ہیں مگر کہتا ہوں کہ ہر ہر آیت سے یہی رحمت ٹپکتی

ہے چنانچہ اس آیت میں کتنی بڑی رحمت کا مضمون ہے کہ ہم کو مصائب کے لئے پہلے سے تیار کر دیا۔ تا کہ وقت پر بدحواس نہ ہو جائیں۔ بلکہ یوں کہیں۔

هٰذَا مَاوَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

کہ یہ تو وہی بات ہے جس کا وعدہ ہم سے خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے کر دیا تھا۔ اور یہ بھی خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ انسان کی مرضی کے موافق سارے کام نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات ناگوار اور خلاف طبع بھی اس کو پیش آتے ہیں۔ اگر سب کام اسی کے مرضی کے موافق ہوا کرتے تو یہ تو ہلاک ہو جاتا۔ کیونکہ اس صورت میں یہ تو اپنے لئے راحت ہی تجویز کرتا۔ اور راحت کا خاصہ ہے بےفکری اور غفلت۔ پس دوام راحت سے یہ غفلت میں پڑ جاتا۔ اور معاصی پر دلیر ہو جاتا۔ اور یہ اس کے لئے سراسر ہلاکت ہے۔ اس کے لئے حق تعالیٰ نے سب کام اپنی مرضی پر رکھے ہیں ہماری مرضی پر نہیں رکھے پس جب کبھی ہم غفلت وغیرہ میں مبتلا ہوتے ہیں ادھر سے کسی ناگوار واقعہ کا ایک تازیانہ لگا دیا جاتا ہے جس سے کچھ دنوں تک غفلت کا علاج ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف توجہ پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ طاعون وغیرہ کے زمانے میں سالہاسال کے بےنمازی بھی نمازی ہو جاتے ہیں اور ہر شخص کو گونہ آخرت کی فکر ہو جاتی ہے گو یہ واقعات ہم کو ناگوار ہوتے ہیں مگر ان میں ہمارے واسطے حکمت اور منفعت رکھی ہوئی ہے اگر حق تعالیٰ ہماری مرضی کے موافق ہی سب کام کیا کریں تو ہم کو آخرت کی طرف کبھی توجہ نہ ہو۔ پس ناگوار واقعات کا پیش آنا بھی بڑی رحمت ہے۔

جیسے استاد کی شفقت یہ ہے کہ کبھی کبھی بچہ کے ایک دو قمچی مار دیا کرے ورنہ وہ تو بدشوق ہے۔ اگر یہ کبھی اس کو ہاتھ بھی نہ لگاوے گا تو بچہ بالکل خراب ہو جائے گا۔ نہ پڑھے گا نہ لکھے گا نہ بے جا حرکتوں سے باز آئے گا۔ بلکہ سر پر چڑھ جائے گا۔ استاد کی شان میں بھی گستاخی کرنے لگا۔ اس حالت میں آپ خود ہی یہ رائے دیتے ہیں کہ استاد کو تنبیہ و تادیب سے کام لینا چاہئے اور اس کے حق میں اسی کو شفقت سمجھتے ہیں پھر اس کو کیا وجہ ہے کہ ناگوار واقعات میں حق تعالیٰ کی رحمت کا اعتقاد نہ ہو۔

کاملین کی آزمائش

یہاں شاید سامعین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ غافلین کو ناگوار واقعات پیش آنے کی تو یہ حکمت ہے مگر کاملین کو ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں وہ تو بدشوق نہیں ہیں۔ جس سے ان کو تنبیہ کی ضرورت ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ اہل اللہ کاملین کو بھی ایسے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں۔

اس شبہ کا جواب اسی آیت میں لفظ لنبلونکم سے نکلتا ہے کیونکہ اس میں اولاحضرات صحابہؓ کو خطاب ہے جو سب کے سب کاملین ہیں اور ان سے فرمایا گیا ہے کہ تم کو ان واقعات سے آزمائیں گے۔ معلوم ہوا کہ کاملین پر ایسے واقعات بطور تنبیہ اور تادیب کے نہیں آتے۔ بلکہ بطور تنبیہ امتحان کے پیش آتے ہیں حق تعالیٰ ناگوار واقعات سے ان کی محبت وعشق کا امتحان فرماتے ہیں اور حق تعالیٰ کو خود امتحان کی کوئی ضرورت نہیں ان کو ہر شخص کی حالت خوب معلوم ہے۔ بلکہ اس امتحان سے دوسروں کو دکھلانا منظور ہے مثلاً ملائکہ وغیرہ کو۔ کہ دیکھ ہمارے بندے مصائب میں بھی کیونکر ہم کو چاہتے ہیں۔ باوجودیکہ ہم ان کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ ہماری محبت سے نہیں ہٹتے اور تکلیف کو عین راحت سمجھتے ہیں۔ پس اب اس شبہ کا جواب ہو گیا ہے کہ کاملین پر ایسے واقعات کیوں آتے ہیں۔

نیز لفظ لنبلونکم میں اس طرف اشارہ ہے کہ کاملین کو مصائب سے کلفت بھی ہوتی ہے کیونکہ یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ اس آیت کے مخاطب حضرات صحابہ ہیں۔ جو سب کے سب کامل ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان پر یہ اقعات بطور امتحان کے آتے ہیں۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب اس کے ساتھ ایک مقدمہ یہ ملالو کہ بدوں احساس کلفت کے امتحان نہیں ہو سکتا اور یہ بالکل ظاہر اور بد، یہی بات ہے۔ جس شخص کو ناگوار واقعات سے کچھ بھی کلفت نہ ہو اس کے حق میں ان کو امتحان نہیں کہا جا سکتا۔

امتحان ہمیشہ اسی چیز سے ہوا کرتا ہے جس کا دوسرے پر بار پڑے اور اس کو بار کا احساس بھی ہو۔ جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو ثابت ہو گیا۔ کہ مصائب سے کاملین کو بھی کلفت ہوتی ہے۔ اتنا فرق ہے کہ کاملین کو صرف جسمانی کلفت اور طبعی رنج ہوتا ہے اور عقلی بھی۔ کیونکہ اہل دنیا کو طول امل کی وجہ سے بہت چیزوں کے ساتھ توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔

مثلاً اموال کے ساتھ توقع وابستہ ہوتی ہے کہ اس مال سے یہ کام نکالیں گے کھیت کی پیداوار سے توقع وابستہ ہوتی ہے کہ اس مرتبہ غلہ بیچ کر فلاں کام کریں گے پھر ان کے خلاف ظہور میں آتا ہے تو ان کو سخت کلفت ہوتی ہے اسی طرح اولاد کے ساتھ توقع وابستہ ہوتی ہے کہ لڑکا پڑھ کر امتحان میں پاس ہوگا تو یوں نوکر ہوگا۔ یوں ہمیں کما کر دے گا پھر وہ مر گیا تو افسوس ہوتا ہے کہ ہائے! یہ بچہ تو پاس ہونے والا تھا اب دور ہو گیا۔ طبعی رنج تو مفارقت کا ہوتا ہی ہے مگر دنیا داروں کو ان امیدوں کے باطل ہو جانے سے عقلی رنج بھی ہوتا ہے اور گو زبان سے نہ کہیں مگر دل میں یہ وسوسہ اکثر کے ذہن میں آ جاتا ہے کہ یہ واقعہ بے محل اور قبل از وقت ہوا۔ اور دیندار کو کسی چیز سے توقع وابستہ نہیں

ہوتی۔ اس کو خدا کے سوا کسی سے کچھ امید نہیں ہوتی۔ اس کو کسی ناگوار واقعہ میں خلاف حکمت ہونے کا وہم بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کو عقلی رنج ایسے موقع پر ہرگز نہیں ہوتا بلکہ یوں کہتا ہے

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود (محبوب جو بھی کرے وہ شیریں ہے)

ہاں طبعی رنج ان کو بھی ہوتا ہے اور اتنا رنج تو ہونا چاہئے ورنہ پھر امتحان کیسے ہوگا۔ اور مصائب میں طبعی رنج موجب نقص نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل ہوگا۔ آپ اپنے صاحبزادے کی وفات پر فرماتے ہیں:

نا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون(جامع المسانید ۲ :۵٦٧ ، بلفظ "بک" مکان " بفراک")

معلوم ہوا کہ صاحبزادہ کی وفات سے طبعی رنج آپ کو بھی ہوا اور وہ صرف مفارقت کا رنج تھا۔ انسان کو ایک جانور کے چندروز پالنے سے اس کی ساتھ انس ہو جاتا ہے اور اس کی مفارقت کا صدمہ ہوتا ہے پھر بھلا اولاد کی مفارقت کا صدمہ تو کیونکر نہ ہو۔ یہ تو طبعی بات ہے جو طبیعت انسانیہ کا خاصہ ہے پس جو کامل بشر ہوگا اسے صدمہ کی بات سے طبعی صدمہ ضرور ہوگا۔ ہاں کامل کو عقلی صدمہ نہ ہوگا۔

ناقص وکامل کی صورت

شاید کسی کو بعض بزرگوں کے ایسے واقعات سے کہ ان کو اولاد کے مرنے پر رنج نہیں ہوا بلکہ وہ ہنستے تھے یہ شبہ ہو کہ یہ حالت زیادہ کمال کی ہے اور ظاہر میں یہ لوگ ان لوگوں سے کامل معلوم ہوتے ہوں گے جو ایسے مواقع پر رنجیدہ اور غمگین ہوئے ہیں سو یہ شبہ لغو ہے۔ نبیؐ سے زیادہ کامل کوئی نہیں ہوسکتا۔ جب آپ کو ایسے واقعات سے رنج ہوا تو رنج ہونا نقصان کی دلیل نہیں۔ بلکہ عاقل یہ کہے کہ زیادہ کامل وہی شخص ہے جس کو رنج ہوا اور پھر حدود سے متجاوز نہ ہوا کیونکہ وہ واقعہ ایسا ہی ہے جس سے رنج پیدا ہونا چاہئے تو جس نے رنج کا احساس کیا معلوم ہوا کہ اس کے حواس کامل اور درست ہونے میں کلام ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی حالت وغیرہ کی وجہ سے اس کے حواس بشریہ معطل ہیں۔ اسی لئے اس کو ایسی بات سے رنج نہیں ہوا جس سے طبعی طور پر رنج ہونا چاہئے تھا۔

اس فرق کو ایک مثال میں سمجھئے۔ فرض کیجئے کہ ڈاکٹر نے دو شخصوں کا آپریشن کیا۔ ایک کو تو کلورافارم سنگھایا۔ وہ تو اپریشن کے وقت بے حس وحرکت پڑا رہا۔ نہ چیخا نہ چلایا نہ ہاتھ پیر ہلائے اور دوسرے کو بدوں کلورافارم سنگھائے اپریشن کیا۔ اس نے ایک چیخ ماری مگر ہاتھ پیر بالکل نہیں ہلائے۔ ظاہر میں نادان کو پہلا

شخص کامل معلوم ہوگا۔ مگر حقیقت شناس دوسرے کو کامل کہے گا اور سمجھے گا کہ پہلے کے تو حواس معطل تھے۔ اسے خبر ہی نہیں ہوئی کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے۔ نہ زخم کی تکلیف کا احساس ہوا اس کا حرکت نہ کرنا کمال نہیں۔ کمال دوسرے شخص کا ہے کہ اس کے حواس درست تھے اس کو زخم نشتر کی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ اور پھر ضبط سے کام لیا۔ ہاتھ پیر نہیں ہلائے صرف ایک چیخ مار کر دم بخود رہ گیا۔

اسی طرح سمجھئے کہ ایسے اولیاء کو حق تعالیٰ نے کلوروفارم سنگھا کر مصیبت کا نشتر لگایا ہے اس لئے ان کو مصیبت کے اثر کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اور وہ ہنستے رہے۔ اور انبیاء کو کلوروفارم نہیں سنگھایا کیونکہ ان میں ضبط وتحمل کی طاقت ہے وہ بدوں بے ہوش کئے بھی مستقل مزاج رہتے ہیں۔ گو تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ کلفت ورنج طبعی کا اثر ہوتا ہے مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے پہاڑ کی طرح جمے رہتے ہیں۔ وہ اولیاء ناقص ہیں جن کو صدمہ کی بات سے طبعی صدمہ بھی نہ ہو۔ کامل وہ ہے جس کی حالت انبیاء کے مشابہ ہو۔ اس لئے کاملین کو رنج ہوتا۔

اب سمجھئے کہ یہاں کلوروفارم کیا چیز ہے وہ غلبہ حال ہے جس سے بعض دفعہ احساس معطل ہو جاتا ہے انبیاء اور اولیاء کاملین پر ایسا غلبہ حال نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو شاذ ونادر ہوتا ہے۔ اکثر متوسطین سلوک پر غلبہ حال زیادہ ہوتا ہے۔

غرض لنبلونکم میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کاملین پر طبعی رنج وکلفت کا اثر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ناگوار واقعات میں ان کے لئے امتحان وابتلا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ سے اس اشارہ کی تائید ہوگئی۔

اس تقریر سے یہ بات تو معلوم ہوگئی ہوگی کہ اس وقت مجھ کو اصل مقصود تقلیل اعمال کے ضرر پر تنبیہ کرنا ہے اور یہ بتلانا منظور ہے کہ بعض دفعہ جو کسی سبب سے ہم لوگ معمولات سابقہ میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں یہ حالت خطرناک اور قابل اصلاح ہے۔ تعیین مضمون سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مضمون کچھ اس آیت کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ اس کا بیان قریب قریب ہر آیت میں موجود ہے کیونکہ قرآن میں جا بجا استقامت علی الاعمال کی تاکید ہے احادیث بھی اس سے بھری ہوئی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

استقیموا ولن تحصوا استقامت اختیار کرو اور گنتی نہ کیا کرو۔

(مسند احمد ۵:۲۷۷، ۲۸۲، سنن الدارمی ۱:۱۶۸، مشکوٰۃ المصابیح :۲۹۲)

اور ارشاد ہے: ان احب الاعمال الی اللہ مادیم علیہ "اللہ کے نزدیک محبوب اعمال وہ ہیں جن پر مداومت کی جائے۔"

(الصحیح لمسلم صلوٰۃ المسافرین :۲۱۵، سنن النسائی ، القبلۃ ب:۱۳۳)

سعد و نحس

مگر تعیین آیت کی وجہ یہ ہوئی کہ آجکل مسلمانوں پر مصائب کا چار طرف سے ہجوم ہے نیز یہ مہینہ بھی محرم کا ہے، جو مصیبت کا زمانہ مشہور ہے۔ جس کا منشا حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ (ورضا ورضی عن من یحبہ) کی شہادت کا واقعہ ہائلہ ہے۔ جو درحقیقت ایک صدمہ جانکاہ ہے مگر جہالت کے سبب ہم لوگوں نے اس میں حدود سے تجاوز کرلیا ہے۔ جس کا اثر تو یہ ہوا کہ لوگوں نے اس زمانے میں نکاح وشادی کو ناگوار اور مکروہ سمجھ لیا۔

چنانچہ ہمارے ایک عزیز کی شادی ذوالحجہ کی ۳۰ تاریخ کو قرار پائی تھی جس میں محرم کی چاند رات کا ہونا تو متیقن تھا اور یہ بھی احتمال تھا کہ شاید کسی جگہ آج ہی محرم کی پہلی ہو۔ تو لڑکی کے ولی کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی کہ تاریخ شادی ...... کے لئے بھلا یہی دن رہ گیا تھا۔ مگر انہوں نے اتنا کرم کیا کہ شادی میں گو خود شریک نہیں ہوئے لیکن اجازت نکاح دے دی اور اپنی طرف سے اپنے ماموں صاحب کو بھیج دیا۔ ہم نے کہا کہ اس خیال کو توڑنا چاہئے۔ اسی دن نکاح کیا مگر کئی سال تک مستورات کو فکر رہا کہ دیکھئے کوئی ناگوار بات نہ پیش آجائے اگر لڑکی کا ذرا بھی کان گرم ہوا تو اس کے ولی یہی کہیں گے کہ یہ اس تاریخ میں نکاح ہونے کی نحوست ہے۔ مگر بحمد اللہ کوئی ناگوار بات پیش نہیں آئی اور دونوں میاں بیوی خوش وخرم ہیں۔ صاحب اولاد بھی ہیں۔ حق تعالی نے کھلی آنکھوں کو دکھلا دیا کہ عوام کا ان زمانے کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے۔

نصوص میں جابجا اس کی تصریح ہے کہ نحوست وسعد کا سبب زمانہ وغیرہ نہیں۔ نہ کوئی دن منحوس ہے نہ کوئی مہینہ۔ نہ کسی مکان میں نحوست ہے نہ کسی انسان میں۔ بلکہ اصل نحوست اعمال معصیت میں ہے۔ مگر افسوس! اس نحوست سے اجتناب کا کسی کو اہتمام نہیں بلکہ خود بخود اپنے ساتھ لپیٹتے ہیں۔

تجدید غم و اظہار حزن

دوسرا اثر اس واقعہ سے یہ لیا گیا ہے کہ اس تذکرہ کا اعادہ ہر سال ہوتا ہے۔ چنانچہ محرم میں جابجا شہادت نامے پڑھے جاتے ہیں۔ مجالس عزا قائم کی جاتی ہیں۔ اور اس واقعہ کو سن کر لوگ بے اختیار روتے ہیں۔ بعضے بری طرح نوحہ کرتے ہیں۔ پھر شہداء کی یادگار میں تعزیئے اور علم نکالے جاتے ہیں۔

نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہوجائے گا کہ یہ حالت بھی خلاف شرع اور قابل اصلاح ہے کیونکہ ان تمام افعال کا خلاصہ تجدید غم واظہار حزن ہے حالانکہ تجدید غم واظہار حزن مرضی خداوندی کے بالکل خلاف ہے۔

مرضی حق یہ ہے کہ رنج طبعی کو اس کی حد سے نہ بڑھایا جائے اور اپنی طرف سے غم بڑھانے کا کوئی سامان نہ کیا جائے۔ بلکہ حق تعالیٰ نے تو رنج طبعی کے کم کرنے کے بھی سامان کئے ہیں۔ چنانچہ وہ باتیں تعلیم فرمائیں ہیں جن کے استحضار سے رنج طبعی بھی کم ہو جاتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ. قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

یعنی حضورؐ کو خطاب ہے کہ ان صابرین کو بشارت دے دیجئے جو مصیبت پہنچنے کے وقت یہ کہتے ہیں کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس جملہ میں ایسا مضمون سکھلایا گیا ہے جو رنج و غم کی بنیادیں اکھاڑنے والا ہے۔ تفصیل اسکی یہ ہے کہ کسی واقعہ سے صدمہ جب ہوا کرتا ہے جب وہ خلاف مرضی واقعہ ہوا ہو اور کوئی واقعہ خلاف مرضی جب ہوتا ہے کہ ہم پہلے سے اپنے ذہن میں اس کے متعلق کوئی شق تجویز کر لیں کہ یوں ہونا چاہئے جب اس کے خلاف دوسری شق ظاہر ہوتی ہے تو وہ ناگوار اور خلاف مرضی ہوتی ہے۔ چنانچہ کسی عزیز کی موت پر ہم کو صدمہ اسی لئے ہوتا ہے کہ ہم نے یہ تجویز کر رکھا تھا کہ ہم سے کبھی جدا نہ ہو۔ ہمیشہ پاس ہی رہے۔

حق تعالیٰ نے انا للہ میں تجویز کا استیصال کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ تم کو یہ مضمون پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ہم خدا کی ملک ہیں۔ خدا تعالیٰ ہمارے مالک ہیں اور ہم ان کے مملوک ہیں اور مملوک کی ہر چیز مالک کی ہوا کرتی ہے تو ہماری چیز بھی خدا ہی کی ملک ہے اس کے ساتھ ایک مقدمہ عقلیہ یہ ملالو کہ تجویز کا حق مالک کو ہوتا ہے غلام کو کسی تجویز کا حق نہیں جب تجویز کا حق مالک کو ہوتا تو ہمارا کسی عزیز کی مفارقت پر اس لئے غم کرنا کہ ہم نے اس کے متعلق یہ تجویز کر رکھا تھا کہ ہمیشہ ہمارے پاس رہے بڑی غلطی ہے آپ تجویز کرنے والے ہوتے کون ہیں؟

اس کی تو ایسی مثال ہوئی کہ گھر کی مالکہ نے الماری میں برتنوں کو ایک خاص ترکیب سے رکھ دیا ہو جو ماما کی ترکیب کے خلاف ہے مثلاً مالکہ نے نیچے کے برتنوں کے اوپر رکھ دیا اور اوپر والوں کو نیچے رکھ دیا۔ اب ماما اس ترکیب کو دیکھ کر نالہ وشیون کرنے لگے کہ ہائے میری تجویز کے خلاف کیوں ہوا۔ تو بتلایئے کہ آپ اس کو احمق کہیں گے یا نہیں۔ یقیناً ہر شخص اسے پاگل کہے گا۔ آخر کیوں؟ اسی وجہ سے کہ تجویز کا حق مالکہ کو ہے ماما کو کسی تجویز کا حق نہیں ہے۔

پھر حیرت ہے کہ آپ کی ادنیٰ سی ملک تو ایسی ہو کہ اس کے سامنے دوسروں کا حق باطل ہو

جائے اور خدا تعالیٰ کی حقیق ملک کے سامنے آپ کی تجویز بالکل باطل نہ ہو۔ یقیناً اگر خدا تعالیٰ کو مالک حقیقی سمجھا جاتا ہے تو آپکو اور کسی کو تجویز کا حق نہ ہونا چاہئے۔

پس سمجھ لیجئے کہ حق تعالیٰ نے عالم کے دو درجے بنائے ہیں۔ آسمان اور زمین۔ آسمان اور زمین جیسے الماری کے دو درجے اوپر نیچے ہوتے ہیں جس میں انہوں نے بعض ارواح کو اوپر کے درجہ میں رکھا ہے یعنی آسمان میں اور بعض کو نیچے کے درجہ میں رکھا ہے یعنی زمین میں۔ اور پھر وہ کبھی اس ترتیب کو بدل کر اوپر کی روحوں کو نیچے بھیج دیتے ہیں اور نیچے کی روحوں کو اوپر رکھ دیتے ہیں اور وہ مالک ہیں۔ ان کو ہر طرح تصرف کا اختیار ہے اس میں ہم غلاموں کا اس لئے نالہ و شیون کرنا کہ ہائے ہماری تجویز کے خلاف کیوں کیا گیا حماقت ہے۔

عالم برزخ

خوب سمجھ لو کہ انتقال کی حقیقت بالکل ایسی ہی ہے جیسے الماری کے ایک تختہ کے برتنوں کو نیچے سے اوپر کر دیا جائے اور اوپر سے نیچے کر دیا جائے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ آدمی مر کر بالکل معدوم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ دنیا سے جو کہ نیچے کا تختہ ہے آخرت میں پہنچ جاتا ہے جو اوپر کا تختہ ہے۔

اور یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ مردہ کو مٹی میں گاڑ دیا جاتا ہے اور اس سے شاید کسی کو اس پر یہ شبہ ہو کہ آخرت میں پہنچنے کو اوپر کے تختہ پر جانا کیسے کہا گیا تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی کو نہیں گاڑا جاتا۔ بلکہ ایک بے جان لاشہ اور جماد محض کو گاڑا جاتا ہے وہ آدمی تھوڑا ہی ہے وہ تو صورت آدمی ہے کیونکہ آدمی اصل میں روح کا نام ہے اور روح مٹی میں نہیں گاڑا جاتا۔ بلکہ اسکو اوپر بلا لیا جاتا ہے اور یہ جو روایات میں آتا ہے کہ پھر روح کو جسم میں واپس کیا جاتا ہے تو یہ واپسی عالم برزخ میں ہوتی ہے۔ اس گڑھے میں نہیں ہوتی۔ قبر حقیقی عالم برزخ ہے۔ جو دنیا و آخرت کے درمیان ہے اور یہ قبر جس میں مردہ کو دفن کیا جاتا ہے۔ اسی عالم برزخ سے ایک قسم کا تعلق رکھتی ہے اس کی حقیقت نہیں۔

پس حق تعالیٰ اپنی مملوک چیزوں میں تصرف مالکانہ کرتے رہتے ہیں کبھی کسی کو نیچے بھیج دیا کبھی کسی کو اوپر بلا لیا۔ مگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ سب نیچے رہیں بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر حق تعالیٰ اس کے جواب میں یہ تجویز فرمائیں کہ اچھا پھر ہم بھی اوپر کی روحیں نیچے نہیں بھیجتے تو پھر کیا ہوگا۔ بس یہ ہوگا کہ سب کے سب اوت نپوت رہ جائیں گے۔ کسی کے بھی اولاد نہ ہوگی۔ مگر آپ کو اس پر بھی چین نہیں۔ اگر کسی کے اولاد نہ ہو تو وہ اولاد کے لئے ایسی گرد چھانتا ہے جس کی حد نہیں یوں تمنا

کرتا ہے کچھ ہو جائے چاہے چوہے کا بچہ ہی ہو جائے۔

بس! آپ کی تجویز کا حاصل یہ ہے کہ اوپر کی روحیں تو نیچے آتی رہیں مگر نیچے کی روحیں اوپر نہ جائیں۔ صاحب خدا کی رحمت ہے کہ انہوں نے ہماری اس تجویز کو پورا نہیں کیا ورنہ دنیا میں رہنے کو بھی جگہ نہ ملتی۔ سوچ لو کہ جتنے آدمی آدم علیہ السلام کے وقت سے اس وقت تک مر چکے ہیں سب زندہ رہتے تو کہاں ٹھکانہ ملتا۔ اس وقت جو ہر شخص اپنے اپنے گھر میں چین سے گزر رہا ہے اس کا یہی تو سبب ہے کہ بہت سے آدمیوں کو حق تعالیٰ نے اوپر بلا لیا ہے ورنہ اگر دادے پردادے سب زندہ ہوتے تو آج گھروں میں تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی۔

پھر سمجھو کہ کسی چیز کے فوت ہونے کا صدمہ جب ہوا کرتا ہے جب کہ اس کا عوض بھی نہ ملے اور اگر عوض مل جائے اور عوض بھی اصل سے زیادہ مل جائے تو غم کم ہو جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص سے پیسہ لے لیا جائے اور اشرفی دیدی جائے تو اس کو پیسہ چھننے کا غم نہ رہے گا۔ حق تعالیٰ نے انا للہ راجعون میں اسی مضمون پر تنبیہ فرمایا کہ مصیبت کے وقت تم یہ سمجھا کرو کہ ہم سب خداتعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں جو رحیم و کریم اور مہربان ہیں جن کی شان یہ ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ”کہ تم سے جو کچھ لیتے ہیں اس کا بدلہ بھی دیدیتے ہیں۔“

چنانچہ جن لوگوں کو دنیا سے بلا لیا ان کو تو آخرت میں پہنچا دیا جس میں مسلمان کیلئے دنیا سے زیادہ راحت ہے۔

مصیبت کا ثواب

تم اپنے مردوں کے ساتھ ایسا برا گمان کیوں کرتے ہو کہ خدانخواستہ وہ جہنم میں گئے ہوں گے جب ان کا خاتمہ اسلام پر ہوا ہے تو یہی سمجھنا چاہئے کہ ہمارے مردے راحت میں گئے ہوں گے اس خیال سے صدمہ کم ہو جائے گا کیونکہ ہم اگر دنیا کی راحتیں ان سے چھوٹتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ تو آخرت کی راحتیں اس سے زیادہ پیش نظر ہوں گی۔ یہ بدلہ تو ان کو ملا اور ہم کو یہ بدلہ ملا کہ عزیز کی مفارقت سے جو طبعی رنج ہوا ہے حق تعالیٰ اس پر بہت بڑا ثواب دیں گے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مسلمان کا لڑکا مرتا ہے تو حق تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کہ تم نے میرے بندے کے جگر کا ٹکڑا چھین لیا وہ کہتے ہیں۔ ہاں خداوند! فرماتے ہیں کہ پھر میرے بندے نے کیا کہا وہ عرض کرتے ہیں خداوندا! آپ کی حمد کی اور شکر کیا اور اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ میرے بندے کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھدو۔

تو آپ نے دیکھا کہ ایک چیز لے کر حق تعالیٰ نے آپ کو کتنی بڑی چیز دی آخرت میں جب حساب کتاب ہوگا اس وقت آپ کو اس کی قدر معلوم ہوگی۔ وہاں نہ یہ اولاد کام دیگی جس کے لئے آپ روتے ہیں۔ نہ بیوی اور ماں کام دیگی وہاں ثواب ہی کام دے گا۔

یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ لِکُلِّ امْرِیءٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ

''جس دن آدمی اپنے بھائی، ماں باپ اور بیوی بچوں سے بھاگے گا۔ ہر شخص اس دن اپنے عرق میں غرق ہوگا۔''

احادیث میں مصیبت کے ثواب کی بہت تفصیل ہے اس کو دیکھنا چاہئے پس اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ہم سب خدا کے پاس جائیں گے اور وہاں ہم کو مصیبت کا اجر ملے گا اور جو مر گئے وہ بھی خدا تعالیٰ کے پاس گئے ہیں۔ جہاں ان کو دنیا سے زیادہ راحت ہے پھر صدمہ کی کیا بات ہے۔

اسی مضمون کو ایک بدوی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے...... تعزیت کے طور پر عرض کیا تھا۔ جب ان کے والد حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال ہوا چنانچہ کہتا ہے

اصبر نكن بک صابرين فانما صبر الرعية بعد صبر الرأس

''آپ صبر کیجئے تاکہ ہم بھی دیکھ کر صبر کریں کیونکہ چھوٹوں کا صبر بڑوں کے صبر کے تابع ہے''

اگر بڑے بھی بے صبری کرنے لگیں تو پھر چھوٹوں کا کیا حال ہوگا۔ سبحان اللہ کیونکر صبر کی تعلیم دی ہے پھر کہتا ہے

خير من العباس اجرک بعده و الله خير منک للعباس

یعنی آپ کے لئے وہ اجر کا ثواب حضرت عباسؓ کی زندگی سے زیادہ بہتر ہے جو ان کے وصال پر صبر کرنے سے آپ کو ملے گا اور حضرت عباسؓ کے لئے اللہ تعالیٰ آپ سے زیادہ بہتر ہیں۔ پس خدا تعالیٰ نے ان کو وہ جگہ دی جو ان کے لئے بہتر تھی اور آپ کو وہ چیز دی ہے جو آپ کے لئے بہتر تھی۔ پھر غم کا ہے کا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بدوی سے بڑھ کر کسی نے تعزیت نہیں کی۔

غرض انا لله وانا اليه راجعون میں دو جملے ہیں پہلے جملہ میں حق تعالیٰ کی مالکیت کو ظاہر کر کے بندوں کی تجویز کا استیصال کیا گیا ہے پھر جب ہم پہلے سے کسی چیز کے متعلق کوئی تجویز ہی نہ کریں گے تو کوئی واقعہ ہمارے خلاف مرضی نہ ہوگا کیونکہ خلاف مرضی ہونے کا مبنیٰ تجویز ہی تھی۔ جب وہ نہ رہی تو اب جو کچھ بھی ہوگا خلاف مرضی نہ ہوگا۔

دوسرے جملہ میں عوض ملنے پر تنبیہ کی گئی ہے اس کے استحضار سے رہا سہا غم اور بھی ہلکا ہو جائے گا کیونکہ میں بتا چکا ہوں کہ جس کلفت کا عوض اس سے زیادہ مل جائے اس پر رنج نہیں ہوا کرتا۔ حزن عقلی تو ان دونوں مضمونوں کو پیش نظر کر لینے سے کبھی نہیں رہ سکتا۔ البتہ مفارقت کا طبعی غم اس کے بعد رہ سکتا ہے۔ سو گو طبعی غم پر مواخذہ نہیں اور نہ وہ دفعۃً زائل ہو سکتا ہے۔ مگر حق تعالیٰ نے اس کے کم کرنے کا بھی سامان کیا ہے۔ چنانچہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ میں اس کا بھی سامان موجود ہے۔

فراق ووصال

وہ یہ کہ ہم کو جو موت عزیز سے مفارقت کا صدمہ ہوتا ہے تو غور کر لیا جائے کہ یہ صدمہ نفس مفارقت پر نہیں بلکہ اعتقاد مفارقت دائمہ اس کا سبب ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بس اب یہ ہمیشہ کے واسطے ہم سے جدا ہو گیا۔ اگر یہ خیال ذہن میں نہ جمے تو نفس مفارقت سے زیادہ صدمہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ دنیا میں بھی بعض دفعہ اس سے مفارقت ہوتی ہے۔ چنانچہ کبھی ہم کو سفر پیش آتا تھا کبھی عزیز کو سفر پیش آتا تھا جس میں مہینہ دو مہینہ اور بعض سالہا سال کی مفارقت ہوتی ہے مگر یہ اس لئے گوارا تھا کہ پھر ملاقات کی امید رہتی ہے تو انا للہ الیہ راجعون میں یہ بتلایا گیا ہے کہ تم اس مفارقت کو دائمی مفارقت نہ سمجھو کیونکہ تم بھی ایک دن وہیں جانے والے ہو جہاں یہ عزیز گیا ہے۔ اور وہاں اس سے ملاقات ہو جائے گی۔ پس یہ مفارقت ویسی ہی چندروزہ مفارقت ہے جیسی دنیا میں کبھی سفر وغیرہ سے پیش آیا کرتی تھی۔ ایک دن یہ مفارقت ختم ہو کر مبدل بہ وصال ہو جائے گی۔ اور قاعدہ ہے کہ جس فراق کے بعد وصال کی یقینی امید ہو وہ زیادہ گراں نہیں ہوتا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے نظام حیدر آباد ایک شخص کو اپنے یہاں کسی اعلیٰ ملازمت پر بلا لیں۔ اور اس کے بھائی کو مفارقت کا صدمہ ہو۔ نظام اس کے صدمہ کی خبر سن کر خط لکھ دیں کہ گھبراؤ نہیں ہم تم کو بھی بلا لیں گے تو غور کر لیجئے کہ نظام کے اس خط سے غمگین بھائی کا صدمہ فوراً زائل ہو جائے گا یا نہیں یقیناً پہلا سا غم تو ہرگز نہ رہے گا۔ البتہ اب اس فکر میں پڑ جائے گا کہ دیکھئے وہ دن کب آتا ہے کہ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں اور جب تک مفارقت رہے گی اس وقت تک دن گن گن کر گزارے گا۔ اور امید وصال میں یہ فراق کے دن خوشی سے گزار دے گا۔

پس ہم کو بھی کسی عزیز کی وفات پر یہی سمجھنا چاہئے کہ یہ مفارقت چندروزہ ہے ایک دن خدا

تعالیٰ ہم کو بھی بلالیں گے۔ جیسا اسے بلایا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے کل الینا راجعون۔ پھر حیرت ہے کہ نظام حیدر آباد کے تو اس کہنے سے کہ ہم تم کو بھی بلالیں گے مفارقت کا غم جاتا رہے اور خدا تعالیٰ کے فرمانے سے ہلکا بھی نہ ہو۔

غرض ان نصوص سے معلوم ہوا کہ صاحب شریعت کا مقصود یہ ہے کہ صدمہ کے وقت ہمارے زخم پر مرہم لگادیں۔ چنانچہ حزن عقلی کے استیصال کا اور حزن طبعی کی تخفیف کا ہر طرح مکمل سامان کر دیا ہے۔

رنج و غم

مگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا دل ہر وقت زخمی رہے اس لئے ایسے سامان کرتے ہیں جن سے غم تازہ ہو اور صدمہ کی یاد دہانی ہو۔ جیسے بچہ چاہا کرتا ہے کہ زخم پر جو کھرنڈ آ گیا ہے اس کو نوچ کر کھجلاوے تاکہ مزا آوے مگر اس کا انجام یہ ہے کہ زخم بڑھ جاتا ہے اور بعض دفعہ ہلاکت تک پہنچاتا ہے۔ اسی لئے باپ یہ چاہتا ہے کہ کھرنڈ جمار ہے تاکہ زخم جلدی اچھا ہو جائے شاید یہاں کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ جب حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ ایسی رحمت ہے کہ وہ ہمارا غمگین رہنا پسند نہیں بلکہ حزن و غم کو زائل کرنا چاہتے ہیں تو پھر صدمہ بھیجتے ہی کیوں ہیں۔ پوری رحمت تو یہ ہوتی ہے کہ صدمہ اور رنج بھیجتے ہی نہ جو بعد میں اس ازالہ کی فکر کی جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ رنج اور صدمہ بھیجنے میں حکمتیں ہیں۔ اس لئے بھیجتے ہیں۔ مگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ جس حکمت کے لئے رنج و صدمہ بھیجا جاتا ہے اس حکمت کو حاصل کرو۔ رنج ہی کو لے کر نہ بیٹھ جاؤ۔ جیسے استاد بچہ کو طمانچہ یا قمچی اس لئے لگاتا ہے تاکہ سبق یاد کرلے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ وہ طمانچہ اور قمچی ہی کو سبق بنالے۔ اگر وہ سبق جلد ہی یاد کرلے گا۔ تو پھر استاد شفقت سے اس کو پیار کرے گا۔ چوٹ کی جگہ کو سہلائے گا۔ اور اگر سبق مقصود کو اس نے یاد نہ کیا۔ بلکہ مار ہی کو سبق بنالیا تو یقیناً اب استاد کا غصہ بڑھے گا۔

اسی طرح یہاں سمجھو کہ یہ ناگوار واقعات ہماری تنبیہ اور اصلاح کے لئے بھیجے جاتے ہیں جن سے مقصود یہ ہے کہ ہم چوکنے ہو کر اعمال کی اصلاح کرلیں۔ یہ مقصود نہیں کہ بس رات دن ناگوار واقعات ہی کا سبق رٹتے رہیں۔ اور زخم کو نوچتے رہیں اور اس میں پڑ کر اصل مقصود کو بھول جائیں۔ میں بقسم کہتا ہوں اور اس سمجھنے سے زیادہ کوئی ذریعہ تسلی کا نہیں کہ ناگوار واقعات میں حکمتیں ہوتی ہیں۔

اہل اللہ کو مصیبت کے وقت تعیین کے ساتھ ہر واقعہ کی حکمت معلوم ہو جاتی ہے گو اجمالا اعتقاد تو سب کو ہے مگر اہل اللہ کا باتعیین معلوم ہو جاتا ہے کہ اس واقعہ میں ہمارے واسطے یہ حکمت

تھی ان کو بیماری میں، چوری میں اور دشمن کی ایذا میں اور ہر ناگوار معاملہ میں کھلی حکمت نظر آتی ہے۔ واقعہ کے ساتھ ہی ان کے دل میں کوئی کھجلاتا ہے کہ یہ معاملہ اس حکمت کے لئے کیا گیا ہے بس وحی تو نہیں آتی نہ آواز سنائی دیتی ہے باقی سب کچھ ہوتا ہے۔ رات دن ان کے قلب پر افعال الٰہیہ کی حکمتیں منکشف ہوتی رہتی ہیں۔ پھر کیا ممکن ہے کہ ان کو ناگوار واقعات سے عقلی ناگواری ہو؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ان کو مصائب میں بھی عشق اور محبت کی ترقی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا ہے کیونکہ وہ اسکی حکمت اور منفعت کو کھلی آنکھوں دیکھتے رہتے ہیں۔

واللہ! اگر کسی وقت تمام دنیا ان کے مخالف ہو جائے جب بھی ان کی محبت حق تعالیٰ کے ساتھ کم نہ ہوگی بلکہ بڑھتی رہے گی۔ گو خاص احباب اور بعض اقربا بھی ان کو چھوڑ دیں۔ کیونکہ ان کو اس میں بھی حکمت نظر آتی ہے ایک کھلی حکمت تو یہ ہے کہ اس وقت عارف کی نظر مخلوق سے بالکل ہٹ جاتی ہے اور اس کا دل دنیا سے سرد ہو کر ہمہ تن خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اس کو بجز ذات حق کے کسی سے امید نہیں رہتی اور دنیا کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے وہ حقیقت وہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

گر گریزی بر امید راحتے ہم از بجا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دو دبے دام نیست جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

اگر راحت کی امید پر بھاگتے ہو تو وہاں بھی تمہیں مصیبت پیش آئے گی۔ کوئی گوشہ مصائب اور پھندوں سے خالی نہیں اور سوائے خلوت گاہِ حق کے کہیں آرام نہیں۔

خلوت مع اللہ

مصائب وآرام اور احباب کی بے مروتی سے سالک کو اس حقیقت کا پورا انکشاف ہو جاتا ہے اور وہ ہمہ تن خلوت مع اللہ میں مشغول ہو جاتا ہے۔ خلوت گاہ سے مراد یہ نہیں کہ چلہ کشی کرے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ دل کو ذات حق کے سوا کسی سے تعلق اور ربط نہ رہے۔ جس کو یہ دولت حاصل ہو جائے وہ ہر دم خلوت میں ہے گو بظاہر مخلوق کے ساتھ ہو اور جس کو ربط قلب باللہ حاصل نہ ہو چاہے وہ چلہ کشی بھی کرے۔ خلوت سے محروم ہے۔ ہاں یہ دولت حاصل ہوتی ہے اول خلوت اختیار کرنے ہی سے۔ اس لئے اہل اللہ مبتدی سلوک کو چندروز یا چند ماہ پوری خلوت کراتے ہیں کہ اختلاط مع الخلق سے بالکل روک دیتے ہیں۔

جیسے طبیب مسہل کے دن مریض کو خلوت کا حکم دیتا ہے تاکہ ہمہ تن دستوں کے تصور میں مشغول رہے۔ اختلاط اور بات چیت میں مشغول ہونے سے دستوں کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کا حاصل ہونا یکسوئی پر موقوف ہو اس کیلئے خلوت کا حکم ضروری ہے مگر لوگ اطباء پر تو اعتراض نہیں کرتے صوفیا پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے بدعت کہاں سے نکالی۔ میں کہتا ہوں کہ بدعت وہ ہے جو دین سمجھ کر اور ثواب کے اعتقاد سے اختیار کی جائے اور کسی مباح کام کو جو شرعاً ممنوع نہ ہو علاجاً اختیار کیا جائے تو یہ بدعت نہیں۔ پس صوفیاء پر یہ اعتراض جب صحیح ہو سکتا ہے کہ پہلے یہ ثابت کر دیا جائے کہ وہ چلہ کشی کو دین سمجھ کر ثواب کے اعتقاد سے اختیار کرتے ہیں۔ بلکہ وہ تو محض علاجاً اس کو اختیار کرتے ہیں۔

یہ جواب تو علی سبیل التنزل ہے ورنہ میں کہتا ہوں کہ خلوت اور عزلت گزینی کا ثبوت شریعت میں موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول وحی سے پہلے جبل حراء میں عزلت اختیار کی ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ آپ ہفتہ عشرہ کیلئے کھانے پینے کا سامان لے کر غار حرا میں رہا کرتے تھے یہی تو چلہ کشی ہے۔ (اور گو یہ واقعہ قبل نبوت کا ہے مگر حضرات صحابہؓ نے بعد نبوت کے اس کو نقل فرمایا ہے اور کسی نے اس پر انکار نہیں کیا۔ اور نہ یہ تنبیہ کی کہ یہ صورت اب ممنوع ہے لہذا تقریر صحابہؓ سے اس کا شرعاً مستحسن ہونا ثابت ہو گیا اور اگر غور کیا جائے تو اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تقریر ہے کیونکہ اس واقعہ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے اور غالب یہ ہے کہ انہوں نے آپ سے سن کر بیان کیا ہے اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فعل کو بلا انکار کے بیان فرمایا تو اس پر تقریر نبوی بھی پائی گئی۔ نیز یہ تو آپ کو معلوم تھا کہ میرے اس فعل کا سب کو علم ہے۔ اس پر بھی آپؐ نے انکار نہیں فرمایا۔ یقینی تقریر ہے۔)

اور بعد میں ایسی خلوت اس لئے اختیار نہیں فرمائی کہ پھر ضرورت نہیں رہی۔ مگر بعد میں خلوت طویلہ کی ضرورت نہ رہی تھی۔ مطلق خلوت کی کاملین کو بھی ضرورت رہتی ہے۔ حق تعالیٰ نے نبوت کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص وقت خلوت مع الحق کیلئے مقرر کرنیکا حکم فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ

کہ جب آپ (تبلیغ احکام وغیرہ سے) فارغ ہو جایا کریں تو (عبادت میں) محنت کیا کریں اور (اس وقت) صرف اپنے رب ہی کی طرف راغب ہوا کریں۔

یعنی گو آپ ہر وقت عبادت میں ہی رہتے ہیں اور تبلیغ وغیرہ بھی آپ کی توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہی رہتی ہے مگر وہ توجہ بواسطہ ہے جس میں کسی قدر مخلوق کی طرف بھی التفات ہوتا ہے۔ (گو وہ درجہ مرآۃ میں ہی ہو۔ مگر توجہ دوسری طرف ہے تو) اس کام سے فارغ ہو کر ایک وقت

عبادت کا ایسا مقرر کیجئے جس میں بجز ذات حق کے کسی طرف مطلق التفات نہ ہو الی ربک فارغب۔ میں جار مجرور کو فعل سے مقدم کرنا مفید حصر ہے اس لئے اس سے یہ مضمون مستفاد ہوا کہ اس وقت خدا ہی کی طرف راغب ہیں۔ اور کسی طرف التفات نہ ہو۔

ایک مقام پر حق تعالیٰ نے حضورؐ کے لئے وقت خلوت کی تعیین بھی فرما دی ہے کہ وہ کون سا وقت ہونا چاہئے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا

حضورؐ کے لئے ان آیت میں حق تعالیٰ نے رات کا آخرت حصہ خلوت کے لئے مقرر فرمایا ہے خواہ نصف اخیر ہو۔ خواہ ثلث اخیر یا اس سے بھی کم وبیش اور اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ آپ کو دن میں بہت کام رہتا ہے اس میں خلوت کاملہ کا موقع ..... نہیں مل سکتا۔ اس لئے رات کو اٹھ کر تلاوت قرآن مع الترتیل اور ذکر اللہ میں مشغول ہوا کیجئے اور اس میں تبتل کامل یعنی پوری یکسوئی کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ پھر درمیان میں اس وقت کی فضیلت بھی بیان فرمائی ہے کہ رات کے اس حصہ میں عبادت کرنے سے نفس پر مجاہدہ کامل ہوتا ہے اور زبان سے جو بات نکلتی ہے وہ ٹھیک ٹھیک ادا ہوتی ہے یعنی زبان وقلب دونوں متوافق ہوتے ہیں۔

(میں کہتا ہوں کہ ان آیت سے صوفیاء کی چند عادات کی اصل نکلتی ہے اور وہ عادات یہ ہیں)

ا: طالبین کیلئے ہر ایک کے مناسب کوئی طریقہ ذکر متعین کر دینا جیسا کہ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تہجد کی نماز میں تلاوت قرآن مع الترتیل اور اسکے بعد ذکر اللہ کو متعین فرمایا ہے لان الاصل فی الکلام التاسلیس لیکون ذکر فی قولہ واذکر اسم ربک غیر تلاوۃ القرآن۔

۲: طالبین کے لئے وقت ذکر متعین کر دینا۔

۳: اور اس وقت میں فرصت وفراغ کی رعایت کرنا۔

۴: طالبین کو ذکر میں یکسوئی کی تاکید کرنا۔

دراصل تعیین ذکر وتعیین وقت فرصت وغیرا سی یکسوئی حاصل کرنے کے لئے ہیں کیونکہ شیخ اگر کوئی ذکر متعین نہ کرے تو طالب کا ذہن مختلف اذکار کی طرف چلے گا کہ یہ کر دیا وہ کروں۔ ایسے ہی کسی کو دو تین وقت فرصت کے ملتے ہوں تو اس کو ان میں بھی یہ تردد ہوگا ہوگا کہ کون سا وقت زیادہ

بہتر کس کو ذکر کے لئے خاص کروں۔ شیخ کی تعیین کے بعد یہ تردد زائل ہوجاتے ہیں اور ذکر میں یکسوئی حاصل ہوجاتی ہے جولوگ معمولات صوفیاء پر جلدی سے بدعت کا الزام لگادیتے ہیں ان کو قرآن وحدیث میں کافی غور کرنے کے بعد زبان سے بات نکالنا چاہئے۔ اگر کام غور وخوض سے کام لیا جائے تو محققین صوفیاء کے تمام معمولات واحوال کی اصل قرآن وحدیث سے مل جائے گی۔ جس کی دلیل حضرت حکیم الامتؒ کا رسالہ حقیقۃ الطریقہ اور رسالہ مسائل السلوک ہے اور ایک رسالہ التشر یف جدید تصنیف ہوا ہے جس میں احادیث کثیرہ سے محققین طریق کے اصول وفروع کی تائید کی گئی ہے۔ باقی جہلاء صوفیاء کی رسوم کا کوئی ذمہ دار نہیں نہ ان کی تائید ہم کو مطلوب ہے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایک خاص وقت میں خلوت کی ضرورت تھی تو اور تو کس شمار میں ہیں۔ آپؐ سے زیادہ کون کامل ہوسکتا ہے۔ اسی لئے ...... اہل اللہ ہمیشہ ایک خاص وقت[1] خلوت کا مقرر فرماتے ہیں جس میں سوائے حضرت حق کے کسی طرف توجہ نہ ہو اور یہ حال ہو

دلآ رامے کہ داری دل درو بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

''تیرے پاس دل آرام (محبوب) ہے تو اس سے دل لگا۔ اور دوسری ساری دنیا سے آنکھیں بند کرلے۔''

اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

بفراغ دل زمانے ،نظرے بماہ روئے   بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ وزہاؤ ہوئے

''دل کی فراغت کے ساتھ ایک لحظہ کسی محبوب کو دیکھنا اس سے بہتر ہے کہ شاہی چتر سر پر رکھ کر سارا دن آدمی ہاؤ ہو میں مبتلا رہے۔

فراغ دل کے ساتھ تھوڑی دیر متوجہ ہوجانا بھی بڑی دولت ہے۔ اس لئے سالکین منتہین کو بھی ایک وقت خاص مقرر کرنا چاہئے خواہ دس پندرہ منٹ ہی ہو جس میں غیر کا خیال بالکل نہ آوے۔ بلکہ اپنا خیال بھی نہ آوے کیونکہ توجہ الی اللہ کے وقت اپنا خیال بھی غیر ہے۔ اسی کو حضرت قلندر فرماتے ہیں،

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم   گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

---

[1] ثقات سے سنا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ علاوہ نماز تہجد کے بعد نماز فجر وقت اشراق تک مراقبہ میں مشغول رہتے تھے اور یہی طریقہ حضرت مرشدی سید مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کا تھا اور حضرت سیدی حکیم الامتؒ علاوہ نماز تہجد کے بعد نماز فجر جنگل کی طرف تنہا تشریف لے جاتے تھے جس میں کامل خلوت کے ساتھ مشغول ذکر رہتے تھے۔ ایک بار فرمایا کہ مجھے تو حق تعالیٰ اس وقت میں یعنی سیر صحرا میں بہت کچھ عطا فرمادیتے ہیں۔ ۱۲ جامع۔

''آنکھ سے غیرت کھاتا ہوں اور تمہارا چہرہ اسے دیکھنے نہ دوں گا۔ اور کان کو بھی تمہاری بات سننے نہیں دوں گا۔''

مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی طرف متوجہ ہونے کے آنکھ اور کان سب کو معطل کر دیتا ہوں۔ جملہ اعضاء سے بے خبر ہو کر آپ کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہوں۔ اور اس کے لئے سب سے اچھا وقت تہجد کا ہے۔ اہل اللہ نے ہمیشہ تہجد کا اہتمام کیا ہے۔ یہ حضرات رات کی بہت قدر کرتے ہیں۔

فضیلت شب قدر

آج کل عام لوگ شب قدر کا تو اہتمام کرتے ہیں اور راتوں کا نہیں کرتے۔ مگر وہ حضرات ہر رات کو شب قدر ہی سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں

اے خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی   ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

شب قدر کی نشانی کیا پوچھتے ہو۔ اگر قدر جانتے ہو تو ہر رات شب قدر ہے اور بات یہ ہے کہ شب قدر کی فضیلت کا اصل سبب کیا ہے۔ اس کو دیکھنا چاہیے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اس رات میں غروب آفتاب سے طلوع فجر تک اہل عالم پر توجہ خاص فرماتے ہیں۔ سو وہ توجہ خاص ہر رات میں ہوتی ہے اتنا فرق ہے کہ شب قدر میں تمام رات اور اول درجہ میں ہوتی ہے اور بقیہ راتوں میں نصف وثلث اخیر میں اور دوسرے درجہ میں ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کی قلیل توجہ بھی بڑی دولت ہے کما قال تعالیٰ:

ورضوان من اللہ اکبر وصرحوا فیھا لکون التنکیر للتقلیل

(اور اللہ کی رضا سب سے بڑی ہے) گو کثیر توجہ اس سے بھی بڑی ہے لیکن قابل قدر تو دونوں ہیں۔ اس لئے اہل اللہ ہر رات کی بہت قدر کرتے ہیں۔ ہاں شب قدر کی اوروں سے زیادہ قدر کرتے ہیں۔ کہ اس میں وہ دولت قابل قدر اور زیادہ ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہ ہونا چاہئے کہ اور راتوں کی بے قدری کی جائے لیکن اگر کسی سے بوجہ کثرت مشاغل کے رات کو اٹھنے کا اہتمام نہ ہو سکے تو وہ دن میں یا اول شب میں کوئی وقت خلوت کا مقرر کرے۔ (خواہ بعد نماز فجر یا بعد عصر یا بعد مغرب یا بعد عشا اور جس وقت میں جس کو فرصت ہو) یہ مضمون اس شعر کی شرح میں یہاں تک پہنچ گیا۔

جز بخلوت گاہ حق آرام نیست   کہ اللہ کی خلوت گاہ سے سوا کہیں آرام نہیں

واقعہ کربلا سے سبق

اس سے پہلے یہ مضمون تھا کہ مصائب وآلام میں حکمتیں ہیں جنکو اہل اللہ تعیین کیساتھ سمجھ جاتے ہیں پس

اب یہ اشکال رفع ہوگیا کہ جب حق تعالیٰ کو ازالہ حزن وتخفیف غم کا اس قدر اہتمام ہے تو اول ہی غم کیوں دیا تھا۔
میں نے بتلا دیا تھا کہ انہوں نے بعض حکمتوں کی وجہ سے ہم کو غم دیا ہے اور مقصود حق یہ ہے کہ ہم ان حکمتوں کو سمجھ کر ان کے مقتضا پر عمل کریں نہ یہ کہ اسی غم کا سبق پڑھتے رہیں اور اسی کو لے کر بیٹھ جائیں۔ جیسا کہ رسوم محرم میں لوگوں نے یہی طرز اختیار کیا ہے۔

پس محرم میں جو لوگ شہادت نامے پڑھتے ہیں یہ مقصود حق کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اس میں تجدید غم ہے اور حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ واقعہ غم سے سبق حاصل کر کے پھر اس کو کم کیا جائے نہ یہ کہ ہر سال تازہ کیا جائے۔ اور سبق حاصل کرنے کے لئے اس کی اجمالی یاد گو بلا قصد ہو کافی ہے جس میں نہ تفصیل واقعات پڑھنے کی ضرورت ہے نہ ماہ محرم کی تخصیص کی ضرورت ہے نہ کسی پر اظہار غم کی ضرورت ہے نہ سامان اظہار کی ضرورت ہے۔

اجمالی قصہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت امامؓ مع اپنے خاندان کے میدان کربلا میں یزید کی جماعت کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے اور جماعت یزید آپ کو بیعت پر مجبور کرتی تھی آپ کے نزدیک یزید کو خلافت سے معزول کرنا واجب تھا۔ اسی کا سامان کرنے آپ کوفہ جا رہے تھے کہ وہاں جماعت یزید کا مقابلہ ہو گیا اور جن لوگوں نے امداد کا وعدہ کیا تھا وہ سب اپنی بات سے پھر گئے آپ اپنی بات پر جمے رہے۔ آخر کار آپ کو شہادت نصیب ہوئی۔

اس سے یہ سبق حاصل ہوا کہ دین کے کام میں اگر ایک شخص اپنے نزدیک حق پر ہو تو اسے کسی کی مخالفت کا خوف نہ کرنا چاہئے چاہے سارے مسلمان اسی کا ساتھ چھوڑ دیں اور کچھ لوگ جان و آبرو کے بھی درپے ہو جائیں۔ دین کے مقابلہ میں اس کی پرواہ نہ کرنی چاہئے آخر موت ایک دن آئے ہی گی۔ پھر دین پر جم کر آ جائے تو اس سے کیا بہتر ہے۔

حضرت حسینؓ اور اکثریت

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق کا مدار کثرت رائے پر نہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت شخص واحد ہی کی رائے حق پر ہو۔ چنانچہ جس وقت سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعت یزید سے انکار کیا ہے اس وقت تمام صحابہ اور تابعین کی رائے ان کے خلاف تھی۔ سب نے یزید کی بیعت کو قبول کر لیا تھا۔ اور اکثر نے امام حسینؓ کو ارادہ خروج سے منع بھی فرمایا۔ اور خیر خواہانہ نصیحت بھی کی تھی۔ مگر حضرت امام چونکہ اپنی رائے کو انشراح صدر کے ساتھ صحیح سمجھے ہوئے تھے اس سے نہ ہٹے اور اسی پر جان دیدی۔ کیا

آج کسی کا منہ ہے جو یوں کہہ سکے کہ امام کی رائے غلط تھی۔ کیونکہ کثرت رائے ان کے خلاف تھی۔

یہ کثرت رائے کی شاخ آج کل ہی نکلی ہے۔ سلف میں بجز صورت اجماع کے جس میں سب کا اتفاق ضروری ہے۔ محض کثرت کا کوئی اعتبار نہ تھا۔ چنانچہ...... مسائل فقہیہ میں بکثرت ایسے مسائل موجود ہیں جن میں ایک امام تمام عالم سے تفرد کرتا ہے اور کوئی اس کی رائے کو کثرت رائے کے خلاف ہونے کیوجہ سے غلط نہیں کہتا۔ اگر کوئی اس کا رد بھی کرتا ہے تو جواب میں احادیث یا نصوص پیش کرتا ہے۔ محض کثرت رائے کی آڑ کوئی نہیں پکڑتا۔ پھر مخالفین کے جواب میں منفرد بھی احادیث ونصوص پیش کر دیتا ہے اور اس کے مقلد یہ دیکھ کر کہ ہمارے امام کے پاس بھی اپنی رائے کے ثبوت ہیں نصوص شرعیہ موجود ہیں اس کی تنہا رائے کو قبول کر رہے ہیں اور اس کے موافق عمل کرتے چلے آتے ہیں۔

چنانچہ حنفیہ کے نزدیک قضاء قاضی ظاہراً و باطنا نافذ ہے جو تمام ائمہ مذاہب کیخلاف ہے۔ دار الحرب میں حربی کافر کے ساتھ معاملہ ربوا جائز ہے جس میں جملہ ائمہ کا حنفیہ سے خلاف ہے اگر تفرد دلیل غلط ہے اور کثرت رائے دلیل صواب ہے تو ان مسائل میں آپ نے امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کو کیوں نہیں ترک کر دیا۔

(اگر واقعہ امام حسینؓ میں کوئی یہ کہے کہ اس وقت بھی بہت لوگ امام کی رائے سے موافق تھے مگر خوف کی وجہ سے موافقت ظاہر نہ کرتے تھے سو اول تو یہ غلط ہے کیونکہ حضرات صحابہؓ وتابعین کی شان یہ ہے۔

لا یخافون لومۃ لائم وہ اظہار حق میں کسی سے کیا ڈرتے۔ امام کی شہادت کے بعد یزید کے منہ پر ایک صحابی نے ایسی کوری کوری سنائی تھی کہ یزید ہونٹ چاٹتا رہ گیا تھا۔ کیا ان حضرات پر یہ گمان ہوسکتا ہے کہ انہوں نے خوف کی وجہ سے امام کا ساتھ نہ دیا نہیں! بلکہ ان کو در حقیقت امام کی رائے ہی سے اختلاف تھا۔

اگر مان لیا جائے کہ خوف کی وجہ سے صحابہؓ وتابعین نے ساتھ نہیں دیا تھا تو...... اس سے ان لوگوں کو پوری سند ملتی ہے جن کو آپ آج کل ڈرپوک کہتے ہیں اور یہ جمہور کے ساتھ خوف کی وجہ سے شریک نہیں ہوتے وہ آپ کے اس الزام کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر کے ان صحابہؓ کے طرز عمل کو دلیل میں پیش کر دیں گے۔ جنہوں نے آپ کے نزدیک خوف کی وجہ سے ایک امر واجب میں امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ساتھ نہ دیا۔

نیز وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تم جو ہم کو متفرد سمجھتے ہو یہ غلط ہے بلکہ ہماری رائے کے ساتھ بہت علماء کو موافقت ہے جو خوف عوام اور لعن طعن جہلاء کے خوف سے اپنے موافقت ظاہر نہیں کرتے۔

جیسا کہ صحابہؓ وتابعین نے خوف کی وجہ سے امام کی موافقت ظاہر نہ کی تھی اور جو علماء تمہارے ساتھ ہیں ان میں بھی بعض افراد دل سے ہماری رائے کو صحیح جانتے ہیں مگر خوف یا طمع کی وجہ سے تمہارے ساتھ

ہو گئے ہیں اور یہ محض الزامی جواب نہیں۔ بلکہ اگر تفتیش وانصاف سے کام لیا جائے تو اس کا صدق واضح ہو جائے گا۔ غرض آپ امام حسین رضی اللہ عنہ کو متفرد مانیں یا غیر متفرد ان کا مدعا ہر طرح سیدھا ہے۔)

لذت شہادت

ایک سبق اس واقعہ سے یہ حاصل ہوا کہ مسلمانوں کو بتلا دیا گیا ہے کہ کاملین کا بھی امتحان ہوا کرتا ہے اور ان کو بھی تکلیف پیش آیا کرتی ہے۔ جس سے ان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ امام حسین رضی اللہ عنہ سے زیادہ کون ولی ہوگا جو حضورؐ کے نواسے اور حد درجہ محبوب تھے۔ جن کے بارے میں پیشین گوئی ہے:

سیدا شباب اھل الجنة حسن اور حسین دونوں نوجوان جنت والوں کے سردار ہیں

مگر دیکھ لیجئے ان کو بھی کیسا امتحان وابتلا پیش آیا اور گو کوئی شخص اپنے محبوب کو تکلیف نہیں دے سکتا۔ مگر درحقیقت اہل اللہ کیلئے ان واقعات میں کلفت جسمانی سے زیادہ روحانی راحت ولذت ایسی ہوتی ہے کہ اس کے سامنے یہ کلفت جسمانی کچھ نہیں معلوم ہوتی۔ اور اگر ان سے یہ کہا جائے کہ تم چاہو تو یہ جسمانی کلفت تم کو نہ دی جائے تو وہ کبھی اس کو گوارا نہ کریں گے اور یوں کہیں گے۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ خنجر آزمائی

دشمن کے نصیب یہ بات نہ ہو کہ وہ تیری تلوار سے ہلاک ہو۔ دوستوں کا سر سلامت رہے تا کہ تو خنجر آزماتا رہے۔

صاحب محبت تو وہ چیز ہے کہ اس میں بعض لوگ ادنیٰ ادنیٰ محبوبوں کے لئے خوشی کے ساتھ جان فدا کر دیتے ہیں۔ حالانکہ جان دینے کے بعد وہ محبوب ان کو اس جاں نثاری کا کچھ صلہ بھی نہیں دے سکتا۔ تو پھر یہ کیونکر خیال میں آ سکتا ہے کہ عاشقان الٰہی کو جان دینے میں کچھ بھی روحانی پریشانی ہوتی ہوگی۔ جب کہ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہم رضائے محبوب کے لئے جان دے رہے ہیں۔ اور یہ بھی یقین رہے کہ مرنے کے بعد وہ اس کا صلہ بھی بہت کچھ دیں گے۔

شہادت کا صلہ اتنا عظیم الشان ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنت کے رہنے والوں میں کوئی ایسا نہیں جو دوبارہ دنیا میں آنا چاہے سوائے شہید کے وہ شہادت کا صلہ دیکھ کر تمنا کرے گا کہ میں دوبارہ دنیا میں جاؤں اور پھر شہید ہوں پھر جاؤں اور پھر شہید ہوں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کامل فرماتے ہیں

وددت ان اقتل فی سبیل الله ثم احيي ثم اقتل ثم احيي ثم اقتل ثم احيي ثم اقتل

(تاریخ بغداد للخطیب البغدادی ۴: ۷)

صاحبو! شہادت میں کچھ تو لذت ہے جو حضورؐ یوں بار بار اس کی تمنا فرماتے ہیں آہ! حضورؐ کے دل پر کیا گزرتی ہوگی جو یہ بات آپؐ کی زبان پر آئی۔ ورنہ آپ تو بڑے ضابط تھے (شہید جب جان دینے کے لئے بڑھتا ہے تو زبان حال سے حق تعالیٰ کی جناب میں یوں کہتا ہوا جاتا ہے

بجرم عشق توام می کشند وغو غائیست　　　تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائیست

تیرے عشق کے جرم میں مجھے قتل کرتے ہیں، فریاد تو خود بھی تو چھت پر آ کر دیکھ کہ کتنا اچھا تماشا ہے۔

یعنی وہ محبوب حقیقی سے عرض کرتا ہے کہ لوگ آپکے عشق و جرم میں مجھے قتل کر رہے ہیں۔ ذرا آپ بھی ایک نظر یہ تماشا دیکھ لیجئے۔ پھر چونکہ مسلمان کو یقین ہے کہ حق تعالیٰ دیکھ رہے ہیں تو محبوب کے سامنے اسکے نام پر جان دینے کی اسے کیا کچھ لذت آتی ہوگی اسکو وہی جان سکتا ہے)

فضیلت شہادت

شہادت کی فضیلت کے لئے کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ شہید کے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور وہ پاک صاف ہو کر خدا کی جناب میں جاتا ہے تو جس کو خدا سے محبت و عشق ہوگا وہ کیونکر اس کا متمنی نہ ہوگا۔ حقیقی شہادت کی تمنا ہر قلب مسلم میں ہے اور جس کے دل میں اس کی آرزو نہیں اس کے ایمان میں نقص ہے۔

مگر ہاں کسی موقع پر پیش قدمی کرنے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ متوقع شہادت حقیقی کا موقع ہے جس میں شرعاً جان دینا مطلوب ہے۔ اور اگر شرعاً کسی موقع پر شہادت کے شہادت ہونے میں شبہ ہو جاوے وہاں عارف کبھی جان نہ دے گا۔ بلکہ ایسے موقع پر وہ اپنی جان کی حفاظت کرے گا۔ گو اس صورت میں لوگ اس کو ملامت بھی کریں۔ بزدل اور ڈرپوک جو چاہیں کہیں۔ اس کی کچھ پروا نہ کریگا۔ کیونکہ وہ حقیقی شہادت کا طالب ہے، جس سے سوائے رضائے حق و اعلاء کلمۃ اللہ کے کچھ مقصود نہ ہو۔ پھر جہاں رضائے حق حاصل ہونے ہی میں شبہ ہو وہاں محض مخلوق کی نظر میں بہادر اور جری بننے کے لئے وہ کبھی اقدام نہ کرے گا۔ کیونکہ اس کا مشرب تو یہ ہے

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　　مانمے خواہیم ننگ و نام را

اگرچہ یہ بات عقل مندوں کے نزدیک بدنامی کا باعث ہے مگر ہم ننگ و نام چاہتے ہی نہیں۔

اور وہ یوں کہتا ہے

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا　　　اور جو خود ناکام ہو اسکو کسی سے کام کیا

عاشق کی ناکامی محرومی کی ناکامی نہیں ہوتی۔ بلکہ ترقی کی وجہ سے وہ اپنے کو ناکام و نامراد

سمجھتا رہتا ہے وہ کسی حالت پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ جتنا وصال سے کامیاب ہوتا ہے اس سے آگے ترقی کا طالب ہوتا ہے۔ اس کی پیاس کبھی نہیں بجھتی اس لئے ناکام کہہ دیا۔ اور اس طریق میں یہ ناکام ہی بڑی کامیابی ہے اور جو شخص اپنے کو کامیاب سمجھ کر کسی خاص حالت پر قناعت کرے اور طلب کی پیاس بجھاوے وہ اس طریق میں ناکام ہے۔ خوب سمجھ لو۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضرت امام کے واقعہ میں جو سبق ہمارے لئے ہے اس کے واسطے گاہے گاہے اجمالی یاد کافی ہے۔ تفصیلی واقعات کی کچھ ضرورت نہیں اور اجمالی واقعہ سے کوئی مسلمان ناآشنا نہیں پھر اس کے لئے خاص طور پر ہر سال مجلسیں منعقد کرنا اور ان میں اظہار غم کے طور پر یہ واقعہ دل خراش پڑھنا اور مسلمانوں کے دلوں کو تازہ غم دیکر زخمی کرنا اور شہداء پر نوحہ و ماتم کرنا بالکل خلاف عقل[1] و خلاف مقصود ہے۔

شہداء پر اظہار غم

صاحبو! میں کہہ چکا ہوں کہ صدمہ اس واقعہ میں ہوتا ہے جو مبتلا کے خلاف مرضی ہو۔ تو کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ یہ واقعہ ان حضرات کے خلاف مرضی ہوا اور وہ شہادت کے طالب نہ تھے ہرگز نہیں! تو جب وہ شہادت کے طالب تھے تو اپنی مراد کو پہنچ گئے۔ اس کے لئے نوحہ و ماتم کیسا کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ حق تعالیٰ ان حضرات شہداء کو وہ مراتب و منازل عطا نہ فرماتے جواب حاصل ہوئے۔ کیا آپ کے نزدیک ان حضرات کو اس واقعہ سے اجر نہیں ملا اور بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر آپ کے سلف دین کے لئے ایسی جاں نثاری اور جاں فروشی نہ کرتے۔ آج آپ کو اس کے لئے ہمت کیونکر ہوتی اور اگر یہ نظیریں آپ کے سامنے نہ ہوتیں تو ایسے مواقع میں دین کے لئے جان دینے کو تمہارے دل کیسے بڑھتے۔ قاعدہ ہے کہ نظائر سے انسان کی ہمت بلند ہوتی ہے اور سلف کے کارناموں کو یاد کر کے پچھلوں کو ان کے اتباع کا شوق ہوتا ہے اگر اس واقعہ کا ظہور نہ ہوتا تو یہ سبق ہم کو کیسے حاصل ہوتا۔ جب اس واقعہ میں ہمارے لئے بھی حکمت ہے اور ان کو اس پر اجر بھی بہت

---

[1] لطیفہ۔ ایک سرحدی کابلی محرم کے زمانے میں ہندوستان آیا تو اس نے تعزیہ و علم وغیرہ نکلتے ہوئے دیکھے اور اس کے پیچھے کچھ لوگوں کو ماتم و نوحہ کرتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا یہ کیا قصہ ہے لوگوں نے کہا تم کو معلوم نہیں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ اس مہینہ میں شہید ہوئے ہیں۔ سرحدی نے کہا وہ تو تیرہ سو برس پہلے شہید ہو چکے ہیں۔ کیا...... ہندوستان میں اب خبر آئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ بہت ہی غافل ہیں کہ تیرہ سو برس کے واقعہ پر آج غم کرنے بیٹھے ہیں۔ اھ مثنوی میں ایک ایسی ہی حکایت ایک شاعر کی جو حلب میں زمانہ محرم میں آیا تھا لکھی ہے۔ واقعی مقتضائے عقل تو یہی ہے کہ صرف واقعہ کے وقت غم کیا جائے سالہا سال تک غم کو لے کر بیٹھنا بقول اس سرحدی کے غفلت ہی کی علامت ہے۔

بڑا املا ہے۔ تو پھر کیا ہر سال اس قدر اظہار غم جو آج کل کیا جارہا ہے منشا حق کے خلاف نہ ہوگا؟

شاید اس پر کسی کو یہ شبہ ہو کہ پھر کیا اس واقعہ کے وقوع کے وقت بھی غم نہ کرنا چاہئے تھا کیونکر یہ بات تو اس وقت بھی تھی۔ یہ واقعہ تو اس وقت بھی ان کے لئے باعث اجر تھا اور شہادت ان کو مطلوب تھی اور اس وقت بھی ہمارے لئے اس میں حکمت تھی؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس وقت کا غم کرنا غیر اختیاری ہوتا۔ قاعدہ ہے کہ ظہور حادثہ کے وقت طبعی غم بلا اختیار ہوا کرتا ہے اور امر غیر اختیاری میں انسان معذور ہے لیکن جب طبعی غم کی حد گزر جائے اس کے بعد غم کو لے کر بیٹھا یہ مذموم ہے۔ بس اب اس کی حکمتوں پر نظر کرنا چاہئے۔

اس فرق کو ایک مثال میں سمجھئے مثلاً ایک شخص ڈاکٹر سے خود کہے کہ میرا اپریشن کر دو۔ اس کیلئے وہ ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اسکی خوشامد بھی کرتا ہے۔ مگر اپریشن کے وقت اسکے منہ سے آہ اور چیخ بھی نکلتی ہے کیا۔ آپ اس شخص کو اس آپ پر کچھ ملامت کریں گے ہرگز نہیں۔ آخر کیوں؟ محض اسی وجہ سے کہ یہ غیر اختیاری بات ہے۔

بس اسی طرح یہاں سمجھئے کہ گو وقت وقوع بھی اس واقعہ کی حکمتیں عقلاء کے پیش نظر ہوتیں مگر اس وقت غیر اختیار غم بھی ساتھ ساتھ ہوتا اور اس میں وہ معذور ہوتے لیکن اب جو ہم رنج و صدمہ ظاہر کرتے ہیں یہ عقلی غم ہے طبعی نہیں اور اس کی ممانعت ہے جیسے مثال مذکور میں اپریشن ختم ہونے اور زخم کے اچھا ہونے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اپریشن کا غم کرتا رہے اور ہر سال اس پر ماتم کیا کرے تو اس کو یقیناً سب لوگ بیوقوف کہیں گے اور اس رنج و غم میں اسے کوئی معذور نہ کہے گا۔

طبعی غم وغصہ کی حد

طبعی رنج کی ایک حد ہوتی ہے جب وہ حد پوری ہو جائے پھر طبعی رنج نہ ہوگا۔ بلکہ عقلی ہوگا۔ فقہاء نے نصوص شرعیہ سے اس حد کو سمجھا ہے واقعی صوفیاء اور فقہاء یہ دونوں فرقے حکماء امت ہیں۔ مگر افسوس سے کہ ان دونوں میں باہم جدال ونزاع ہے جس کی وجہ سے ہماری بدقسمتی ہے کہ بعض لوگ ان دونوں جماعتوں میں غیر محقق بھی ہوتے ہیں۔ ان ناقصین میں نزاع ہوتا رہتا ہے ورنہ اگر دونوں محقق ہوں تو کبھی نزاع نہ ہو۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ تین روز کے بعد تعزیت کرنا پاس والوں کو ممنوع ہے۔ ہاں جو لوگ باہر رہتے ہوں ان کو تین دن کے بعد تعزیت کی اجازت ہے۔

وجہ یہ ہے کہ تین دن میں طبعی غم ہلکا ہو جاتا ہے اس کے بعد تعزیت کرنا اس کو بڑھانا ہے۔ اب

اگر وہ آ کر تعزیت نہ کرے۔ تو طرفین میں بدمزگی ہوگی صاحب واقعہ اپنے دل میں کہے گا کہ اس ظالم کو میری مصیبت سے غم ہی نہیں ہوا۔ اس نے ایک حرف بھی تسلی کا نہ کہا۔ اس لئے مسافر کو تین دن کے بعد بھی جب وہ آئے تعزیت کرنی چاہئے اور اس کی تعزیت سے صاحب واقعہ کا غم نہ بڑھے گا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ شخص ضرورت کی وجہ سے اتنے دنوں کے بعد تعزیت کر رہا ہے۔ یہ پہلے نہ آ سکتا تھا۔

فقہاء نے تین دن کی حد کو غالباً اس حدیث سے استنباط کیا ہو۔

لا یحل لمؤمن ان یھجر اخاہ فوق ثلثة ایام (کنز العمال : ۲۴۷۹۴)

''کوئی شخص اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ ہجراں نہ کرے۔''

یعنی اگر کسی سے دنیوی معاملہ میں رنج و تکرار ہو گیا ہو تو تین دن تک تو بات چیت سلام کلام ترک کرنا جائز ہے۔ اس سے زیادہ جائز نہیں کیونکہ شارع علیہ السلام نے عادت انسانیہ سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ طبعی غم و غصہ تین دن میں کم ہو جاتا ہے اس کے بعد تکلف بڑھانے سے رنج بڑھے گا۔ اگر اسباب زیادہ اختیار نہ کئے جائیں تو تین دن کے بعد رنج کا غلبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ تو جب طبعی رنج کا غلبہ تھا اس وقت تک شریعت نے بھی اس کو ترک کلام میں معذور سمجھا جب غلبہ جاتا رہا اب یہ معذور نہیں۔ اب ترک کلام و سلام محض خبث نفس کی وجہ سے ہے اس کی اجازت نہیں۔

یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی رحمت فرمائی کہ تین دن تک ہجران کی اجازت دیدی۔ اگر کوئی فلسفی ہوتا تو ایک دن کے لئے بھی ہجران کو جائز نہ رکھتا اور یہ کہتا کہ ہجران اتفاق او اتحاد باہمی کے خلاف ہے پس رنج و تکرار کو جلد رفع کرنا اور فوراً صفائی کر لینا چاہئے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جذبات نفس پر بڑی گہری نظر ہے آپ نے تین دن تک ہجران کی اسلئے اجازت دی کہ فوراً صفائی کرنا عادۃ دشوار اور نفس پر بہت گراں ہوتا ہے۔ آپ نے ہمارے اوپر گرانی اور دشواری ڈالنا گوارا نہیں فرمایا۔

دوسرے رنج و تکرار کے وقت چونکہ دونوں طرف نفس میں رنج و غصہ بھرا ہوگا تو فوراً صفائی کرنے سے یہ صفائی بیکار ہوگی۔ گو ظاہر میں دونوں بات چیت کرنے لگیں گے۔ مگر دلوں میں سخت غبار ہوگا۔ اس حالت میں صفائی کرنے سے کینہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اس سے جو غرض تھی یعنی اتحاد و اتفاق وہ مطلق حاصل نہ ہوگی۔ اس لئے آپ نے معاً صفائی کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ تین روز تک ترک کلام و ہجران سے دل کا غبار نکالنے کے اجازت دیدی جب تین دن میں دل کا غبار نکل گیا اور غلبہ رنج فرو ہو گیا۔ اب ملنے جلنے کا حکم دیا اس وقت صفائی سے نفع بھی ہوگا اور چونکہ غبار نکل چکا ہے اس لئے کینہ بھی پیدا نہ ہوگا واقعی حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں جذبات نفس کی جس درجہ رعایت ہے۔اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

(اور یہ حکم دنیوی رنج وتکرار کا ہے اور اگر کسی سے دینی معاملہ میں رنج ہو گیا ہو تو اس میں یہ حد نہیں۔ بلکہ جب تک دوسرا شخص اس معصیت سے جو سبب ہجران تھی توبہ خالص نہ کرے اسوقت تک ہجران کی اجازت ہے اور بعض مواقع میں واجب ہے۔

اظہار غم پر وعید

اس حدیث سے تین دن کے بعد رنج کو لے کر بیٹھنے کی ممانعت ثابت ہوئی۔دوسری خرابی شہادت ناموں کے پڑھنے اور مجالس منعقد کرنے میں یہ تھی کہ اس میں اظہار غم ہے اور اظہار غم جائز نہیں۔

اس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جنازہ کے ساتھ جاتے ہوئے بعض صحابہ کو دیکھا کہ انہوں نے اپنی چادریں اتاردی ہیں اہل عرب کا لباس ازار و رداء تھا۔ اس کو عربی میں حُلہ کہتے ہیں۔ مہذب لوگ قمیض بھی پہنتے تھے۔مگر زیادہ لوگ چادر اور لنگی ہی پہنتے تھے۔اس وقت القار رداء غم کی علامت تھی جیسے آج کل بازو پر سیاہ کپڑا باندھنا لوگوں نے انگریزوں سے سیکھا ہے۔اور جو لوگ کرتہ پہنتے تھے وہ گریبان چاک کرتے تھے۔ان کے یہاں شق جیب علامت غم تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو چادرہ اتارے ہوئے دیکھ کر فرمایا۔

افعل الجاهلية تاخذون اوباهل الجاهلية تشبهون لقد هممت ان ادعو عليكم دعوة ترجعون فی غير صوركم (سنن ابن ماجه: ۱۴۸۵ ، كنز العمال: ۴۲۴۷۳)

(فيا خذوا اردیتهم ولم لعودوله بعد اخرجه ابن ماجة كما فی المشكوة بسند ضعيف فيه متروک ولكن تايد معناة بحديث ليس منا من شق الجيوب ودعا بدعوى الجاهلية.

"کیا تم جاہلیت کا اختیار طریقہ کرتے ہو یا اہل جاہلیت کے ساتھ مشابہت کرتے ہو۔میرا قصد ہوا تھا کہ تم پر ایسی بددعا کروں جس سے تمہاری صورتیں بدل جائیں۔

اس وعید کو سن کر صحابہؓ نے فوراً چادریں اوڑھ لیں۔اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ اظہار غم ناجائز ہے حالانکہ چادرہ اتارنے میں کوئی زیادہ اظہار نہیں مگر آپ کو اتنا بھی ناگوار ہوا۔ پھر یہ رونا اور ماتم کرنا اور اس کے لئے مجالس منعقد کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے جو سراپا اظہار ہے۔

رہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے صاحب زادے کے واقعہ انتقال میں

انا بفراقک یا ابراهيم لمحزونون (المصنف لابن ابی شيبة ۳: ۲۹۳)

(اے ابراہیم ہم تیری جدائی پر مغموم ہیں۔) فرمانا۔ سو اتنا اظہار غم وقت ظہور واقعہ کے مضائقہ نہیں جس میں بیان اور شکایت الٰہی نہ ہو چنانچہ حضورؐ نے اسکے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا۔

العین تدمع و القلب یحزن و لا نقول الا مایرضی ربنا.

یعنی آنکھ سے آنسو بہہ رہے ہیں اور دل غمگین ہے مگر زبان سے وہی کہیں گے جس سے خدا راضی ہو۔

رہا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حضورؐ کے وصال پر یہ فرمانا

صبت علی مصائب لو انها　　　صبت علی الایام صرن لیالیا

''مجھ پر ایسی مصیبتیں پڑیں کہ اگر وہ زمانے کے دنوں میں پڑتیں۔ تو وہ راتیں بن جاتیں۔''

سو اول تو بقاعدہ محدثین اس کا ثابت ہونا مشکل ہے کہ یہ اشعار حضرت فاطمہؓ ہی کے ہیں (اہل سیر کی روایت ہے جس میں رطب و یابس سب کے بھرے ہوتے ہیں)۔ دوسرے یہ غلبہ حال تھا۔ تیسرے اس میں کوئی شکایت تھوڑا ہی ہے صرف صدمہ کی عظمت بتلائی ہے جیسے حضورؐ نے اپنے بیٹے حضرت ابراہیم کے انتقال پر انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون۔ فرمایا تھا۔ رہا اس کو نظم میں فرمانا تو نظم و شعر اہل عرب کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ ان کو نظم و نثر دونوں برابر ہیں۔ چوتھے یہ بھی تو خیال کیا جائے کہ وہ واقعہ کیسا تھا۔ حضورؐ کا وصال کیسی مصیبت عظمیٰ تھی۔ اس وقت اگر دل پھٹ جاتا تو تعجب نہ تھا۔ یہ بھی حضرات صحابہؓ و اہل بیت کو غایت تحمل ہے کہ انہوں نے دو چار باتوں پر اکتفا کیا۔ پانچویں حضرات صحابہؓ کو انقطاع نزول وحی کا صدمہ زیادہ تھا کہ اب بار بار حق تعالیٰ کا کلام نازل نہ ہوگا۔ یہ نعمت ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی سو محض وفات پر اظہار غم نہ تھا۔ بلکہ انقطاع برکات کا صدمہ بھی زیادہ تھا جس کو انہوں نے ظاہر کیا ہے۔

الغرض! قواعد شرعیہ سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اظہار غم کی ممانعت ہے۔

نام و نمود کی صورتیں

اس سے ان امور کا ممنوع ہونا ثابت ہو گیا جو آج کل محرم میں کئے جا رہے ہیں اور جتنے قصے آج کل اس قسم کے ہوتے ہیں ان کا منشا یہ ہے کہ اہل مال و اہل دولت کو دراصل روپیہ خرچ کرنے اور نام پیدا کرنے کی خواہش ہوتی ہے اس کے لئے یہ بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ جو اہل دولت دنیادار ہیں وہ تو اپنی اولاد کی بسم اللہ ختنہ اور شادی وغیرہ میں دل کے حوصلے نکالتے ہیں۔ چنانچہ بمبئی کی طرف ایسے واقعات بھی سننے میں آئے ہیں۔ ایک جگہ بندر بندریا کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔

اور جو اہل دولت دیندار ہیں انہوں نے دین کی صورت میں روپیہ خرچ...... کرنے کا بہانہ

نکال لیا۔ کسی نے مولود شریف اختیار کیا۔ کسی نے محرم میں ماتم برپا کیا۔ کسی نے گیارہویں شریف نکالی۔ کسی نے شب برات کا حلوا ایجاد کیا جو لوگ ربیع الاول میں حضورؐ کی ولادت پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کوئی ان سے یہ کہے کہ حضورؐ کی وفات بھی تو اسی مہینہ میں ہوئی ہے اس پر غم بھی تو کرو۔ واقعی حق تعالیٰ نے حضورؐ کی ولادت وفات دونوں کو ایک مہینہ میں جمع کر کے اس حکمت کا اظہار فرمایا ہے مسلمانوں کو اس زمانہ میں نہ فرط غم ظاہر کرنے کا موقع ملے بموجب زمان وفات ہونے کے نہ فرط سرور کرنے کا موقع ملے بوجہ زماں ولادت ہونے۔ بس جب یہ مہینہ آتا ہے تو خوشی اور غم دونوں ساتھ ساتھ آتے ہیں جس سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تو عوام کی حالت تھی۔

اب خواص سنئے۔ انہوں نے بھی اظہار شوکت و شان کے لئے بعض صورتیں نکالی ہیں۔ مولویوں نے تو مدارس کے جلسے نکالے ہیں جن میں اکثر نام و نمود کا اظہار ہوتا ہے۔

چنانچہ کانپور میں ایک دو سال دو مدرسوں کا جلسہ تھا ہر ایک چاہتا تھا کہ اپنی کاروائی دوسرے سے زیادہ دکھلائے تو ایک مدرسہ والوں نے دوسرے مدرسہ کے طلبہ کو توڑ کر اپنے یہاں بلایا کہ تم ہمارے مدرسے سے سند دستار لینا۔ دوسرے مدرسہ والوں کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ان طلباء کو برا بھلا کہا۔ وہ اس ارادہ سے رک گئے تو پہلے مدرسہ والوں نے ایک طالب علم کو کسی بہانے سے بلا کر کوٹھری میں بند کر دیا۔ اور جلسہ کے وقت تک بند رکھا تاکہ بھاگ نہ جائے اور دستار بندی کے وقت نکال کر اسے سند اور دستار دیکر اپنے مدرسہ کی طرف منسوب کر لیا۔ پھر کہہ دیا کہ اب جاؤ جہاں چاہو۔

بھلا یہ دین ہے۔ واللہ بجز شہرت اور نام کے اس سے کچھ مقصود نہیں۔ پھر جلسوں میں رقمیں ایسی صرف ہوتی ہیں جو جلسہ کے لئے مخصوص نہیں ہوتیں۔ لوگوں نے تو نہ معلوم کیا سمجھ کر چندہ دیا تھا اور یہاں وہ رقمیں جلسہ کے انتظامات میں صرف کی جاتی ہیں انہی رقموں سے امراء و رؤسا کی دعوت بھی ہوتی ہے اور غربا کو بھی کھلایا جاتا ہے۔ اور اس کو ہم سب کھاتے ہیں۔ اگر ان جلسوں کا منشا محض دین ہوتا۔ تو ان میں حدود کی کچھ پروا نہیں یہ تو مولویوں کی حالت ہے۔

ستم یہ ہے کہ صوفیوں نے بھی جن کا شرف اپنے کو مٹانا اور گمنام کرنا ہے نام و نمود کی بعض صورتیں نکالی ہیں۔ چنانچہ ہر سال جا بجا عرس ہوتے ہیں جن میں چار طرف سے مدعیان تصوت کا ہجوم ہوتا ہے تاکہ لوگ جان لیں کہ عرس میں جتنے حضرات تشریف لائے ہیں یہ سب صوفی ہیں پھر قوالی میں حال اور وجد سے تو اچھی طرح اپنے تصوف کو ظاہر کر دیا جاتا ہے کہ ہاں ہمارے اندر بھی کچھ ہے۔

بے غرضی و بے نفسی کی صورتیں

صاحبو! حقیقی صوفی کبھی ان صورتوں کو پسند نہیں کرسکتا۔ علماء کے فتوے سے بھی قطع نظر کر لی جائے وہ یہ عرس وغیرہ اسباب شہرت ہونے کی وجہ سے خود طریقے کے بھی خلاف ہیں۔ آہ! اب مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب جیسے بے نفس کہاں ہیں جو شہرت و نام سے بھاگتے تھے اور اپنے کو مٹانا چاہتے تھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ کا لباس ایسا موٹا جھوٹا ہوتا تھا کہ صورت سے کوئی نہ سمجھے کہ یہ بھی کوئی بڑے عالم یا شیخ ہیں مگر

نور حق ظاہر بود اندر ولی　　　نیک بیں باشی اگر اہل ولی

ولی کے اندر اللہ کا نور ہوتا ہے۔ اگر تم ٹھیک دیکھنے والے ہوتو دیکھ لوگے وہ کتنا ہی اپنے کو چھپاتے بھلا کیوں چھپ سکتے تھے پہچاننے والے پہچان ہی لیتے تھے تو پھر آپ نے اس کا یہ انتظام فرمایا کہ جب کہیں سفر میں جاتے ساتھیوں کو نام ظاہر کرنے سے منع فرما دیتے کہ میرا نام کسی کو نہ بتلانا۔ اگر کوئی مولانا ہی سے پوچھتا کہ جناب کا نام کیا ہے تو فرماتے حافظ خورشید حسن۔ یہ مولانا کا تاریخی نام تھا اس لئے کذب بھی نہ ہوتا اور سائل کو پتہ بھی نہ چلتا۔ کیونکہ یہ نام مشہور نہ تھا۔ لوگوں میں مشہور نام مولانا محمد قاسم ہی تھا۔ خورشید حسن سن کر سائل یہ سمجھتا کہ یہ کوئی اور شخص ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحب نہیں ہیں۔

اگر کوئی پوچھتا کہ آپ کا وطن کہاں ہے فرماتے ہیں الہ آباد۔ بعض مخلصین کو شبہ ہوا کہ اس میں تو کذب ہوگیا تو مولانا سے عرض کیا کہ حضرت آپ کا وطن الہٰ آباد کدھر سے ہوگیا۔ فرمایا کہ نانوتہ بھی تو خدا تعالیٰ ہی کا آباد کیا ہوا ہے تو لغۃً وہ بھی الہ آباد ہی ہے۔ مولانا تھے بڑے ذہین۔ بات بات سے ذہانت ٹپکتی تھی۔

غدر کے موقع میں مولانا نے ایک عجیب ذہانت سے بچاؤ کیا۔ بعض لوگوں نے آپ سے شکایت کردی تھی کہ یہ بھی عذر تھانہ بھون میں شریک تھے تو تین دن تک آپ روپوش رہے۔ تین دن کے بعد ظاہر ہو گئے لوگوں نے کہا۔ حضرت ابھی تک آپ کی تلاش جاری ہے اور وارنٹ موقوف نہیں ہوا ابھی کچھ دنوں اور چھپے رہئے۔ فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے موقع تین ہی دن غار ثور میں روپوش رہے تھے۔ بس! سنت پر عمل کرلیا ہے اس سے زیادہ مدت تک مخفی رہنا زائد علی السنّت ہے۔

سبحان اللہ! اتباع سنت اسے کہتے ہیں کہ روپوشی میں بھی اس کا لحاظ رہا کہ سنت سے زیادہ نہ ہو آجکل لوگ نوافل و تسبیحات ہی میں اتباع سنت کو منحصر سمجھتے ہیں کمال اتباع یہ ہے کہ جو مولانا کے فعل سے ظاہر ہوا۔ غرض تین دن کے بعد آپ اعلانیہ پھرتے تھے کئی مرتبہ گھر پر دوڑ آئی۔ مگر آپ اپنی ذہانت

سے بچ جاتے تھے۔ ایک دفعہ مولانا چھتے کی مسجد میں تھے کسی نے مخبری کر دی اور فوراً دوڑ آ گئی۔ مولانا اس وقت جہاں بیٹھے تھے اس جگہ سے ذرا کھسک کر بیٹھ گئے۔ پولیس کے افسر نے صورت سے نہ پہچانا کہ یہی مولانا محمد قاسم ہیں۔ کیونکہ لباس مولانا کا عالمانہ نہ ہوتا تھا۔ عامیانہ لباس پہنتے تھے اس نے سمجھا کہ یہ کوئی عالم نہیں معمولی آدمی ہے۔ تو اس نے مولانا ہی سے پوچھا کہ یہاں مولانا محمد قاسم صاحب آئے تھے؟ تو آپ نے اپنی پہلی جگہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ابھی تو یہیں تھے دیکھ لو۔ یہ کہہ کر اپنے جوتے ہاتھ میں لئے پولیس کے درمیان سے نکل گئے۔ بعد میں پولیس افسر کو معلوم ہوا کہ جس سے میں نے باتیں کی تھیں وہی مولانا محمد قاسم صاحب تھے۔ وہ مولانا کی ذہانت پر بڑا حیران ہوا کہ جھوٹ بھی نہیں بولا اور صاف بچ بھی گئے۔

غرض اس ذہانت سے بچتے رہے۔ مگر تین دن کے بعد روپوش نہیں ہوئے۔ خیر یہ تو مولانا کی ذہانت کا ایک لطیفہ تھا۔ مجھے بتلانا یہ تھا کہ یہ حضرات شہرت سے کس درجہ بھاگتے تھے کہ صورت سے کوئی ان کو عالم یا شیخ نہ سمجھتا تھا۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ رات کے وقت دیوبند سے نانوتہ جا رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر راستہ بھول گئے کیونکہ رات باقی تھی۔ تو آپ نے ایک شخص سے پوچھا کہ بھائی نانوتہ کا راستہ کدھر ہے اس نے کہا ارے تو کون ہے جو صبح ہی صبح نانوتہ کا نام لیتا ہے (مشہور ہے کہ صبح کو نانوتہ کا نام لینے سے دن بھر کھانا نہیں ملتا) فرمایا بھائی پھر کیا کہوں۔ کہا چھوٹا شہر کہہ! آپ نے فرمایا اچھا بھائی چھوٹے شہر کا راستہ کس طرف کو ہے اس نے بتلایا کچھ دور چل کر پھر راستہ بھول گئے تو ایک شخص اور ملا اس سے پوچھا۔ بھائی شہر کا راستہ کدھر کو ہے۔ وہ کوئی نانوتہ کا رہنے والا تھا اس نے کہا ارے تو کون ہے جو ہمارے شہر کو چھوٹا شہر کہتا ہے فرمایا پھر کیا کہوں کہا نانوتہ کیوں نہیں کہتا۔ فرمایا اچھا بھائی نانوتہ کا راستہ بتلا دے۔ کہا یہ سامنے نانوتہ ہی تو ہے۔ اس وقت مولانا نانوتہ پہنچ گئے تھے۔ مگر اندھیرے کی وجہ سے معلوم نہ ہوا کہ میں گھر کے قریب آ گیا ہوں۔

غرض راستہ میں جو بھی ملتا اور مولانا اس سے راستہ پوچھتے وہ برا بھلا ہی کہتا تھا اور مولانا سب کی سنتے جا رہے تھے کسی کی بات کا برا نہ مانا نہ کسی سے اپنا نام ظاہر کیا ورنہ اگر نام ظاہر کر دیتے تو ان اطراف کے سب لوگ آپ کو جانتے تھے۔ نام سن کر وہ لوگ پیروں میں گر پڑتے مگر ان کو تو اس میں ہی مزا آتا تھا کہ یہ نفس ذلیل ہو۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کا واقع ہے کہ ایک دفعہ آپ حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے کہ بارش آ گئی۔ طلباء سب کتابیں لے لے کر اندر چلے گئے پھر سب اپنے جوتے اٹھانے آ گئے تو دیکھا کہ مولانا نے ایک چادرہ میں سب کے جوتوں کو جمع کر رکھا ہے اور اٹھانا چاہ رہے ہیں یہ حالت دیکھ کر لوگوں کو وجد آنے لگا اور دیر تک قلوب پر اس کا اثر رہا۔ بھلا آج تو کوئی ایسا کر کے دکھاوے کہ اپنے شاگردوں کے جوتے سمیٹنے لگے۔

صاحبو! حکایتیں بیان کر دینا اور بات ہے مگر کر کے دکھلانا اور بات ہے مولانا کو لوگ خشک کہتے تھے۔ بعضے متشدد کہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی کی تربیت کرتے ہوئے مولانا کو دیکھا ہوگا۔ اس وقت مولانا سیاست و تنبیہ فرمارہے ہوں گے وہ احمق سمجھا کہ بس یہ رات دن اسی حالت میں رہتے ہیں۔

جیسے کوئی شخص کسی رحم دل جج کو خون کا مقدمہ فیصل کرتے ہوئے دیکھ کر یہ کہنے لگے کہ جج تو بڑا خونی ہے۔ ارے ظالم جج تو خونی نہیں بڑا مہربان ہے مگر افسوس تو اس کے پاس ایسے وقت گیا۔ جب وہ ایک ڈاکو کے لئے سزائے موت تجویز کررہا تھا۔ اگر تو اس کے بنگلہ پر جا کر ملتا تو معلوم ہوتا کہ وہ کیسا مہربان ہے۔

ایسے ہی سیاست و تربیت کے وقت کسی بزرگ کو سختی کرتے ہوئے دیکھ کر سخت مزاج سمجھ لینا بڑی حماقت ہے۔ اصلاح و تربیت میں وضرورت کی وجہ سے یہ حضرات سختی برتتے ہیں باقی فی نفسہ سخت مزاج نہیں ہوتے تمہیں فارغ اوقات میں ان حضرات سے ملنا چاہئے جب حقیقت معلوم ہوگی کہ تم خشک ہو یا وہ خشک ہیں۔

تعلق مہمان و میزبان

ایک سخی کی عادت تھی کہ جب اس کے یہاں مہمان آتا تو بڑی خاطر مدارت کرتا تھا۔ مگر رخصت کے وقت یہ کہہ دیتا ہے کہ مہربانی کر کے دوبارہ آپ یہاں نہ آئیں لوگ اسے بدنام کرتے تھے یہ بڑا ہی بخیل اور تنگ حوصلہ ہے جو مہمانوں کو یوں کہتا ہے پھر یہاں نہ آنا۔ ایک عاقل نے بھی یہ بات سنی اسے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ شخص تو بڑا سخی اور عالی حوصلہ ہے۔ آخر یہ بات کیا ہے اس کی تفتیش کرنا چاہئے۔

چنانچہ وہ خود اس سخی کا مہمان بنا۔ اس نے خوب خاطر کی۔ اس کے سارے کام اپنے ہاتھ سے کئے اس نے بھی کچھ تکلف نہ کیا اور اس کی ہر خدمت کو گوارا کرتا رہا۔ کسی بات میں مزاحمت نہ کی کہ تم یہ کام کیوں کرتے ہو میں خود کرلوں گا۔ جب چلنے لگا تو سخی نے کہا میری یہ درخواست ہے کہ آپ پھر بھی یہاں تشریف لائیں اس کو بڑی حیرت ہوئی کہ میرے ساتھ اس نے یہ معاملہ نہیں کیا جو لوگوں میں مشہور ہے آخر اس سے پوچھا کہ آپ کی نسبت جو یہ مشہور ہے کہ آپ مہمان سے چلتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ یہاں پھر

نہ آنا۔ اس کی کیا اصل ہے۔ میں اسی کی تحقیق کے لئے آیا تھا۔ مگر میرے ساتھ آپ نے برعکس کیا۔
کہا وہ بات غلط نہیں بالکل صحیح ہے۔ واقعی میں ایسا کہتا ہوں مگر اس کا راز یہ ہے کہ جو کوئی میرے یہاں مہمان بن کر آتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس کی خدمت کروں۔ اسے راحت پہنچاؤں۔ مگر لوگوں کی عادت یہ ہے کہ جب میں کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں تو مجھے اس سے روکتے ہیں کہ آپ تکلیف نہ کریں۔ ہم خود یہ کام کرلیں گے۔ مجھے اس تکلف سے تکلیف ہوتی ہے کیونکہ بعضے کام صاحب خانہ جس سہولت اور عمدگی سے کرسکتا ہے اجنبی اس طرح نہیں کرسکتا ہے اور مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ مہمان میری نظر کے سامنے تکلیف اٹھائے اور میں اس کو راحت نہ دے سکوں اس لئے میں کہہ دیتا ہوں کہ آپ پھر یہاں نہ آئے۔ اور تم نے کسی بات میں تکلف نہیں کیا ۔ جس طرح میں دل راحت پہنچانے کو چاہتا تھا تم نے مجھے ویسے ہی کرنے دیا۔ کسی بات سے نہیں روکا۔ اس سے میرا دل خوش ہوا اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم پھر آؤ۔
دیکھئے اس غریب کے متعلق شہرت کیا تھی اور حقیقت کیا نکلی تفتیش سے معلوم ہوا کہ اس کی وہ بات لوگوں سے کہنا بھی غایت کرم پر مبنی تھا۔ وہ مہمانوں کو راحت پہنچانا چاہتا تھا۔ اور مہمان اس کی راحت رسانی سے روکتے تھے۔ یہی حال مولانا گنگوہی قدس سرہ کا تھا کہ لوگ بے ڈھنگا پن خود کرتے تھے اس سے مولانا کو تکلیف ہوتی تھی ورنہ اگر کوئی ڈھنگ سے مہمان ہوتا تو مولانا سے زیادہ خوش اخلاق کوئی نظر نہ آتا۔
یہ قاعدہ یاد رکھو کہ مہمان کو میزبان کے کام میں دخل نہ دینا چاہئے مصالح کی رعایت وہی خوب کرسکتا ہے۔ مہمان کو ان مصالح کی اطلاع نہیں ہوسکتی۔

شر میں خیر

حضرت مولانا کے یہاں ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب ایسے وقت آئے کہ مولانا اس وقت درس حدیث میں مشغول تھے مولانا معمولی طور پر مزاج پرسی کر کے درس میں مشغول ہوگئے اور یہ بھی غایت کرم تھا کہ مولانا نے ان سے دو چار باتیں کرلیں ورنہ حدیث نبوی کی جس قدر عظمت مولانا کے قلب میں تھی اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس وقت کسی سے ایک بات بھی نہ کرتے۔
صاحبو! اگر کوئی شخص اپنے محبوب کا خط پڑھتا ہو تو کیا اس وقت وہ کسی سے بات کرنا گوارا کرسکتا ہے اسکو عشاق اپنے دل میں خود غور کرلیں لیکن مولانا نے تطییب قلب مسلم کے لحاظ سے اس وقت اپنی طبیعت پر جبر کر کے ان سے کچھ باتیں کیں پھر حدیث میں مشغول ہوگئے۔ اس کی ان

ڈپٹی صاحب نے یہ قدر کی کہ مولانا سے بدظن ہوگئے کہ یہ تو بہت روکھے ہیں دو چار باتیں کر کے پھر التفات بھی نہ کیا۔ غرض ان کو یہ طرز ناگوار ہوا۔ پھر اس کی انہوں نے اس طرح کسر نکالی کہ مولانا کو گورنمنٹ کی طرف سے کوئی خطاب دیا جانا تجویز ہوا تھا ڈپٹی صاحب سے بھی رائے لی گئی۔ انہوں نے اس کو روک دیا اور بڑے فخر سے اپنی کاروائی کو ظاہر کیا کہ مولانا نے ہم سے بے رخی کی تھی تو ہم نے بھی ان کو خطاب سے محروم کر دیا۔

مولانا کو یہ خبر پہنچی تو بہت ہنسے۔ فرمایا کہ میں تو ان کی اس کاروائی سے ممنون ہوا کہ مجھے ایک بلا سے بچا دیا اگر میں خطاب لے لیتا تو درباروں میں جانا پڑتا۔ اگر نہ لیتا اور واپس کرتا تو اس میں کوئی حکومت کی توہین تھی تو میں تو خطاب کے پہنچنے سے ایک پریشانی میں مبتلا ہو جاتا کہ کیا کروں۔ خدا ان کا بھلا کرے کہ انہوں نے خطاب کو مجھ تک آنے ہی نہ دیا۔ بالا بالا ہی واپس کر دیا۔

ہمارے حضرات اس کو بھی گوارا نہیں کرتے کہ حکومت کے مقرب بنیں اور درباروں میں شریک ہوتے پھریں اور اس کو بھی گوارا نہیں کرتے کہ حکومت کی توہین کریں حکام کو برا بھلا کہیں۔ یہ تو آج کل ہی نیا دستور نکلا ہے کہ حکام کو بندر اور سور کہا جاتا ہے۔ چاہے وقت پر کچھ نہ ہو سکے صرف زبان ہی کی بہادری ہے۔ موقع پر یہ لوگ جو حکومت سے مقابلہ کرتے ہیں خود ہی بندروں کی طرح بھاگتے نظر آتے ہیں پھر نہ معلوم یہ کون سی تہذیب ہے کہ حکام کو گالیاں دی جائیں۔

قاعدہ یہ ہے کہ بہادر آدمی اپنے مقابل کو گالیاں نہیں دیا کرتا۔ بلکہ قوت سے جواب دیا کرتا ہے یہ طریقہ کمزوروں کا ہے کہ مقابل کو گالیاں دیکر اپنی زبان گندی کرتے ہیں۔

یاد رکھو اسلام نے یہ طریقہ ہم کو نہیں سکھایا۔ اسلام نے ہم کو تہذیب سکھائی ہے اور یہ طریقہ جو آج کل اختیار کیا گیا ہے۔ تہذیب اسلامی کے بالکل خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ حکومت کے خطاب کو واپس کر کے اس کی توہین کی جائے۔ غرض ایسے ایسے مخلص ہوں تو شہرت سے بھاگیں ورنہ ہم تو اکثر شہرت کے طالب ہیں۔

اخلاص کی علامت

امام شعرانی نے اخلاص کی ایک علامت بیان فرمائی ہے۔ واقعی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے وہ لکھتے ہیں کہ اے عزیز! اخلاص کی علامت یہ ہے کہ جو کام دین کا تو کر رہا ہے اگر تیری بستی میں اس کام کا کرنے والا کوئی دوسرا آ جائے تو اس سے خوش ہو اور خدا کا شکر بجا لا کہ اس نے ایک

آدمی تیرا بوجھ ہلکا کرنے کو بھیج دیا۔ اور اس کے آنے کے بعد تو اپنے شاگردوں اور مریدوں کو کہہ دے کہ اس سے جا کر مستفید ہوں۔ اس سے فیض حاصل کریں پھر تو اپنا کام اس کے حوالے کر کے اطمینان سے خدا کی یاد میں مشغول ہو۔ بشرطیکہ وہ دوسرا شخص صاحب کمال اور قابل اطمینان ہو اگر ناقص وغیر قابل اطمینان ہو تو ایسا نہ کرنا چاہئے۔ مگر اسکے ساتھ عداوت وحسد نہ کرنا چاہئے۔

بتلایئے ہمارے اندر ایسے کتنے افراد ہیں۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ ایک دوسرے سے جلتے ہیں۔ اگر بستی میں کوئی واعظ ہے تو دوسرے واعظ کے آنے سے جلتا ہے کوئی شیخ ہے تو دوسرے شیخ سے جلتا ہے اگر کسی جگہ مدرسہ ہے اور وہاں دوسرا مدرسہ قائم ہونے لگے تو پہلے مدرسہ والوں کو دوسرے سے حسد وعداوت ہو جاتی ہے پھر اس حالت کے ساتھ اخلاص کہاں؟ بس! ہم لوگ اسی وقت تک مخلص ہیں جب تک بستی میں اکیلے ہیں۔ ہمارے اخلاص کی قلعی اس وقت کھل جاتی ہے جب کوئی دوسرا کام کرنیوالا ہمارے جیسا بستی میں آجاتا ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ مولویوں نے شہرت اور اظہار شان وشوکت کے لئے یہ سالانہ جلسے نکالے ہیں جیسے اہل دولت نے مولد شریف اور محرم وشب برات کی رسمیں نکالی تھیں۔ الغرض! یہ سب حوصلے نکالنے کی باتیں ہیں۔

امور بدعت کی علامت

دیکھئے! جو امور بدعت ہیں وہ چندروز میں اپنی حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ چنانچہ مولد شریف اول تو محض ذکر رسول کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ پھر قیام کی قید بڑھی پھر اس میں تعین تاریخ و ماہ کا اضافہ ہوا۔ پھر مٹھائی تقسیم ہونے کی شاخ بڑھی پھر گانے والے خوش الحان تجویز ہوئے جن میں اکثر امارد ہوتے ہیں اور بعض بعض جگہ مرد وعورتیں سب شریک ہوتے ہیں۔ اب وہ مولود کیا ہوا اچھی خاصی بیاہ شادی کی تقریب ہوگئی۔ جس میں اتنا اہتمام ہوتا ہے کہ بعض دفعہ اس اہتمام میں نماز بھی قضا ہو جاتی ہے۔ اور جماعت تو بہتوں کی فوت ہو جاتی ہے۔

امور شرعیہ اصلیہ ہیں۔ ان میں حدود سے کبھی زیادتی نہیں ہوتی۔ دیکھئے! نماز، روزہ، تلاوت قرآن، تہجد اور اشراق یہ دین کے اصلی کام ہیں ان میں کبھی زیادتی نہیں ہوتی جس حالت پر تھے اسی حالت پر چلے آرہے ہیں۔

نیز امور بدعت کی یہ بھی علامت ہے کہ سخت پریشانی کے وقت میں حذف ہو جاتے ہیں اور جو دین کے اصلی کام ہیں وہ حذف نہیں ہوتے چنانچہ طاعون وہیضہ کے زمانہ میں تیجہ، دسواں، چالیسواں سب حذف ہو جاتا ہے اور نماز، جنازہ وکفن دفن نہیں ہوتا۔

اگر کسی سال ربیع الاول میں طاعون وہیضہ کا زور ہو جائے تو مجالس مولد بھی حذف ہو جائیں گے اور جو ہوں گی بھی تو محض ذکر رسولؐ ہوگا۔ مٹھائی اور حلوا اور گانا بجانا تو ضرور حذف ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ سب فرصت کی باتیں ہیں بس! یہی دلیل ہے ان کے زائد اور فضول ہونے کی۔

خیر! یہ تو لطیفہ تھا۔ میں دلائل سے بیان کر چکا ہوں کہ دلائل شرعیہ سے اظہار غم ممنوع ہے کیونکہ اس میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس سے غم کو ترقی ہوتی ہے اور ترقی غم سے اعمال شرعیہ اور معمولات راتبہ میں خلل پڑ جاتا ہے اور اس کا ضرر بہت سخت ہے۔ جس کو میں پہلے بتلا چکا ہوں۔

صابرین کو بشارت

حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے مسلمان غم سے پریشان نہ ہوں چنانچہ اسی لئے پیشگی اطلاع فرمادی کہ ہم کو طرح طرح کی تکالیف سے آزمائیں گے۔ تاکہ دفعۃً کلفت آنے سے پریشانی نہ ہو۔ پہلے سے اس کے لئے آمادہ رہیں پھر چونکہ لنبلونکم سے معلوم ہو گیا ہے کہ مصائب کا آنا بغرض امتحان ہے اور قاعدہ ہے کہ امتحان میں دو درجے ہوتے ہیں ایک فیل ہونے کا ایک پاس ہونے کا۔ تو آگے اس امتحان میں پاس ہونے کا طریقہ بتلاتے ہیں ارشاد ہے

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دو۔

اس جملہ سے معلوم ہو گیا کہ اس امتحان میں پاس ہونے والے صابرین ہیں اور پاس ہونے کا طریقہ صبر ہے کیونکہ بشارت انہی لوگوں کو دی جایا کرتی ہے جو امتحان میں پاس ہوں اور اس بطریق مفہوم یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ بے صبری فیل ہونے کا سبب ہے۔

پھر اس جگہ بشر میں بشارت کا اجمال ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضورؐ کو ارشاد ہو رہا ہے کہ بس آپ تو صابرین کو بشارت دے دیجئے تفصیل نہیں کی کہ کس چیز کی بشارت دے دیجئے اس میں اشارہ ہے کہ جو کچھ وہ چاہیں گے وہی ملے گا کیونکہ بشارت کہتے ہیں خوشخبری کو۔ اب اگر اس کی تفصیل کر دی جائے تو جن چیزوں کو بیان کیا جائے گا۔ انہی میں بشارت کا حصر ہو جائے گا۔ اور جب اجمالاً کہہ دیا گیا کہ صابرین کو خوش ہونے کی خبر دے دیجئے تو اس میں کسی چیز کی تخصیص نہیں بلکہ عموم ہے۔ جس سے تمام خوش ہونے کی باتوں کی طرف اشارہ ہو گیا کہ جس چیز سے بھی وہ خوش ہوں گے وہی ملے گی اور یہ کام حق تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں۔ کہ ہر شخص کی خواہش کو پورا کر دیں ورنہ انسان کو تو ایک بچہ ہرا سکتا ہے۔

چنانچہ ہمارے اس قصبہ میں ایک بچہ نے اپنے والدین کو ہرا دیا تھا اس نے رونا شروع کیا

اور ضد کرنے لگا کہ میں تو فلاں چیز لوں گا۔ والدین نے اس کا انتظام کر دیا پھر ضد کرنے لگا کہ میں تو وہ چیز کھاؤں گا وہ بھی لا کر رکھ دی پھر ضد کرنے لگا اور کوئی چیز مانگی وہ بھی لا کر دیدی جب ساری ضدیں پوری ہو گئیں تو کہنے لگا ہائے یہ چاند کیوں نکل رہا ہے اس کو چھپاؤ۔ بس یہاں والدین عاجز ہو گئے اور دو چار طمانچے مار کر اسے خاموش کیا۔

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک دفعہ اکبر نے بیربل سے کہا کہ یہ جو مشہور ہے کہ تین ہٹیں بہت سخت ہیں جن کا پورا کرنا مشکل ہے راج ہٹ، تریا ہٹ، بالک ہٹ، تو ان میں بادشاہ اور عورت کی ضد کا دشوار ہونا تو سمجھ میں آتا ہے کیونکہ وہ دونوں عاقل ہوتے ہیں ممکن ہے کسی وقت سوچ کر ایسی بات دشوار بات کہیں جو کسی سے پوری نہ ہو سکے مگر بچہ کی ہٹ کا پورا کرنا کیا مشکل ہے اس میں اتنی سمجھ کہاں جو سوچ سوچ کر دشوار باتیں نکالے اور دوسروں کو عاجز کر دے۔

بیربل نے کہاں حضور سب سے زیادہ مشکل بالک ہٹ ہی ہے جس کے پورا کرنے کے لئے بڑی عقل درکار ہے اکبر نے کہا یہ سمجھ میں نہیں آیا اس کا امتحان ہونا چاہئے بیربل نے کہا حضور پھر میں بچہ بنتا ہوں۔ آپ میری ضدیں پوری کیجئے کہا اچھا! چنانچہ بیربل بچوں کی طرح رونے لگا۔ اکبر نے پوچھا کیوں روتا ہے کہا ہم تو کلھیا لیں گے۔ اکبر نے فوراً ایک کلھیا منگا دی وہ پھر رونے لگا۔ پوچھا اب کیوں روتا ہے کہا ہم تو ہاتھی لیں گے۔ اکبر نے فیل خانے سے ایک ہاتھی منگا دیا۔ وہ پھر رونے لگا۔ کہا اب کیوں روتا ہے۔ کہا اس ہاتھی کو کلھیا میں رکھ دو۔ بس اکبر عاجز ہو گیا ہے کہا اچھا اب ہم بچے بنتے ہیں تم ہماری ضد پوری کرو۔ اس نے کہا بہت اچھا۔ اکبر کو اور کچھ تو سبق آتا نہ تھا۔ بیربل ہی کا پڑھایا ہوا سبق دہرایا دیا کہ ہم تو کلھیا لیں گے اس نے بازار سے مٹی کا ایک ذرا سا ہاتھی منگا دیا پھر کہا اس کو کلھیا میں رکھ دو اس نے اٹھا کر رکھ دیا۔ بس خاموش ہو گئے بیربل نے کہا حضور آپ نے یہ غلطی کی کہ بچہ کی فرمائش پر اتنا بڑا ہاتھی منگایا۔ آپ کو ہاتھی بھی بچے کے مناسب منگانا چاہئے تھا۔

میں کہتا ہوں کہ اکبر نے بیربل ہی کا سبق دہرا دیا تھا اس لئے بیربل نے اسے جلدی ہی پورا کر دیا۔ اگر وہ تھانہ بھون کے اس بچہ سے سبق لیتا۔ تو بیربل کے باپ سے بھی یہ ضد پوری نہ ہوتی کہ ہائے چاند کیوں نکل رہا ہے اسے چھپاؤ۔

غرض بشر کا عموم قدرت کے عموم پر دلالت کرتا ہے پھر اس میں بجائے نبشر (صیغہ متکلم کے) بشر امر اختیار کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ بشارت بواسطہ زیادہ موثر ہوتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ ہم سے خود

تکلم فرماتے تو غلبہ جلال و ہیبت ایسا ہوتا کہ اس غلبہ کے سامنے لذت بشارت حاصل نہ ہوتی اور جنت میں ہمارے قویٰ بڑھ جائیں گے۔ وہاں ہم کو اس ہیبت وجلال کا تحمل ہو جائے گا۔ تو تکلم بلاواسطہ مفید ہوگا۔

حقیقت حجابات

باقی دنیا میں تکلم بلا حجاب کا ہم کو تو کیا تحمل ہوتا۔ حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کو بھی تحمل نہ ہوا۔ ان سے بھی حجاب کے ساتھ کلام ہوا ہے اور ایک دفعہ بے حجاب ہونے کی تمنا کی تھی تو دیکھنے سے پہلے ہی غلبہ انوار سے بے ہوش ہو گئے بعض لوگ تَجَلّٰی رَبُّہٗ سے وقوع رویت سمجھ گئے ہیں یہ غلط ہے اور دھوکا ہے اس سے ہوا کہ اردو میں تجلی کے معنی رؤیت مشہور گئے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں تجلی کے معنی ظہور ہیں اور یہ فعل حق تعالیٰ کا ہے رویت موسےٰ علیہ السلام کے فعل رویت کا وقوع کیونکر لازم آیا ہے قرآن میں جو ان کا فعل مذکور ہے وہ وَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے ہے رویت کا کہیں ذکر کہ نہیں بلکہ اس سے پہلے لَنْ تَرٰنِیْ تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے مذکور ہے جو نفی مؤبد کو مفید ہے اور قابل نسخ نہیں (کیونکہ نفی موبد میں نسخ نہیں ہوا کرتا کما ثبت فی الاصول۔ لیکن یہ تائید محض دنیا کے اعتبار سے ہے کیونکہ آخرت میں وقوع رویت ہوگا) بعض لوگو ں کو اس سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ آیت میں تجلی کا ذکر پہلے اور خرور وصعق کا ذکر بعد میں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خرور کا سبب تجلی تھی۔ تو شبہ ہوتا ہے کہ تجلی مقدم اور خرور مؤخر تھا تو لازم آیا کہ موسےٰ علیہ السلام تجلی کے بعد بے ہوش ہوئے تجلی کے ساتھ بے ہوش نہیں ہوئے تو رویت پائی گئی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تجلی و خرور میں تقدم و تاخر ذاتی تھی اور زمانا مقانت تھی تقدم و تاخر ذاتی کے لئے زمانا تقدم و تاخر لازم نہیں جیسا کہ اہل علم اس کو جانتے ہیں پس تجلی کے سبب خرور ہونے سے دونوں کی مقارنت فی الزمان کی نفی نہیں ہوتی۔ خوب سمجھ لو۔

بہر حال دنیا میں انبیاء کو بھی بلا حجاب کے کلام الٰہی کا تحمل نہیں ہوا تو ہم کیا تحمل کر سکتے ہیں۔ مگر حجابات انبیاء و حجابات غیر انبیاء میں فرق ضرور ہے ان کے لئے کم حجاب ہیں کیونکہ ان میں دوسروں سے زیادہ تحمل ہے اور ہمارے لئے زیادہ حجابات ہیں کیونکہ ہمارے اندر تحمل کم ہے اس لئے بشارت بواسطہ کو اختیار فرمایا کیونکہ ہم لذت بشارت کو اس صورت سے ادراک کر سکتے ہیں۔ پھر حضور کو واسطہ مقرر کر کے بھی صیغہ بشرا اختیار فرمایا یہ نہیں کہا

وقل لهم انا نبشر هم ان سے کہہ دو ہم انہیں بشارت دیتے ہیں

یعنی واسطہ کے بعد بھی صیغہ تکلم نہیں فرمایا تا کہ لوگ بے فکری سے سن لیں کیونکہ قاعدہ ہے کہ اگر بادشاہ پس پردہ ہواور تکلم اپنی زبان پر کررہا ہو جہاں پناہ یوں فرماتے ہیں جب بھی جلال کا غلبہ ہوتا ہے گواس قدر نہ ہو جتنا تکلم بلا حجاب میں ہوتا اور اگر وہ پس پردہ بیٹھ کر وزیر سے یوں کہے کہ تم ان لوگوں سے یہ کہہ دوتو اس صورت میں جلال کم ہوتا ہے گواس وقت بھی وزیر کا کلام بادشاہ کا کلام ہی ہوگا۔ مگر چونکہ وہ اپنی زبان پر تکلم کررہا ہے۔ بادشاہ کی زبان پر تکلم نہیں کررہا اس لئے جلال کا اثر کم ہو جاتا ہے اسی طرح یہاں حق تعالیٰ نے حضور کا واسطہ رکھا ہے اور حضور بھی کون جن کی شان یہ ہے۔ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (کہ آپ ہمارے ہی میں سے رسول ہیں) کوئی اجنبی اور غیر شخص نہیں اور اپنے ہم جنس وہم قوم سے انس بھی زیادہ ہوتا ہے فیض بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس کو بھی ہمارے حال پر زیادہ شفقت ہوتی ہے تو ان وسائط کا اثر ایسا ہے جیسے گرمی کو لوخس کی ٹٹی کے اندر ٹھنڈی ہو کر آیا کرتی ہے تو یہ حجابات خس کی ٹٹی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو وہ حالت ہو جائے جو حدیث میں وارد ہے۔

لا حرقت سبحات وجهه ما انتهى اليه بصر (لم أجد الحيث فی "موسوعة أطراف الحديث)

''تو اس کے چہرے کے جلوے ہر اس چیز کو جلا دیں جہاں تک آنکھ پہنچے''

غرض! جملہ بشر الصابرین میں یہ بھی بتلا دیا کہ اس امتحان میں پاس ہونے والے کون ہیں اور یہ بھی بتلا دیا کہ پاس ہونے کا طریقہ کیا ہے پھر ساتھ ساتھ ان کو انعام ملنے کی بشارت بھی دیدی ہے اور عموم بشارت سے انعام وجزا کی عظمت اور اپنے عموم قدر کو بھی واضح کر دیا پھر صیغہ امر اختیار کر کے بشارت بواسطہ کا زیادہ مفید ومؤثر ہونا بھی بتلا دیا۔

(پھر چونکہ عادت یہ ہے کہ کسی علم وفن میں امتحان دینے والی جماعت کو اسی شخص کے ہاتھ سے انعام دلواتے ہیں جو اس فن میں کامل وممتاز ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صابرین کے لئے واسطہ بشارت بنا کر یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ آپ اکمل الصابرین ہیں اور تحمل مصائب میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ کما ورد فی الحدیث:

اوذيت فی الله مالم يؤذ احد (فتح الباری لابن حجر ۷:۱۶۶)

کہ مجھے اللہ کی راہ میں اس قدر ایذا دی گئی جتنی کسی اور کو نہیں دی گئی۔

اناللہ کی فضیلت

قرآن کے ایک ایک لفظ میں اتنی دلالتیں اور اس قدر رعائتیں اعجاز قرآن کی دلائل ہیں

آگے فرماتے ہیں اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ یہ جملہ یا تو صفت مادحہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ بشارت جن صابرین کے لئے ان کی یہ خاص مدح ہے یا صفت مقیدہ ہے کہ صابرین میں جن کی یہ شان ہے صرف انہی کے لئے بشارت ہے۔ بہرحال اس سے ہر مصیبت کے وقت انا للہ پڑھنے کی فضیلت ثابت ہوئی۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چراغ گل ہو جانے پر بھی انا للہ پڑھا کیونکہ یہ بھی ایک مصیبت ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ روشنی بھی نعمت ہے واقعی رات کو اندھیرے مکان میں جب چراغ روشن کیا جاتا ہے تو جان میں جان آتی ہے۔ اندھیرے گھر سے وحشت سی معلوم ہوتی ہے اس لئے آپ نے چراغ گل ہوئے انا للہ پڑھ کر روشنی کا نعمت عظمیٰ ہونا اور...... اندھیرے کا مصیبت ہونا ظاہر کر دیا۔

مگر آج کل انا للہ بہت بدنام ہو گیا ہے لوگوں نے اس کو مردوں کیلئے خاص کر لیا ہے۔

گنگوہ میں ایک لڑکا ہر بات پر انا للہ پڑھا کرتا تھا تو ایک بڑھیا نے کہا بچے خدا سے خیر مانگ۔ تو ہر بات پر انا للہ پڑھ کر کس کو مارے گا شاید بڑھیا کو اپنی ہی فکر ہوئی ہوگی کہ بس سب سے زیادہ میری عمر ہے کہیں انا للہ سن کر ملک الموت گھر میں نہ آ گھسیں اور مجھے سب سے زیادہ عمر والی دیکھ کر اپنے ساتھ لے جائیں۔ اسی طرح لاحول بھی بہت بدنام ہے۔

کانپور کا ایک قصہ ہے کسی نے دوسرے کو دور سے دیکھ کر سمجھا کہ یہ فلاں شخص ہے پاس پہنچا تو اور تھا۔ اس نے اپنی غلطی پر لاحول پڑھ دی وہ دوسرا شخص اس کے سر ہو گیا کہ تم نے مجھ کو شیطان کہا وہ ہر چند سمجھاتا ہے کہ میں نے تم پر لاحول نہیں پڑھی اپنی غلطی پر پڑھی ہے۔ مگر وہ کسی طرح مانتا ہی نہیں بہت مشکل سے پیچھا چھڑایا۔

سورۂ یٰسین بھی بہت بدنام ہے اس کو بھی لوگوں نے مردوں کے لئے خاص کر لیا ہے حالانکہ حدیث شریف میں اس کی بہت فضیلت آئی ہے اس سورۃ کو دم کرنے سے بڑے مہلک امراض میں شفا حاصل ہوتی ہے مگر میں جب کسی مریض پر یہ سورت دم کرتا ہوں تو آہستہ پڑھتا ہوں کہیں زور سے پڑھنے میں وہ بیمار یا اس کے گھر والے یہ نہ کہیں کہ مارنے کو آیا تھا۔

دہلی میں ایک دفعہ مومن خاں شاعر تراویح میں قرآن سنتے تھے ایک ڈوم بھی ان کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ وہ مومن خان سے چند روز کے بعد کہنے لگا کہ خان صاحب وہ سورت آوے جو مردوں پر پڑھی جاتی ہے تو مجھ سے ایک دن پہلے کہہ دینا تا کہ میں اس دن نہ آؤں۔ اس کے سننے

سے آدمی مر جاتا ہے۔ مومن خان نے وعدہ کرلیا چند روز کے بعد اس نے یہ بات پھر یاد دلائی تو مومن خان نے کہہ دیا کہ وہ سورت تو پڑھی بھی گئی مجھ کو کہنا یاد نہیں رہا۔ بس ڈوم یہ سن کر سہم ہی تو گیا کہ ہائے وہ سورت پڑھی گئی اور وہم کی وجہ سے اس کی روح تحلیل ہوگئی اور دو تین دن میں مر گیا یہ محض اس کے وہم کا اثر تھا۔ اس سورت کا اثر نہ تھا ورنہ آج کل لوگ کیوں نہیں مر جاتے۔

ایک شخص نے کسی گاؤں میں جا کر حافظ ہونے کا دعویٰ کیا حالانکہ وہ پورا حافظ نہ تھا کہیں کہیں سے سورتیں یاد تھیں۔ رمضان شریف میں آپ نے قرآن سنایا اور جتنا یاد تھا وہ چند روز میں سنا کر کہہ دیا کہ قرآن ختم ہو گیا، مٹھائی بانٹو مجھے نذرانہ دو۔ گاؤں والے اس کے جھوٹ یا سچ کو کیا سمجھتے۔ مگر ایک شخص کو ان میں سورۂ یٰسین یاد تھی اس نے کہا حافظ جی! آپ نے یہ کیسا ختم کیا سورۂ یٰسین تو پڑھی ہی نہیں تو وہ کیا کہتا ہے کہ بے وقوف تو زندوں پر یٰسین پڑھوانا چاہتا ہے۔ ابے وہ تو مردوں پر پڑھی جاتی ہے۔ اگر میں تراویح میں اسے پڑھ لیتا تو تم سب مر جاتے۔ گاؤں والے بہکانے میں آگئے اور الٹا معترض ہی کو دھمکانے لگے کہ تو ہمیں مارنا چاہتا ہے جو زندوں پر یٰسین پڑھواتا ہے۔

اسی جہالت کا یہ اثر ہے کہ لوگ سوائے مواقع موت کے اور کسی جگہ انا للہ پڑھنے سے رکتے ہیں حالانکہ (حدیث شریف میں آتا ہے جب انسان پر کوئی مصیبت آوے وہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ لے تو حق تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بناتے ہیں اور جب کبھی اس مصیبت کو یاد کر کے انا للہ پڑھے گا تو وہی ثواب ملے گا جو صدمہ اولیٰ کے وقت ملا تھا)

میں بتلا چکا ہوں کہ انا للہ کا مضمون ایسا ہے کہ اس کو مستحضر رکھنا غم کو بہت ہلکا کر دیتا ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

افسوس! لوگوں نے مرہم کو نشتر سمجھ لیا ہے۔ یہ محض جہالت ہے اس خیال کو دل سے نکال کر مصیبت کے موقع میں انا للہ پڑھنا چاہئے اور اسکے مضمون میں غور کرنا چاہئے۔ انشاء اللہ غم پاس بھی نہ رہے گا اور ہلکا تو ضرور ہو جائے گا۔ حق تعالیٰ نے یہ دوسرا سامان کیا ہے تخفیف حزن کا کہ رنج و غم کے موقع کیلئے ایسا مراقبہ ہم کو تعلیم کیا ہے جو غم کو ہلکا کرتا ہے تا کہ صبر آسان ہو جائے اور ہم مصیبت کے وقت صابرین میں داخل ہو کر امتحان میں پاس ہو جائیں اور صابرین کیلئے جس انعام کی بشارت ہے اسکے مستحق ہو جائیں۔

صبر کی حقیقت

اب صبر کی حقیقت سنئے تا کہ وہ غلطی رفع ہو جائے جس میں عام طور پر لوگ مبتلا ہیں کیونکہ

تمہید میں معلوم ہو چکا ہے کہ لوگ صرف جزع فزع نہ کرنے کو صبر سمجھتے ہیں اور مداومت اعمال کو صبر میں داخل نہیں سمجھتے ان کے نزدیک بے صبری فقط جزع وفزع کا نام ہے۔ حالانکہ مصیبت کے وقت اعمال میں کوتاہی اور کمی کر دینا بھی بے صبری میں داخل ہے اور اس کا انجام جزع وفزع سے بھی اشد ہے اس کے لئے اول صبر کے معنی سمجھنے چاہئیں۔

تو صبر کہتے ہیں لغت میں حبس کو یعنی رکنے کو۔ اور اصطلاح شرع میں صبر کے معنی حبس النفس ہیں یعنی نفس کو روکنا۔ عربی میں صبر کا استعمال...... مختلف صلات سے ہوتا ہے۔ اور صلات سے لفظ کے اصل معنی کا پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ ایک لفظ کا استعمال مختلف صلات سے ہوتا ہے تو لوگوں کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا اصلی صلہ کون سا ہے اور عارضی صلہ کونسا ہے۔ اسلئے حقیقت میں خلط واقع ہو جاتا ہے۔

لفظ صبر کی حقیقت بھی بعض لوگوں پر اسی لئے مخفی ہوگئی کہ وہ اس کا استعمال مختلف صلات سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ کبھی لام کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے[۱] ایک شاعر کا قول ہے۔ اصبر لکل مصیبة وتجلد۔ کہیں صلہ فی سے آتا ہے جیسے وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ (اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہیں تنگ دستی میں اور بیماری میں) کہیں عن سے آتا ہے۔ جیسے حدیث شریف میں ایک منافق کا قول آتا ہے جو غزوۂ تبوک میں اس نے کہا تھا انی امرأ لا اصبر عن النساء (میں عورتوں سے صبر نہیں کرسکتا) کہیں علی سے آتا ہے جیسے وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ کہیں سے باء ساء آتا ہے جیسے وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ (اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خاص خدا ہی کی توفیق سے ہوا) کہیں مع سے آتا ہے جیسے وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو صبح وشام اپنے رب کی عبادت محض اسکی رضا جوئی کیلئے کرتے ہیں) یہ تو وہ حروف ہیں جو بطور صلہ کے لفظ صبر کے ساتھ مستعمل ہوتے ہیں۔

بعض حروف ایسے بھی ہیں جو اس کے ساتھ مستعمل ہیں مگر ان کو صلہ صبر نہیں کہا جا سکتا جیسے فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (اور صبر کیجئے جیسے اولالعزم رسولوں نے صبر کیا) اور واصبر حتی یاتی اللہ بامرہ۔ (اور صبر کیجئے یہاں تک کہ اللہ کا حکم آپ تک پہنچے) کیونکہ کاف اور حتی ہر فعل کے بعد مستعمل ہو سکتے ہیں جن سے مقصود تشبیہ اور بیان غایت ہوتا ہے اور تشبیہ اور غایت ہر فعل

---

[۱] اس تقریر سے حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا تبحر عربیت میں اور وسعت نظر طرق کلام میں اور مذاق صحیح فہم حقائق الفاظ میں بخوبی واضح ہے میں نے بہت غور کیا کہ صبر کا کوئی صلہ ان صلات مذکورہ کے سوا اور بھی ہے مگر نہیں ملا۔ ۱۲ جامع۔

کیلیے ہوسکتی ہے۔اس لئے ان کا استعمال بطور صلہ کے نہیں۔ بلکہ صلات وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔
مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلی صلہ عن وعلی ہیں۔ باقی صلات باعتبار خصوصیات مقام کے ظروف ہیں اور وجہ عن وعلی میں حصر کی یہ ہے کہ صبر کا مدخول یا مامور بہ ہے یا منہی عنہ ہے۔ کیونکہ صبر کے معنی حبس کے ہیں۔ پس کبھی کسی بات کے اوپر حبس ہوتا ہے کبھی کسی بات سے حبس ہوتا ہے جس بات کے اوپر روکا جائے وہ مامور بہ ہے اور جس بات سے روکا جائے وہ منہی عنہ ہے۔ حبس کے یہی دو محل اصلی ہیں۔ اس کے سوا اور کوئی حالت اصلی نہیں بس جہاں صبر کا استعمال بدوں علی وعن کے معلوم ہوتا ہے وہاں یہ اصلی صلہ مقدر ہوگا۔

مثلاً وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ (اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہیں تنگ دستی میں اور بیماری میں) کی اصلی تقدیر یہ ہے الصبرین علی احکام اللہ والمحترزین عن معاصیۃ فی الباساء والضراء اور وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ کی اصل یہ ہے واصبر علی حکم اللہ حال کونک جالسا مع الذین یدعون ربھم. الخ. اور وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ کی اصل یوں تھی واصبر علی امر اللہ وما صبرک علیہ قائما بشیء الا باللہ اسی طرح ہر جگہ غور کر لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ جہاں یہ لفظ عن وعلی کے بغیر استعمال ہوا ہے وہاں اصلی صلہ مقدر ہے اور جو حرف جر مذکور ہے وہ صبر کا صلہ نہیں۔ بلکہ کسی فعل محذوف کا صلہ ہے اور زیادت تعمق سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کا اصلی صلہ صرف ایک ہی ہے یعنی علی اور عن بھی اصلی نہیں بلکہ عارضی ہے۔

اجر وثواب

وجہ اس کی یہ ہے کہ صبر فی نفسہ مامور بہ ہے اور مامور بہ میں اصل افعال وجودیہ ہیں نہ کہ متروک۔ پس صبر کا مدخول اصلی فعل مامور بہ ہی ہونا چاہئے اور اس کے مناسب صلہ حروف علی ہی ہے نہ کہ عن۔ اور جہاں صبر کا صلہ عن آیا ہے وہاں گو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدخول صبر منہی عنہ ہے۔ مگر تامل کے بعد معلوم ہوتا کہ وہاں بھی ایک نہ ایک مامور بہ ضرور ہوتا ہے کیونکہ متروک کی دو قسمیں ہیں ایک ترک عدمی ایک ترک وجودی اور یقیناً تروک عدمیہ متعلق صبر نہیں ہوسکتے کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ صبر مامور بہ ہے اور اس میں اجر ثواب کی بشارت دی گئی ہے پس لازم ہے کہ اس کا مدخول ایسی شے ہو جس پر ثواب مل سکے اور تروک عدمیہ پر اجر نہیں ہے ورنہ چاہئے کہ قیامت میں ہر شخص مسلم کے حسنات غالب اور سیئات مغلوب ہوں کیونکہ ہر وقت میں انسان کرتا ایک کام کو ہے اور ہزاروں گناہوں کو ترک کرتا ہے۔

مثلا ایک شخص کھانا کھارہا ہے۔ اس وقت وہ زنا اور غیبت اور چوری ڈاکہ ظلم وغیرہ سے بچا ہوا ہے۔ پانی پیتا ہے تو اس وقت بھی وہ ہزاروں گناہوں کو ترک کئے ہوئے ہے۔ سوتا ہے تو اس وقت بھی وہ دنیا بھر کے فضول اور لغو کاموں سے الگ ہے۔

یا فرض کرلو کہ ایک شخص کسی گناہ کا مرتکب ہے تو وہ اس وقت ایک گناہ کے سوا باقی تمام گناہوں سے بچا ہوا ہے تو چاہئے کہ ہر گناہ کے ساتھ اس کے نامہ اعمال میں ہزاروں نیکیاں بھی لکھی جائیں اور اس صورت میں حسنات کا سیئات پر غالب ہونا لازم ہے تو ایسا کوئی شخص نہ نکلے گا جس کے سیئات غالب ہوں حالانکہ یہ نصوص قرآنیہ کے خلاف ہے۔ پس ثابت ہوا کہ تروک عدمیہ پر کوئی اجر نہیں۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ اس صورت میں ترک غیر اختیاری ہے نہ کہ اختیاری اور ثواب امور اختیاریہ پر ملتا ہے نہ کہ غیر اختیاریہ پر (قانون یہی ہے گو حق تعالیٰ کسی کے ساتھ اپنے فضل سے اس کے خلاف بھی معاملہ کرسکتے ہیں۔ مگر اس سے قاعدہ پر نقص وارد نہیں ہوسکتا۔)

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب میں کہتا ہوں جہاں صبر کا صلہ عن ہوتا ہے وہاں متعلق صبر ترک وجودی ہوگا نہ کہ ترک عدمی اور ترک وجودی بھی مامور بہ کی ایک فرد ہے۔ پس گو بعض جگہ مدخول صبر منہی عنہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں وہ بھی مامور بہ ہے مثلا اس منافق کے قول میں جو لا اصبر عن النساء وارد ہے اس کی اصل یہ ہے کہ لااصبر علی کف النظر عن النساء اس جگہ مدخول صبر کف النظر ہے جو ترک وجودی ہے اور یہ حقیقت میں مامور بہ ہے چنانچہ ارشاد ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ اس میں غض بصر کا امر ہے اور یہی کف النظر ہے پس کف النظر کا مامور بہ ہونا ثابت ہوگیا۔ لہذا یہ بات محقق ہوگئی کہ صبر کا اصلی صلہ علی ہے عن بھی اصلی صلہ نہیں۔ بلکہ یہ بھی خصوصیت مقام کے لحاظ سے بطور ظرف کے آتا ہے جب صبر کا اصلی صلہ متعین ہوگیا ہے تو معلوم ہوا کہ مافیہ الصبر جسے محل صبر بھی کہتے ہیں اور ماعلیہ الصبر اور عنہ الصبر ایک ہی چیز ہے یعنی عمل۔

اب اس کی حقیقت بھی واضح ہوگئی اور ثابت ہوگیا کہ صبر کے معنی حبس النفس علی الاعمال ہیں یا حبس النفس علی احکام اللہ ہیں یعنی نفس کو اعمال، طاعات واحکام الٰہی پر جمانا اور روکے رکھنا اس میں سب اعمال آگئے جن میں تروک وجودیہ بھی آگئے۔ پس حقیقت صبر استقامت علی الاعمال ہے اور اس میں ترک منہیات بھی داخل ہے لہذا ابشر الصابرین کا حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ مصائب میں اعمال طاعات پر جمے رہتے ہیں۔ ان کے لئے بشارت ہے۔

صبر کے معنیٰ

صبر کے معنیٰ صرف یہ نہیں ہیں کہ مصائب میں جزع فزع کو ترک کر دے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ناگوار واقعات میں بھی اپنے معمولات پر مستقل رہے اور منہیات سے بچا رہے پس یہ کتنی بڑی غلطی تھی کہ لوگوں نے صبر کے مفہوم اصلی کو تو اس کی حقیقت سے خارج کر دیا اور اس کی ایک فرد یعنی جزع وفزع نہ کرنے میں اس کو منحصر کر دیا۔ حالانکہ جس طرح مصیبت کا یہ حق ہے کہ اس وقت جزع وفزع نہ کرے یہ بھی ایک بڑا حق ہے کہ اعمال میں تقلیل اور اختلاط نہ ہونے پائے۔ بدوں اس کے حقیقت صبر کا وجود نہیں ہوسکتا۔ اور جو شخص ایسے وقت میں اعمال میں کوتاہی کرنے لگے وہ صابر کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا مصائب میں اہتمام اعمال کی سخت ضرورت ہے لیکن اکثر لوگوں کو اس کی بالکل پرواہ نہیں۔ بس جہاں کوئی ناگوار بات پیش آئے۔ اب ذکر بھی ناغہ ہے اور تہجد بھی رخصت ہے۔ تلاوت قرآن بھی ندارد ہے اور جماعت کا اہتمام بھی فوت ہے۔ اس وقت انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس مصیبت کے بعد معمولات کی پابندی شروع کروں گا۔ مگر یہ اس کی غلطی ہے کیونکہ ممکن ہے کہ اس کے بعد دوسری مصیبت آجائے۔ پھر یہ کہو گے کہ اس کے بعد پابندی کروں گا ممکن ہے اس کے بعد بھی کوئی حادثہ ہو جائے تو تم اسی امروز وفردا میں رہو گے اور عمر بھر پابندی نصیب نہ ہوگی۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں

گر گریزی بر امید راحتے　　　ہم آبجا پیشت آید آفتے

(اگر کسی راحت یا آرام کی جگہ پر بھاگتا ہے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی)

صاحب! اس طرح تو عمر گزر جائے گی اور آپ کو فراغ کا وقت نہ ملے گا، بس اگر پابندی چاہتے ہو تو ہمت کر کے مصیبت ہی میں کام شروع کر دو۔ کام کا خاصہ ہے کہ وہ خود بخود فراغ پیدا کر دیتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

ہیچ کنجے بیدود و بے دام نیست　　　جز بخلوت گاہ حق آرام

"کوئی گوشہ دام ودد سے خالی نہیں خلوت گاہ حق کے سوا کہیں آرام نہیں ہے"

انسان چاہتا ہے کہ ذکر اللہ اور اعمال طاعات سے پہلے فراغ اور راحت قلب حاصل ہو جائے تو پھر ان میں مشغول ہوں مولانا فرماتے ہیں کہ فراغ و راحت اس کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتا پس جس چیز کے تم منتظر ہو اس کا ذریعہ وہی ہے جس کو تم چھوڑے ہوئے ہو اور اس کے بغیر تمہارا فراغ اور راحت کو طلب کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص ناپاکی کی حالت میں یوں کہے کہ دریا

میں اس حال سے کیونکر جاؤں میں تو ناپاک اور وہ صاف وشفاف اور پاک مجھے پاک ہوکر دریا میں جانا چاہئے تو دریا اس سے یہ کہے گا کہ مجھ سے دور رہ کر تو پاک ہو ہی نہیں سکتا۔ پاک ہونے کی تو یہی صورت ہے کہ تو اسی حال سے میرے اندر چلا آ۔ اسی طرح ہمارا یہ خیال خام ہے کہ غم سے خالی ہوکر ذکر وطاعات میں مشغول ہوں گے۔ صاحب غم سے خالی ہونے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ آپ اسی حالت میں کام شروع کردیں۔ وہ خود سارے غموں کو دور کردے گا۔

واللہ مصیبت کے وقت ذکر وطاعات ہی سے غم ہلکا ہوتا ہے اور ان میں کمی کر کے اور زیادہ پریشانی بڑھتی ہے آج کل میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں پر مصائب کا نزول ہو رہا ہے اور نہ معلوم یہ کب تک زائل ہوں گے۔

ذاتی اصلاح کا طریقہ

آج کل لوگوں کو اس کی وجہ سے تشویش ہے اور زیادہ وقت اسی قسم کی باتوں میں صرف ہوتا ہے۔ معمولات کی پابندی بالکل فوت ہوگئی ہے جو لوگ اس قسم کی باتوں میں مشغول ہیں انہوں نے تو معمولات سابقہ کو بالائے طاق ہی رکھ دیا ہے۔ مگر جو لوگ فضول باتوں سے الگ بھی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ بھی تشویش سے خالی نہیں ہیں ان کے معمولات میں بھی خلل واقع ہو رہا ہے اور جو ہمت کر کے معمولات کی پابندی پر جمے ہوئے بھی ہیں ان کا بھی بعض دفعہ پریشانی کی وجہ سے کام میں دل نہیں لگتا۔ مجھے خود اپنے اندر یہ بات محسوس ہوتی ہے اور میں نے تجربہ کیا ہے کہ جب مجھے کسی بات پر عمل دشوار ہوتا ہے تو میں اسی کے متعلق بیان کر دیتا ہوں۔ اس سے مجھے عمل میں سہولت ہو جاتی ہے۔

اس لئے یہ مضمون میں نے اپنی اصلاح کی غرض سے بھی اختیار کیا ہے اور یہ بھی مقصود ہے کہ اگر کسی اور کو یہ بات پیش آرہی ہو تو وہ بھی اپنی اصلاح کر لے اور سامعین میرے واسطے بھی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے مصائب میں ایسا استقلال عطا فرمائیں کہ تشویش سے معمولات فوت نہ ہوں اور ہمیشہ کی طرح دلجمعی سے پورے ہوتے رہیں اور یہ بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کے اوپر سے ان مصائب کو دور فرمائیں اور جس حکمت کے لئے یہ بھیجے گئے ہیں اس کا اثر ہمارے اندر ظاہر ہو۔ کیونکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ناگوار واقعات میں حکمت ہوتی ہے۔ جس سے مبتلا کو سبق لینا چاہئے۔ یہ بڑی غلطی ہے کہ حکمت کو چھوڑ کر واقعہ ہی کو سبق بنالیا جائے جیسا کہ ہم لوگوں نے کر رکھا ہے۔ کہ بس رات دن اسی کی تذکرہ میں رہتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ مصیبت ہم پر کیوں

نازل ہوئی ہے اگر ہماری حالت میں کوئی نقص ہو تو اس کی تلافی کر کے حالت کو درست کرنا چاہئے تا کہ پر حق تعالیٰ کا فضل و کرم متوجہ ہو اور یہ تازیانہ عبرت ختم ہو مگر افسوس! ناگوار واقعات سے سبق لینے کی ہم کو عادت نہیں۔ بس یہ سبق سیکھ رکھا ہے کہ مصیبت کو مشغلہ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ طاعون و ہیضہ کے زمانہ میں بعض لوگوں کو اسی کا شغل ہو جاتا ہے کہ آج اتنے مرے کل اتنے مرے۔

اصلاح اعمال پر بہت کم توجہ ہوتی ہے۔ یہی طریقہ ہم نے آج کل اختیار کر رکھا ہے کہ سوائے اخباری باتوں کے اور کچھ شغل ہی نہیں رہا۔ جہاں بیٹھتے ہیں بس یہی باتیں ہیں اور اسی کا تذکرہ۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ رفع مصیبت کی تدبیر نہ کریں۔ نہیں جس طرح طاعون و ہیضہ کے لئے حفظ ماتقدم کا اہتمام جائز ہے اور بیماری کی دوا دارو مسنون ہے اسی طرح ہر مصیبت کی تدبیر جائز ہے۔ اگر کچھ تدبیر کرنی ہو شوق سے کرو۔ مگر کیا وہ باتیں جو ہم رات دن کرتے ہیں یہ بھی تدبیر میں داخل ہرگز نہیں بلکہ ان سے بجز مشغلہ کے اور کچھ مقصود نہیں۔ آج کل جو ہر مجلس میں باتیں ہوتی ہیں وہ تدبیر کی باتیں نہیں محض دل بہلانے کا مشغلہ ہے لوگوں کو اس میں مزہ آتا ہے کہ ادھر ادھر کی نئی باتیں کی جائیں

چنانچہ آج کل یہ تازہ واقعہ ہندو مسلمان کے فساد کا ظاہر ہوا ہے لوگوں نے اسی کی باتوں کو مجلس آرائی کا ذریعہ بنالیا۔ میں تدبیر کو منع نہیں کرتا۔ تدبیر کریں مگر کون وہ لوگ۔ جو اہل تدبیر ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ عامی نتھو خیرا مدبر نہیں ہو سکتا تدبیر کرنے والے خاص لوگ۔ ہوتے ہیں نہ کہ ہر شخص۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ یہ باتیں تدبیر کے لئے ہوتی ہیں۔

اگر تدبیر کرنی ہو اس کی دو صورتیں ہیں ایک باطنی ایک ظاہری۔ باطنی تدبیر تو یہ ہے کہ اس وقت مصیبت کے حقوق شرعی کو ادا کرنا چاہئے۔ شریعت نے مصیت کے وقت صبر کی تعلیم کی ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ اعمال طاعات پر استقلال و پابندی ہو اور جزع و فزع و اظہار غم سے احتراز ہو۔ جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے اور میں بتلا چکا ہوں۔ کہ غم زائل ہونے میں ذکر اللہ و اعمال طاعات کو بڑا دخل ہے۔ مگر افسوس! آج کل اس طرف کسی کو بھی توجہ نہیں۔ ان واقعات میں اعمال کا تو خون ہی ہوتا ہے اور جزع فزع و اظہار غم بھی بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔

چنانچہ پہلی تحریکات میں شریعت سے بہت تجاوز کیا گیا۔ کفریات و معاصی میں بہت لوگ مبتلا ہوئے۔ اور صاف کہا جاتا تھا کہ یہ وقت مسائل کی بحث کا نہیں کام ہونا چاہئے۔

افسوس! وہ اسلامی کام ہی کیا ہو! جس میں خدا تعالیٰ کو ناراض کیا گیا۔ اس کے علاوہ سڑکوں اور

گلیوں میں اسلام کا نوحہ اشعار میں پڑھا جاتا تھا یہ بالکل وہی طریقہ ہے جو محرم میں شہادت نامہ والوں نے اختیار کر رکھا ہے آج کل وعظوں اور تقریروں میں بھی یہی سبق رہ گیا ہے کہ دلخراش الفاظ میں اسلام اور مسلمانوں کے ضعف کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مصائب میں مسلمانوں کو استقلال وثبات کے ساتھ رہنا چاہئے کسی طریقہ سے اظہار غم کر کے اپنی کمزور کو طشت ازبام نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے غیر اقوام کے حوصلے بلند ہوتے ہیں اور مسلمان ان کی نظروں میں گر جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ نتائج بد اس حرکت کے اب ظاہر ہو رہے ہیں۔ مگر افسوس اس مفسدہ پر کسی کی بھی نظر نہیں۔

پس سب سے پہلا کام اس وقت ہمارے ذمہ یہ ہے کہ معمولات سابقہ میں کمی کر کے اور اعمال میں حدود شریعت سے تجاوز کر کے کبھی مصیبت زائل نہیں ہوسکتی چاہے تم کتنی تدبیر کرو۔ اس حالت سے غم کو ترقی اور پریشانی میں زیادتی ہوگی۔

دوسری صورت تدبیر ظاہری کی ہے اس کی آسان اور سہل صورت یہ ہے کہ کسی کو اپنا بڑا بنالو اور بڑا ایسے شخص کو بناؤ جس کی ذہانت اور تقویٰ پر پورا اعتماد ہو کہ یہ کسی مصیبت یا پریشانی میں شریعت سے تجاوز نہ کرے گا۔ نیز اس کی عقل وتدبیر پر بھی اعتماد ہو۔ ایسے شخص کو بڑا بنا کر اس سے پریشانی ظاہر کر دو اور بے فکر ہو جاؤ پھر وہ جو کچھ بتلاوے اس کے موافق عمل کرو تم تدبیریں نہ کرو وہ خود تدبیر کرے گا۔ تم اپنے دینی اور دنیوی کام میں بے فکری سے لگے رہو اور سارا بوجھ اس کے اوپر ڈال دو اور چونکہ وہ خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتا ہے اور خدا تعالیٰ نے اسکو عقل وتدبیر بھی کامل دی ہے۔ وہ اس بوجھ سے گھبرائے گا نہیں بلکہ اپنے متبعین سے یوں کہے گا

من غم تو می خورم تو غم مخور   برتو من مشفق ترم از صد پدر

"میں تمہارا غم کھاتا ہوں تم غم مت کھاؤ اور میں تم تم پر باپ سے زیادہ مشفق ہوں۔"

اس صورت میں مسلمانوں کا نہ کوئی دینی کام بند ہوگا نہ دنیوی۔ سب کام اپنے قاعدہ سے چلتے رہے ہیں۔ اور اگر کوئی بات حکام وقت سے کہنے کی ہو تو اپنے بڑوں سے مشورہ کر کے حکام کو اطلاع کر دو۔ اب جو کام ان کے کرنے کا ہے وہ خود کریں۔ اگر پھر بھی تم پر کوئی ناگہانی آفت آجاوے تو وقت پر صبر کرو اور اگر کوئی ہنگامہ ہو جاوے تو تم کو لازم ہے کہ خود ظلم نہ کرو اور اپنی حفاظت کرو اس صورت میں غالب تو یہ ہے کہ دوسرا ابھی ظلم سے باز آجائے گا۔ اور اگر وہ ظلم ہی کرے تو تم شہید ہو جاؤ گے اس میں بھی مسلمان کا نفع ہے۔

شہادت وہ چیز ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے لئے ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے۔

اللھم ار زقنی شھادۃً فی سبیلک واجعل موتی ببلد رسولک

''اے اللہ! مجھے اپنی راہ میں شہادت نصیب فرمایا اور میری موت اپنے رسول کے شہر میں مقرر فرما۔''

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تمنا کیا کرتے تھے۔

وددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احي ثم اقتل ثم احي ثم اقتل ثم احي ثم اقتل

(تاریخ بغداد للخطیب ۴:۷)

(میں اوپر تفصیل کے ساتھ اس کی فضیلتیں کسی قدر بیان کر چکا ہوں مگر اتنی بات پھر کہے دیتا ہوں کہ جان دینا اسی وقت شہادت ہے جب شریعت کے موافق ہو ورنہ خودکشی ہے۔)

اسباب تنزل

تو ظاہری تدبیر کی یہ صورت ہے۔ مگر افسوس! آج کل ہر مسلمان متفکر نظر آتا ہے یہ خودرائی کا نتیجہ ہے ان کے سر پر کوئی بڑا نہیں۔ ہے نہ کسی کو بڑا بناتے ہیں اس لئے ہر کس خود تدبیر کرنا چاہتا ہے اور ایرا غیرا نتھو خیرا تدبیر کے اہل نہیں تو پریشانی ہی پریشانی بڑھتی ہے۔ ہمارے اندر اتفاق و اتحاد نہیں۔ اس لئے ہمارا کوئی مرکز نہیں اور بدوں کسی مرکز کے کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ پہلی تحریکات میں[۱] ہم کو شرکت کے لئے کہا جاتا تھا۔ ہم نے کہا شرکت کے لئے کہا جاتا ہے۔ ہم نے کہا شرکت کیلئے کچھ شرائط ہیں جن میں سے ایک شرط یہ ہے کہ کوئی بڑا اور سردار ہو اور وہ اس شان کا ہو کہ اگر کوئی اس کے حکم کی مخالفت کرنا چاہے تو قوت سے اس کو دبا سکے اور اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ بدوں اتفاق و اتحاد باہمی کے کوئی کام نہیں چل سکتا۔ اور جس طرح کسی کام کے لئے حدوث اتحاد کی ضرورت ہے بقاء اتحاد کی بھی ضرورت ہے اور بقاء اتحاد بدوں کسی سردار کے نہیں ہوسکتا۔

ایک شخص ایسا بھی تو ہونا چاہئے جو اپنی قوت وشوکت سے اس اتحاد کو قائم رکھ سکے۔ بس وہ قہری وحدت ہو ورنہ ارادی وحدت کیا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ان تحریکات میں آپ نے جن لوگوں کو بھائی بنایا تھا۔ انہوں نے دشمنی کا برتاؤ شروع کر دیا وہ...... ارادی اتحاد تھا۔ جب انہوں نے چاہا زائل کر دیا۔

تو یہ اتحاد جو بدوں کسی سردار کے ہو، لڑکوں کی یاری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لڑکے آپ

---

[۱] مراد تحریکات خلافت ہیں۔ اس کے بعد دوسری تحریکات انسداد فتنہ ارتداد کی پیدا ہوئیں جو اس دعظ کے وقت ابتدائی حالت میں تھیں۔ (۱۲ جامع)

میں دوستی کرتے ہیں اور ذرا سی بات پر کہہ دیتے ہیں کہ جاؤ آج سے یاری کٹ کر دی۔ یہ تو نئے بھائیوں کا حال ہوا اور جو پہلے سے قدیم بھائی تھے یعنی مسلمان، ان کو اصحاب تحریکات نے فاسق اور ڈرپوک بنا کر ان سے بائیکاٹ کر کے خود ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ بائیکاٹ نہیں بلکہ بھائی کاٹ ہے کیونکہ اس کی زیادہ تر مسلمانوں ہی پر مشق کی گئی ہے تو اب ان کے ہاتھ سے دونوں جاتے رہے وہی قصہ ہو گیا کہ جہانگیر نے نور جہاں کو بچپن میں شادی سے پہلے ایک موقعہ پر دو کبوتر دیئے تھے کہ ان کو اپنے ہاتھ میں لئے رہ۔ میں آ بھی آتا ہوں۔ اس کے ہاتھ سے ایک کبوتر نکل گیا۔ جہانگیر نے جو واپس آ کر ایک ہی کبوتر دیکھا۔ پوچھا دوسرا کہاں گیا۔ نور جہاں نے کہا جہاں پناہ اڑ گیا۔ جہانگیر نے غصہ سے کہا کیسے اڑ گیا۔ نور جہاں نے دوسرا بھی چھوڑ دیا اور کہا جہاں پناہ! ایسے اڑ گیا۔ اس ادا پر جہانگیر فریفتہ ہو گئے اور زبان حال سے یہ کہنے لگے۔

درون سینہ من زخم بے نشاں زدہ — بحیرتم چہ عجب تیر بے کماں زدہ

"میرے سینہ کے اندر بے نشان زخم تو نے لگایا۔ میں حیران ہوں کہ بے کماں کا تیر کس نے مارا۔"

اور آخر کار نور جہاں سے نکاح کر لیا۔

واقعی دل کے آنے کا بھی کوئی قاعدہ نہیں بعض دفعہ ذرا سی بات پر دل آ جاتا ہے تو جس طرح ایک کبوتر تو اتفاقاً اڑ گیا تھا ایک کو نور جہاں نے خود چھوڑ دیا اسی طرح ہمارے بھائیوں کو ہندوؤں نے تو اتفاق کر کے چھوڑا اور انہوں نے اپنے قدیم بھائیوں کو نفاق کر کے انہیں خود چھوڑ دیا۔ اب دونوں ہاتھ خالی رہ گئے (دایاں بھی اور بایاں بھی کیونکہ قدیم بھائی **اصحٰب الیمین** تھے۔ اور جدید بھائی **اصحٰب الشمال**)

افسوس! مسلمان مصائب کے وقت سیاست دوسری قوموں کی دست نگری کرتے ہیں حالانکہ سیاست میں بھی شریعت کے مکمل احکام ان کے پاس موجود ہیں اور اسلامی سیاست تو وہ چیز ہے جس سے دنیا بھر کے سیاست دان سبق لیتے ہیں۔ مگر مسلمان ہیں کہ دوسروں کے محتاج ہیں بس وہ حال ہے

یک سبد پر ناں ترا بر فرق سر — تو ہمی جوئی لب ناں در بدر

"روٹی کی بھری ہوئی ٹوکری تو سر پر ہے اور تم روٹی کا ٹکڑا در بدر ڈھونڈ رہے ہو۔" اور یہ حال ہے

تا بزانوئے میاں قعر آب — وز عطش وز جوع گشتستی خراب

"پانی کے اندر گھٹنے گھٹنے تک چل رہے ہو اور پیاس سے اور بھوک سے خراب ہو رہے ہو۔"

یعنی جیسے ایک شخص کے سر پر روٹیوں سے بھرا ہوا ٹوکرا رکھا ہو۔ اور وہ بھوک کی حالت میں اس

سے بے خبر ہوکر ہائے بھوک ہائے بھوک کہتا پھرے یا ایک شخص گھٹنوں تک پانی میں کھڑا ہوا اور ہائے پیاس ہائے پیاس گاتا پھرے یہی حال آج کل مسلمانوں کا ہے۔ یہ اپنے گھر کے جواہرات سے بے خبر ہیں اور دوسروں کی کوڑیوں کے محتاج ہیں۔ مسلمانوں نے بڑی غلطی کی کہ ان تحریکات میں شریعت کی تعلیم کو بالکل چھوڑ دیا۔ واللہ! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم شریعت کو اختیار کرلو تو تشویش تمہارے پاس بھی نہ ہوگی۔ گو تشویشناک واقعات کیسے ہی پیش آئیں کیونکہ متبع شریعت کا مذاق یہ ہوتا ہے۔

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے | چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگاہے

"یہ شہر خوبرویوں سے بھرا ہوا ہے لیکن میں اپنے چاند کے خیال میں محو ہوں کیا کروں بدخو آنکھ کسی دوسرے پر نگاہ ہی نہیں ڈالتی۔"

اسکی نظر ہر واقعہ میں ہر حالت میں حق تعالیٰ پر ہوتی ہے۔ اسکے سوا کسی پر نظر نہیں ہوتی وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے محبوب کی طرف سے ہو رہا ہے پھر تشویش کیسی بس اسکو تو فکر ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ راضی رہیں۔ پھر دنیا میں جو چاہے ہوتا رہے۔ چاند سورج بھی نکلیں یا نہ نکلیں اسے اسکی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس کا مذاق تو یہ ہوتا ہے

مصلحت دید من آں است کہ یاراں ہمہ کار | بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

"میری دیکھنے کی مصلحت تو یہ ہے کہ دوست سب کام چھوڑ کر صرف دوست کی زلفوں کی یاد میں محو ہو جائیں۔ اور وہ یوں کہتا ہے

بفراغ دل زمانے نظرے بما روئے | بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

"دل کی فراغت کے ساتھ ایک لحظہ کسی ماہرو کو دیکھ لینا اس سے اچھا ہے کہ سر پر چتر شاہی رکھ کر سارا دن ہاؤ ہو کرتا پھرے۔" خاقانی اسی کو فرماتے ہیں۔

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی | کہ یک دم باخدا بودن بہ از ملک سلیمانی

تیس سال کے بعد خاقانی پر یہ بات واضح ہوئی کہ ایک لحظہ خدا تعالیٰ کیساتھ مشغول ہونا ملک سلیمان سے بہتر ہے۔"

واللہ جب تھوڑی دیر عارف کو حق تعالیٰ کا حضور بے کیف میسر آجاتا ہے اس کی وہ لذت ہوتی ہے جو تمام غموں کو کافور کر دیتی ہے پھر اس کے پاس پریشانی کہاں۔ اس شخص کو مصیبت کے وقت یہ فکر تو ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں۔ کہیں ناراضی کی وجہ سے تو یہ سزا نہیں۔ دی۔ پھر جب اعمال و حالت قلب میں غور کر کے معلوم ہوتا ہے حق تعالیٰ ناراض نہیں ہیں

تو اب اس کا دل قوی اور منشرح ہو جاتا ہے اور ہر قسم کی کلفت میں اس کو راحت نظر آتی ہے اور گو وعدہ تو نہیں مگر وقوع اکثر یہ ہے کہ ایسے لوگ ظاہری واقعات تشویش سے بھی محفوظ رہتے ہیں اور باوجود قلت جماعت وقلت سامان کے غالب وفائز رہتے ہیں۔ کمافی الحدیث۔

لا یزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق لا یضرهم من خالفهم ولا دنیا هم (سنن ابن ماجة: ۱۰) ای لا یضر هم فی الدین خلاف من خالفهم ولو اضر دنیا هم احیاناً. ۱۲ جامع

(ترجمہ: میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت حق پر ظاہر ہوگی اور ان کی مخالفت کرنے والے انہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا اور نہ ان کے پاس بھٹک سکے گا یعنی ان کا مخالف دین میں ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا، اگرچہ کبھی انہیں دنیوی نقصان پہنچے۔)

فساد ذات البین

اگر بالفرض کبھی ان کو ناکامی بھی ہو تو اتباع شریعت کی برکت سے معاملہ الٹا نہیں پڑتا کہ قہر کی سی صورت ہو جائے۔ آج کل تو مشکل یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ ہوتا ہے لوگ حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں پر بھی زیادتی کرنے لگتے ہیں بھلا عورتوں اور بچوں نے کیا قصور کیا پھر اس غلطی کی وجہ سے معاملہ ہم پر ہی الٹ جاتا ہے اور قہر کی سی صورت بن جاتی ہے ان تشویشناک واقعات میں جھوٹ اور مبالغہ اور تجاوز حدود بہت ہی ہوتا ہے جس سے دین برباد ہو جاتا ہے۔

چنانچہ پہلی تحریکات میں ہمارے ہی بھائیوں نے بعض مسلمانوں کی طرف سے ایسے جھوٹے الزامات عائد کیے ہیں کہ کوئی مسلمان ان کا مصداق ہرگز نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً وہ مسلمان جس کی حالت کا عرصہ دراز تک تجربہ بھی کرلیا گیا ہو پھر ان باتوں کا انجام فساد ذات البین ہوا کہ دوستوں اور بھائیوں کی عداوت اور بغض پیدا ہو گیا اور فساد ذات البین وہ بلا ہے جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

ایاکم و فساد ذات البین فانهما هی الحالقة لا اقول تحلق الشعر بل تحلق الدین. (سنن الترمذی: ۲۵۰۸، کنز العمال: ۵۴۸۱)

یعنی مسلمانوں کو حضورؐ خطاب فرماتے ہیں کہ فساد ذات البین کو اپنے سے دور رکھو کیونکہ یہ مونڈنے والی چیز ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے۔

یاد رکھو مصائب میں حدود شرع سے تجاوز کرنا اعلیٰ درجہ کی بے صبری ہے صابر وہی ہے جو ایسے مواقع میں شریعت پر جما رہے اور کوئی کام خلاف مرضی حق نہ کرے ایسے ہی صابرین کے لئے بشارت ہے اور انہی لوگوں کی فضیلت احادیث وقرآن میں بیان کی گئی ہے۔

صابرین کی دنیوی جزا

آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

اُولٰٓئِکَ عَلَیۡھِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَرَحۡمَۃٌ ۔یعنی صابرین پر ان کے پروردگار کی طرف سے خاص رحمتیں بھی ہیں اور عام رحمتیں بھی۔اس میں صابرین کیلئے دوسری بشارت ہے جو بلاواسطہ سنائی گئی ہے۔ بشرالصمرین میں بشارت بواسطہ تھی یہ بلاواسطہ ہے اور یہ مبنی ہے اس قاعدہ پر کہ تاکید سے تاسیس اولیٰ ہے۔

بعض علماء نے اس کو وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ہی کا بیان سمجھا ہے۔مگر ظاہر یہ ہے کہ مستقل کلام ہے ماقبل کا بیان نہیں۔کیونکہ دونوں مستقل آیتیں ہیں۔پس ظاہر یہی ہے کہ دونوں کا مفہوم بھی مستقل ہو بیان کہنے میں یہ آیت مضمون سابق کی تاکید ہوگی۔اور مستقل ماننے میں تاسیس ہے اس لئے یہی اولیٰ ہے۔

پس میرے ذوق میں بشرالصابرین میں بواسطہ بشارت ہے اور اس جملہ میں بلاواسطہ بشارت ہے۔

بہرحال اس میں بتلا دیا گیا ہے کہ صابرین پر خاص وعام دونوں طرح کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔خاص رحمت تو آخرت میں ہوگی اور رحمت عامہ کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے صابرین کو صبر و استقلال کا ثمرہ دنیا میں بھی حق تعالیٰ کھلی آنکھوں دکھلا دیتے ہیں بشرطیکہ صبر کی حقیقت صحیح طور پر موجود ہو جس کو میں قبل بیان کر چکا ہوں۔

اس کے بعد ایک تیسری بشارت تو ایسی بیان فرمائی ہے کہ وہ جزا تو ہر صابر مومن کو ضرور ہی حاصل ہے یعنی وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُھۡتَدُوۡنَ۔ کہ یہی لوگ راہ صواب پر چلنے والے ہیں۔ صاحب جو شخص ناگوار واقعات میں شریعت پر کام طور پر جمار ہتا ہے۔گو ظاہر میں اس کو کیسی ہی کلفت ہو مگر دل میں اس کی خوشی بھی ہوتی ہے کہ خدا کے فضل سے میں حق پر ہوں۔

دیکھئے! میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں مثلاً ایک شخص تو وہ ہے جو اپنے نزدیک صحیح راستہ پر چل رہا ہے۔مگر راہ میں کچھ کانٹے اور گڑھے بھی اس کو تنگ کرتے ہیں اور ایک شخص راستہ بھولا ہوا ہے اور اسے جابجا باغات اور عمدہ عمدہ پھل ملتے ہیں۔

غور کر کے دیکھ لیجئے کہ ان دونوں کی حالت میں فرق ہے یا نہیں۔بخدا زمین آسمان کا فرق ہوگا جو شخص ٹھیک راستہ پر چل رہا ہے اس کے قلب میں سکون و اطمینان ہوگا۔ وہ کانٹوں اور گڑھوں کو بھی اطمینان سے طے کریگا۔کیونکہ جانتا ہے کہ راستہ یہی ہے اور جو شخص راستہ بھولا ہوا ہے اس کو قدم قدم پر پیر کا اٹھانا بھاری ہو جائے گا اور جتنے نئے نئے باغات اور پھل پھلواڑیاں

اسے راستہ میں نظر آئیں گی اتنی زیادہ وحشت ہوگی کہ اے اللہ! میں کدھر نکل آیا۔ یہ باغات تو میرے راستہ میں کبھی نہ آتے تھے۔ آج یہ کیا معاملہ ہے میں...... کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ متبع شریعت کو اگر کوئی کلفت بھی پیش آتی ہے تو وہ گھبراتا نہیں کیونکہ وہ راستہ کو دیکھ رہا ہے اور جانتا ہے کہ مقصود کا راستہ یہی ہے۔ اگر کسی وقت اس کو جان پر بھی خطرہ آتا ہے جب بھی یہ مسرت اس کا دل بڑھاتی رہتی ہے کہ بحمد اللہ میں خدا کے راستہ میں جان دے رہا ہوں اور جو شخص خدا کا مجرم ہے حدود سے گزر گیا ہے اس کو جان دیتے ہوئے یہ خوشی ہرگز نہیں ہوتی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں غلط راستہ پر ہوں میں منزل مقصود یعنی جنت پر نہ پہنچوں گا۔ بلکہ نہ معلوم کہاں جا کر گروں گا۔ اس لئے ہدایت پر ہونا واللہ بڑی بشارت ہے اور یہ وہ جزا اور وہ نعمت ہے، جو صابر مومن کو دنیا میں ضرور ہی حاصل ہوتی ہے۔

اطمینان بخش دولت

مجھے ہدایت کا نعمت ہونا ایک بار سفر میں بخوبی محسوس ہوا۔ عرصہ ہوا کہ میں ایک بار سہارنپور سے براہ لکھنو کانپور کا ارادہ کر کے ریل میں سوار ہوا۔ میرے ایک دوست بابو صاحب بھی اسی گاڑی میں آ کر پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے جب گاڑی چل پڑی تو آپس میں باتیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جائیں گے کہا میرٹھ جاؤں گا۔ میں نے کہا ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جاتے ہوں مگر افسوس ہے کہ یہ ریل گاڑی تو میرٹھ نہ جائے گی۔ یہ تو لکھنو جائے گی۔

اب یہ سن کر جوان کی حالت ہوئی کچھ نہ پوچھئے وہ سخت پریشان ہوئے اور بار بار ادھر ادھر دیکھتے تھے۔ میں ان سے باتیں کرنا چاہتا اور وہ جھلاتے تھے کہ میں تمہیں دل لگی سوجھی ہے یہاں خود ہی پریشانی ہے کہ میں نے یہ بڑی غلطی کی۔ سردی کا موسم تھا ان کو اس لئے اور بھی فکر تھی کیونکہ وہ بالکل بیک بنی و دو گوش تھے۔

جنٹلمین سردی کا سامان ساتھ لے کر سفر کرنے کو عیب سمجھتے ہیں بلکہ لوٹا بھی ساتھ نہیں لیتے اس بھروسہ پر رہتے ہیں کہ جہاں پیاس لگے گی اسٹیشن پر پانی مل جائے گا۔ پی لیں گے نماز کی تو انہیں ضرورت ہی نہیں۔ مگر بعض دفعہ جب اسٹیشن پر پانی نہیں ملتا اور پیاس لگی ہے تو ان کا برا حال ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک بار ایک سفر میں ایک جنٹلمین صاحب نے ایک اسٹیشن کے قریب مجھ سے لوٹا مانگا کہ میں اس میں پانی لے سکتا ہوں۔ میں نے لوٹا دے دیا اس میں کچھ پانی موجود تھا۔ مگر جنٹلمین صاحب نے اسے پھینک دیا کیونکہ...... اسٹیشن قریب آنے والا تھا اتفاق سے وہاں سے جو اترے تو پانی نہ ملا۔ اب

آپ بڑے کھسیانے ہوئے اور خود ہی کہنے لگے کہ بڑی حماقت ہوئی میں نے پہلا پانی بھی پھینک دیا۔
واقعی یہ لوگ اپنے کو اصولی سمجھتے ہیں یہ خاک بھی اصولی نہیں۔ ہاں وصولی تو ہیں کہ رقمیں وصول کرنا خوب جانتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی اصول ہے کہ بادل دیکھ کر گھڑے پھوڑ دیں تو وہ بابو صاحب بھی اسی مذاق کے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور ان کے ساتھ کوئی کپڑا نہ تھا کیونکہ یہ بھی آج کل اصول میں داخل ہے۔

خلاصہ یہ کہ انکو کسی طرح بشاش و اطمینان حاصل نہ ہوتا تھا۔ اس وقت میں نے سوچا کہ مجھے میں ان میں اس وقت کس بات کا فرق ہے۔ معلوم نہ ہوا کہ میں راہ پر تھا اس لئے مطمئن تھا اور وہ بے راہ تھے اس لئے بے چین تھے اس وقت معلوم ہوا کہ واقعہ راہ پر ہونا بھی بڑی اطمینان بخش دولت ہے بے راہ گو ظاہر میں کتنا ہی سامان رکھتا ہو اس کے دل کو اطمینان و سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس اُولٰئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (پس وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں) حقیقت میں بڑی بشارت ہے۔

ہدایت کی صورت

راہ پر ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو خود محقق ہو کہ راستہ کو دیکھ رہا ہو یا کسی محقق کے ہاتھ میں ہاتھ دے دے جیسا کہ ظاہری۔ راستہ پر چلنے کی بھی دو ہی صورتیں ہی یا تو خود سوآنکھا ہو کہ اپنی آنکھوں سے راستہ کو دیکھتا ہو اور جو خود اندھا ہو تو کسی سوآنکھے کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر منزل پر پہنچ سکتا ہے۔ یہی قاعدہ حق طریق کا ہے۔ واقعہ محقق کے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے آدھا غم تو فوراً ہی ہلکا ہو جاتا ہے۔ میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ بیماری میں محقق طبیب کی صورت دیکھنے ہی سے آدھا مرض جاتا رہتا ہے اسی طرح محقق عارف کے پاس جانے اور اس کی تسلی بخش باتوں کے سننے سے آدھا مرض تو خود زائل ہو جاتا ہے بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عارف کی محض صورت دیکھنے ہی سے مرض جاتا رہتا ہے مولانا فرماتے ہیں

اے لقائے تو جواب ہر سوال   مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

"آپ کی ملاقات ہر سوال کا جواب ہے۔ مشکل بغیر گفتگو کے آپ ہی سے حل ہو گی۔"

محقق کی علامت یہ ہے کہ اس کی باتوں سے دل کو تسلی اور اطمینان ہوتا ہے غیر محقق کی باتوں سے اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ جیسے سفر میں اگر آپ کے ساتھ کوئی ایسا رہنما ہو جس کو واقع میں راستہ نہیں معلوم تو اس کی باتوں سے آپ تاڑ لیتے ہیں کہ یہ واقف طریق نہیں۔ ناواقف کی باتیں کچھ ایسے اکھڑی اکھڑی ہوتی ہیں جن سے سمجھنے والوں کو اس کا ناواقف ہونا خود بخود معلوم ہو جاتا ہے اور واقف کی باتیں دل میں گھر کر لیتی ہیں۔

راز اس کا یہ ہے کہ ناواقف کو اپنی باتوں پر خود ہی اطمینان نہیں تو دوسرے کو اس سے اطمینان کا فیض کیسے پہنچے اور جاننے والا جو کچھ کہتا ہے اطمینان سے کہتا ہے تو دوسرے پر بھی اس کے اطمینان کا اثر پڑتا ہے اسی کو مولانا...... فرماتے ہیں۔

وعدہ ہا باشد حقیقی دل پذیر　　　وعدہ ہا باشد مجازی تاسہ گیر

''حقیقی وعدے دل پذیر ہوتے ہیں مجازی وعدے کچھ نہیں۔''

پس راہ پر ہونے کی صورت یہ ہے کہ کسی محقق سے تعلق پیدا کرو جبھی آپ کو مصائب میں کمال صبر کی دولت حاصل ہوسکتی ہے اور اسی وقت آپ کو یہ بشارتیں صلوت ورحمت وہدایت کی حاصل ہوسکتی ہیں۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں اور خلاصہ وعظ پھر بیان کئے دیتا ہوں کہ مصائب میں شریعت نے ہم کو صبر کی تعلیم کی ہے مگر صبر فقط ترک جزع وفزع کا نام نہیں۔ بلکہ صبر کی حقیقت ی ہے کہ کسی حال میں کسی مامور بہ میں خلل نہ آوے اور جو دینی معمولات پہلے سے اختیار کر رکھے ہیں ان پر مصیبت میں بھی دوام رکھا جاوے۔ اگر اس طرح صبر کیا جاوے تو یہی ہر مصیبت اور غم کا علاج...... بھی ہے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق دیں اور فہم سلیم عطا فرمائیں۔

آمین! یارب العالمین والحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه سیدنا و مولنا محمد وعلی آله واصحابه اجمعین.

برحتمک یا ارحم الراحمین.

ماعلیہ الصبر

صبر کی صورت کے متعلق یہ وعظ ۲۶ محرم ۱۳۴۲ھ بروز یکشنبہ بعد نماز صبح خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون در کوٹھی مدرسہ بیان فرمایا جو پونے دو گھنٹے میں ختم ہوا۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدً عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

اُولٰٓئِکَ عَلَیۡھِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَرَحۡمَۃٌ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُھۡتَدُوۡنَ ○ (البقرہ آیت نمبر ۱۵۷)

(ترجمہ: ان لوگوں پر خدا تعالیٰ کی طرف سے خاص رحمتیں بھی ہیں اور عام رحمتیں بھی۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو حقیقت حال تک رسائی ہوگی)

تمہید

جس جزو کی آیت کی میں نے تلاوت کی ہے اس کے سننے سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ بیان ماسبق کا تمتہ ہے، کیونکہ پرسوں اسی آیت کے متعلق بیان ہو چکا ہے۔ اس بیان کا نام حقیقۃ الصبر ہے ہر چند کہ یہ بیان بظاہر غیر ضروری ہے کیونکہ اسی جمعہ کو اس مضمون پر بیان ہو چکا ہے نیز اس وقت میرا قصد بھی بیان کا نہ تھا اور جب بعض مہمانوں نے فرمائش کی تو میں دیر تک سوچتا رہا کہ کیا بیان کروں مگر پھر خیال آیا کہ پہلے بیان میں ایک جزو بیان سے رہ گیا ہے چنانچہ اس وقت بھی ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ اگر وقت ملا تو میں ایک جزو اس مضمون کے متعلق اور بیان کرتا۔ مگر اس وقت تمہید طویل ہوگئی اور دوسرے مضامین ضروریہ

کے بیان میں دیر ہوگئی۔ اس لئے جزو رہ گیا تو چونکہ اس وقت ایک ایسا مضمون بیان کیا جائے گا جو پہلے بیان نہیں ہوا اور اس کے بغیر وہ مضمون ناتمام رہا جاتا ہے اس لئے یہ بیان غیر ضروری نہیں اور سننے کے بعد اس کی ضرورت خود ہی معلوم ہو جائے گی اب میں اول اس جزو کی یقین کئے دیتا ہوں پھر اس کے متعلق ضروری تفصیل بھی عرض کردوں گا گو وقت تنگ ہے کیونکہ جن مہمانوں نے بیان کی فرمائش کی ہے وہ اس ریل سے جانے والے ہیں۔ اس لئے زیادہ تفصیل کا موقع نہیں اگرچہ میں نے ان سے یہ کہہ دیا ہے کہ بیان ممتد ہو جائے تو وہ گھڑی دیکھ کر وسط بیان میں اٹھ کر چلے جائیں بلکہ اگر بیان ریل کے وقت تک ختم نہ ہوا تو میں انشاء اللہ درمیان میں خود ہی اطلاع کردوں گا کہ ریل پر جانے والے اب چلے جائیں اسی لئے میں نے گھڑی اپنے پاس رکھ لی ہے تا کہ وقت کو دیکھتا رہوں۔

لیکن جی چاہتا ہے کہ جن صاحبوں نے فرمائش کی ہے وہ اول سے آخر تک بیان میں شریک رہیں تا کہ کامل مضمون ان کے کانوں میں پڑ جائے کیونکہ پورا مضمون اول سے اخیر تک شریک رہنے ہی سے معلوم ہوا کرتا ہے بعض دفعہ کسی مضمون میں کچھ قیود ہوتی ہیں جو اخیر میں بیان کی جاتی ہیں اس لئے وسط میں اٹھ جانے سے اکثر ناتمام مضمون کانوں میں پڑتا ہے۔ اور جی یہ چاہتا ہے کہ فرمائش کرنے والوں کے سامنے ہی مضمون ختم ہو جائے اسی لیے میں نماز فجر کے متصل ہی بیان شروع کر دیا ہے مگر پھر بھی وقت زیادہ نہیں اس لئے میں قدر ضرورت پر اکتفا کروں گا اور زیادہ تفصیل نہ کروں گا مگر انشاء اللہ ضروری باتیں سب بیان کر دی جائیں گی۔

جو لوگ پہلے بیان میں شریک تھے ان کو معلوم ہے کہ اس وقت بعد چند مقامات کے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ حقیقت صبر میں پابند اعمال بھی داخل ہے عام طور پر لوگ اس کو صبر میں داخل نہیں سمجھتے بلکہ صرف ترک جزع وفزع کے ساتھ اس کو مختص سمجھتے ہیں اس خیال کی غلطی اس بیان میں تفصیل کے ساتھ ظاہر کی گئی تھی اس کے بعد یہ تفریع کی گئی تھی کہ ماعلیہ الصبر اور محل صبر حقیقت میں ایک ہی چیز ہے مگر اس وقت ماعلیہ الصبر کی تعیین نہ کی گئی تھی اس وقت میں اس کی تعیین کرنا چاہتا ہوں یہی وہ جزو ہے جو اس وقت بیان سے رہ گیا تھا اب سمجھئے کہ ماعلیہ الصبر کیا ہے۔

محل صبر

تعیین اجمالی اس کی یہ ہے کہ ماعلیہ الصبر مامور بہ ہے یعنی جس وقت جس کام کا امر ہو اس پر ثابت رہنا صبر ہے اور وہ مامور بہ ماعلیہ الصبر ہے پس اگر کسی وقت معمولات کے ترک کا امر ہو تو اس وقت ترک

معمولات ہی ماعلیہ الصبر ہوگا اور معمولات مناسب نہ ہوں گے یہ بات اس بیان سے واضح نہ ہوئی تھی بلکہ اس وقت محل خاص ہے کہ نا گوار واقعات میں نا گواری کا تحمل کرنا اور جزع فزع نہ کرنا اور ایک محل عام ہے کہ اس وقت تمام معمولات کوادا کریں اور کسی وقت امرنا گوار کی وجہ سے اعمال میں خلل نہ ڈالیں۔

ورنہ اس گنوار کی سی مثال ہوگی جس نے رمضان کا روزہ رکھا تھا اتفاق سے اس کی بھینس مرگئی تو اس نے فوراً روزہ توڑ ڈالا اور خدا تعالیٰ سے خطاب کر کے کہا کہ آپ نے میری بھینس مار دی تو جاؤ ہم نے بھی روزہ توڑ دیا مہذبین گو اس طرح کھلم کھلا نہ کریں مگر حقیقت یہ ہے کہ در پردہ وہ بھی ایسا ہی کرتے ہیں گو اعتقاداً نہ سہی مگر عملاً سب ایسا ہی کرتے ہیں کہ جہاں خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی امر نا گوار پیش آیا اس کی وجہ سے فوراً اعمال میں خلل ڈال دیا حالانکہ سوچنے کی بات ہے کہ نا گوار واقعات میں ہمارا کیا بگڑتا ہے، کچھ بھی نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ ہوتا ہے بہتر ہی ہوتا ہے۔

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود (جو کچھ محبوب حقیقی کی طرف سے پیش آئے محبوب ہے)

نا گوار واقعات میں جس قدر حکمتیں ہوتی ہیں ان پر نظر کر کے یہ کہنا غلط ہے کہ ان سے ہمارا کچھ بگڑ گیا ہے بلکہ درحقیقت وہ عین رحمت ہیں جیسے میں نے استاد کی مار اور ڈاکٹر کے اپریشن کی مثال سے اس کو بیان گذشتہ میں واضح کر دیا تھا۔

نیز میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ واقعات ہمارے اوپر بطور امتحان کے آتے ہیں جس میں کامیاب ہونے پر ہم کو اجر عظیم کی بشارت ہے تو حق تعالیٰ نے آپ کو انعام دینے کی غرض سے آزمایا تھا آپ سمجھے کہ ہمارا نقصان کر دیا یہ تو وہی مثل ہوگئی کہ گدھے کو دیا تھا نمک وہ سمجھا تھا کہ میری آنکھیں ہی پھوڑ دیں پھر جس چیز میں اللہ تعالیٰ نے تصرف کیا ہے وہ ان کی ہی چیز تھی آپ کا اس میں تھا کیا کچھ بھی نہیں خدا تعالیٰ اگر ہمارے مال میں تصرف کریں یا متعلقین میں تصرف کریں یا پیداوار اور اولاد میں تصرف کریں تو یہ سب چیزیں انہی کی تو ہیں اپنی چیز میں اگر وہ تصرف کریں تو تمہارا کیا بگڑا یہی مقدمہ غلط ہے کہ یہ چیزیں تمہاری ہیں جب تمہاری کوئی چیز نہیں تو ان کے نقصان سے تمہارا کچھ بھی نہیں بگڑتا پھر اعمال میں کوتاہی کس لئے ہے۔

صاحبو۔ یہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ اپنی چیز میں تصرف کر کے بندوں کو صبر کا صلہ دیتے ہیں حالانکہ بندوں کو کسی تصرف پر نہ غم کرنے کا کچھ حق ہے نہ رنج کرنے کا کیونکہ خدا تعالیٰ نے ان کا بگاڑا ہی کچھ نہیں جو ان کو رنج وغم کا حق ہو اور اگر وہ ناحق رنج کر کے صبر بھی کریں تو یہ کچھ کمال کی بات نہیں۔

بس ان کے رنج کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنا خزانہ ایک خزانچی کے سپرد کر کے کسی وقت میں لے لے اور خزانچی رونے چلانے لگے تو کیا کوئی، عاقل اس کے رنج کو بجا کہہ سکتا ہے ہرگز نہیں اور اگر وہ رنج کر کے صبر وتحمل بھی کر لے تو کیا کوئی اس کو اس صبر وتحمل کی بنا پر مستحق انعام کہہ سکتا ہے ہرگز نہیں۔

یہی حالت ہماری ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو خزانچی بنا رکھا ہے اور اپنی کچھ چیزیں ہمارے سپرد کر دی ہیں اور جب چاہتے ہیں وہ اپنی چیزوں میں تصرف کر لیتے ہیں، تو ہم کو نہ اسمیں کچھ رنج وملال کا حق ہے نہ بے جا رنج پر صبر کر کے کچھ انعام کا استحقاق ہے ہے مگر حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے اس بے جا رنج پر صبر کرنے سے اجر وثواب اور انعام وجزا کی بشارت دی ہے پھر حسرت ہے کہ ہم ناگوار واقعات میں خدا تعالیٰ سے خفا ہو کر اعمال میں خلل ڈالنے لگیں جیسا کہ اس گنوار نے کیا تھا کہ بھینس کے مرنے پر روزہ توڑ دیا تھا۔

عقلی ناگواری

کم وبیش ناگواری سے بہت کم لوگ خالی ہیں طبعی رنج تو غیر اختیاری ہے مگر افسوس یہ کہ ہم لوگ عقلی ناگواری میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ وہ چیز جس میں حق تعالیٰ نے تصرف کیا ہے تمہاری ہی چیز تھی اور یہ بھی مان لیا جائے کہ تمہارا کچھ بگڑ بھی گیا تب بھی ناگواری کا حق نہ ہونا چاہئے کیونکہ

آنرا کہ بجائے تست ہر دم کرمے | عذرش بنہ ار کند بعمرے ستمے

(جس شخص نے تجھ پر عمر بھر احسان کیا ہے اگر اس سے کبھی کوئی غلطی ہو جائے تو اسے معذور سمجھو)

اے صاحب جس خدا نے سالہا سال ہم کو راحت وآرام میں رکھا ہے اگر کسی وقت وہ تکلیف بھی دے دیں تو کیا یہی انسانیت ہے کہ ہم اس تکلیف کو زبان پر لائیں اور ناگواری کا اثر لے کر اطاعت میں کوتاہی کرنے لگیں۔

صاحبو۔ سلاطین عالم فوجی ملازموں کو سالہا سال بے مشقت گھر بیٹھے تنخواہ دیتے ہیں اور کسی وقت دشمن کے مقابلے میں بھی بھیج دیتے ہیں تو بتلایئے کیا اس وقت فوجی ملازم کو اس حکم پر ناگواری کا کچھ بھی حق ہے ہرگز نہیں بلکہ اس وقت کہا جاتا ہے کہ نمک حلالی ہی ہے کہ جس بادشاہ نے برسوں گھر بیٹھے تنخواہ دی ہے اور بلا کسی مشقت وکلفت کے خبر گیری کی ہے کسی وقت اس کے حکم سے مشقت بھی ضرور برداشت کرنا چاہئے بشرطیکہ وہ حکم خدا تعالیٰ کے خلاف نہ ہو، چنانچہ فوجی

ملازم کبھی ایسے وقت میں انکار نہیں کرتا اور خوشی سے دشمن کے مقابلہ میں بادشاہ کو خوش کرنے کیلئے ہر قسم کی مصیبت کو برداشت کرتا ہے اور جان دینے کو اپنی سعادت اور نمک حلالی سمجھتا ہے۔

پھر کس قدر افسوس ہے کہ باوجود دعویٰ شرافت ہمارا خدا تعالیٰ کے ساتھ وہ برتاؤ بھی نہ ہو جو ایک ادنیٰ فوجی ملازم کا جو اکثر چھوٹی قوموں کے لوگ ہوتے ہیں ایک ادنیٰ بادشاہ کے ساتھ برتاؤ ہوتا ہے واقع اگر مصیبت میں ہمارا کچھ بگڑتا بھی ہوتا جب بھی ایسے محسن سے ناگواری کا خیال دل میں لانا یا زبان سے ظاہر کرنا بالکل ہی انسانیت سے دور اور شرافت کے خلاف ہے۔ حضرت لقمان علیہ السلام کی حکایت ہے کہ وہ ابتدا میں کسی شخص کے غلام تھے ایک دفعہ ان کے آقا نے ککڑی منگائی اور اس کی قاشیں کر کے پہلے ایک قاش اپنے ہاتھ سے حضرت لقمان کو دی جس کو انہوں نے خوشی خوشی کھالیا وہ اتفاق سے بہت تلخ تھی مگر حضرت لقمان نے ذرا منہ نہ بنایا نہ کوئی اثر ناگواری کا ظاہر ہونے دیا آقا سمجھا کہ شیریں ہوگی اس نے بھی ایک قاش کھائی تو فوراً تھوکنے لگا اور ان سے سوال کیا کہ کیا تم کو یہ کڑوی نہیں لگی فرمایا تلخی معلوم تو ہوئی تھی پوچھا پھر تم نے خوشی خوشی کیسے کھالیا ذرا بھی منہ نہ بنایا فرمایا کہ حضور جس ہاتھ سے میں نے عمر بھر اتنی شیرینیاں کھائی ہیں کیا اس کے ہاتھ سے ایک تلخی پر منہ بناتا یہ تو انسانیت کے خلاف تھا اس لیے میں نے ناگواری ظاہر نہیں کی اس کو سعدیؒ فرماتے ہیں۔

آنرا کہ بجائے تست ہر دم کرمے | عذرش بنہ ار کند بعمرے ستمے

(جس شخص نے مجھ پر عمر بھر احسان کیا ہے اگر اس سے کبھی کوئی غلطی ہو جائے تو اسے معذور سمجھو)

ترک اعمال کا نتیجہ

پھر کوئی یہ تو بتلائے کہ ناگواری کی، حالت میں اعمال کے اندر خلل ڈالنے سے حق تعالیٰ کا کیا نقصان ہے اگر تم نماز روزہ کی پابندی کرو گے تو حق تعالیٰ کو کیا بخش دو گے اور جو نہیں کرو گے تو ان کا کیا بگاڑ دو گے جو کچھ نقصان ہوگا تمہارا ہی ہوگا پھر اس حالت میں تو کسی مصیبت کی وجہ سے اعمال طاعات میں خلل ڈالنے کی ایسی مثال ہوئی جیسے کسی نے ایک شخص سے روپے قرض لے کر مکان بنایا تھا قرض خواہ نے روپیہ کا تقاضا کیا تو کہہ دیا ابھی روپیہ ہمارے پاس نہیں ہے اس نے زیادہ تقاضا کیا تو، آپ نے غصہ میں آکر مزدور لگا کر بنا بنایا مکان ڈھا دیا کہ جاؤ ہم تمہارے روپیہ کا مکان ہی نہیں رکھتے بھلا اس نے مکان ڈھا کر کس کا نقصان کیا قرض خواہ کے روپے تو پھر بھی ذمے رہے ایک نقصان اور سر لے لیا کہ مکان سے بھی ہاتھ دھویا۔

اسی طرح ناگوار واقعات میں اعمال و معمولات کے ترک سے مصیبت تو کم ہونہیں جاتی ہاں ترک اعمال کا نقصان اور بڑھ جاتا ہے ایک نقصان تو غیر اختیاری ہوا تھا یہ دوسرا نقصان ہم اپنے ہاتھوں کرتے ہیں جس سے مصیبت کو اور ترقی ملتی ہے جیسے کسی شخص کے ناک پر بار بار مکھی بیٹھتی تھی جس سے تنگ آگیا تو اس نے غصہ میں ناک ہی کاٹ ڈالی کہ جاؤ ہم اڈا ہی نہیں رکھتے بھلا مکھی کا اس سے نقصان ہوا اس کو تو اب چشمہ شیریں مل گیا اور

ہر کجا بود چشمہ شیریں مگس و مرغ ومور گرد آیند

(جہاں میٹھے پانی کا چشمہ ہو وہاں اس کے گرد مکھی، مرغ اور مور آئیں گے)

پہلے تو مکھی ہی آتی تھی اب چیونٹی اور چیونٹے بھی آئیں گے یہی حال ہمارا ہے کہ ایک مصیبت میں اعمال ترک کر کے ہم دوسری آفتوں کو بھی بلا لیتے ہیں اس مضمون کو پہلے بیان میں تفصیل کے ساتھ بیان کر کے میں نے یہ کہا تھا کہ مصائب کے وقت اعمال میں خلل نہ ڈالنا چاہئے جس سے متبادر یہ ہوا تھا کہ اپنے معمولات پر پابند رہنا چاہئے اور اسی کو ماعلیہ الصبر سمجھا گیا۔

صابرین کی نشانی

اب میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اعمال ماعلیہ الصبر کی صورت ہیں اور اس کی حقیقت دوسری شی ہے یعنی امتثال امر یعنی جس وقت جس بات کا امر ہو اس کا بجالانا صبر ہے اور وہ مامور بہ ماعلیہ الصبر ہے اگر کسی وقت پابندی معمولات میں امتثال امر ہو اس وقت ترک معمولات ماعلیہ الصبر ہے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ماعلیہ الصبر فقط صورت اعمال کے ساتھ خاص ہے بلکہ امتثال امر کی رعایت اس میں ضروری ہے اس کو میں پہلے صراحۃً بیان نہ کر سکا تھا کیونکہ وقت نہ ملا۔

اب اس کو بیان کرتا ہوں اس کے لئے مجھے دوسری آیت تلاش کرنے کی فکر ہوتی مگر الحمد للہ کہ اسی آیت میں ایک لفظ اس پر دال ہے وہ لفظ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ہے میں نے پہلے اس کو بطور بشارت کے بیان کیا تھا مگر اب غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی ماعلیہ الصبر اور مامور بہ ہے گویا اس میں صابرین کا پتہ بتلایا گیا ہے کہ صابر وہ لوگ ہیں جو ناگواری کے وقت ہدایت پر قائم رہتے ہیں یعنی سیدھے راستہ پر جمے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ راستہ پر چلنے سے کسی مقصود پر پہنچنا مطلوب ہوتا ہے پس مھتدون کا حاصل یہ ہوا کہ ناگواری کے وقت وہ لوگ سیدھے راستہ پر چلتے ہیں اور مقصود پر نظر رکھتے ہیں۔

پس یہاں ایک تو یہ بات بتلائی گئی ہے کہ یہاں دو راستے ہیں ایک سیدھا ایک ٹیڑھا۔ چنانچہ دوسری آیت میں اس کو صراحۃ بیان فرمایا ہے وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ (اور اللہ تک پہنچنے کے راستے ہیں اور ان میں ٹیڑھا راستہ بھی ہے)

دوسرے مقام پر ارشاد ہے

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد ہے کہ لوگوں سے فرما دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے، سیدھا اسکا اتباع کرو اور دوسرے راستوں کا اتباع نہ کرو وہ تم کو خدا کے راستہ سے متفرق کر دیں گے۔

مقصود تو یہ ہے ٹیڑھا راستہ تم کو خدا تعالیٰ سے جدا کر دے گا مگر

فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (وہ تم کو خدا کے راستے سے متفرق کر دیں گے)

مبالغۃً فرمایا گیا ہے کہ ٹیڑھے راستوں پر چل کر تم کو خدا تو کیا ملتا خدا کا راستہ بھی نہ ملے گا۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں)

میں سیدھے راستے پر چلنے کا ذکر تو صراحۃ ہے کیونکہ ہدایت اسی کو کہتے ہیں ٹیڑھے راستہ پر چلنے کو ہدایت نہیں کہتے بلکہ ضلالت کہتے ہیں۔

رہی دوسری بات یعنی سیدھے راستہ پر چلنے کے ساتھ مقصود پر نظر رکھنا سو گو اس کا ذکر صراحۃ نہیں مگر ادنیٰ تامل سے اس پر بھی اس کی دلالت واضح ہے کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ کسی راستہ پر چلنے سے کسی مقصود پر پہنچنا ہی مطلوب ہوتا ہے راستہ خود کو مطلوب نہیں ہوتا۔

اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملایا جائے کہ طریق دو قسم کے ہیں ایک حسی دوسرے معنوی۔ طریق حسی کا موصل الی المقصود ہونا چلنے والے کے قصد و ارادہ پر موقوف نہیں بلکہ اگر راستہ سیدھا ہو تو آنکھیں بند کر کے بھی چلنے سے مقصود تک وصول ہو جاتا ہے مثلاً دہلی کو سیدھی سڑک جاتی ہے اس، پر جو کوئی بھی چلے گا دہلی پہنچ جائے گا خواہ دہلی کا قصد ہو یا نہ ہو اور طریق معنوی کی یہ حالت نہیں اس میں بدون قصد و ارادہ کے وصول نہیں ہو سکتا گو راستہ سیدھا بھی ہو مگر ہر وقت مقصود پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

نیت کی اہمیت

اب سمجھو کہ اس طریقہ کا مقصود کیا ہے سو نصوص میں غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ مقصود اس طریق معنوی سے رضا حق ہے اور نصوص ہی سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ یہ مقصود بدون ارادہ و

نیت کے حاصل نہیں ہوسکتا گوراستہ سیدھا ہی اختیار کیا گیا ہو چنانچہ حدیث میں ہے۔

انما الاعمال بالنیات وانما لکل امری مانوی فمن کانت ھجرته الی الله ورسوله فھجرته الی الله ورسوله ومن کانت ھجرته الی دنیا یصیبھا اوامراۃ یتنزوجھا ھجرته الی ما ھا جر الیه

(الصحیح البخاری ۱:۲،۸:۱۷۵)

(ترجمہ: بے شک تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، انسان کو وہی چیز حاصل ہوگی جس کی وہ نیت کرے گا جس نے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت خدا اور رسول کے لئے ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا پانے یا کسی عورت سے شادی کرنے کے لئے ہو تو اس کی ہجرت اس طرف ہوگی جس کے لئے اس نے ہجرت کی)

اس حدیث کا پہلا جزو۔ انما الاعمال بالنیات (بے شک تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے) بتلا رہا ہے کہ اعمال شرعیہ سے ثواب بدون نیت کے حاصل نہیں ہوتا اعمال کی تفسیر اعمال شرعیہ سے اس لئے کی گئی کہ شارع علیہ السلام کو اعمال غیر شرعیہ سے بحث کی ضرورت ہی نہیں پھر آگے ہجرت کا ذکر فرمانا اس کا قرینہ ہے اور ثواب الاعمال سے تفسیر اس لئے کی گئی کہ وجود اعمال بدون نیت کے ہوسکتا ہے، چنانچہ مشاہدہ ہے لہذا توقف وجود اعمال علی النیۃ شارع کا مقصود نہیں ہوسکتا کیونکہ اول تو یہ خلاف واقعہ ہے دوسرے وجود اشیا بھی ان امور کی قبیل سے ہے جو شارع علیہ السلام کی بحث سے خارج ہیں شارع کا مقصود بیان احکام ہوتا ہے نہ کہ بیان کیفیات وجود اب اس میں گفتگو ہوسکتی ہے کہ یہاں صحت اعمال مراد ہے یا ثواب اعمال۔ سو اس کا جواب حنفیہ نے کتب فقہ میں دے دیا ہے کہ چونکہ ثواب اعمال کا نیت پر موقوف ہونا اجماعی ہے اس لئے تقدیر صحت سے تقدیر ثواب اولیٰ ہے، اور ثواب و رضا باہم قریب قریب ہیں جب حق تعالیٰ کسی عمل پر ثواب دیں گے تو اس سے راضی بھی ہوں گے۔ دوسرے ثواب سے بھی رضا ہی مقصود ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ رضا ثواب کی اعلیٰ فرد ہے۔

اس کے بعد حضورؐ نے ہجرت کے متعلق صاف فرمایا کہ اگر اس سے خدا مطلوب نہ ہو تو وہ شرعاً قابل قدر اور لائق اعتبار نہیں اور اس سے خدا تک وصول نہ ہوگا۔ تو دیکھئے ہجرت کتنا بڑا عمل ہے کہ جہاد کے برابر ہے اور اس کا طریق ہدایت ہونا یقینی ہے کیونکہ عمل شرعی ہے مگر بدون نیت و ارادہ کے وہ بھی موصل نہیں۔

علی ہذا نماز کتنا بڑا عمل ہے لیکن خدا کے لئے نہ ہو بلکہ ریاکاری سے ہو تو ہر گز وصول وقرب مرتب نہ ہوگا اسی طرح جملہ اعمال شرعیہ میں غور کر لیا جائے کہ مقصود کی نیت اور قصد سب میں شرط ہے بدون اس کے وہ موجب وصول نہیں ہو سکتی۔ جب نصوص شرعیہ سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ بدون نیت کے کوئی عمل مقبول نہیں تو معلوم ہوا کہ ہدایت صرف اس کا نام نہیں کہ اعمال شرعیہ کی صورت کو اختیار کر لیا جائے بلکہ اس کے ساتھ طلب رضا حق بھی شرط ہے، پس یہ ثابت ہوگیا کہ

اُولٰئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں)

میں سیدھے راستے پر چلنے کے ساتھ مقصود پر نظر رکھنا بھی مذکور ہے، کیونکہ اسکے بغیر ہدایت کی صورت ہی صورت ہوگی حقیقت نہ ہوگی اور مقصود رضائے حق ہے۔

پس حاصل یہ ہوا کہ صابر وہ ہیں جو ناگواری کے وقت رضا حق پر نظر رکھتے ہیں اور اسکو فوت نہیں کرتے اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ رضائے حق کا مدار امتثال امر پر ہے پس صبر کی حقیقت امتثال امر ہوئی اور ماعلیہ الصبر مامور بہ ہوا۔ یہی مطلوب تھا۔

غلو فی الدین

اب ہمارے اندر بعض لوگ تو ایسے ہیں جو پریشانی کے وقت طریق ہی میں خلل ڈالتے ہیں کہ جہاں مصیبت آئی فوراً اعمال سابقہ کی پابندی چھوڑ دی اور ناجائز امور میں مبتلا ہوگئے اکثر لوگ تو ایسے ہی ہیں۔ ان کی تو زیادہ شکایت نہیں یہ تو گفتگو ہی سے خارج ہیں دوسری جماعت وہ ہے جو طریق پر غلو کے ساتھ جمے رہتے ہیں۔

کسی حال میں بھی ان کی تسبیحیں اور معمولات فوت نہیں ہوتے مگر ان کی نظر مقصود پر نہیں ہوتی اس لئے بعض دفعہ ان سے مقصود فوت ہو جاتا ہے۔

مثلاً بعض لوگ ایسے معمولات کے پابند ہوتے ہیں کہ چاہے لڑکا مر جاوے مگر وظیفہ فوت نہیں ہوتا۔ لوگ ان کی تعریف کرتے ہیں کہ بڑے پابند اوقات ہیں مگر قواعد شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی پابندی شرعاً محمود نہیں یہ غلو فی الدین میں داخل ہے کیونکہ بعض دفعہ پابندی کا توڑ بھی مامور بہ ہے بلکہ بعض دفعہ نماز شروع کر دینے کے بعد نماز توڑ دینا بھی واجب ہوتا ہے۔

جیسے کوئی اندھا آرہا ہو اور اس کے راستے میں کنواں یا گڑھا ہو جس میں اس کے گرنے کا اندیشہ ہو تو نماز کا توڑنا اور اس کو بچانا واجب ہے اس وقت امتثال امر اسی میں ہے کہ عمل کو توڑ

دے اس وقت نماز پڑھنے میں امتثال امر نہیں۔

ایک صحابیؓ کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ جنگل میں وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جارہے تھے کہ نماز کا وقت آ گیا وہ گھوڑے سے اترے اور وضو کر کے گھوڑے کی لگام ہاتھ میں لے کر نماز میں مشغول ہو گئے وہ گھوڑا کبھی کبھی شوخی کر کے ایک دو قدم چلتا تھا تو آپ بھی ایک دو قدم اس کے ساتھ آگے پیچھے ہٹ جاتے تھے ایک خارجی نے ان کو نماز میں آگے پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھ کر اعتراض کیا کہ یہ کیسی نماز ہے ان صحابی نے فرمایا کہ تم کیا جانو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے ہیں آپ نے ہم پر ایسی سختی نہیں کی کہ سفر میں بھی اسی طرح خشوع و اطمینان سے نماز پڑھیں جس طرح حضر میں پڑھا کرتے ہیں، بھلا اگر میں گھوڑے کو چھوڑ کر نماز پڑھتا اور گھوڑا بھاگ جاتا تو کیسی پریشانی ہوتی پھر شاید اس وقت یہ خیال آتا کہ ہائے میں نے نماز ہی کیوں پڑھی تھی جو اتنا نقصان ہوا اور یہ حالت بہت سخت ہے کہ انسان طاعت کر کے اس پر پچھتائے۔

اس لئے حضرات صحابہؓ کو تقویٰ کا غلو نہ تھا کہ کچھ ہی ہو جائے مگر معمول نہ چھوٹے کیونکہ بعض دفعہ معمول کی پابندی ظاہر میں تو اچھی ہوتی ہے مگر باطن میں اس سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ پابندی سے جب دنیا کا ضرر ہوتا ہے تو اس وقت طاعت پر پچھتاتا ہے اسی لئے میں بعض لوگوں سے جو حج کا ارادہ کر کے جاتے ہیں یہ کہہ دیتا ہوں کہ سفر مدینہ میں اگر خطرات سے پورا اطمینان ہو تو جانا ورنہ حج کر کے واپس آ جانا گو یہ بات ظاہر میں بہت سخت ہے مگر اس نیت سے کہہ دیتا ہوں کہ ایسا نہ ہو خطرہ کی حالت میں سفر کر کے بعد میں نفس یہ کہے کہ ہائے میں ناحق ہی آیا اور سفر مدینہ پر پچھتائے تو یہ حالت مدینہ نہ جانے سے زیادہ سخت ہوگی کیونکہ اس وقت تو یہی، حسرت ہوگی کہ ہائے میں زیارت نبویؐ سے محروم رہا اور امید ہے کہ یہ حسرت ہی کام دے جائے اور اب افسوس ہوگا کہ ہائے میں کیوں آیا تھا اور دونوں حالتوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے۔

اس خارجی معترض کی نگاہ اس دسیسہ پر نہ پہنچی تھی اس لئے اس نے صحابیؓ پر اعتراض کیا خارجی لوگ بظاہر اعمال کے بہت پابند ہوتے تھے وہ نماز روزہ میں اہلسنت سے زیادہ پختہ تھے کیونکہ انکے یہاں اعمال جزو ایمان ہیں اور انکے نزدیک گناہ کبیرہ سے بھی آدمی کافر ہو جاتا ہے مگر ان میں اعمال کی صورت ہی صورت تھی حقیقت نہ تھی۔

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ بعض لوگ قرآن کو ایسا سنوار کر پڑھیں گے جیسا تیر کو سیدھا کیا جاتا ہے مگر حالت یہ ہوگی کہ قرآن ان کے گلے سے نیچے نہ اترے گا بس اوپر ہی اوپر رہے گا وہ اسلام سے ایسے

نکلیں گے جیسے تیر بعض دفعہ نشانہ سے تیزی کے ساتھ نکل جاتا ہے کہ اس میں خون کا نشان تک نہیں ہوتا۔

معلوم ہوا کہ شریعت میں اعمال ظاہرہ کی ایسی پابندی مطلوب نہیں جس میں محض صورت ہی صورت ہو اور مقصود پر نظر نہ ہو بلکہ ایسی پابندی مطلوب ہے جس میں ہر وقت مقصود یعنی رضائے حق پر نظر ہو گو اس سے بعض دفعہ صورت میں بھی خلل آ جائے۔

تفقہ فی الدین

چنانچہ ایک بار امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ سفر میں تھے اونٹ پر چلتے ہوئے نیند آ گئی اور بالکل طلوع شمس کے قریب آنکھ کھلی جلدی سے اتر کر وضو کیا نماز شروع کی امام ابو یوسفؒ امام بنائے گئے امام ابو یوسفؒ نے چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھیں اور تمام ارکان میں تخفف کی رکوع اور سجدہ وغیرہ جلدی جلدی ادا کیا اس وقت کوئی زاہد خشک ہوتا تو یوں کہتا کہ نماز ناقص ہوئی مگر امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے نماز کے بعد فرمایا۔

الحمد لله صار یعقوبنا فقیها

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یعقوب۔ یعنی امام ابو یوسف فقیہہ ہو گئے۔

اس وقت ان کا نماز میں جلدی کرنا تفقہ کی علامت تھی کیونکہ طلوع شمس قریب تھا اگر وہ جلدی نہ کرتے تو نماز قضا ہو جاتی اور گناہ ہوتا دوسرے ادا نماز کا درجہ قضا سے بہت بڑھا ہوا ہے پس اس وقت جلدی کرنے ہی سے نماز کامل ہوئی خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھنے سے ناقص ہوتی مگر ان باتوں پر فقیہ کی نظر ہی پہنچ سکتی ہے کہ اس وقت جلدی مناسب ہے یا ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا مناسب ہے جاہل تو ہر حالت ایک سی ہی نماز پڑھے گا چاہے وہ ادا ہو یا قضا ہو جائے یا رفقاء کو ایذا ہونے لگے۔

چنانچہ ایک بزرگ ہمارے ساتھ سفر میں تھے راستہ میں مغرب، کی نماز پڑھی گئی تو اس بندہ خدا نے فرض وسنت کے بعد صلوٰۃ الاوابین شروع کر دی اب جب تک ان کی صلوۃ الاوابین ختم نہ ہو گئی سب رکے رہے تمام رفقاء کو تکلیف ہوئی۔

اسی طرح ایک اور بزرگ کے ساتھ لوگ سفر میں چل رہے تھے ظہر کی نماز کا وقت آیا تو وہ حضرت فرضوں کے بعد وظیفہ پڑھنے بیٹھ گئے لوگوں نے کہا سوار ہو جائیے تو آپ فرماتے ہیں کہ میں تو ظہر سے عصر تک بیٹھا کرتا ہوں میں عصر سے پہلے نہیں اٹھ سکتا تمام رفقاء سخت پریشان ہوئے اور آئندہ کو عہد کر لیا کہ ان کے ساتھ کبھی سفر نہ کرنا چاہئے۔

تو یاد رکھو ایسی پابندی میں محض صورت عمل ہوتی ہے حقیقت نہیں ہوتی کیونکہ اس وقت

شریعت کا حکم ہے کہ معمول کو ترک کر کے ضروری پر اکتفا کرو اور رفیقوں کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔

حدیث میں جریج عابد کا قصہ آتا ہے کہ وہ اپنے صومعہ میں شریک عبادت تھے کہ نیچے سے ان کی ماں نے پکارا وہ دل میں کہنے لگے کہ اے اللہ ادھر میری ماں پکار رہی ہے اور ادھر میری نماز ہے میں کیا کروں بالآخر وہ نماز ہی میں کہنے لگے ماں نے چندبار پکارا مگر انہوں نے جواب نہ دیا اس وقت شریعت کا حکم یہ تھا کہ وہ بول پڑتے اور نماز کا بعد میں اعادہ کر لیتے کیونکہ نماز فرض نہ تھی نفل تھی اور ماں کو اطلاع نہ تھی کہ یہ نماز میں مشغول ہیں اس وقت جواب نہ دینے سے اس کو کلفت ہوتی تھی۔ چنانچہ اس نے دو تین بار آواز دینے کے بعد یہ دعا کی جس کا لمبا قصہ حدیثوں میں آتا ہے حضورؐ نے اس واقعہ نقل کر کے فرمایا۔

لو كان فقيها لاجاب امه

یعنی اگر جریج فقیہہ ہوتے تو اپنی ماں کو ضرور جواب دیتے خاموش نہ رہتے۔

دیکھئے اس وقت حضور نے نماز توڑ دینے کو افضل قرار دیا۔

حق اللہ وحق العباد

حضرت جریج کو یہ شبہ ہوا تھا کہ نماز حق اللہ ہے اور ماں کو جواب دینا حق العبد، ہے اور حق اللہ حق العبد سے مقدم ہے اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دوسرا مقدمہ تو صحیح ہے کہ حق اللہ حق العبد سے مقدم ہے مگر پہلا مقدمہ غلط ہے کہ اس وقت ماں کو جواب دینا محض حق العبد ہی تھا ان کو بوجہ عدم تفقہ کے یہ خبر نہ تھی اس وقت نماز کا توڑنا اور ماں کو جواب دینا حق اللہ بھی ہے کیونکہ اس وقت اسی کا امر تھا اور جس وقت جس چیز کا امر ہو وہ حق اللہ بھی ہے محض حق العبد نہیں گو ظاہر میں بندہ سے اس فعل کا تعلق ہو۔

اس غلطی میں سب لوگ مبتلا ہیں کہ جس فعل کا تعلق عبد سے دیکھتے ہیں، اسکو حق العبد ہی سمجھتے ہیں حالانکہ جب وہ شرعاً ماموربہ ہے تو حق اللہ بھی ہے اور حقوق العباد سب کے سب مامور بہا ہیں تو وہ حق اللہ سے خالی نہیں پس کسی بندہ کے واسطے نماز توڑ دینا درحقیقت حق اللہ کی رعایت ہے کیونکہ اسوقت خدا تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔

ابھی کل پرسوں کا واقعہ ہے کہ میں صبح کی سنتیں پڑھ رہا تھا کہ بڑے گھر سے آدمی دوڑا ہوا یہ خبر لایا کہ گھر میں سے کوٹھے کے اوپر سے گر گئی ہیں میں نے خبر سنتے ہی فوراً نماز توڑ دی یہاں تو سب سمجھ دار لوگ ہیں مگر شاید بعض ناواقف اپنے دل میں اس وقت یہ کہتے ہوں کہ ہائے بیوی کے واسطے نماز توڑ دی بیوی سے اتنا تعلق ہے کہ خدا کی عبادت کو اس کے لئے قطع کر دیا۔ بے شک اس وقت اگر کوئی دکاندار پیر ہوتا وہ ہرگز نماز نہ توڑتا کیونکہ اس سے جاہل مریدوں کی نظر میں ہیٹی ہوتی مگر الحمدللہ مجھے اس

کی پرواہ نہیں کہ کوئی کیا کہے گا اگر کسی کی نظر میں اس فعل سے میری ہیٹی ہوئی وہ شوق سے کوئی دوسرا شیخ تلاش کرلیں جب خدا کا حکم تھا کہ اس نماز کو توڑ دو تو میں کیا کرتا کیا اس وقت جاہلوں کی نظر میں بڑا بننے کے لئے میں حکم خداوندی کو چھوڑ دیتا اور جریج عابد کی طرح نماز میں مشغول رہتا وہ تو اس حکم سے ناواقف تھے اس لئے معذور تھے مگر میں بحمد اللہ اس حکم سے ناواقف نہ تھا ظاہر ہے کہ جب بیوی کوٹھے پر سے گری تو اس کی چوٹ کو شوہر ہی ہلکا کر سکتا ہے اور وہی دریافت کر سکتا ہے کہ چوٹ کہاں لگی کہاں نہیں لگی خصوص ایسی حالت میں کہ گھر کے اندر بجز ایک نا سمجھ بچی کے اور ایک معذور بڑھیا کے کوئی امداد کرنے والا بھی نہ تھا اور امداد کرنے والے ہوں بھی تو کوٹھے سے گر جانا بعض دفعہ ہلاکت کا سبب ہو جاتا ہے فوراً ہی کوئی تدبیر ہو جائے تو زندگی کی آس ہو سکتی ہے اس لئے بھی مجھ کو فوراً جانا ضروری تھا اس لئے میں نے شرعاً نماز کا توڑ دینا اور فوراً جا کر ان کی خبر گیری کرنا ضروری سمجھا۔

حدیث میں آتا ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ فرما رہے تھے کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہ میں سے کوئی ایک صاحبزادے مسجد میں آگئے اس وقت وہ چھوٹے بچے تھے چلتے ہوئے لڑکھڑاتے تھے تو حضورؐ نے خطبہ توڑ کر انکو دور ہی سے گود میں اٹھا لیا حالانکہ خطبہ بحکم صلوٰۃ ہے جو بدون کسی سخت عذر کے قطع نہیں ہو سکتا۔

تو جب حضورؐ نے نواسوں کے لئے خطبہ توڑ دیا تو میں کیا چیز تھا کہ اتنے بڑے حادثے کے وقت سنتوں کی نیت نہ توڑتا اس میں بیوی کی رعایت نہ تھی بلکہ حق تعالیٰ کی رعایت تھی کیونکہ اس وقت خدا کا حکم یہی تھا خدا کے حکم کے سامنے بیوی کیا چیز ہے اگر حق تعالیٰ کسی وقت بیوی کے قتل کا حکم دیں تو سچا مسلمان ایسا بھی کر دے گا اور جہاں وہ اس کی خبر گیری کا حکم دیں وہاں وہ اس کے لئے نماز بھی توڑ دے گا اور دونوں صورتوں میں دونوں فعلوں کا سبب حق اللہ ہی ہو گا پس جس جگہ شریعت ترک معمولات کا امر کرتی ہو جیسے سفر میں رفقاء کی رعایت سے فرائض وسنن موکدہ پر اکتفا کرنا یا جس جگہ نماز توڑنے کا امر کرتی ہو جیسے کسی مسلمان کی حفاظت وخبر گیری کے لئے ایسا کرنا وہاں معمولات کی پابندی کرنا غلو فی الدین اور تقویٰ کا ہیضہ ہے۔

پابندی طریق کی حقیقت

فقہاء نے لکھا ہے کہ جو شخص ایک دانہ گیہوں کی تعریف یعنی تشہیر کرتا پھرے کہ یہ دانہ کس کا ہے اس پر تعزیر جاری کی جائے آخر کیوں اسی لئے تو کہ یہ ورع نہیں بلکہ ورع کا ہیضہ ہے پس ہمارے اندر بعض لوگ تو وہ ہیں جو پریشانی کے وقت طریق کو بالکل ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں اور بعض و،

ہیں جو اپنی وضع بنانے کے لئے طریق پر غلو کے ساتھ جمے رہتے ہیں لیکن مقصود کو چھوڑ بیٹھتے ہیں کیونکہ ان کی نیت اس وقت معمولات کی پابندی سے امتثال امر اور طلب رضائے حق نہیں بلکہ محض اپنی وضع کو قائم رکھنا ہے اور یہ طریق ایسا نہیں جو بلا قصد کے بھی موصل ہو سکے یہاں تو ہر وقت ارادہ امتثال امر کی ضرورت ہے جس عمل میں امتثال امر کی نیت نہ ہوگی وہ عمل موصل نہ ہوگا۔

پس جہاں شریعت تھوڑی دیر کے لئے ترک معمولات کا امر کرتی ہو وہاں بھی معمولات پر جمارہنا یہ پابندی طریق محض صوری ہے جس میں مقصود کا پتہ بھی نہیں۔

پس میں نے جو پہلے بیان میں مصائب کے وقت پابندی اعمال کی ضرورت کو ظاہر کیا تھا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک شریعت ترک معمولات کا امر نہ کرے اس وقت تک تو معمولات کو ترک نہ کرے اور جس وقت جتنی دیر تک ترک معمول کا امر کرے اس وقت اتنی دیر تک معمول کو ترک کر دے اور اس حالت میں معمول کو ترک کر دینا بھی پابندی طریق میں داخل ہے کیونکہ اس وقت اس میں امتثال امر ہے اور پابندی طریق امتثال امر و نہی کا نام ہے مثلاً سفر میں قصر کا[1] امر ہے وہاں تمام کرنا گو ظاہر میں پابندی طریق ہے مگر حقیقت میں پابندی نہیں کیونکہ خلاف امر ہے خلاصہ یہ کہ پابندی طریق کی حقیقت مامور بہ کو بجالانا ہے اور یہی ماعلیہ الصبر ہے باقی یہ بات کہ کہاں ترک معمول مامور بہ ہے کہاں نہیں اور جہاں ترک معمول کا امر ہے وہ کتنی دیر کے لئے علم شریعت اور محققین کی صحبت سے معلوم ہو سکتی ہے کیونکہ شریعت ترک معمولات کا امر کسی ضرورت شدیدہ ہی سے کرتی ہے اور قاعدہ ہے کہ! الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ۔ (ضروری بقدر ضرورت ہوتا ہے)

اس لئے ضرورت سے زیادہ معمول کو ترک کرنا صبر کے خلاف ہوگا اور اس وقت یہ ترک ما علیہ الصبر میں داخل نہ ہوگا۔ خوب سمجھ لو۔

اعمال کی قسمیں

لیکن یہاں بعض ناواقفوں کو ایک دھوکا ہوتا ہے میں اس کو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اہل علم کو

---

[1] یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ضرورت کے وقت اگر ایک معمول نہ ہو سکے مثلاً سفر میں تہجد و اشراق کی پابندی نہ ہو سکے تو ان اعمال کے وقت ذکر اللہ ہو سکتا ہے لہذا اس وقت کو ذکر سے خالی نہ چھوڑے۔ خواہ تلاوت قرآن کرلے یا ذکر لسانی جہر یا خفا کے ساتھ کرے غرض اس کو یاد خدا سے خالی نہ جانے دے تا کہ دل کو اس وقت خاص میں معمول کا خیال رہے یہ بھی پابندی کا قائمقام ہے فقہاء نے لکھا ہے کہ حائضہ کو نماز کے وقت میں وضو کر کے مصلے پر بیٹھ کر کچھ دیر سبحان اللہ والحمد للہ کی تسبیحیں پڑھ لینا چاہئے تا کہ نماز کی عادت باقی رہے فقہاء نے اس راز کو سمجھا ہے لہذا یہ غلطی ہے کہ سفر یا مرض میں اوقات عبادت کو سہل ذکر میں بھی مشغول نہ کیا جائے۔ ۱۲۔ جامع

معلوم ہے کہ اعمال تین قسم کے ہیں۔ایک وہ جو دین میں نافع ہیں ان کا تو کرنا مامور بہ ہے خواہ درجہ فرضیت ووجوب میں ہو یا درجہ سنت واستحباب میں اور بعض وہ ہیں جو دین میں مضر ہیں ان کا ترک مامور بہ ہے خواہ درجہ حرمت میں ہو یا کراہت میں اور بعض وہ ہیں جن کے فعل یا ترک کا امر نہیں وہ مباحات ہیں۔

پہلی دو قسموں کا ما علیہ الصبر میں داخل ہونا تو ظاہر ہے کیونکہ وہ مامور بہ ہیں خواہ فعلا ہو یا ترکا۔لیکن مباحات کو اکثر مامور بہ سے خارج سمجھتے ہیں کیونکہ ظاہر میں وہ مامور بہ فعلا یا ترکا نہیں ہیں مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیسری قسم بھی پہلی ہی دو قسموں میں داخل ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ اپنے اثر کے لحاظ سے مباحات دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ دین کے لئے نافع ہیں جیسے بغرض حفظ صحت چلنا پھرنا ورزش کرنا یا نافع نہیں اگر دین میں نافع ہے تو وہ فعل مامور بہ ہے گو درجہ وجوب میں نہ ہو مگر جب مباح نافع فی الدین کو اچھی نیت سے کیا جائے تو وہ مستحب ضرور ہو جاتا ہے اور اس میں ثواب بھی ملتا ہے یا وہ دین میں نافع نہیں تو فضول ہے اور فضولیات کا ترک کر دینا مامور بہ شرعا ہے چنانچہ حدیث میں ہے۔

من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ (الکامل لابن عدی ۳:۷۰۴،۶،۵۸۸۴: ۲۳۴۱)

اسلام کی خوبی اور کمال یہ ہے کہ مالایعنی کو ترک کر دیا جائے

جب فضولیات کے ترک کو حسن اسلام میں دخل ہے اور حسن اسلام مامور بہ اور مطلوب ہے تو ان فضولیات کا ترک بھی مامور بہ ہو گیا گو ان کو حرام نہ کہا جائے مگر فضولیات میں اشتغال کراہت سے خالی نہیں پس مباحات کا مامور بہ سے خارج ہونا اس لحاظ سے ہے کہ اس کی ذات من حیث ہی ذات دین کے لئے نافع یا مضر نہیں لیکن اثر کے لحاظ مباح یا نافع ہے یا فضول ہے اور فضول کا حسن اسلام کے لئے مضر ہونا حدیث سے معلوم ہو چکا ہے تو یوں کہنا چاہئے کہ مباح بھی یا نافع ہے یا مضر تو مال کے اعتبار سے وہ بھی مامور بہ میں داخل ہے جس کے بعض افراد فعلا مامور بہ ہوتے ہیں اور بعض ترکا۔لہذا یہ بھی ما علیہ الصبر سے خارج نہیں تو ہم کو مصائب میں جس طرح، حرام اور مکروہ سے بچنا ضروری ہے اسی طرح فضولیات سے بچنا بھی ضروری ہے۔

لوگوں کو فضولیات سے بچنے کا بہت ہی کم اہتمام ہے اسی لئے مصائب کے وقت بے کار تذکروں میں وقت گزارتے ہیں اور اس کو صبر کے خلاف نہیں سمجھتے حالانکہ جب صبر کی حقیقت امتثال امر ہے تو فضولیات میں مشغول ہونا خلاف صبر کیوں نہ ہوگا جبکہ جب شارع علیہ السلام ترک

مالا یعنی کا امر ترغیب کے صیغے سے فرمارہے ہیں اہل اللہ کو اس کا اس قدر اہتمام ہوتا ہے کہ ایک بزرگ ایک فضول بات زبان سے نکلنے پر تیس برس تک روئے تھے مگر بعض لوگ اس میں بھی غلو کرتے ہیں کہ جب وہ فضولیات سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں تو خشک بن کر بیٹھ جاتے ہیں کوئی ان کے پاس آئے تو مزاج پرسی کو بھی فضول سمجھتے ہیں اور جو دوسرا ان کی مزاج پرسی کرے تو ناک منہ چڑھاتے ہیں اور جب وہ کسی کام کو ہنستے دوڑتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیسا کامل ہو جو فضول افعال میں مبتلا ہے دوڑتا بھی ہے ہنستا بھی ہے۔

اس غلطی کا منشا یہ ہے کہ ان لوگوں نے بعض مباحات کو ذات کو فضول قرار دے دیا ہے ان کے نزدیک دوڑنا ہنسا دیر تک کسی سے باتیں کرنا مطلقا فضول ہے حالانکہ کوئی مباح اپنی ذات سے فضول نہیں بلکہ مباح کا نافع یا فضول ہونا اکثر کے تابع ہے جس مباح پر کوئی نفع دینی مرتب نہ ہو اور نہ اس میں نفع دینی کا قصد ہو وہ فضول ہے اور جس پر نفع مرتب ہو یا اس میں کسی دینی نفع کا قصد ہو وہ فضول نہیں بلکہ نافع ہے اور مامور بہ کہ فرد ہے پس ناقص کا کامل کے دوڑتے ہنسنے اور بہت باتیں کرنے پر اعتراض کرنا اس کے فہم کا قصور ہے کامل محض نفس کے لئے یہ کام نہیں کرتا بلکہ وہ ان افعال میں دینی نفع کا قصد کرتا ہے اس لئے اس کے حق میں یہ افعال ،فضول نہیں۔

حسن معاشرت

خبر بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گا ہے صحابہؓ سے مزاح فرمایا کرتے تھے اور حضورؐ نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ کی ہے تو کیا تمہارے نزدیک معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی یہ کام فضول کئے ہیں معلوم ہوا کہ کوئی مباح اپنی ذات سے فضول نہیں بلکہ ہوسکتا ہے کہ جن کاموں کو تم فضول سمجھتے ہو ان میں ابھی کوئی دینی حکمت ہو چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں ایک حکمت مناسب نبوت تھی وہ یہ کہ آپ کا جلال خداداد بہت بڑھا ہوا تھا جو صحابہؓ کو آپ کے سامنے دل کھول کر بات کرنے سے مانع تھا اس لئے آپ نے ان کو اپنے سے بے تکلف کرنے کے لئے مزاح شروع فرمایا کیونکہ افادہ واستفادہ کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ طرفین کے دل کھلے ہوئے ہوں کسی کو انقباض نہ ہو۔ انقباض مانع فیض ہوتا ہے خواہ طالب کی طرف سے ہو یا مربی کی طرف سے ہو اسی طرح ہر کامل کے ہنسی اور مزاح میں اس کے مناسب حال کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے جس پر ناقص کی نظر نہیں پہنچتی اسلئے وہ اعتراض کرتا ہے۔

حضورؐ نے جو حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ کی ہے اس میں یہ حکمت تھی کہ آپ نے امت کو تعلیم دی ہے کہ اگر زیادہ عمر والا کمسن لڑکی سے، شادی کرے تو اس کو یہ نہ چاہئے کہ اپنی طرح اس بچی کو بھی دانا بنا کر رکھے بلکہ اس کے جذبات کی بھی رعایت کرے بچیوں کی طبیعت کھیل کو چاہا کرتی ہے تو اس کو اس کا موقع دینا چاہئے اور اگر وہ شوہر کے لحاظ وادب سے کھیل کو دشرم کرتی ہو تو اس کو صرف قولا ہی نہیں بلکہ عملا اجازت دینی چاہئے اسی لئے آپ خود حضرت عائشہ کے ساتھ دوڑے اور بعض دفعہ آپؐ نے ان کو حبشی بچوں کا کھیل بھی دکھلایا جو مسجد کے فناء میں نیزوں سے کھیل رہے تھے ان کو گڑیوں سے کھیلنے کی بھی اجازت دی اور کبھی ایسا ہوتا کہ محلہ کی لڑکیاں حضورؐ گھر میں تشریف لاتے دیکھ کر گڑیوں کے کھیل سے متفرق ہو جاتیں تو آپ ان کو جمع کر کے لاتے کہ میں کچھ نہیں کہتا تم، اطمینان سے کھیلو۔

ان سے امور میں امت کو تعلیم دی گئی ہے کہ بوڑھا مرد کمسن لڑکی سے شادی کر کے اس کے ساتھ کیونکر معاشرت کرے پس چونکہ حضورؐ کے ان افعال کو حسن معاشرت میں دخل ہے جو شرعا مطلوب ہے نیز امت کو بھی حسن معاشرت کی تعلیم ہے اس لئے یہ فضول نہیں ہیں، مگر ناقصین کی نظر چونکہ صورت ہی پر پہنچتی ہے حکمت تک نہیں پہنچتی اس لئے وہ کامل پر اعتراض کر دیتے ہیں اسی لئے کفار کہتے تھے۔

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ

یہ کیسے رسول ہیں جو ہماری طرح کھاتے پیتے ہی اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں۔

انبیاء نے ایسے اعتراضوں کا جواب دیا۔

اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ

بے شک ہم تم جیسے ہی بشر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس پر چاہتے ہیں احسان فرما دیتے ہیں۔

بس ہم میں اور تم میں اتنا فرق ہے کہ ہم پر خدا تعالیٰ کا خاص احسان ہے اور تم پر وہ احسان نہیں غرض صورت میں کامل اور غیر کامل یکساں معلوم ہوتا ہے کامل کو من الہی سے امتیاز ہوتا ہے اور من خداوندی کی اطلاع کسی کو نہیں ہو سکتی بجز اس کے جس کی آنکھیں ہوں اس لئے کامل کا پہچاننا بڑا مشکل ہے مولانا فرماتے ہیں:

در نیابد حال پختہ ہیچ خام ۔۔۔ پس سخن کوتاہ باید والسلام

(جب خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا تو طویل کلام سے کیا فائدہ، سلامتی اسی میں ہے کہ ان مضامین سے سکوت کیا جائے)

یہ بڑی غلطی ہے کہ ناقص کامل کو اپنے اوپر قیاس کرنے لگے اور ان کو زیادہ باتیں کرتے

ہوئے دیکھ کر یہ سمجھنے لگے کہ وہ بھی اسی طرح لایعنی میں مشغول ہیں کیونکہ کاملین کو حق تعالیٰ ایک ایسا ذوق عطا فرما دیتے ہیں جس سے باتیں کرتے کرتے ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب خاموشی کی حد آگئی ہے اس وقت وہ فوراً خاموش ہو جاتے ہیں اور ناقص کو یہ ذوق حاصل نہیں وہ اگر زیادہ باتیں بنائے گا تو ضرور لایعنی میں مبتلا ہو گا اس لئے اس کو زیادہ باتیں کرنا مضر ہے اور کامل کو مضر نہیں۔

ناقص و کامل کا فرق

کاملین کی باتیں بھی ذکر ہی ہوتی ہیں۔ اور جس کی کھلی دلیل یہ ہے کہ ان کی باتوں سے خواہ وہ دین کے متعلق ہوں یا دنیا کے اہل مجلس پر ذکر اللہ کا اثر غالب ہوتا ہے اور جتنی دیر تک بھی کوئی ان کے پاس بیٹھا باتیں سنتا رہے حق تعالیٰ ہی کے طرف متوجہ رہے گا اور ناقص کی باتوں میں یہ اثر نہیں ہوتا۔

ایک دفعہ مولانا فتح محمد صاحب کو حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ کی خدمت میں زیادہ دیر لگ گئی اور اٹھتے وقت بطور معذرت کے حضرت سے عرض کیا کہ آج حضرت کا بہت حرج ہوا کیونکہ یہ وقت عبادت کا تھا فرمایا کہ میاں کیا تسبیح چلانا ہی عبادت ہے دوستوں سے باتیں کرنا بھی تو عبادت ہے کیونکہ اس میں تطییب قلب مسلم ہے۔

ایک بار میرا نام لے کر فرمایا کہ میاں اشرف علی جب ہم مجلس میں باتیں کرتے ہوں اسوقت بھی تم ہمارے باطن کی طرف متوجہ رہا کرو یہ مت سمجھنا کہ اس وقت تو باتوں میں مشغول ہیں اس لئے باطن سے فیض نہ ہوگا بھائی ہمارا باطن اس وقت بھی ذکر ہی میں مشغول ہوتا ہے۔

تو بات کیا ہے اس کا راز یہی ہے کہ کامل باتیں بھی عبادت ہی کی نیت سے کرتا ہے اس کا باطن اس وقت بھی مشغول بحق ہوتا ہے اسی لئے اسکو معلوم ہوتا رہتا ہے کہ اب خاموشی کا وقت ہے اور اس وقت بولنے کی ضرورت ہے، اس وقت مزاح کی ضرورت ہے، تو اس کا کوئی قول یا فعل عبادت و ذکر سے خالی نہیں ہوتا اس لئے کامل کو ہنسی مزاح اور زیادہ باتوں میں مشغول دیکھ کر اپنے اوپر قیاس کر کے اس پر اعتراض نہ کرنا چاہئے جن باتوں کو تم فضول سمجھتے ہو وہ کسی حکمت یا ضرورت کی وجہ سے ان میں مشغول ہوتا ہے۔

صوفیاء نے اس کو خوب سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ خلوت طویلہ سے طبیعت گھبرا جائے تو چند روز کے لئے خلوت کو چھوڑ کر لوگوں سے ملنا ملانا دوستوں سے باتیں کرنا اور ہنسی مزاح کرنا چاہئے یا کچھ دنوں کے لئے سفر کر کے کسی شہر میں سیر و تفریح کے لئے چلا جانا چاہئے بلکہ امام غزالیؒ نے تو اس حالت میں ان امور کے اختیار کرنے کو واجب لکھا ہے، جس کی وجہ سے ان پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا گیا کہ

انہوں نے مباحات بلکہ بظاہر فضولیات کو واجب کہہ دیا مگر امام کی رائے صحیح ہے کیونکہ قاعدہ فقیہہ ہے

مقدمۃ الواجب واجب کہ واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے

اور جب طبیعت اعمال طاعات سے گھبرانے لگے تو اس کو طاعات کی طرف مائل کرنا واجب ہے ورنہ یہ حالت بڑھتے بڑھتے تعطل کی طرف مفضی ہو جائے گی اور جب کثرت اعمال سے طبیعت اکتا جائے تو اس صورت میں انشراح وانبساط کے لئے اختلاط و سیر و تفریح ومزاح بھی مفید ہوتا ہے اس راز کو محقق ہی سمجھ سکتا ہے غیر محقق تو ایسے موقع میں یہ بتلائے گا کہ۔ یا باسط کا وظیفہ پڑھو یا فتاح کا ورد کرو مگر محقق اس کی رائے پر ہنستا ہے اور کہتا ہے

بے خبر بودند از حال دروں استعیذ اللہ مما یفترون

اندر کے حال سے بے خبر تھے میں ان کے افترا سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔

اس جگہ مولانا نے طبیب الٰہیٰ کا قول نقل فرمایا ہے کہ اس نے دوسرے اطباء کی رائے سن کر یہ کہا ہے۔

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند آن عمارت نیست ویراں کردہ اندر

انہوں نے کہا کہ ان لوگوں نے جو دوا بھی کی ہے یہ تعمیر نہیں بلکہ تخریب ہے۔

سو غیر محقق تو اس موقع پر ایک وظیفہ اور بڑھا دیتا ہے یہ نہیں دیکھتا کہ وظیفوں ہی سے تو یہ حالت پیدا ہوئی مگر وہ الٹا اور وظیفہ ہی بڑھاتا چلا جاتا ہے تو اس سے مرض کم ہوگا یا بڑھے گا ظاہر ہے کہ جب سبب مرض میں اضافہ ہوگا تو مرض کو بھی ترقی ہوگی محقق اس وقت علاج بالضد کرے گا وظیفوں سے قبض ہوا ہو تو وہ ترک وظائف کی تعلیم کرتا ہے خلوت سے انقباض ہو تو وہ ترک خلوت کا امر کرتا ہے اور اس سے بہت جلد حالت میں افاقہ ہوتا ہے۔

میرے ایک دوست تھے مولوی صادق الیقین صاحبؒ مرحوم وہ بیعت تو حضرت حاجی صاحب سے تھے اور اجازت یافتہ حضرت مولانا گنگوہی کے تھے مجھ سے بھی ان کو محبت وعقیدت کا تعلق تھا ایک دفعہ ان پر قبض شدید طاری ہوا تو مجھے اطلاع کی کیونکہ میں اس وقت ان کے وطن سے قریب کانپور میں تھا میں نے لکھا کہ آپ کچھ دنوں کو ذکر و شغل اور خلوت بالکل ترک کر دیجئے اور لکھنؤ جا کر چوک وغیرہ میں سیر و تفریح کیجئے اول تو ان کو اس جواب سے بڑی وحشت ہوئی مگر انہوں نے اس پر عمل کیا اس طریق میں انقیاد و اتباع کی بہت ضرورت ہے خود رائی اس طریق میں سد راہ ہے چنانچہ انہوں نے انقیاد سے کام لے کر فوراً عمل کیا۔ وہی تین دن میں سارا قبض جاتا رہا اور شدت سے بسط طاری ہوا۔

اب ایسا شخص اگر ہنسی مزاح میں مشغول ہوگا تو ظاہر ہے وہ علاجاً ایسا کر رہا ہے اور ضرورت کی وجہ سے ان کو اختیار کر رہا ہے مگر ظاہرین کو کیا خبر وہ تو صرف دیکھ کر کہ یہ شخص زاہد و عابد ہو کر اور شیخ و صوفی ہو کر ہنسی مذاق کر رہا ہے اس کو یہ کیا معلوم ہے کہ اس وقت اس کا ہنسنا اور مزاح کرنا ہی عبادت ہے کیونکہ مقدمہ واجب ہے۔

مباحات اور فضولیات

غرض جن امور مباحہ کو فضول کہا جاتا ہے وہ اسی وقت تک فضول ہیں جب ان سے دین میں کوئی نفع نہ ہو اور اگر کوئی مباح دین میں نافع ہو تو وہ فضول نہیں اس لئے بے ضرورت مباحات میں مشغول ہونا بھی برا اور ضرورت کے وقت مشغول نہ ہونا بھی برا پس ثابت ہو گیا کہ مباحات بھی اپنے اثر کے اعتبار سے مامور بہ میں داخل ہیں بحمد اللہ اس تقریر سے ماعلیہ الصبر کی تعیین بخوبی ہو گئی اور صبر کی حقیقت بھی اچھی طرح واضح ہو گئی شبہات کا ازالہ بھی ہو گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ناگوار واقعات کے وقت دو چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں ایک یہ کہ جو طریق حق تعالیٰ کی طرف پہنچنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے اس میں تو خلل نہیں آیا خواہ وہ واجبات ہوں یا مستحبات کیونکہ مستحبات کی پابندی بھی خواص کے لئے ایک درجہ میں ضروری ہے حدیث میں ہے:

احب الاعمال الی اللہ ادومھا (الصحیح لمسلم: المسافرین : ۲۱۸)

کہ حق تعالیٰ کی طرف سے سب اعمال میں زیادہ محبوب وہ ہیں جن پر دوام کامل ہو۔

اس میں لفظ احب عاشق کی نظر میں دوام کی ضرورت کو بتلا رہا ہے کیونکہ جب ایک چیز حق تعالیٰ کو محبوب ہے تو عاشق کو ان کے سامنے محبوب ہی چیزیں پیش کرنا لفظ احب سے دوام کی عدم ضرورت پر ہی استدلال کرے گا جس میں محبت و عشق نہ ہو ورنہ عاشق تو یہ سن کر کہ محبوب فلاں چیز سے خوش ہوتا ہے اس پر جان نثار کر دے گا اور جب تک محبوب ہی منع نہ کرے اس وقت تک اس کو اپنے ذمہ لازم کر لے گا۔

میں پوچھتا ہوں کہ آخر عبادت اور عمل سے مقصود کیا ہے ظاہر ہے رضائے حق مطلوب ہے تو عامل کو ضروری ہے کہ عمل اس طرح کرے اور اس میں وہ طریق اختیار کرلے جس سے محبوب خوش ہوتا ہے اور حدیث سے معلوم ہو چکا کہ حق تعالیٰ دوام سے خوش ہوتے ہیں تو دوام کا اہتمام ضروری ہے اور دوسری حدیث میں تو اس کی تصریح ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

یا عبد اللہ لا تکن مثل فلان کان یقوم من اللیل ثم ترک (الصحیح للبخاری ۶۸:۲)

اے عبد اللہ بن عمرؓ تم فلاں شخص کی طرح نہ ہو جانا جو رات کو اٹھا کرتا تھا پھر قیام لیل ترک کر دیا۔

اس میں حضورؐ نے ایک معمول مستحب کے ترک پر صراحتہ کراہت کا اظہار فرمایا ہے پس ثابت ہوا کہ مستحب کو معمول بنا کر بلا عذر ترک کر دینا ایک گونہ مکردہ ہے تو دوام ضروری ہے۔

اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ عمل تھوڑا سا اختیار کرو جس پر نباہ ہو سکے اور اگر کسی وقت زیادہ کا شوق ہو تو میں کہتا ہوں کہ اس وقت زیادہ کر لو مگر اپنے ذمے زائد کو لازم نہ سمجھو کبھی نشاط وسرور ہو تو زیادہ بھی کر لو مگر اس کی پابندی کو لازم نہ سمجھو اس کی صورت میں اگر کبھی زیادہ نہ ہو سکا تو قلیل کو ادا کر کے تسلی ہو جائے گی کہ ہاں معمول پورا ہو گیا کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ بغیر معمول پورا کیے تسلی نہیں ہوتی اور یہی حکمت ہے صوفیاء کے اس فعل کی کہ وہ طالبین کے لئے ذکر کی کوئی مقدار معین کر دیتے ہیں حالانکہ ذکر ایسی چیز ہے کہ اس کے لئے کوئی مقدار معین نہ ہونا چاہئے جتنا بھی زیادہ ہو اچھا ہے مگر بغیر تعیین مقدار کے ذاکر کی تسلی نہیں ہو سکتی وہ ہر دن اسی فکر میں رہے گا کہ نہ معلوم جتنا ذکر میں کر رہا ہوں یہ وصول الی المطلوب کے لئے کافی بھی ہے یا نہیں اور جب شیخ نے ایک مقدار معین کر دی اب اس کو پورا کر کے تسلی ہو جاتی ہے۔

اس طریق میں تسلی قلب و جمعیت خاطر کی رعایت بہت ضروری ہے اس لئے اپنے ذمہ عمل اتنا ہی لازم سمجھو جسکو نباہ سکو زیادہ کو معمول نہ بناؤ تا کہ روزانہ قلب کو تسلی حاصل ہوتی رہے کہ کام پورا ہو گیا۔

جمعیت قلب

اہل اللہ کو جمعیت قلب کا بہت زیادہ اہتمام ہوتا ہے کیونکہ اس طریق کا مدار اسی پر ہے چنانچہ ایک بزرگ نے اسی لئے حق تعالیٰ سے عرض کیا تھا کہ میرا عمر بھر کا رزق ایک دم سے مجھے دے دیا جائے ارشاد ہوا کیا ہمارے اوپر اعتماد نہیں، عرض کیا اعتماد تو ہے مگر شیطان مجھے روز آ کر پریشان کرتا ہے کہ کل کو کہاں سے کھاوے گا میں جواب دیتا ہوں کہ اللہ دے گا وہ کہتا ہے کہ اللہ تو دے گا مگر یہ تو وعدہ نہیں کب دے گا ممکن ہے تین چار روز بھوکا رکھ کر دیں پس یہاں آ کر خاموش ہو جاتا ہوں اگر آپ مجھے عمر بھر کا رزق ایک دم سے دے دیں تو میں اس کو اپنے گھر میں بھر کر قفل لگا دوں گا اور جب شیطان کہے کہ کل کو کہاں سے کھاوے گا تو میں کہہ دوں گا کہ دیکھ اس کوٹھڑی میں سے کھاؤں گا۔

ان بزرگ نے جمع وطمع کے ذریعہ سے (مگر طمع من اللہ) جمعیت قلب کو حاصل کرنا چاہا اور بعضے قناعت وتوکل کے ذریعے سے اس کو طلب کرتے ہیں بہر حال کامل کا مطلوب رضا وجمعیت قلب مع اللہ ہے خواہ طمع سے حاصل ہو یا توکل سے جس میں خدا تعالیٰ نے طمع ہی کا مادہ رکھا ہے وہ توکل اور قناعت کو کیونکر اختیار کرے وہ تو طمع ہی ظاہر کر کے جمعیت کا طالب ہوگا۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں　　　خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(جب دین کا بادشاہ مجھ سے طمع کا اظہار کرے تو پھر ایسی قناعت پر خاک)

لیکن وہ مخلوق سے طمع ظاہر نہ کرے گا بلکہ محبوب سے ظاہر کرے گا اسی طرح جس کو خدا تعالیٰ نے راحت کا عادی بنایا ہے وہ راحت ہی کے ذریعہ سے جمعیت طلب کرے گا اچھے کپڑے پہنے گا اچھا کھانا کھائے گا اور جب تک حق تعالیٰ ہی مشقت نہ بھیجیں اس وقت تک وہ اپنے اختیار سے طریق مشقت کو کبھی اختیار نہ کرے گا اور جب حق تعالیٰ اس کو مشقت میں ڈالتے ہیں تو اس میں دوسروں سے زیادہ رضا و تحمل ظاہر ہوتا ہے اور یوں کہتا ہے

ناخوش تو خوش بود برجان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

تیری ناخوشی میرے دل کی خوشی ہے اور میرا دل، دل تو تکلیف دینے والے دوست پر قربان ہے اور یوں کہتا ہے

نشود و نصیب دشمن کو شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اس مذاق کا تفویض کلی ہوتا ہے حق تعالیٰ جس حال میں رکھتے ہیں اسی میں خوش رہتا ہے بعض لوگ یہاں آئے اور کہنے لگے کہ یہاں تو فقیری معلوم نہیں ہوتی اچھے کپڑے پہنتے ہیں اچھا کھانا کھاتے ہیں میں نے کہا جاؤ کسی لنگوٹ بند کے یہاں بلکہ کسی ننگ دھڑنگ کے یہاں جسنے لنگوٹہ بھی اتار پھینکا ہو۔

آج کل کا مذاق

آج کل بہت لوگ اسی مذاق کے ہیں کہ ننگ دھڑنگ آدمی کے جلدی معتقد ہو جاتے ہیں اور وہ انہیں گالیاں بھی دے تو راضی رہتے ہیں بلکہ اگر کفریات بھی بکے جب بھی معتقد رہتے ہیں حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ کہیں چلے جاتے تھے راستہ میں ایک مجمع دیکھا معلوم ہوا کہ بیچ میں ایک ننگ دھڑنگ آدمی بیٹھا ہوا کم بخت کفریات بک رہا ہے۔ نالائق اپنے عضو کو ہلا ہلا کر کہتا ہے کہ توبہ توبہ یہ تو اللہ کا الف ہے۔ نقل کفر کفر نہ باشد) اور بہت سے لوگ اس کے معتقد ہو رہے ہیں شاہ صاحب نے اپنے ایک ہمراہی شاگرد سے فرمایا کہ اس شخص کی کمر میں ایک لات مارو اور یہ کہو کہ نامعقول بے پیرا معلوم ہوتا ہے بھلا کہیں الف کے نیچے دو نقطے بھی ہوتے ہیں۔ شاہ صاب جامع فنون تھے۔ ننگوں کا جواب انہی کے مذاق میں دیا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور سارے معتقدین ففرو ہو گئے۔ اس طرح فتنہ فرو ہوا۔

یہ مذاق کچھ آج سے نہیں پرانا مذاق ہے لوگ ہمیشہ سے ایسے شخص کے کم معتقد ہوتے ہیں جو آدمیوں کی شکل میں ہو عقل وتہذیب سے آراستہ ہو چنانچہ کفار کو انبیاء پر یہی اعتراض تھا کہ یہ تو ہمارے جیسے آدمی ہیں وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ نبی کو آدمی نہ ہونا چاہئے یہی مذاق آج کل ہے کہ آدمیت کو کمال کا منافی سمجھتے ہیں چنانچہ جتنا کوئی آدمیت سے گزرا ہو اس کے جلدی معتقد ہو جاتے ہیں۔

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ مصیبت کے وقت معمولات میں کمی نہ کردو اور طریق وصول کی طرف متوجہ رہو۔ ورنہ یاد رکھو اگر تم طلب میں کمی کردو گے تو ادھر سے بھی عطا میں کمی ہو جائے گی۔ حق تعالیٰ اس وقت تک اپنا برتاؤ بندے کے ساتھ نہیں بدلتے جب تک وہ اپنے برتاؤ کو خود نہ بدلے : اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ جب ادھر سے برتاؤ بدلتا ہے تو ادھر سے بھی معاملہ بدل جاتا ہے۔

مصائب اور معمولات

صوفیا کا ارشاد ہے کہ من لا وارد لہ لا ورد لہ: جس کا کچھ ورد نہ ہو اس پر وارد بھی نہیں ہوتا۔ اور اس طریق میں وارد بڑی نعمت ہے۔ جس سے جزئیات میں ہر دم الہام ہوتا رہے کہ اب یہ کرنا چاہئے۔ اس وقت بولنا چاہئے۔ اس وقت خاموش ہونا چاہئے اس طریق کے علوم کتابی نہیں ہیں جو کتاب سے جزئیات کے احکام معلوم ہوتے رہیں یہاں تو ہر جزئی کے لئے الہام کی ضرورت ہے چنانچہ کامل کو ہر وقت الہام پر الہام ہوتا رہتا ہے اور یہ حالت ورد کی پابندی سے ہی حاصل ہوتا ہے بدون ورد کے وارد نہیں ہوسکتا۔

دوسرے یہ تو نادانی کی بھی بات ہے کہ ایک نقصان تو غیر اختیاری ہوا تھا یعنی مصیبت تکوینیہ دوسرا ضرر اپنے اختیار سے مول لیا جائے یعنی ترک معمولات دنیا دار بھی ایسا نہیں کرتے۔ ان کا بھی یہ قاعدہ ہے کہ ایک مد میں نقصان ہوتا ہے تو وہ دوسری مد میں ترقی کی فکر کرتے ہیں۔

حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے زمانہ جاہلیت کے ایک حلیم کی حکایت بیان فرمائی تھی کہ اس کے بھتیجے نے اس کے بیٹے کو قتل کردیا لوگ قاتل کو پکڑ کر اس کے پاس لے گئے۔ تو غایت حلم یہ تھا کہ اس نے اپنی نشست بھی نہیں بدلی جس طرح بیٹھا تھا اسی طرح بیٹھا رہا اور یہ کہا۔

احدی یدی قطعت الاخری میرے ایک ہاتھ نے دوسرے ہاتھ کو کاٹ دیا ہے اب یہ حماقت ہے کہ میں دوسرے ہاتھ کو بھی کاٹ دوں۔

ثم قال ولکن ادوا الی امراتی دیة ابنھا من ابلی فانھا لا ترضیٰ بدونھا

پھر کہا لیکن میری بیوی کو میرے اونٹوں میں سے اس کے بیٹے کی دیت دے دو کیونکہ وہ بغیر دیت کے راضی نہ ہوگی۔

دیکھئے یہ ایک کافر تھا جس نے غیر اختیاری ضرر سے پریشان ہو کر اختیاری ضرر کو گوارا نہ کیا تو ہم کو مسلمان ہو کر ایسا نہ ہونا چاہئے پس یہ بڑی حماقت ہے کہ ہم مصائب غیر اختیاریہ کی وجہ سے اپنے معمولات کو تباہ کر کے اختیاری ضرر میں مبتلا ہوں اس وقت اعمال پر جما رہنا یہی صبر ہے۔۔۔۔۔ایک بات تو یہ قابل لحاظ ہے۔

دوسری بات یہ قابل لحاظ ہے کہ پابندی طریق میں رضائے حق کا قصد کرو محض عادت کے طور پر پابندی نہ کرو۔ پس اگر کہیں ضرورت شدیدہ سے ترک معمول میں رضائے حق معلوم ہو تو وہاں ضرورت کے وقت تک معمول کو ترک کر دو (لیکن ذکر خدا سے اس وقت کو بھی خالی نہ جانے دو چاہے چلتے پھرتے ہی ہو یا آہستہ آہستہ ہی ہو) اور اس ضرورت کے ختم پر پھر پابندی شروع کر دو۔ (ترک معمول سے جو بے برکتی ہوتی وہ جب ہی ہے جب کہ ترک میں رضائے حق نہ ہو ورنہ رضائے حق کے ساتھ ہر حالت میں برکت ہی برکت ہے) جب رضائے حق کا اہتمام ہوگا تو ہر حال میں وہی کام ہوگا جو امر کے موافق ہے کسی حال میں مامور بہ ترک نہ ہوگا اس سے قلب میں ایک حلاوت پیدا ہوگی اور زبان و دل و گوش سب پابند ہو جائیں گے جمعیت و سکون حاصل رہے گا پریشانی کا نام بھی نہ رہے گا اور جب امتثال امر میں خلل ہوتا ہے یا بلا وجہ معمولات ناغہ ہوتے ہیں تو خیالات میں تفرق ہو جاتا ہے اور خیالات کے تفرق سے روح بھی پریشان ہو جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

جاں ہمہ دم زیں لک کوب خیال ... مے شود مجروح و خستہ پائمال
نے صفا میماندش نے لطف و فر ... نے بسوئے آسماں راہ سفر

جان خیال کی دھما چوکڑی سے زخمی اور پائمال ہے نہ اس میں صفائی رہی نہ لطف اور نہ آسمان کی طرف اب سفر ہوتا ہے۔

شیطانی و نفسانی خطرات

صاحبو۔ حق تعالیٰ نے ہر شخص کو آسمان کی طرف سفر کرنے کی قوت عطا فرمائی ہے مگر تشتت اعمال سے ہم اس قوت کو خود ہی کمزور کر رہے ہیں ذکر و طاعات و امتثال امر کی پابندی اور التزام کر کے دیکھو۔ انشاء اللہ خدا کے ساتھ دل لگا رہے گا اور چاروں طرف سے اطمینان نصیب ہوگا۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (خبردار دلوں کو اطمینان اللہ کے ذکر سے ہی حاصل ہوتا ہے عارف کو مصائب میں بھی یہ اطمینان نصیب ہوتا ہے اور اس کا قلب چاروں طرف سے مطمئن ہوتا ہے۔ یہ تو دنیوی پریشانی کا حال تھا اس کی وجہ سے اعمال و معمولات و امتثال امر میں لوگ خلل ڈال دیتے ہیں۔

اب میں ایک باطنی پریشانی کا حال بتانا چاہتا ہوں جو بعض دفعہ پابندی اعمال کے ساتھ پیش آتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض لوگ اعمال و معمولات پر پابندی کرنا چاہتے ہیں مگر جب کام کرنے بیٹھتے ہیں فوراً شیطانی وساوس اور نفسانی خطرات آکر گھیر لیتے ہیں اور بعض دفعہ ایسے واہیات کفریہ وسوسے آتے ہیں جن سے سالک پریشان ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں طریق سے ہٹ گیا اور خدا تعالیٰ کے یہاں سے مردود ہو گیا ہوں اس حالت میں بہت سے لوگ کام کو چھوڑ بیٹھتے ہیں کیونکہ یہ وسوسے کام ہی کے وقت آتے ہیں مگر یہ بڑی غلطی ہے اس طرح تو تم نے شیطان کی مراد پوری کر دی وہ یہی تو چاہتا تھا۔

چنانچہ ایک صاحب نے اس حالت کی وجہ سے تلاوت قرآن مجید بالکل چھوڑ دی تھی کیونکہ جب وہ قرآن پاک پڑھنے بیٹھتے ساتھ ہی ساتھ دل میں خدا اور رسولؐ کی شان میں گالیوں کے خطرات آتے تھے۔ ایک تفسیر تو جلالین کی تھی ایک تفسیر وبالین کی خود بخود ان کے ذہن میں آتی تھی۔ آخر وہ گھبرا گئے۔ اور تلاوت چھوڑ بیٹھے مجھ سے یہ حال بیان کیا میں نے کہا کہ اس کا یہ علاج نہیں اس کا علاج یہ ہے کہ خوب تلاوت کرو اور گالیاں ذہن میں آویں تو آنے دو یہ تو ویسا حال ہو گیا

بحر تلخ و بحر شیریں ہم عناں — درمیاں برزخ لا یبغیان

کڑوا اور شیریں سمندر اکٹھے ہیں درمیان میں ایک برزخ ہے

کام کے ساتھ ان وساوس و خطرات سے کچھ بھی تنزل یا بعد نہیں ہوتا ہاں جب کام چھوڑ دو گے تو بعد کا اندیشہ ہے کہ گو وساوس بھی نہ ہوں اسلئے سالک کو طریق پر قائم ہو کر بے فکر رہنا چاہئے عارف فرماتے ہیں

در طریقت ہرچہ پیش سالک آید خیر اوست — بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

طریقت یہ جو کچھ پیش آتا ہے وہی خیر ہے صراط مستقیم پر جو چل رہا ہے وہ گمراہ نہیں۔

یعنی جب تک مستقیم پر جما رہے یعنی اعمال اختیاریہ میں خلل نہ ڈالے تو بے فکر رہے اب اس کے بعد چاہے بلا اختیار کچھ ہی ہوتا رہے کفر کے وسوسے آویں یا معصیت کے سب بے ضرر ہیں بلکہ بخدا صراط مستقیم پر رہ کر تمام ظلمتیں انوار ہیں جیسے نور عین کے وہ منبع انوار ہے مگر خود سیاہ ہے اور صوفیاء نے فرمایا ہے کہ لطیفہ اخفی کا لون بھی سیاہ ہے۔ اور تجلی ذاتی اصطلاحی سیاہ رنگ میں بھی ظاہر ہوتی ہے پس اگر اعمال

اختیاریہ میں خلل نہیں تو قلب میں کیسی ہی ظلمات ہوں وہ سب خیر ونور ہی ہیں چاہے وساوس کفریہ ہی کیوں نہ ہوں لہذا ان سے گھبرا کر کام میں ہرگز خلل نہ ڈالنا چاہئے اس طرح تو یہ قیامت تک بھی پیچھا نہ چھوڑیں گے اس کا علاج یہی ہے کہ کام میں لگا رہے اور ان پر التفات بھی نہ کرے جب شیطان دیکھے گا کہ یہ تو خطرات سے گھبراتا ہی نہیں نہ کام میں کمی کرتا ہے تو وہ جھک مار کر خود پیچھا چھوڑ دیگا۔

ایک دفعہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو وضو کے بعد شبہ ہوگیا کہ شاید خفین پر مسح نہیں کیا حضرت نے دوبارہ پھر مسح کر لیا بس دوبارہ مسح کرنا غضب ہوگیا فرماتے تھے کہ پھر تو یہ حالت ہوئی کہ ہر دفعہ وضو کر کے جب نماز شروع کروں یہی وسوسہ آوے کہ مسح نہیں کیا مہینہ بھر تک پریشان رہا ایک مہینے کے بعد جو مولانا مصلے پر نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے پھر وہی وسوسہ آیا۔ مولانا نے دوبارہ اعادہ مسح نہیں کیا اور نماز کی نیت باندھ لی شیطان نے کہا کہ بے وضو نماز ہوگی مولانا نے فرمایا کہ ہونے دے تیری بلا سے اس نے کہا بے وضو نماز پڑھ کر کافر ہو جاؤ گے کیونکہ تم عمداً ایسا کر رہے ہو مولانا نے فرمایا کہ تیری بلا سے تو بڑا آدمیوں کو کافر ہونے سے بچانے والا نکلا ہے اتنی دنیا کو تو کافر بنا رکھا ہے تجھے ان کی فکر نہ ہوئی سب سے زیادہ میرے ہی کفر کی فکر ہوئی جا چاہے نماز ہو یا نہ ہو وضو سے ہو یا بے وضو ہو میں تو اب مسح کرتا نہیں فرماتے تھے کہ بس اس دن کے بعد شیطان نے پھر وسوسہ نہیں ڈالا۔

یہ بڑا ہوشیار ہے بعض دفعہ خیر خواہ بن کر دھوکا دیتا ہے چنانچہ ایک بار حضرت معاویہؓ کو تہجد کی نماز کے لئے شیطان نے جگایا۔ پوچھا کون ہے کہا میں ابلیس فرمایا کیوں جگایا کہا تہجد کا وقت ہے نماز پڑھ لیجئے فرمایا کہ تجھے اس سے کیا مطلب تو ایسا خیر خواہ کب سے بن گیا۔ کہا آخر کبھی تو میں بھی کام کرنے والا تھا ہی وہ جوش آ گیا۔ تو فرمایا کم بخت اس وقت تیرے جگانے میں بھی کوئی راز ہے جب تک تو راز نہ بتلائے گا اس وقت تک محض تیرے کہنے سے پیچھا نہ چھوڑوں گا۔ کہا صاحب بات یہ ہے کہ میں نے کل آپ کا تہجد ناغہ کرا دیا تھا اور میں خوش ہوا تھا کہ آج ان کا نقصان کر دیا مگر تم نے جو صبح اٹھ کر تہجد کے فوت ہونے پر رنج وغم اور آہ وافسوس کیا اس سے تمہارے درجے اتنے بلند ہو گئے کہ تہجد سے بھی نہ ہوتے تو میں نے کہا کہ اس سے ان کا تہجد پڑھنا ہی اچھا ہے یہ تو ناغہ کر کے آرام سے نیند بھی لیتے ہیں اور درجہ بھی لیتے ہیں تہجد میں کم از کم نیند تو خراب ہوگی گو آخرت کا نقصان نہ ہوگا حضرت معاویہؓ اٹھ بیٹھے اور تہجد کی نماز پڑھ لی۔

اس وقت اگر کوئی خالی صوفی ہوتا تو شاید تہجد پڑھتا ہی نا اور یہ کہتا کہ اس وقت تہجد پڑھنے میں

شیطان کی اطاعت ہے حالانکہ اس کی تو مخالفت کرنا چاہئے مگر اس کو بھی محقق ہی سمجھتا ہے کہ شیطان کی مخالفت کہاں کرنا چاہئے اگر ہر بات میں مخالفت کی جائے اور شیطان دیکھ لے کہ اس کو میری مخالفت میں غلو ہے تو پھر وہ ہمیشہ نیک کاموں ہی کا امر کرے گا تاکہ یہ شخص مخالفت کر کے طاعات سے محروم رہے اس لئے محقق مخالفت میں بھی غلو نہیں کرتا اگر، اس وقت حضرت معاویہ تہجد نہ پڑھتے تو ظاہر ہے کہ یہ عمداً ناغہ ہوتا اور اس پر وہ رنج و افسوس بھی نہ ہوتا جو غلبہ نیند پر ناغہ ہونے پر ہوا کرتا ہے تو رنج و غم سے جو ترقی ہوتی وہ اب نہ ہوتی اور تہجد کا وقت پا کر اسے بھی فوت کر دیتے تو نقصان ہی نقصان تھا نفع کچھ نہ ہوتا اس لئے انہوں نے تہجد پڑھ لیا، یہی تو باتیں ہیں جن کی وجہ سے حدیث میں آتا ہے۔

فقيه و احد اشد على الشيطان من الف عابد (سنن الترمذی: ۲۶۸۱، سنن ابن ماجه : ۲۲۲)

کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔

مراد فقیہ النفس ہے جو احکام کے ساتھ نفس و شیطان کے مکائد سے بھی عارف ہو اور سلف کی اصطلاح میں فقہ محض علم ظاہر کے ساتھ مختص نہ تھا بلکہ علم باطن بھی اس میں داخل تھا۔

چنانچہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی تعریف

معرفة النفس مالها و ما عليها

منقول ہے جس میں علم اخلاق و سلوک بھی داخل ہے کیونکہ **معرفة النفس مالها وما عليها** اس کو بھی شامل ہے پس حدیث میں فقہ کے وہی معنی ہیں جو سلف میں متعارف تھے نہ وہ معنی جو متاخرین کی اصطلاح ہے فقیہ ظاہر تو ہجوم وساوس سے ذکر اور تلاوت قرآن کو چھوڑ بیٹھتا ہے جس سے شیطان اپنے مقصود میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر فقیہ باطن کہتا ہے کہ اس حالت کام کو ہرگز نہ چھوڑے بلکہ کام میں لگا رہے چاہے کتنے ہی وسوسے آئیں گے کچھ پروا نہ کرے اور وساوس سے ہرگز پریشان نہ ہو ان کو دفع کرنے کی کوشش کرے اور نہ از خود ادھر متوجہ ہو بلکہ اپنی توجہ کو ہمت کے ساتھ ذکر وغیرہ میں مشغول کرے اور وساوس سے بے توجہی اور بے التفاتی برتے ان شاء اللہ چند روز میں خود ہی سب وسوسے جاتے رہیں گے اور شیطان اپنی مراد میں ناکام ہو کر خود ہی پیچھا چھوڑ دے گا۔

دشنام محبت

بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر کسی وقت غیب سے بھی کوئی خطاب پریشانی کا قلب پر وارد ہو اس

سے بھی پریشان ہو کر کام کو نہ چھوڑے کیونکہ کبھی غیب سے بطور امتحان کے کوئی بات کہہ دی جاتی ہے کہ دیکھیں یہ شخص درجات کے لئے عمل کر رہا ہے یا محض ہماری محبت میں کام کر رہا ہے اس وقت کامیابی کا طریقہ یہی ہے کہ عمل کو ہاتھ سے نہ دے اور بدستور اپنے کام میں لگا رہے۔

چنانچہ ایک بزرگ کو ذکر کے وقت غیب سے یہ آواز آتی تھی کہ تو کافر ہو کر مرے گا چاہے کچھ ہی کر وہ بڑے پریشان ہوئے کہ یہ کیا معاملہ ہے چونکہ عارف تھے اس لئے یہ بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ آواز شیطان کی نہیں ہے بلکہ غیب ہی کی آواز ہے اس لئے پریشانی زیادہ تھی قسمت سے ان کے شیخ اس وقت زندہ تھے گھبرائے ہوئے شیخ کے پاس گئے ۔۔۔۔۔۔۔۔ شیخ بڑی نعمت ہے سالک چاہے کتنا ہی کامل ہو جائے مگر پھر بھی شیخ کی احتیاج فی الجملہ باقی رہتی ہے کام کو بھی بعض دفعہ ایسی حالت پیش آتی ہے جس کو وہ خود حل نہیں کر سکتا اس وقت شیخ ہی امداد کرتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ چنانچہ انہوں نے اپنے شیخ سے اس حالت کو بیان فرمایا فرمایا کام میں لگے رہو اور اس آواز سے پریشان نہ ہو یہ دشنام محبت ہے معشوقوں کا قاعدہ ہے کہ عاشقوں کو بعض دفعہ ناز و انداز سے یوں ہی پریشان اور تنگ کیا کرتے ہیں سبحان اللہ واقع شیخ محقق تھا کہ قیمتی بات کہی کہ یہ دشنام محبت ہے غور کیجئے کہ طالب کی اس جواب کو سن کر کیا حالت ہوئی ہو گی بس اب تو وہ تو محبوب حقیقی سے یوں لگتا ہو گا۔

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی   جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

تو نے مجھے برا کہا اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے بہت اچھا کہ شکر کھانے والے سرخ ہونٹوں کو جواب تلخ ہی زیبا ہے اور شیخ کو اس طرح دعائیں دیتا ہو گا۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی   مرابا جان جاں ہمراز کردی

اللہ تجھے جزا دے تو نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے محبوب کے ساتھ تو نے ہمراز بنا دیا اور شیخ کے پاس سے یہ کہتا ہوا لوٹا ہو گا

از در دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم   ہمہ غم آمدہ بودم ہمہ شاداں رفتم

میں کیا بتاؤں کہ دوست کے پاس سے کیسے واپس ہوا ہمہ تن غم بن کے آیا تھا ہمہ تن خوش ہو کے جا رہا ہوں۔ اور یوں کہتا ہوں۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند   وندر آں ظلمت شب آب حیاتم دادند

کل کے وقت غصہ سے مجھے نجات ملی اور اسی تاریکی میں انہوں نے مجھے آب حیات پلایا۔

باقی یہ کہ وشنان محبت کذب تو نہ ہوا اور خوش خاتمہ کو بد خاتمہ کہنا تو کذب ہے جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں مومن کو کافر بالطاغوت کہا گیا ہے ممکن ہے کہ معنے اس وارد کے یہ ہوں گے کہ تو مومن ہو کر مرے گا خواہ تجھ سے کوئی معصیت صادر ہو جائے جیسے حدیث میں ہے

اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم

تو دیکھئے غیر محقق تو شیطانی خطرات سے بھی پریشان ہو جاتا ہے اور محقق عالم بالا کے دل شکن خطابات سے بھی پریشان نہیں ہوتا وہ ان کو بھی وشنام محبت سمجھ کر اپنے کام میں لگا رہتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر وہ وشنام محبت بھی نہ ہو بلکہ ظاہر ہی پر محمول ہو تب بھی عمل کو ترک نہ کرنا چاہئے کیونکہ اگر یہ عمل کی حالت میں کافر ہوگا تو بدون عمل کے تو اکفر ہوگا۔ پھر ترک عمل سے فائدہ کیا صاحب اگر وحی قطعی سے بھی کفر پر خاتمہ ہونے کا علم ہو جائے جب بھی عشق کا مقتضا یہ ہے کہ محبوب سے تعلق محبت کو ترک نہ کرے بلکہ محبت میں ثابت قدم رہے۔

شرط عشق ست در طلب مردن ورنہ شاید بد دست رہ بردن

اگر دوست تک راہ نہ پا سکے تو طلب میں مرجانا عشق کی شرط ہے

عاشقان مجازی میں بھی جو سچے عاشق ہیں انہوں نے ایسا کر کے دکھلا دیا ہے مجنوں کو لیلیٰ سے محبت تھی مگر لیلیٰ کے باپ نے اس کی شادی دوسرے شخص سے کر دی جب مجنوں کو یہ خبر پہنچی تو کہنے لگا

وما اکثر الاخبار ان قد تزوجت فهل یا تینی بالطلاق بشیر

لیلیٰ کے نکاح کی خبریں بہت آچکی ہیں کیا کوئی خوش خبری دینیوالا اسکی طلاق کی خبر بھی لائے گا۔

اور مرتے دم تک باوجود وصال سے ناامیدی کے محبت وعشق پر ثابت رہا۔ بوستان میں ایک بزرگ کی حکات لکھی ہے کہ ایک رات وہ تہجد کے لئے اٹھے تو غیب سے آواز آئی کہ یہاں کچھ قبول نہیں چاہے کتنا ہی کر اور یہ آواز اتنے زور سے آئی کہ ایک مرید نے بھی سن لی مگر وہ بزرگ اللہ کے بندے وضو کر کے تہجد میں مشغول ہو گئے اگلا دن ہوا تو پھر حسب معمول تہجد کو اٹھے مرید نے کہا کہ حضرت ایسی بھی کیا بے غیرتی ہے کہ وہ تو دھکے دیں اور آپ پھر بھی لپٹتے ہیں جب وہاں کچھ قبول ہی نہیں تو آپ خواہ مخواہ اپنی راحت میں کیوں خلل ڈالتے ہیں یہ سن کر بزرگ رونے لگے اور فرمایا بیٹا یہ تو بتلاؤ کہ اس دروازہ کو چھوڑ کر میں جاؤں کہاں کوئی در بھی تو نہیں جہاں ان کو چھوڑ کر چلا جاؤں بس میرا تو یہی ایک در ہے میں تو اسی پر جان دے دوں گا چاہے۔ وہ قبول

کریں یا رد کریں انہیں اختیار ہے:

توانی ازاں دل بہ داختن　　　　کہ دانی کہ بے اوتواں ساختن

(اس سے دل خالی کر سکتے ہو جسکے متعلق معلوم ہو کہ اسکے بغیر گزارہ کر سکتے ہو)

اس سے دل اٹھالینا تو آسان ہے جس کے بغیر کام چل سکے

بس اس پر دریائے رحمت کو جوش آگیا اور پھر آواز آئی

قبول است گرچہ ہنر نیستت　　　　کہ جز ماپناہے دگر نیستت

اگر چہ کچھ ہنر نہیں لیکن پھر بھی قبول ہے کیونکہ تمہارا میرے بغیر کوئی ٹھکانا نہیں کہ جاؤ قبول کر لیا مگر اسکے ساتھ ایک چرکہ بھی لگا دیا کہ گو ہنر تو کچھ نہیں مگر ہم کو رحم آتا ہے اسلئے قبول کر لیا کیونکہ تیرا ہمارے سوا کوئی ٹھکانا نہیں تو صاحبو اہل اللہ تو اس حالت میں بھی کہ صاف صاف غیب سے مردود کر دیا جائے عمل کو نہیں چھوڑتے پھر حیرت ہے کہ ہم ذرا ذرا سی مصیبت یا ہجوم وساوس سے عمل کو ترک کر دیں۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں خلاصہ سارے بیان کا یہ ہوا کہ ناگوار واقعات میں جس صبر کی ہم کو تعلیم کی گئی ہے اس کی حقیقت امتثال امر ہے اور مامور بہ ماعلیہ الصبر ہے۔ پس ایسی حالت میں ہم کو احکام پر مستقیم رہنا چاہئے اور عمل میں خلل نہ ڈالنا چاہئے اور عمل میں مقصود پر نظر رکھنی چاہئے جو کہ رضاء حق ہے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہماری مدد فرماویں کیونکہ بدون انکی امداد کے نرے علوم و مجاہدات سے کچھ نہیں ہو سکتا جو کچھ ہوتا ہے ان کی عنایت ہی سے ہوتا ہے۔

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر بسیچ　　　　بے عنایات خدا ہیچم و ہیچ،

بے عنایات حق و خاصان حق　　　　گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(یہ تمام کچھ جو ہم نے بیان کیا ہے لیکن بغیر عنایت خداوندی کے ہم ہیچ ہیں بغیر حکم خداوندی اور خاصان خدا کی عنایت کے اگر فرشتہ بھی ہو تو اس کا ورق سیاہ ہے)

حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی ہر حال میں توفیق دیں۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه سیدنا محمد وآله واصحابه اجمعین وآخر دعونا ان الحمد لله رب العلمین.

الصبر والصلوٰۃ

یہ وعظ ۲۱ جمادی الثانی ۱۳۴۰ھ بوقت شب مظفر نگر میں حافظ سخاوت علی صاحب کے مکان پر کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا جو ساڑھے تین گھنٹے میں ختم ہوا۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے قلمبند فرمایا حاضرین کی تعداد ۶۰ سے اوپر تھی

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ط وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَ اَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ . وقال تعالیٰ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ط اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ o

(ترجمہ: اے ایمان والو صبر اور نماز سے سہارا حاصل کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنیوالوں کیساتھ (رہتے ہیں)

تمہید

اس وقت میں نے دو آیتیں مختلف مواقع سے تلاوت کی ہیں جس کا میری یاد میں کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ آج ایک مصلحت سے ایسا کیا ہے۔ یہ دونوں آیتیں ایک امر میں تو مشترک ہیں۔ (یعنی طلب استعانت بالصبر والصلوٰۃ) اس وجہ سے شاید دونوں کی تلاوت کو زائد سمجھا گیا ہو مگر ایک فائدہ کے اظہار کے لئے دونوں کو اختیار کیا گیا ہے اور وہ ابھی معلوم ہو جائے گا اور اگر وہ فائدہ نہ بھی ہوتا جب بھی دونوں کی تلاوت زائد نہیں تھی۔ کیونکہ جزو مشترک کا مہتمم بالشان ہونا اس سے ظاہر ہو جاتا کہ دو جگہ ارشاد فرمایا ہے۔ مگر ان آیتوں میں ایک جزو مشترک بھی ہے اس سے فائدہ جدیدہ معلوم ہوگا۔ ایک آیت میں ایک

فائدہ ہے۔ دوسری آیت میں دوسرا فائدہ ہے۔ وہی تعدد فائدہ محرک ہوا تعدد تلاوت کا۔

اب سمجھنا چاہئے کہ وہ جزو مشترک وغیر مشترک کیا ہے۔ سو ترجمہ میں غور کرنے سے معلوم ہوجائے گا کہ استعانت **بالصبر والصلوٰۃ** تو امر مشترک ہے۔ پھر پہلی آیت میں نماز میں گراں مان کر یہ بتلایا گیا ہے کہ خاشعین پر گراں نہیں ہے جو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ہیں اور اسی کے پاس جانے والے ہیں اور دوسری آیت میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ صابرین کے ساتھ ہیں اس میں صبر کی فضیلت بیان ہوئی ہے اس سے معیت حق حاصل ہوتی ہے۔

اس میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اصل مقصود کچھ اور ہے جس میں نماز اور صبر سے مدد حاصل کرنے کا امر کیا گیا ہے اور وہ اصل مقصود دونوں میں مشترک ہے اور جو امور مابہ التفات ہیں وہ اصل کے متعلق ہیں اور چونکہ صلوٰۃ وصبر کو اس کا معین قرار دیا گیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اصل مقصود زیادہ مہتم بالشان و مطمعنظر ہوگا۔ غرض! مجموعہ آیتیں کا تین امر ہیں۔

ایک مقصود مشترک۔ دوسرے ذریعہ مقصود کا اور وہ بھی مشترک ہے۔

تیسرے مابہ التفاوت یعنی وہ فائدہ خاصہ جس کی وجہ سے دونوں آیتوں میں استقلال و انفراد کی شان پیدا ہوئی جس میں دونوں مشترک نہیں ہیں۔

چوتھا امر درجہ مہتم میں ہے وہ یہ کہ خاص خاص عمل کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے۔ ایک میں ایک عمل کی۔ دوسرے میں دوسرے عمل کی۔ یہ مہتم ہے خواہ اس کو مدلول رابع قرار دیا جائے یا مستقل عدد نہ قرار دیا جائے۔ بلکہ مہتمم کہا جائے۔

سب سے اول پہلے اصل مقصود کی تعیین ضروری ہے اسلئے اولاً میں اسی کو عرض کرتا ہوں۔ پھر امر ثانی وامر ثالث وامر رابع کو عرض کروں گا۔ گو وہ مقصود یہاں صراحۃً مذکور نہیں۔ مگر دوسری آیت سے نیز قواعد شرعیہ سے اسکی تعیین ہوجاتی ہے۔

مقصود زندگی

اب سنئے کہ ان دونوں آیتوں میں **اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ** ارشاد ہوا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ صبر اور نماز سے سہارا ڈھونڈو۔ اس ترجمہ ہی سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ مقصود کچھ اور ہے کیونکہ صبر اور نماز سے تو مدد حاصل کرنے کا امر کیا گیا ہے۔ جیسے محاورہ میں کہتے ہیں کہ قلم سے مدد لو۔ یعنی کتابت میں اس سے مدد لو۔ تو جو شخص یہ جانتا ہے کہ قلم کس کام کا آلہ ہے۔ وہ تو بدوں ذکر کتابت کے

بھی اسی کو سمجھے گا۔ اور جو کتابت کو نہیں جانتا وہ بھی زبان فہمی کی وجہ سے اتنا ضرور سمجھے گا کہ مقصود کوئی اور چیز ہے جس میں قلم سے مدد لی جاتی ہے۔ اس اجمالی علم کے بعد وہ تعیین مقصود کی کوشش کرے گا۔

بہر حال اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ۔ میں حرف باء کا آنا بتلا رہا ہے کہ یہ مقصود کا ذریعہ ہے۔ جیسے کتبت بالقلم میں مفہوم ہوتا ہے کہ قلم کتابت کا ذریعہ ہے اور مقصود کتابت ہے۔ اسی طرح یہاں مفہوم ہوا ہے کہ صبر و صلوۃ ذریعہ ہے اور مقصود دوسرا ہے۔

اب اس کو سمجھئے کہ وہ مقصود کیا ہے جس کے لئے ان دونوں کو آلہ بنایا گیا ہے اگر آیات قرآنیہ میں غور کیا جائے تو اس کی تعیین ہو جائیگی۔ آیات بہت ہیں مگر سب سے زیادہ صریح آیت وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے نفی و استثنا کو استعمال فرمایا ہے اور محاورہ میں نفی استثناء حصر کے لئے ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ میں نے جن و انس کو نہیں پیدا کیا۔ مگر اس لئے وہ میری عبادت کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود عبادت ہے۔ اب دوسری آیات کی تلاش ضروری نہ رہی کیونکہ اسمیں صراحۃً مقصود کی تعیین ہو گئی ہے۔ اب ان دونوں آیتوں کا مدلول ہر شخص آسانی سے سمجھ لے گا کہ یہ معنی ہیں کہ مدد حاصل کرو صبر و صلوٰۃ کے ذریعہ سے عبادت میں جو اصل مقصود ہے۔ اس تفصیل سے آپ کو قرآن کی خوبی تعلیم کا علم بھی ہو گیا ہوگا۔ کہ کیسی پاکیزہ تعلیم ہے خوبیاں تو بہت ہیں سب کو ہم کہاں تک بیان کر سکتے ہیں۔ مگر ایک خوبی یہ ہے کہ اس طرز تعلیم سے حق تعالیٰ کی شفقت و رحمت معلوم ہوتی ہے کہ مقصود کی طرف کس طرح متوجہ کیا گیا ہے کہ اسکی تسہیل کا طریقہ بھی بتلا دیا۔

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقصود میں کچھ کسی قدر دشواری بھی ہے جبھی تو اس کے حاصل کرنے میں صبر و صلوٰۃ سے مدد لینے کی ضرورت ہوئی۔

دین کی آسانی

رہا یہ کہ مقصود کے مشکل ہونے کی وجہ کیا ہے؟ حالانکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

یُرِیۡدُاللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَ لَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ

''اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتے ہیں دشواری کا معاملہ نہیں کرنا چاہتے۔''

یہ تو قرآن کی نص موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ...... آسانی کا معاملہ فرماتے ہیں نہ کہ دشواری کا۔ اسکا مقتضاء یہ ہے کہ تمام مقاصد آسان ہوں۔ دشوار نہ ہو۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں مَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ۔ کہ دین میں کچھ تنگی نہیں۔ اس

میں نکرہ تحت النفی ہے جو بقاعدہ عربیت عموم منفی کو مفید ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دین فی نفسہٖ آسان ہی ہے مگر کبھی کسی عارض کیوجہ سے اس میں تنگی پیش آجاتی ہے۔ پس

یُرِیْدُاللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ (اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتے ہیں)۔ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (تمہارے اوپر دین میں کچھ تنگی نہیں)

کا مطلب یہ ہے دین فی نفسہٖ اس میں تنگی نہیں ہے اور جن آیتوں کی تلاوت کی گئی ہے ان سے جو دین کے اندر کسی قدر دشواری کا ہونا مفہوم ہو رہا ہے۔ یہ عارضی دشواری ہے۔ اور اس عارض کو آئندہ وضاحت کے ساتھ متعین کیا جائے گا۔

مگر پہلے میں ان لوگوں کا شبہ رفع کردوں جو دین کی فی نفسہٖ دشوار سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ہم تو دین میں ایسی تنگی کا مشاہدہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے دین پر چلنا بڑا دشوار ہو رہا ہے۔

چنانچہ شریعت میں سودی لین دین حرام ہے حالانکہ تجارت میں سود لینا دینا پڑتا ہے کبھی بیع معدوم بھی کرنا پڑتی ہے اور وہ بھی ناجائز ہے مختصر تجارت تو ممکن ہے کوئی ہمت کر کے اس سے بچ جائے۔ مگر بڑی تجارت میں بچنا دشوار ہے۔

اسی طرح ملازمت میں بڑی ملازمتیں محرمات سے بہت کم خالی ہوتی ہیں اسی طرح زمینداری میں کہیں عرف کی وجہ سے۔ کہیں قانون کی وجہ سے شرعی تنگی لاحق ہوتی ہے۔ ہاں اگر کوئی تارک تعلقات ہو تو اس کو بچنا ممکن ہے مگر پھر اس کو معاش کی تنگی لاحق ہوگی جو ہر شخص کے تحمل میں نہیں۔ چنانچہ بعض محققین نے بھی ناداری کی تنگی کو بعض کے لئے گوارا نہیں کیا۔ کیونکہ بعض دفعہ اس سے نوبت بکفر آجاتی ہے کہ کبھی خدا کی شکایت ہے کبھی تبدیل مذہب کی صورت ہے۔

طرز معاشرت کی تنگی

اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ تنگی شریعت میں نہیں۔ بلکہ آپ نے طرز معاشرت میں تنگی ہے کہ آپکا سابقہ ایسی قوم سے پڑا ہے جو دین سے آزاد ہے اور دین پر چلنا نہیں چاہتی اور جہاں غلبہ ایسے لوگوں کا ہو۔ وہاں دین پر چلنے والے کو تنگی ضرور لاحق ہوگی۔ گو دین کے احکام کیسے ہی سہل ہوں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک عاقل احمقوں میں پھنس جائے تو اس کو مقتضائے عقل پر عمل کرنا دشوار ہوگا۔ خواہ وہ کیسا ہی سہل ہو کیونکہ احمق لوگ اس سے مزاحمت کریں گے۔ مثلاً شادی

میں فضول رسمیں نہ کرنا مقتضاء عقل ہے اور یہ سہل بھی ہے۔ مگر چونکہ سابقہ جہلاء اور حمقاء سے ہے اس لئے عاقل کو تنگی پیش آتی ہے کہ اس کی کوئی بات نہیں چلتی۔

نیز اس کی ایسی مثال ہے جیسے طبیب مریض کو بکری کا گوشت یا مونگ کی دال کھانے کو بتلائے مگر مریض ایسے کوردہ کا رہنے والا ہے جہاں کچھ دستیاب نہیں ہوتا تو یوں نہیں کہا جائے گا کہ طبیب کے مطب میں تنگی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس شخص کا گاؤں تنگ ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم دین میں ایسی آسانی کے مدعی نہیں کہ اس کے لیے ہمت کی بھی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ ایسی آسانی کے مدعی ہیں کہ ہمت وقدرت سے زیادہ مشقت کی ضرورت نہیں۔ باقی کسی قدر مشقت ضرور ہے۔ جس کی وجہ سے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ

"کیا لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان کے یہ کہنے پر کہ ہم ایمان لے آئے ان کو یونہی چھوڑ دیا جائے گا اور ان کی آزمائش ایمان نہ ہوگی۔"

اور یہ مشقت بھی چندروزہ ہوتی ہے پھر آسانی سے مبدل ہوجاتی ہے چنانچہ جو لوگ دین پر چلنے والے ہیں وہ اس کو محسوس کرتے ہیں۔ اور صاحبو! دنیوی مقاصد میں بھی تو کچھ نہ کچھ مشقت ہوتی ہے آخر بی۔اے پاس کرنا کچھ آسان تو نہیں مگر ہمت کے بعد سب آسان ہے اسی طرح احکام اُخرویہ میں کسی قدر مشقت اور مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ مگر زیادہ مشقت کی ضرورت نہیں۔ جس کا تحمل نہ ہو سکے ورنہ پھر ضعف کا مقتضاء ظاہر ہوگا کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ محقق کبھی ایسی مشقت نہیں ڈالتا جس کا تحمل نہ ہو سکے۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ سے ایک دیہاتی بیعت ہوا اور بیعت کے بعد کہنے لگا کہ حضرت آپ نے مجھے افیون کھانے سے توبہ نہیں کرائی۔ فرمایا کہ مجھے کیا خبر کہ تو افیون بھی کھاتا ہے۔ اچھا اب بتلا کہ تو کتنی کھاتا ہے اس نے گولی بنا کر مولانا کے ہاتھ پر رکھ دی۔ آپ نے اس کے دو حصے کر دیئے اور فرمایا کہ اتنی مقدار میں کھالیا کرو۔ وہ کہنے لگا کہ جب چھوڑنا ہی ہے تو کیا آدھی اور کیا ساری۔ بس! میں نے آج سے بالکل ہی چھوڑ دی۔ یہ اس کی ہمت تھی۔ مگر مولانا نے اپنی طرف سے اس پر ایسی مشقت نہیں ڈالی جو تحمل سے باہر ہو۔

اسی طرح ایک بزرگ کے ہاتھ پر ایک چور نے چوری سے توبہ کی۔ اور خانقاہ میں رہنے لگا۔ صبح کو خانقاہ والوں کے جوتے گڑبڑ ہوجاتے۔ کسی کا ایک کہیں پڑا ہے دوسرا کہیں پڑا ہے۔ لوگوں کو دس پندرہ منٹ تک جوتوں کی تلاش میں پریشانی ہوتی اور اتنی دیر تک اچھی خاصی رونق ہوجاتی سب کو فکر ہوئی کہ یہ کس کی

حرکت ہے۔ پھر اس نوواردپر شبہ ہوا۔ مگر چونکہ اہل اللہ تھے۔ اس لئے بدگمانی نہ کی بلکہ تفتیش شروع کی۔ آخر ایک رات پکڑے گئے اور صبح کو شیخ کے سامنے حاضر کئے گئے۔ کہ حضرت یہ نو وارد خانقاہ والوں کے جوتے گڑ بڑ کر دیتا ہے۔ نہ معلوم اس کو اس میں کیا مزا آتا ہے اور ہم کو بے فائدہ پریشانی ہوتی ہے۔

شیخ نے پوچھا۔ نو وارد نے کہا کہ حضرت میں آپ سے پالیسی نہیں کرتا بلکہ صاف صاف اپنا فرض بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں پہلے چوری کا عادی تھا جس سے اب توبہ کر لی ہے۔ مگر جب رات کو دو بجتے ہیں تو نفس تقاضا کرتا ہے میں اس کو دباتا ہوں کہ بزرگوں سے بیعت ہو کر ان کی مخالفت کرنا چھوڑ دو وہ پھر تقاضا کرتا ہے۔ میں پھر روکتا ہوں۔ گھنٹہ بھر تک میری اس کی جنگ ہوتی ہے۔ آخر کار مصالحت پر فیصلہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ صلح میں کچھ دینا پڑتا ہے کچھ دوسرے کو دبایا جاتا ہے۔ تو میں نفس سے کہتا ہوں کہ چوری میں دو باتیں ہوتی ہیں ایک چیز کا اٹھانا دوسرے اسے لے جانا۔ تو ان دونوں میں ایک کام کر لے ایک کام چھوڑ دے۔ اسلئے خانقاہ والوں کے جوتے گڑ بڑ کر دیتا ہوں کہ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیتا ہوں۔ اب اگر یہ بھی ممنوع ہے تو میں اس سے بھی توبہ کر لوں گا۔ مگر اندیشہ ہے کہ جب نفس کا تقاضا زیادہ ہوگا تو چوری میں مبتلا ہو جاؤں گا۔

شیخ نے کہا کہ تم جوتے گڑ بڑ کر دیا کرو۔ تم کو جائز ہے۔ بلکہ تم پر واجب ہے کیونکہ چوری سے وقایہ ہے اور خانقاہ والوں سے کہا تم اس تکلیف کو گوارا کر لو تم کو ثواب ملے گا۔

صاحبو! اس کی ہنسی نہ سمجھو بلکہ اس حکایت میں ایک گر کی بات ہے وہ یہ کہ جس سے اعلیٰ درجہ کا تقویٰ نہ ہو سکے وہ ادنیٰ ہی پر نفس صلح کر لے مگر ادنیٰ کو خود تجویز نہ کرو۔ بلکہ کسی محقق سے تجویز کراؤ۔

یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ شاید ابھی سے لوگوں نے تجویزیں شروع کر دی ہوں گی تو ایسا مت کرو۔ بلکہ کسی محقق سے مشورہ کرو کیونکہ طبیب نسخہ میں ایسا تصرف کرتا ہے جو دوسرا نہیں کر سکتا۔ پس شیخ کامل سے رجوع کیا جائے تمہاری حالت کو دیکھ کر جو درجہ تقویٰ کا تجویز کرے اس کو اختیار کرو۔ جیسا کہ ان بزرگ نے چور کو ہیرا پھیری کی اجازت دی تھی۔

فتویٰ اور معالجہ

ہاں ایک بات اور کہتا ہوں۔ وہ یہ کہ شیخ کے اس تصرف کو فتویٰ نہ سمجھا جائے بلکہ عارضی معالجہ سمجھا جائے کیونکہ بعض دفعہ کوئی عارض ایسا قوی ہوتا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اصل مرض کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی۔ اس وقت طبیب اس کی کوشش کرتا ہے کہ عارض کو اول رفع کرے۔

اس کے بعد اصل مرض کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اطباء روحانی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔

چنانچہ بعض دفعہ وہ سالک کو عشق مجازی میں مبتلا کرتے ہیں کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ اس کا دل علائق مختلفہ میں پھنسا ہوا ہے تو عشق مجازی میں مبتلا کر کے وہ ان سب تعلقات کو قطع کرنا چاہتے ہیں۔ پھر صرف ایک تعلق کا قطع کرنا باقی رہ جاتا ہے اس کا قطع کرنا سہل ہے پس یہ جو مشہور ہے کہ

متاب از عشق رو گرچہ مجازی ست (عشق مجازی کے ازالہ کی حاجت نہیں)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عشق مجازی کی اجازت دیتے ہیں بلکہ اس سے ایک کام لیتے ہیں۔ یعنی عارض قوی کا ازالہ اور علائق مختلفہ کا استیصال کرنا چاہتے ہیں اور عشق مجازی بھی وہ ایسا تجویز کرتے ہیں جو حرام نہ ہو یعنی امرد یا عورت اجنبیہ کا عشق تجویز نہیں کرتے بلکہ حلال محبت تجویز کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک بزرگ نے اپنے ایک مرید سے پوچھا کہ تجھے کسی چیز سے محبت بھی ہے کہاں۔ ہاں۔ میرے ایک بھینس ہے مجھے اس سے بہت محبت ہے فرمایا۔ اچھا تم بھینس کا مراقبہ کیا کرو۔ چالیس دن تک ایک خاص وقت میں اسکا مراقبہ کیا کرو۔ اب اس کی یہ حالت ہوئی کہ فنافی الجاموس ہو گیا چالیس دن کے بعد شیخ نے اس کو حجرہ سے باہر آنے کا حکم دیا۔ تو وہ کہتا ہے۔ کیسے آؤں۔ سینگ دروازہ سے اٹکتے ہیں۔ اب اس کا یہ حال تھا کہ

ہر چہ پیدا میشود از دور پندارم توئی ''جو کچھ بھی سامنے پڑتا ہے سمجھتا تھا کہ تو ہی ہے۔

اور یہ حال تھا کہ

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی   تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

مجھ میں اور تجھ میں اتنا اتصال ہو گیا کہ دونوں کو الگ الگ کہنا بے جا ہے گویا کہ میں تو ہو گیا اور تو میں ہو گیا۔ میں بدن ہو گیا اور تو جان بن گیا۔ اب اس کے بعد کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ میں اور تو جدا جدا ہیں۔

شیخ اس حالت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ہاتھ پکڑ کر اسے باہر نکالا اور کہا اب نہیں اٹکتے تو باہر آ۔ تیرا مراقبہ کامیاب ہو گیا۔ سب علائق قطع ہو گئے۔ اب صرف بھینس کا تعلق قطع کرنا باقی رہا۔ تو یہ کچھ مشکل نہیں۔

بتلایئے! اس عشق مجازی میں کیا خرابی تھی اور اس کا نفع کس قدر رہا کہ جو شخص پہلے یکسوئی کا عادی نہ تھا۔ اب پوری طرح یکسو ہو گیا۔ جس کا دل ہزار چیزوں میں معلق تھا۔ اب صرف ایک چیز سے وابستہ ہو گیا۔ اس قصہ کو دل لگی نہ سمجھئے۔ بلکہ حقیقت میں یہ بڑا فلسفہ تھا۔

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمام اطباء و حکماء ان حضرات کے سامنے بیوقوف ہیں کیونکہ وہ

تو محسوس کے خواص دریافت کرتے ہیں اور یہ کچھ کمال نہیں۔ حضرات اہل اللہ غیر محسوس خواص معلوم کرتے اور معانی کی تحلیل کرتے ہیں۔ یہ بڑا کمال ہے پھر دونوں کے مقصود میں کتنا بڑا تفاوت ہے کہ وہاں تو مال مقصود ہے یا جاہ! اور یہاں قرب حق میں ترقی مقصود ہے۔

ان کے معالجات اور مقاصد کے سامنے اطباء کی تشخیص اور مقصود کی مثال ایسی ہے جیسے بچے گھروندہ یا پیرمنا بناتے ہیں اور اس میں ایسے مشغول ہوتے ہیں کہ مغرب تک اسی کی اصلاح و درستی میں لگے رہتے ہیں ماں باپ، کہتے ہیں کہ رات ہوگئی اب یہ کھیل موقوف کردو۔ مگر وہ اپنے گھر کی تعمیر میں مشغول ہیں۔ جب بچہ رات کو بھی وہاں سے نہیں ہٹا تو باپ ایک لات مار کر اسے گرادیتا ہے۔ اب بچہ روتا ہے کہ ہائے! میرا گھر گرادیا۔ تو جو نسبت بچوں کے اس گھر کو ایک شاہی محل سرائے سے ہے وہی نسبت اطباء ظاہری کے علوم و مقاصد کو اہل اللہ کے علوم و مقاصد سے ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ خود اپنی رائے سے کوئی درجہ تقوی کا اپنے واسطے اختیار نہ کرو کیونکہ تم علیل ہو۔ رائے العلیل علیل۔ بلکہ شیخ سے تجویز کراؤ۔ مریض کو خود حلوا نہ کھانا چاہئے۔ بلکہ طبیب سے پوچھ کر کھانا چاہئے۔ ممکن ہے وہ بھی حلوا کھلا دے۔ مگر قیود کے ساتھ کھلائے گا۔ مثلا مقدار کم بتلائے گا یا بہت ہی کھلا دے۔ مگر نسخہ میں اس کی رعایت کرلے گا۔ اور یہ قاعدہ کچھ دین ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ دنیا کے کاموں میں بھی جاننے والے کا اتباع کرنا چاہئے اسی میں سلامتی ہے۔

پس سالک کو جائز نہیں کہ خود تجویز کرے کہ اس گناہ کے ذریعہ میں کفر سے بچ جاؤں گا۔ لاؤ کرلوں بلکہ شیخ سے دریافت کرے کہیں وہ بھی خود ایسا کرتے ہیں کہ مرید کو معصیت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور نہیں روکتے بلکہ موقع کے منتظر رہتے ہیں۔

مثلا ایک شخص حرام نوکری پر ملازم ہے مگر پریشان ہے اس ملازمت سے کڑھتا ہے۔ بار بار چھوڑنے کا ارادہ کرتا ہے۔ مگر توکل کی قوت نہیں نہ اس میں نہ بال بچوں میں۔ اس وقت شیخ سوچتا ہے کہ ملازمت چھڑانے میں اس کے دین پر اندیشہ ہے۔ ممکن ہے کہ اس سے زیادہ مفسدہ میں مبتلا ہو جائے مثلا چوری کرنے لگے۔ قرض کر کے مارنے لگے یا عیسائی ہو جائے یا کوئی اور مذہب اختیار کرلے۔

غرض نوکری چھڑانے میں ہزاروں مصائب کا سامنا ہے۔ اس وقت شیخ بھی یہی تجویز کریگا جو تم تجویز کرتے ہو کہ ملازمت نہ چھوڑو۔ مگر اتنا فرق ہے کہ جب شیخ سے استفتاء کرو گے تو اس کے فتوی میں کچھ قیود ہوں گی اور تمہارے فتوی میں آزادی ہوگی۔

مثلاً شیخ ایک یہ قید لگائے گا کہ اس نوکری کو حرام سمجھتے رہو۔ دوسرے سونے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کرتے رہو۔ تیسرے یہ کہ اپنے احباب سے کہہ دو کہ میرے واسطے حلال ملازمت کی تلاش رکھنا اسی طرح انشاء اللہ بہت جلد حلال ملازمت مل جائے گی۔ مگر حلال نوکری ملنے کے بعد بھی شیخ فوراً پہلی ملازمت کے چھوڑنے کا مشورہ نہیں دیتا۔ بلکہ وہ رائے دیتا ہے کہ رخصت لے لو۔ دوسری نوکری کی حالت دیکھ کر پہلے سے استعفیٰ نہ دینا۔ اس لئے ضرورت ہے تجویز شیخ کی۔ کیونکہ تمام پہلوؤں کی رعایت تم خود نہیں کر سکتے۔

اس تقریر سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ محقق کبھی ایسی مشقت نہیں ڈالتا جو تحمل سے باہر ہو اور اس کی یہ وجہ نہیں کہ شیخ اپنی طرف سے یہ مسئلے ایجاد کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شریعت مقدسہ نے خود احکام ایسے مقرر کئے ہیں جو تحمل سے باہر نہیں اور جن گناہوں کا دفعۃً چھوڑنا یا کسی طاعت کا بجالانا جو تحمل سے باہر معلوم ہوتا ہے اس کی یہ وجہ نہیں کہ فی نفسہ دشوار ہے بلکہ اس کی تنگی کا منشاء یہ ہے کہ تقاضا ہی نفس حکم کی مزاحمت کرتا ہے اور اس مزاحمت کی مقاومت فی نفسہ تحمل سے باہر نہیں۔ کیونکہ عمل کے وقت کوئی مزاحمت کرنے والا ظاہر نہیں ہوتا۔ صرف اتنی بات ہے کہ اندر سے طبیعت متوجہ نہیں ہوتی۔

نفس کی مزاحمت

تو دنیا کے بہت سے کام ایسے ہیں جس کو تمہاری طبیعت نہیں چاہتی۔ مگر دل پر جبر کر کے تم وہ کام کرتے ہو۔ مثلاً رات کے بارہ بجے تم سو رہے ہو۔ کوئی دوست یا مہمان آ گیا طبیعت اٹھنے کو نہیں چاہتی۔ مگر مہمان کی خاطر سے اٹھتے ہو۔ اسی طرح خاندان میں کوئی تقریب ہو اور تمہارے ہاتھ میں گنجائش نہیں۔ مگر عزیزوں کی خاطر سے جاتے ہیں اور دل پر جبر کر کے شادی میں روپے دیتے ہو۔ نیز حکام کی خاطر داری کو رشوت بھی دیتے ہو۔ دعوتیں بھی کرتے ہو۔ گو اندر سے دل نہیں چاہتا۔ اور صدہا کام ہیں جو تم رات دن اپنی طبیعت کے خلاف کرتے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ تقاضائے نفس کی مخالفت دشوار نہیں اور تحمل سے باہر تو ہرگز نہیں اور دین کے کاموں میں جو کچھ تنگی ہے وہ اتنی ہی ہے کہ بعض دفعہ طبیعت متوجہ نہیں ہوتی۔ اس سے زیادہ کچھ تنگی نہیں۔ پس حق تعالیٰ کو یہ بھی حق تھا کہ اس تنگی کی پرواہ نہ فرماتے۔ کیونکہ دنیا کے کاموں میں تم خود اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ مگر اللہ تعالیٰ بندہ پر اس سے زیادہ مہربان ہیں۔ اس لئے تنگی کے رفع کرنے کی بھی تدبیر بتلاتے ہیں۔ جس سے کڑوی دوا شیریں ہو جائے۔

یہاں سے آپ کو حق تعالیٰ کی رحمت و شفقت کا اندازہ ہوگا کہ اول تو ایسی تنگی کو رفع کرنا چاہتے ہیں جس کو تم خود بھی دنیا کے کاموں میں رفع نہیں کرتے۔ پھر تدبیر ایسی بتلاتے ہیں جو سہل الحصول ہے۔ ایسی تدبیر نہیں بتلائی جو دشوار ہو۔

جیسے بعض طبیب ایسی دوائیں بتلاتے ہیں جو ہر جگہ مل جائیں مثلاً بخار کے لئے کونین بتلادی جو ہر جگہ سے مل سکتی ہے۔ پھر بعض طبیب تو کونین کی تلخی دور نہیں کرتے اور مریض اگر تلخی کی شکایت کرے تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ دوا یہی ہے کرنا ہو تو کرو ورنہ جاؤ۔ مگر شفیق ڈاکٹر اس پر مٹھائی لپیٹ کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اسکو منہ میں ڈال کر نگل جاؤ۔ چبانا نہیں بلا تشبیہ یہی معاملہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ فرمایا ہے کہ تدبیر سہل الحصول بتلائی۔ اس میں جو کچھ گرانی تھی۔ اس کے رفع کرنے کی تدبیر بتلائی۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ ہم سے عبادت اچھی طرح ہونے لگے اور اس میں نفس کی مزاحمت کی وجہ سے، جو کچھ تنگی تھی اس کو اللہ تعالیٰ ان آیات میں ایک تدبیر بتلا کر رفع فرماتے ہیں کہ صبر اور نماز سے مدد لو۔

دو چیزوں سے مدد لینے کو اس لئے فرمایا کہ طاعات کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن میں بعضے کام کرنے پڑتے ہیں۔ بعض وہ جن میں کچھ کام چھوڑنے پڑتے ہیں۔ مثلاً تقویٰ کرنا، محبت الٰہی حاصل کرنا، اخلاص دل میں پیدا کرنا، یہ تو کرنے کے کام ہیں اور غیبت نہ کرنا، چوری نہ کرنا، جھوٹ نہ بولنا، یہ چھوڑنے کے کام ہیں۔ اور دونوں میں ایک قسم کی تنگی ہوتی ہے۔

مثلاً نماز کا وقت آ گیا تو سستی اور کسل کی وجہ سے نہیں اٹھ سکتے۔ اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ طاعات وجودیہ میں قیود ہوتی ہیں جس سے نفس گھبراتا ہے کیونکہ نفس آزادی چاہتا ہے اور یہ کچھ طاعات کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ ہر عمل وجودی میں کچھ قیود ہوتے ہیں مثلاً مٹھائی کھانا عمل وجودی ہے اسمیں بھی یہ قید ہے کہ ہاتھ چلاؤ مٹھائی تک ہاتھ لے جاؤ۔ پھر منہ میں ڈالو اور چباؤ پھر نگلو۔ مگر یہ قیود کچھ دشوار نہیں ہیں۔ ایسے ہی نماز کی قیود ہیں البتہ اگر کسی کو کھانا اور نگلنا بھی دشوار ہو تو اس کا کچھ علاج نہیں۔"

جیسے واجد علی شاہ کے زمانہ میں دو احدی تھے۔ ایک کے سینہ پر بیر رکھا تھا اس سے اتنا نہ ہو سکا کہ سینہ پر سے اٹھا کر منہ میں ڈال لے۔ بلکہ اس کا منتظر رہا کہ کوئی دوسرا میرے منہ میں ڈال دے۔ چنانچہ ایک سوار سامنے سے گزرا تو اس کی خوشامد کی کہ ذرا یہاں آنا۔ وہ بیچارہ رحم کھا کر گھوڑے سے اتر کر اس کے پاس آیا اور پوچھا کیا کام ہے۔ کہ میرے سینہ پر جو بیر رکھا ہے اس کو اٹھا کر میرے منہ میں ڈال دے۔ اس کو بڑا غصہ آیا کہ نامعقول نے اتنے کام کے واسطے مجھے سواری سے اتارا اور رو

چابک رسید کئے پھراس کے رفیق سے کہا نا معقول، تو نے ہی اتنا کام کر دیا ہوتا۔ وہ کہنے لگا کہ بس بس خاموش رہیے۔ میں اس کے منہ میں بیر ڈالوں گا۔ کل میرے منہ میں کتا موت گیا ہے۔ اس کمبخت نے کتے کو تو ہٹایا نہیں۔ سوار نے دونوں پر لعنت بھیجی اور سوار ہو کر چلا گیا۔

تو بعضے ایسے بھی ہوتے ہیں جو پڑے پڑے بھی کھانے سے کسل کرتے ہیں اور یوں چاہتے ہیں کہ دوسرا کوئی ہمیں کھلاوے۔ ایسے لوگ اگر نماز کی قیود سے گھبرائیں تو ان سے خطاب نہیں۔

کسل کی وجہ

کسل کی اصل وجہ یہ ہے کہ نفس قیود سے گھبراتا ہے یہ تو اعمال وجودیہ کی تنگی کا سبب ہے اور جو کام نہ کرنے کے ہیں اس میں کچھ کرنا تو نہیں پڑتا۔ بلکہ صرف چھوڑنا ہی چھوڑنا ہے مگر وہ اعمال وجودیہ سے بھی زیادہ شاق ہیں ان میں مشقت کا سبب یہ تو نہیں کہ ان میں قیود ہیں کیونکہ وہاں کوئی بھی قید نہیں۔ اگر بولنے کا حکم ہو تو اس میں تو کچھ بھی قید نہیں۔ سو اس میں مشقت کی وجہ یہ ہے کہ نماز تو پانچ منٹ میں ختم ہو جاتی ہے اور ترک غیبت میں ہر دم دل پر آرہ چلتا ہے کہ خبردار! جو زبان چلائی۔ بار بار بولنے کا تقاضا ہوتا ہے۔ مگر بولنا ممنوع ہے اس لئے خاموش ہے اور بولنے کا تقاضا ہوتا ہے۔ مگر بولنا ممنوع ہے اس لئے خاموش ہے اور بولنے کا تقاضا اس لئے ہوتا ہے کہ غیبت کرنے میں دوسرے کی وقعت گھٹتی ہے اور اس میں حظ نفس ہے کیونکہ نفس میں تکبر ہے وہ سب سے بڑا بننا چاہتا ہے۔ اسلئے غیبت سے اس کو مزا آتا ہے مگر یہ نہیں سمجھتا کہ جس طریق سے تم دوسروں کو جاہ کم کرتے ہو۔ وہی تمہاری ذلت کا بھی سبب ہوگا۔ کیونکہ تمہارے کلام سے تو مخاطب کے دل سے اس شخص کی وقعت نکلے گی جس کی تم نے غیبت کی تھی۔ پھر وہ اس کے ساتھ ایک مقدمہ ملائے گا کہ جب ایسا شخص برا ہو گیا جو سالہا سال سے اچھا تھا تو یہ راوی ہی کونسا معصوم ہے۔ بس یہ بھی قابل اعتبار نہیں۔ نیز جب تم دوسروں کی غیبت کرو گے تو مخاطب کو دوسروں کے برا سمجھنے کی عادت ہو جائے گی آج اس نے غیر کو برا سمجھا۔ کل کو تمہیں بھی برا سمجھنا اسے دشوار نہ ہوگا۔

جاہ کی قیمت

جاہ میں مال سے زیادہ حظ ہے۔ اسی لئے نفس کو غیبت میں حظ آتا ہے۔ مگر یہ حماقت ہے کیونکہ چار پیسے ہاتھ میں ہوں تو دس کام چلیں گے اور چند لوگوں کی تعریف سے کیا ہو جائیگا۔

دیوبند میں ایک رئیس نے اپنے لڑکے کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی تھی تو مولانا قاسم صاحب نور اللہ مرقدہ نے نہایت لطافت کے ساتھ نصیحت فرمائی کہ جتنی رقم آپ نے دھوم دھام میں لگائی ہے اگر اسکی جائیداد خرید کر بیٹے کو دے دیتے تو اس کے کام آتی۔ اور اب جو چیز آپ نے خریدی ہے۔ یعنی نام وہ ایک کوڑی کو بھی نہیں بک سکتا۔

واقعی جاہ کی کچھ بھی قیمت نہیں محض خیالی چیز ہے پھر جاہ سے سب کے دلوں میں تو عظمت پیدا نہیں ہوتی۔ خواہ کتنی ہی کوشش کرو۔ بلکہ حالت یہ ہے کہ ایک شخص کو ایک تو قطب اور بایزید سمجھتا ہے اور دوسرا شمر و یزید سمجھتا ہے اس لئے چند معتقدوں کی تعریف سے مغرور ہونا بڑی حماقت ہے۔ مگر باوجود اس کے اکثر عقلاء بلکہ بعضے علماء و مشائخ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں کہ جہاں کسی نے ان کے ہاتھ چومے اور وہ سمجھے کہ ہم چوں من دیگرے نیست

یہ سراسر حماقت ہے اور بے وقوفی ہے جو اس سے دھوکا میں آتا ہے جیسے ایک میاں جی سے لڑکوں نے چھٹی لینا چاہی تو سب نے اتفاق کرلیا کہ آج میاں جی کو بیمار بناؤ جب وہ مکتب میں آئیں ہر شخص یکے بعد دیگرے ان کی مزاج پرسی کرے کہ آج کیسی طبیعت ہے کچھ چہرا اترا ہوا ہے۔ منہ پر زردی چھا رہی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔ میاں جی نے ایک دو کو تو دھمکا دیا۔ مگر جب سب نے یہی کہنا شروع کیا تو ان کو بھی وہم ہو گیا اور وہ اچھے خاصے بیمار بن کر گھر چلے گئے اور مکتب بند کر کے لڑکوں کو چھٹی دے دی۔

حکایت تو ہنسی کی ہے مگر یہ بات سچی ہے کہ جہاں چند آدمیوں نے کچھ کہنا شروع کیا۔ اس سے مخاطب کو وہم ہو جاتا ہے کہ ہاں میں ایسا ہی ہوں چنانچہ جہاں چار آدمیوں نے ہاتھ پیر چومنا۔ حضور حضرت کہنا شروع کیا اب آپ سمجھے کہ ہاں میں بھی کچھ ہوں۔ جبھی تو یہ سب مجھے حضرت حضرت کہتے ہیں۔ مجھے یہ حضرت کا لفظ اپنے لئے بہت ہی گراں معلوم ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ میں نے اپنے احباب کو اس سے منع کیا اور کہہ دیا کہ ایسا ہی تعظیم کو دل چاہتا ہے تو مولوی مولانا کہہ دیا کرو۔ یہ حضرت کیا نکالا ہے۔ پھر میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر حقیقت کی رعایت ضروری نہیں تب بھی اس لفظ کا ایک وقت ہے اسے آنے دو۔ یعنی بال سفید ہونے دو۔ پھر حضرت کہہ لینا۔

ہمارے یہاں ایک بڑھیا تھی۔ اس نے ایک بزرگ کی شان میں لوگوں کی زبان سے حضرت حضرت کہتے سنا تو ہمارے گھر آ کر کہنے لگی کہ اے بوا لوگ فلاں شاہ جی کو حضرت حضرت کہتے ہیں۔ بھلا کہیں حضرت پاخانہ بھی کرتے ہیں اور وہ تو پاخانہ پیشاب کرتے ہیں تو اس کے نزدیک

حضرت کہلانے کا مستحق وہ ہے جو بالکل فرشتہ ہو کہ نہ کھائے نہ پئے نہ پاخانہ کرے نہ پیشاب۔

خیر یہ افعال تو واقع میں حضرتیت کے خلاف نہیں۔ مگر جو باتیں اس کے خلاف ہیں وہ تو ان حضرت کو خود معلوم ہیں پھر وہ دوسروں کے کہنے سے اپنے کو حضرت کیوں سمجھنے لگے۔ مگر حالت یہ ہے کہ دوسروں کی تعریف سے ہم خود بھی اپنے معتقد ہو جاتے ہیں اور یہ وہم کرنے لگتے ہیں کہ ہم کسی قابل نہ ہوتے تو لوگ ایسا کیوں سمجھتے؟

ان کی وہی مثال ہے جیسے ایک شخص نے دلال کو گھوڑا دیا کہ اس کو فروخت کر دو۔ میں اس کو رکھنا نہیں چاہتا۔ دلال نے اس کو بازار میں کھڑا کر کے اپنے قاعدہ کے موافق جھوٹ موٹ شاعرانہ طریق سے اس کی تعریف شروع کی کہ یہ گھوڑا ایسا ہے اور ویسا ہے۔ یہ تعریفیں سن کر مالک کہنے لگا کہ اگر ایسا ہے تو ہم نہیں بیچتے اس کو ہم ہی رکھیں گے۔

تو جیسے اس شخص کا ساری عمر کا تجربہ ایک دلال کی تعریف سے بدل گیا اور جھوٹی مدح سے اپنے گھوڑے کا معتقد بن گیا۔ اسی طرح ہم لوگ دوسروں کی جھوٹی تعریفوں سے خود بھی اپنے معتقد ہو جاتے ہیں۔ اور معتقدوں کی تعریف کا یہ حال ہے کہ بعض دفعہ پیر کی جھوٹی کرامتیں گھڑی جاتی ہیں۔ خود میری نسبت ایک دفعہ مشہور کیا گیا کہا کہ ایک ہی دن میں تھانہ بھون[1] میں بھی تھا اور جرتھاول میں بھی تھا۔ حالانکہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ایک وقت میں دوجگہ ہرگز نہ تھا اور کیونکر ہوتا جب کہ یہ حال ہے۔

از بروں طعنہ زنی بر بایزید　　　　وز درونت ننگ می دارد یزید

''باہر سے بایزید سے بڑھ کر نظر آتے ہو اور اندرونی طور سے یزید سے برے ہو۔''

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اعمال عدمیہ کا اہتمام یعنی غیبت وغیرہ کا ترک اس لئے دشوار ہے کہ اس میں حظ نفس ہے اس سے بزعم خود جاہ وغیرہ حاصل ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کی دشواری کا علاج فرمایا اور دونوں قسم کے کاموں کو آسان کر دیا۔ علاج کا حاصل یہ ہے کہ صبر و صلوٰۃ کی پابندی کرو۔

---

[1] بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک بزرگ دوجگہ نظر آتے ہیں۔ اس میں بعض دفعہ تو بزرگ کا تصرف ہوتا ہے کہ دوسری جگہ اپنی صورت مثالیہ کو بھیج دیتے ہیں اور بعض دفعہ بزرگ کا تصرف نہیں ہوتا نہ ان کو اطلاع ہوتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ شیخ کی صورت میں کسی لطیفہ غیبی کو بھیج دیتے ہیں تا کہ سالک و مرید کی امداد و تسلی کی جائے۔ بہرحال اس صورت میں یہ سمجھنا کہ شیخ ایک وقت میں دوجگہ تھا صحیح نہیں۔ بلکہ یہ احتمال بھی ہونا چاہئے کہ شاید شیخ کو اس کی اطلاع بھی نہ ہو کہ میری صورت دوسری جگہ ظاہر ہوئی ہے۔۱۲ ظ۔

مگر اس واقع متن میں یہ بھی نہ تھا۔ بلکہ میں نے اس واقعہ کی خود تحقیق کی معلوم ہوا کہ راوی اول نے ایک موقع پر ایک بزرگ کو پشت کی طرف سے دیکھا تھا اس کو دھوکہ ہو گیا پھر اوروں سے کہہ دیا۔ شہرت ہو گئی۔۱۲ اشرف علی۔

صبر کے معنی

صبر کے معنی ہیں کہ نفس کو ناگوار باتوں کا عادی بنایا جائے یعنی خواہش نفس کی مخالفت کی جائے چونکہ تروک میں دشواری اسی لئے ہے کہ حظ نفس فوت ہوتا ہے اس لئے جو شخص مخالفت نفس کا عادی ہو جائے گا اس کو تمام تروک آسان ہو جائیں گے کیونکہ ترک غیبت نفس کو اسی لئے شاق ہے کہ اس میں حظ ہے۔ نظر بد کا ترک اسی لئے شاق ہے کہ نظر بد میں لذت ہے۔ اور تمام محرمات کا ترک اسی لئے دشوار ہے کہ حرام میں لذت ہے۔ ان سب کی دشواری رفع کرنے کے لئے صبر کی تعلیم کی گئی کہ نفس کو ناگوار امور کا عادی بناؤ نفس کی مخالفت کرو۔ اس کی خواہش کو پورا نہ کرو۔

اعمال وجودیہ نماز وزکوۃ وحج وغیرہ اس لئے شاق ہیں کہ ان میں قیود ہیں ان کی مشقت کا علاج یہ بتلایا گیا ہے کہ نماز کے عادی بن تا کہ اس کی عادت سے قیود کی پابندی کی عادت ہو یہ خلاصہ ہے دونوں آیتوں...... کی تعلیم کا۔

اعمال میں اولیت

اب یہاں یہ سوال ہوگا کہ صبر اور صلوٰۃ بھی تو خود شاق ہیں۔ پس لازم یہ تھا کہ ان سے بھی آسان تر تدبیر بتلائی جاتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں اور اعمال کے اعتبار سے آسان ہیں۔ یہ زیادہ دشوار نہیں۔ اس کی وہی مثال ہے جیسے ان بزرگ نے مرید کو بھینس کا مراقبہ تعلیم کیا تھا۔ تو یہ مراقبہ بھی آسان نہ تھا۔ مگر دوسری تدابیر کے مقابلہ میں آسان تھا۔ پھر جیسے مراقبہ جاموس سے مراقبہ مقصود میں کام لیا گیا ہے کہ اس کا عادی بنا کر تمام احکام کا عادی بنانا سہل ہو گیا۔

یہ وجہ ہے کہ اسلام میں تعلیم عقائد کے بعد اعمال میں سب سے پہلے نماز اور صبر کی تعلیم کی گئی۔

چنانچہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رہے مسلمان زیادہ تر انہی دو باتوں کے مکلّف تھے یعنی نماز کے اور کفار کے ایذاؤں پر صبر وتحمل کے (محرمات میں سے زنا وسرقہ وقطع رحم و کذب واخلاف وعدہ نحو ہا کے چھوڑنے کا امر کیا گیا تھا۔ بقیہ احکام محرمات کے متعلق بعد میں حکم نازل ہوا۔ اور جن محرمات کے ترک کا مکہ میں حکم ہوا یہ وہ امور تھے جن کی قباحت عام طور سے تمام لوگوں کے ذہن میں مرکوز تھی اس لئے ان کا ترک دشوار نہ تھا۔) غرض اس ترتیب سے معلوم ہوا کہ نماز اور صبر کی پابندی کو تمام اعمال کی سہولت میں بڑا دخل ہے۔

مراقبہ ذات وصفات

ایک بات پہلے بیان کرنے سے رہ گئی تھی اب بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ شاید کسی کو اس حکایت پر کہ بزرگ نے اپنے مرید کو بھینس کا مراقبہ تعلیم کیا تھا۔ کہ انہوں نے یہ طریقہ اچھا اختیار نہیں کیا کہ غریب کو مدت تک بھینس کے مراقبہ میں مشغول رکھا۔ اگر اسکی بجائے ذات وصفات کے مراقبہ میں مشغول رکھتے تو کیا اچھا ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مراقبہ ذات وصفات لطیف غذا ہے اور لطیف غذا ہر معدہ کے مناسب نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض کو اول مسہل اور منضج کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ لطیف دوا مثلاً خمیرہ گاؤزبان اور لطیف غذا پلاؤ وغیرہ کے قابل ہوتا ہے۔ تو جیسے طبیب جسمانی بعض دفعہ کڑوی اور بدمزہ دواؤں سے علاج کرتا ہے اور بعد میں لطیف دوا وغذا ابتلاتا ہے اسی طرح طبیب روحانی کبھی ادنیٰ چیز کو تجویز کرتا ہے کیونکہ مریض کے موافق وہی ہے۔ ابھی وہ اعلیٰ شے کے قابل نہیں ہے۔ پھر تدریجاً ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی دیتا ہے۔

چنانچہ ان بزرگ محقق نے دیکھا کہ اس شخص کا دل علائق مختلفہ میں پھنسا ہوا ہے اور اس حالت میں دفعۃً وہ تعلق مع اللہ کا اہل نہیں۔ کیونکہ تعلق مع اللہ کے لئے فراغ قلب کی ضرورت ہے۔ پھر انہوں نے یہ دیکھا کہ ہر ہر تعلق کا الگ الگ قلب سے نکالنا طول طویل قصہ ہے۔ ساری عمر اسی میں ختم ہو جائے گی۔ تعلق مع اللہ کبھی نصیب نہ ہوگا۔ وہی قصہ ہوگا

تا تو بمن مے رسی من بخدا میرسم

جب تک تم مجھ تک پہنچتے ہو۔ میں خدا تک پہنچ جاؤں گا۔

جیسے گھر میں سے کوئی شخص کوڑے کو اس طرح صاف کرنا چاہے کہ ایک ایک تنکا اور پتھر الگ الگ اٹھائے تو اس میں بہت زمانہ صرف ہوگا۔ آسان تدبیر یہ ہے کہ جھاڑو ہاتھ میں لے کر سب کو ایک طرف سے سمیٹنا شروع کرو۔ اسی طرح ان بزرگ نے تجویز کیا کہ اس شخص کے دل کو جھاڑو سے صاف کرنا چاہئے چنانچہ بھینس کے مراقبہ کو انہوں نے جھاڑو بنایا اور اس کو اس لئے تجویز کیا کہ مرید کو بوجہ محبت جاموس کے یہ مراقبہ آسان تھا۔ اس جھاڑو نے تمام تعلقات کو ایک دم سے سمیٹ کر دل سے نکال دیا۔ اب صرف جھاڑو کا الگ کرنا باقی رہ گیا۔ اس کو شیخ نے ایک توجہ سے نکال باہر کیا۔ اب دل بالکل صاف ہو گیا تو اس میں مراقبہ حق اور تعلق مع اللہ کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد اس مراقبہ حق اور ذکر اللہ تعلیم کر کے بہت جلد واصل بنا دیا۔

شیخ محقق کا قاعدہ

دوسرے یہ کہ شیخ محقق کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ صفات نفسیہ کے ازالہ کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ ان کے امالہ کی تدبیر کرتا ہے کیونکہ صفات نفسیہ سب محمود ہیں۔ ان میں برائی اس سے آتی ہے کہ بے موقع استعمال کیا جاتا ہے ورنہ حب و بغض و کبر و بخل و غضب فی نفسہ سب محمود ہیں اگر ان کا مصرف صحیح ہو۔

جب یہ بات سمجھ گئے تو اب سمجھو کہ جس شخص کے دل میں غیر اللہ کی محبت ہے تو محبت فی نفسہ مذموم نہیں بلکہ بہت کام کی چیز ہے۔ مذموم صرف یہ ہے کہ محبت کا تعلق محل صحیح کے ساتھ نہیں تو محقق اس صورت میں محبت کو فنا کرنے کی سعی نہ کرے گا۔ بلکہ اس کو باقی رکھ کر اس کا رخ تبدیل کر دے گا۔

جیسے گاڑی انجن کے ساتھ لگی ہوئی جا رہی ہو مگر انجن کی رفتار غلط ہو کہ الٹا جا رہا ہو تو ناواقف اس صورت میں انجن کی سٹیم کو بجھانا چاہے گا۔ محقق ایسا نہ کریگا کیونکہ سٹیم تو بڑے کام کی چیز ہے۔ وہ یہ کرے گا کہ انجن کے رخ کو بدل دے گا۔ یعنی کل موڑ کر مشرق سے مغرب کی طرف پھیر دے گا۔

تو ان بزرگ نے ایسا ہی کیا جب اس مرید کے دل میں بھینس کی محبت معلوم ہوئی تو انہوں نے محبت کو زائل نہیں کیا۔ بلکہ اس کو اور بڑھایا۔ کیونکہ محبت فی نفسہ طریق میں بڑے کام کی چیز ہے کہ اس سے تمام تعلقات جلد قطع ہو جاتے ہیں۔ جب یہ محبت اچھی طرح بڑھ گئی اور اسٹیم گرم ہو گیا۔ اب شیخ نے انجن کی کل موڑ دی۔ اب وہ محبت کی اسٹیم تعلق مع اللہ میں کام کرنے لگی۔ اس لئے ہمارے حاجی صاحب فرماتے تھے محقق رذائل کا ازالہ نہیں کرتا۔ بلکہ امالہ کیا کرتا ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب میں اصل بیان کی طرف عود کرتا ہوں۔

نماز کی جامعیت

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو دو کاموں کی تعلیم دی ہے کہ انکو کرتے رہو تو سب احکام پر عمل کرنا آسان ہو جائے گا۔ یعنی صبر و نماز کی پابندی کرو۔ یہ ایسا ہے جیسے کتابت میں اول الف ب ت کا لکھنا سکھاتے ہیں۔ اگر استاد جاہل ہوگا وہ اول ہی سے گلستان کی عبارت لکھوانا شروع کریگا۔ مگر محقق ایسا نہ کریگا۔ گو مقصود یہ ہے کہ طویل عبارت لکھنا آ جائے۔ مگر اس کا سہل طریق یہ ہے کہ حروف مفردہ سے ابتداء کی جائے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تعلیم میں سہل طریق اختیار فرمایا ہے۔ گو مقصود یہ ہے کہ تمام احکام پر عمل کیا جائے۔

اب سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دو عبادتیں اس لئے تجویز فرمائی ہیں کہ ان میں جامعیت کی شان ہے اگر ان میں جامعیت نہ ہو تو وجہ ترجیح سمجھ نہ ہوگی۔ کیونکہ تمام عبادات میں اسی عمل سے سہولت ہو سکتی ہے جو سب کا جامع ہو۔ لیکن ہم کو وجہ جامعیت کی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ طبیب کامل کی تشخیص کے بعد کوئی بھی نسخہ کے اجزاء کے متعلق یہ سوال نہیں کرتا کہ یہ دوا کیوں لکھی اور اس کا وزن اتنا کیوں لکھا۔ مگر آج کل دین کے بارہ میں فضول سوالات کا لوگوں کو بہت مرض ہو گیا ہے تو سمجھنا چاہئے کہ دوائیں دو قسم کی ہیں بعض بالخاصہ مفید ہیں جو تجربہ سے کسی مرض میں خاص طور پر نافع ثابت ہوئی ہیں۔ جس کی علت خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور بعض موثر بالکیفیت یعنی اپنے مزاج حرارت یا برودت کی وجہ سے نافع ہوتی ہیں۔ مگر حقیقت میں جو ادویہ موثر بالکیفیت ہیں وہ بھی موثر بالخاصیت ہی ہیں۔ کیونکہ ایک مریض کے لئے جو نسخہ تجویز کیا جاتا ہے اگر مخزن دیکھ کر انہی ادویہ کے مزاج کے موافق دوسری دوائیں اختیار کی جائیں تو نفع نہیں ہو سکتا۔ مثلاً زکام میں بنفشہ اور گاؤزبان دیا جاتا ہے اگر آپ انکے مزاج کے موافق دوسری ادویہ استعمال کریں تو ہرگز نفع نہ ہوگا۔ تو اب یوں ہی سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے جو تدبیر بیان فرمائی ہے وہ بالخاصہ تمام اعمال میں سہولت پیدا کرتی ہے تم کو وجہ اور سبب تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

مگر حالت یہ ہے کہ لوگوں کو طبیب کے نسخہ سے تو تسلی ہو جاتی ہے وہاں کوئی یہ نہیں کہتا کہ دوائیں کیوں لکھی گئیں دوسری کیوں نہ لکھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جانتے ہیں کہ طبیب ماہر فن ہے پھر حیرت ہے کہ حق تعالیٰ کی تجویز کے بعد سوال کیا جاتا ہے کیا خدا تعالیٰ پر اعتماد نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ صبر اور نماز میں خاصیت ہی یہ ہے کہ ان سے تمام طاعات آسان ہو جاتی ہیں۔ وجہ بیان کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں اور اگر ایسا ہی شوق ہے تو ہم تبرعاً اس کو بھی بتلاتے ہیں۔

سنئے! نماز میں جامعیت کی شان ہے یعنی جتنی طاعات شعائر دین ہیں وہ اکثر نماز میں موجود ہیں اس میں روزہ بھی ہے اور زکوٰۃ بھی، حج بھی اور اعتکاف وغیرہ بھی۔ چنانچہ نماز میں اللہ اکبر کے بعد نہ کھانا ہے نہ پینا ہے نہ بولنا ہے۔ یہ روزہ کی شان ہے۔ بلکہ روزہ سے بھی بڑھ کر۔ کیونکہ روزہ میں بولنا ممنوع نہیں۔ تو اگرچہ نماز میں تھوڑی ہی دیر کا روزہ ہے مگر سخت روزہ ہے اور حج کی روح توجہ الی البیت ہے اور یہاں نماز میں بھی توجہ الی البیت موجود ہے چنانچہ حکم ہے۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

''اپنے چہرے کو مسجد حرام کی جانب موڑ لیجئے۔''

سب جانتے ہیں کہ استقبال بیت نماز میں فرض ہے اور زکوٰۃ کی روح اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنا ہے۔ نماز میں یہ بات بھی موجود ہے کیونکہ نماز میں ستر عورت فرض ہے اس کے لئے کپڑا بنانا بھی انفاق سبیل اللہ ہے۔ اسی طرح اعتکاف میں بھی ایک حصہ مسجد میں مقید ہوتا ہے۔ نماز میں بھی یہ بات موجود ہے۔ کہ مقام صلوۃ میں مقید ہونا ضروری ہے کہ چلنا پھرنا ممنوع ہے۔ بلکہ یہ حبس اعتکاف کے حبس سے اشد ہے کیونکہ اعتکاف میں تو مسجد کے اندر حبس ہوتا ہے جو وسیع مکان ہے اس میں چلنا پھرنا بھی جائز ہے اور نماز میں ایک ہی مکان میں قید ہے کہ چلنا پھرنا بھی جائز نہیں۔ پھر نماز کے اندر تلاوت قرآن بھی اذکار بھی مختلف قسم کے ہیں۔ دعا بھی ہے۔ درود شریف بھی ہے غرض! نماز ایک جامع عبادت ہے اس کی پابندی اور عادت سے تمام اعمال وجودیہ شرعیہ میں اس سے مدد ملتی ہے۔

نماز کی خاصیت

بلکہ ایک آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کام چھوڑنے کے ہیں ان میں بھی نماز میں مدد ملتی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ

کہ نماز بے حیائی کے کاموں سے اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

اس پر شاید سوال کسی کے دل میں آیا ہوگا کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعضے نمازی بھی برے کام کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نماز کا فحشاء و منکر سے منع کرنا ایسا ہے جیسا یوں کہتے ہیں کہ قانون چوری اور زنا و غصب و ظلم سے روکتا ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں ہیں کہ قانون ہاتھ پکڑ کر روک دیتا ہے۔ بلکہ معنی یہ ہوتے ہیں کہ قانون کا مقتضاء یہ ہے غصب نہ کرو۔ رشوت نہ لو۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ باپ کی عظمت بے ادبی سے روکتی ہے۔ یعنی باپ کی عظمت کا مقتضاء یہ ہے کہ اس کی بے ادبی نہ کی جائے۔ یہی مطلب اس آیت کا ہے کہ نماز کا مقتضا ہے فحشاء سے روکنا کیونکہ وہ درباری ہو گیا ہے اور درباری بننے کے بعد اس سے ایسے افعال کا صادر ہونا۔ جو درباریوں کے شایان شان نہیں بعید ہے کہ آج تو عبادت و خشوع ظاہر کر رہا ہے اور کل کو اس کے خلاف کر رہا ہے (اور تجربہ ہے کہ نمازی آدمی کو برے کاموں سے حیاء آتی ہے اور یقیناً بے نمازیوں کے مقابلہ میں نماز آدمی جرائم پر بہت کم اقدام کرتے ہیں) تو نماز کی یہ بھی ایک خاصیت ہے کہ وہ محرمات سے روکتی ہے اور نفع

پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ عبادات وجود یہ کو آسان کر دیتی ہے۔

مگر افسوس! کہ آج کل نماز کی بالکل پرواہ نہیں حالانکہ یہ اتنی بڑی چیز ہے کہ حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں۔

ما كنا نرى ترك شيء كفرا سوى الصلوٰة اونحوه

''کہ ہم کسی کام کے چھوڑنے کو کفر نہیں سمجھتے تھے بجز نماز کے کہ اس کا چھوڑنا اس وقت کفر سمجھا جاتا تھا۔''

کیونکہ نماز ایسی ہی چیز ہے کہ مسلمانوں کا قومی امتیاز ہے اس لئے اس زمانہ میں اس امتیاز کی ہر مسلمان حفاظت کرتا تھا۔ اور جو شخص نماز نہ پڑھتا اسکے اوپر کفر کا شبہ ہوتا تھا۔

آج کل نئی روشنی والوں کو قومی امتیاز کا بڑا اہتمام ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ وہ نماز کو قومی امتیاز ہی سمجھ کر اختیار کر لیں اس سے بڑھ کر قومی امتیاز کیا ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لیکر قیامت تک کیلئے مسلمانوں کا خاص امتیاز ہے کہ امیر وغریب، شریف دنی سب مشترک ہے۔ جس سے کفار کو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سب لوگ ایک قوم کے ہیں ایک مذہب کے ہیں پس میں اخیر درجہ مجبور ہو کر کہتا ہوں کہ اگر نماز کو دین اور عبادت سمجھ کر نہیں پڑھتے تو امتیاز قومی سمجھ کر پڑھ لیا کرو۔

افسوس! ہم نے زمانہ ہی ایسا پایا ہے۔ جس میں یہ بات زبان پر آ گئی حالانکہ نماز کے متعلق مسلمانوں سے ایسی بات کہتے ہوئے اس قدر شرم آتی ہے کہ زمین میں گڑ جانا اس سے سہل معلوم ہوتا ہے۔

حضرات صحابہؓ نے جو فرمایا ہے کہ ہم ترک صلوٰۃ کفر سمجھتے تھے اس کا یہ مطلب نہیں کہ تارک صلوٰۃ کافر ہو جاتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں کوئی مسلمان تارک صلوٰۃ نہ تھا۔ اگر کوئی تارک صلوٰۃ نظر آتا تو اس پر کافر ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ کیونکہ اسلامی علامت کے فوت ہونے سے صورت تو کفر کی ہو گئی۔

صورت کے فوت ہونے کا ایسا اثر ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ میرے گھر سے مدرسہ میں مہمان کے لئے کھانا آیا تو منتظم نے مجھ سے پوچھا کہ وہ مہمان کہاں ہیں حالانکہ وہ میرے پاس ہی بیٹھے تھے اور منتظم نے پہلے ان کو دیکھ بھی لیا تھا۔ میں نے کہا تجھ کو نظر نہیں آتے یہ میرے پاس بیٹھے ہیں کہنے لگا یہ تو پہلے چادر اوڑھے تھے اور اس وقت چادر ان کے بدن پر نہیں۔ میں نے مہمان سے ہنس کر کہا۔ آج سے یہ بھی یاد کر لیجئے کہ نئی جگہ جس حالت اور لباس میں پہنچو۔ شروع سے اخیر تک اسی حالت میں رہو ورنہ بھوکے مرو گے۔

خیر یہ حکایت تو ہنسی کی ہے مگر اس سے سبق حاصل کرنا چاہئے کہ انسان کی امتیازی شان بدلنے سے وہ خود بدل جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کی نظر میں دوسرا شخص دکھائی دیتا ہے۔

صاحبو! تمہاری اصلی چادر نماز ہے اگر تم اس کو ترک کر دو گے تو ہم کیسے سمجھیں کہ تم خدا کے مہمان ہو۔

نماز کی تاکید

نماز کی تاکید کے متعلق ایک حدیث میں وارد ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ارادہ کرتا ہوں کہ ایک شخص کو مسجد میں امام بناؤں اور خود ان لوگوں کی تلاش کروں جو عشاء کی جماعت میں حاضر نہیں ہوتے (اوران کو کوئی عذر بھی نہیں) پھر اپنے غلاموں کو حکم دوں کہ لکڑیاں جمع کر کے ان لوگوں کے گھروں میں آگ لگادیں۔ عشاء کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ منافقین اس وقت کی جماعت میں نہیں آتے تھے۔

اللہ اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تو ایسی شفقت و رحمت ہے کہ باوجودیکہ کفار کو بھی آگ سے جلانا آپ کو گوارا نہ تھا۔ جیسا حدیثوں میں وارد ہے مگر تارک جماعت کیلئے آپ نے اسکا ارادہ فرمایا۔

اس سے سمجھ لیجئے کہ جماعت کا شریعت میں کس قدر اہتمام ہے پس نماز کی پابندی کے لئے جماعت کی پابندی کرنا چاہئے۔ اگر کوئی عذر مانع ہو تو خیر۔ مگر عذر بھی آپ کا تراشا ہوا نہ ہو۔ بلکہ شریعت کا مانا ہوا عذر ہو۔ یہ تو آپ کے لئے حکم ہے یعنی ہر مکلف کیلئے کہ ترک جماعت پر عذر شرعی سے اقدام کرے بدوں اس کے نہ کرے۔

ناصح کے لئے یہ حکم ہے کہ اگر کوئی مسلمان جماعت سے نماز پڑھتا ہوا اس پر بلاوجہ بدگمانی نہ کرے۔ بلکہ حتی الامکان مسلمان کی حالت کو محمل حسن پر محمول کرے کہ شاید اس کو کوئی عذر شرعی ہوگا جو مجھے معلوم نہیں کیونکہ بعض اعذار مخفی بھی ہوتے ہیں جن کا علم ہر شخص کو نہیں ہوسکتا۔ (مثلاً کسی کے مخفی جگہ زخم ہے جو ہر وقت بہتا ہے مگر تھوڑی دیر کو بند بھی ہو جاتا ہے۔ جس کیوجہ سے اس شخص کو خون کے بند ہونے کا انتظار لازم ہے۔ جماعت کی پابندی لازم نہیں یا اس کی یہ حالت ہے کہ اس کا نفس تقویٰ کا اعلیٰ درجہ حاصل نہیں کرسکتا۔ اس لئے اس نے ادنیٰ درجہ ہی پر نفس سے صلح کرلی ہے۔ اگر وہ نفس کو پابندی جماعت پر مجبور کرے تو اندیشہ ہے کہ نماز ہی سے رہ جائے گا۔ اس چور نے اپنے نفس سے ہیرا پھیری پر صلح کرلی تھی۔ اگر یہ بھی نہ کرتا تو سرقہ میں مبتلا ہو جاتا اور یہ ایسا عذر ہے جس کی اطلاع دوسروں کو نہیں ہوسکتی۔ اسلئے ناصح کو امر بالمعروف میں بہت احتیاط اور ہوشیاری کی ضرورت ہے جو شخص امر بالمعروف میں سیاست سے کام نہ لے اس کو امر بالمعروف جائز نہیں۔)

بعض دفعہ طبیب روحانی ایسے اعذار کو ترک جماعت کے لئے عذر مان لیتا ہے جن کو اہل ظاہر عذر نہیں مان سکتے۔ اسلئے سچ یہ ہے کہ امر بالمعروف صرف اہل اللہ کا منصب ہے اہل ظاہر کا منصب نہیں۔ بعض دفعہ اہل ظاہر امر بالمعروف میں ایسی غلطی کرتے ہیں کہ بجائے اصلاح کے فساد بڑھ جاتا ہے۔

چنانچہ کانپور میں ایک رئیس نماز پڑھتے تھے مگر کبھی موخر کر دیتے تھے اتفاق سے ایک واعظ ان کے یہاں مہمان ہوئے انہوں نے رئیس کو اس کے متعلق تاکید کی اور سختی سے تاکید کی۔

رئیس نے کہا حضرت ہم دنیا دار لوگ ہیں زیادہ ہمت نہیں سختی نہ کیا کیجئے۔ مگر واعظ صاحب نے ان کا ایسا پیچھا کیا کہ صبح کی نماز کے لئے بہت سویرے سے ان کو جگا دیتے اور سخت الفاظ سے انکو ملامت کرتے کہ جانوروں کی طرح پڑے سو رہے ہیں جگانے سے بھی نہیں اٹھتے۔ ایک دو روز تو رئیس نے صبر کیا۔ مگر جب وہ سختی سے باز نہ آئے تو ایک دن رئیس کو غصہ آ گیا اور اس نے جواب دیا کہ نماز تمہاری نہیں نہ تمہارے باوا کی۔ جاؤ ہم نماز ہی نہیں پڑھتے۔

بعد میں یہ رئیس کہتے تھے کہ اس کلمہ کی ایسی نحوست ہوئی کہ مجھے بیس برس تک نماز ہی کی توفیق نہ ہوئی۔ اور گو اس میں میری بھی خطا تھی۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کا وبال ان واعظ صاحب پر زیادہ پڑے گا۔ کیونکہ ان کی سختی نے ہی مجھے اس کلمہ پر مجبور کیا۔

تو ناصح کو ایسی سختی نہ چاہئے کیونکہ شریعت کا حق ہر مسلمان پر ہے تنہا ہمارے ہی ذمہ نہیں۔ پس ہم کو ایک دو دفعہ نرمی سے نصیحت کر دینا چاہئے۔ اب اگر مخاطب عمل نہ کرے تو پیچھے پڑنے کی ہم کو کیا ضرورت ہے۔

نماز اور جماعت

مگر ایسی مداہنت بھی نہ کرے کہ رئیسوں کو شطرنج کی اجازت دے دے کہ امام شافعیؒ کے مذہب[1] میں جائز ہے کھیلو! جیسا بعض واعظ ایسا بھی کرتے ہیں۔ بس! معیار یہ ہے کہ جو شخص اپنی مصلحت کے لئے امر بالمعروف میں مداہنت کرے وہ تو راہزن ہے اور جو دوسرے کی مصلحت سے کرے وہ عین محقق ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم محقق کی مداہنت کو سن کر اپنے جی میں خوش ہو جاؤ کہ ہمارے واسطے محققین نے گنجائش نکال دی ہے۔ بلکہ تم کو محقق سے اپنا حال عرض کرنا چاہئے اس کے بعد اگر وہ تمہاری ترک جماعت کو علاجاً گوارا کرے اور ترک جماعت کی وعید بھی سنا دے تو تارک جماعت رہو اور اپنے کو گنہگار بھی سمجھو اور اس گناہ سے توبہ بھی کرتے رہو اور خود تارک جماعت بنو گے۔ تو اپنے کو خواہ مخواہ معذور بے گناہ سمجھ کر گناہ کرو گے۔ اور یہ حالت اشد ہے اور اگر تم کو کوئی واقعی عذر ہو گا تو محقق اس کے ازالہ کا ایسا طریقہ بھی بتلا دے گا جو خود تمہاری سمجھ میں نہ آ سکتا تھا۔

---

[1] امام شافعیؒ کے نزدیک بھی کراہت سے خالی نہیں۔ کما یظھر من الجواھر النقی (ص ۲۵۳ ج ۲) اور اگر غفلت عن الصلوٰۃ کی طرف مفضی ہو تو بالاتفاق حرام ہے۔ ۱۲

بہر حال جماعت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت اہتمام فرمایا ہے اور اس کے ترک پر سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ مسلمانوں کو اسکا خاص اہتمام کرنا چاہئے۔ افسوس یہ ہے کہ بعض لوگوں کے گھر سے ملی ہوئی مسجد ہے پھر بھی ان کو جماعت کی توفیق نہیں ہوتی۔

مکہ معظمہ میں سوق حراج میں ایک بڈھا بدوی گاؤں کی چیزیں لاکر بیچتا تھا ساری عمر اسی بازار میں آتے جاتے گزر گئی تھی۔ مگر حج کی توفیق نہ ہوئی۔ ایک دفعہ وہ تعجب سے پوچھنے لگا کہ بعض موسموں میں لاکھوں آدمی یہاں کیوں جمع ہو جاتے ہیں اس کو اتنی بھی خبر نہ تھی کہ لوگ حج کے واسطے مکہ آتے ہیں ایک رئیس کو بڈھے کی بات پر بہت تعجب ہوا کہ مکہ میں ساری عمر گزر گئی اور آج تک اسکو حج کی توفیق نہیں ہوئی۔

ایک مولوی صاحب نے کہا حضور تعجب کی کیا بات ہے۔ یہ تو ایسا ہے جیسے آپ کے گھر کے پاس مسجد ہے اور آپ آج تک مسجد میں نہیں آئے (یہ رئیس تارک جماعت تھے) یہ جواب سن کر ان کی آنکھیں کھل گئیں۔

غرض! جیسے ترک صلوٰۃ مذموم ہے اسی طرح ترک جماعت بھی مذموم ہے البتہ عورتوں کی جماعت یہی ہے کہ وہ اپنی نماز کو سنبھال کر ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کریں ان کے واسطے یہی جماعت ہے کیونکہ مرد کو جو ثواب جماعت میں ملتا ہے وہ عورتوں کو تنہا پڑھنے سے مل جاتا ہے۔

تعجیل فی الصّلوٰۃ

اسی طرح نماز کو سنبھال سنبھال کر پڑھنا چاہئے۔ بعض ائمہ کے نزدیک تو تعجیل فی الصلوۃ سے نماز فاسد ہو جاتی ہے کیونکہ ان کے یہاں تعدیل ارکان واطمینان فرض ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ کے نزدیک نماز فاسد نہیں ہوتی۔ بلکہ صحیح ہو جاتی ہے۔ مگر ایسی صحیح ہوتی ہے جیسے لنگڑا آدمی بھی آدمی کہلاتا ہے۔ پس جلدی کی نماز نماز تو ہے مگر لنگڑی لنجی نماز ہے تو کیا خدا کے سامنے ایسی نماز پیش کر کے آپ کا جی خوش ہو سکتا ہے؟ البتہ بچوں اور کمزوروں پر آسان کرنا چاہئے وہ اگر جلدی جلدی نماز پڑھیں تو ان پر سختی نہ کرو۔ مولانا فرماتے ہیں

چار پار اقدر طاقت بار نہ   برضیعفاں قدر ہمت کار نہ

جانوروں پر انکی طاقت کے لحاظ سے بوجھ لادو اور کمزوروں پر انکی برداشت کے مطابق کام ڈالو۔

فساد عقیدہ

مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ضعفاء خود اپنے واسطے کچھ تجویز نہ کریں کسی محقق سے تجویز کراویں۔

اور یہ ہر امر میں ضروری ہے اور میں کس طرح اس کی ضرورت آپ کے دل میں ڈال دوں۔ واللہ! مجھے اس کے لئے الفاظ بھی نہیں ملتے۔ مگر لفظ کے سوا میرے پاس کیا ہے بس پھر یہی کہتا ہوں کہ دوسرے کے حوالے اپنے کو کردو۔ اس کی بہت ضرورت ہے اور اس میں سہولت بھی ہے کہ سارا بوجھ دوسرے کے اوپر رہے تم آزاد رہو۔ جہاں کوئی اشکال پیش آیا اس سے کہہ دیا جو اس نے بتلایا اس پر عمل کرلیا۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ شخص محقق اور شفیق ہو جو زبان حال سے یوں کہتا ہو

من غم تو میخورم تو غم مخور بر   تو من مشفق ترم از صد پدر

''تو غم نہ کر مجھے تیرا بے حد خیال ہے۔ میں تجھ پر سو باپوں سے بھی زیادہ شفیق ہوں۔''

جسکو ایسا رہبر مل جائے اس کی سعادت وراحت کا کیا پوچھنا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے حتیٰ کہ اگر وہ کسی سوال کے جواب میں یوں کہہ دے کہ خود سوچ کر جو مناسب سمجھو کرلو تو اس صورت میں اس کی بات مانو اور خود سوچ کر کام کرو۔ یہ نہیں کہ ہر بات کے جواب پر اس کو مجبور کرو۔ چنانچہ بعض لوگ شیخ کو تنگ کردیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضور میں نے وعظ میں سنا تھا کہ ہر کام شیخ سے پوچھ کر کرو۔ اس لئے میں پوچھتا ہوں کہ بیٹی کا رشتہ کہاں کروں۔

چنانچہ ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میں بانوں کی تجارت کروں یا دواؤں کی۔ میں نے لکھ دیا کہ نہ میرا باپ کھٹ بنا تھا نہ عطار۔ میں کیا جانوں کہ کس کی تجارت اچھی ہے کسی کی بری۔

تو ہر کام کے پوچھنے کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کی تجارت وزراعت وغیرہ میں ان سے مشورہ لیا کرو۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ ان سے مسائل شرعیہ پوچھو کہ یہ تجارت جائز ہے یا نہیں یا دعا کی درخواست کرو تو اس کا بھی مضائقہ نہیں۔ غرض! ہماری حالت حدود کے اندر نہیں۔ یا تو افراط ہے یا تفریط ہے۔ اگر علماء سے استغناء ہے تو ایسا کہ مسائل احکام میں بھی ان سے مراجعت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ خود جو سمجھ میں آیا کرلیا۔ اور اگر احتیاج ہے تو ایسی کہ شادی کی تاریخ بھی انہی سے دریافت کرکے مقرر کرتے ہیں جیسے ہندو برہمنوں سے پوچھ کر تاریخ معین کرتے ہیں۔

چنانچہ بعض لوگ مجھ سے بھی ایسے سوال کرتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ اپنی زبان سے ایک وقت تو بتلا دو۔ میں ان کو اپنی زبان سے کچھ نہیں بتلاتا کیونکہ اس میں فساد عقیدہ ہے۔

یہ لوگ علماء یا اہل اللہ سے ایسی باتیں اس لئے پوچھتے ہیں کہ وہ ان کو کارخانہ خداوندی میں دخیل سمجھتے ہیں۔ خیر! عورتوں کا فساد عقیدہ تو عجیب نہیں۔ وہ تو ناقصات العقل ہیں ہی مگر آج

کل تو لکھے پڑھے خوش عقیدہ لوگ بھی بزرگوں کے بارہ میں فساد عقیدہ میں مبتلا ہیں۔

چنانچہ الہ آباد کے ایک رئیس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ میرے پاس اس کو زندہ کرانے آئے تھے۔ میں نے ان کو بہت کچھ سمجھایا مگر ان کا فساد عقیدہ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ اپنے بھائی سے کہ یہ زندہ تو کر سکتے ہی۔ مگر کسی مصلحت کی وجہ سے انکار کرتے ہیں

اے صاحبو! اہل اللہ زندہ تو کیا کر سکتے وہ تو واللہ! آپ کے معاملات میں دعا کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ کیونکہ آپ نے یہ درخواست کی کہ میں وکالت کا امتحان دینا چاہتا ہوں۔ پاس ہونے کی دعا کیجئے تو ان کو اس کے لئے دعا کرتے ہوئے اندیشہ ہوتا کہ نہ معلوم یہ وکالت سے کن کن حرام کاموں میں مبتلا ہو گا۔ پھر وہ اس طرح دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! اگر اس کے واسطے وکالت بہتر ہو تو پاس کر دیجئے۔

بہر حال اہل اللہ سے دعا کی درخواست کا تو مضائقہ نہیں اور اگر کسی کام کے متعلق وہ یہ کہہ دیں کہ خود سوچو تو پھر خود سوچنا چاہئے۔ اس میں یہ بھی آسانی ہے کہ تم آزاد اور بےفکر رہو گے۔ اور اگر وہ ہر کام میں ایک شق ...... متعین کر دیا تو بعض دفعہ تم کو تنگی پیش آئے گی۔ کیونکہ ممکن ہے تم کو دوسری شق میں مصالح نظر آتے ہوں اور اہل اللہ کے لئے صاحب کشف ہونا ضروری نہیں کہ ہر معاملہ میں اسی شق کو ترجیح دیں جو خیر ہو۔ اور صاحب کشف ہوں بھی تو ہر وقت کشف ہونا لازم نہیں۔

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ تم اپنی رائے سے اپنے کو ترک جماعت وغیرہ میں معذور قرار نہ دو۔ بلکہ اپنے کو کسی محقق کے حوالے کر دو اور اس کی رائے پر عمل کرو۔

امام کے فرائض

بہر حال نماز اور جماعت کا بہت اہتمام کرنا چاہئے اور اس میں کچھ دشواری نہیں کیونکہ شریعت نے نماز اور جماعت میں آسانی کی بہت تدبیریں کی ہیں جو محقق کامل سے دریافت کرنے پر معلوم ہو سکتی ہیں۔ مثلاً امام کو امر ہے کہ قرأت میں تخفیف کرے مقتدیوں پر بوجھ نہ ڈالے۔ بعض ائمہ اس کی رعایت نہیں کرتے۔

کانپور میں ایک بزرگ آئے۔ گرمی کا دن تھا۔ نماز جمعہ کا وقت تھا۔ آدمی بہت تھے۔ بعضے شامیانہ سے بھی باہر تھے دھوپ سخت تھی امام مسجد نے نماز پڑھانے کے لئے ان بزرگ کو بڑھا دیا۔ انہوں نے اول تو خطبہ بہت لمبا پڑھا۔ حالانکہ تطویل خطبہ خلاف سنت ہے۔ خطبہ میں اختصار سنت ہے۔ مگر شیخ بن جانا آسان ہے اتباع سنت دشوار ہے پھر ان حضرت نے یہ فرمایا کہ یہ وہ خطبہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر پڑھا تھا۔ سبحان اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھنا تو ایسا تھا کہ آپ سارا بھی پڑھتے تو مثل سورۂ فاتحہ کے معلوم ہوتا۔ کیونکہ آپ کی قرأت میں لطف ہی عجیب تھا جس کی وجہ سے سامعین پر ذرا گرانی نہ ہوتی تھی (پھر باوجود اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جمعہ کے خطبہ میں تطویل منقول نہیں۔ ہاں جمعہ کے علاوہ بھی بعض اوقات میں آپ کسی ضرورت سے خطبہ فرماتے تھے۔ اس میں تطویل ممکن ہے تو شاید یہ خطبہ بھی ایسا ہی ہوگا جسکو ان بزرگ نے نماز جمعہ میں پڑھ دیا، پھر نماز میں اتنی تطویل کی کہ بعض لوگ بے ہوش ہو گئے۔ بعض کو استغراق ہو گیا امام کو ایسی تطویل جائز نہیں۔ مگر آج کل ائمہ کو اس کی مطلق پرواہ نہیں۔ بلکہ غضب یہ ہے کہ تطویل کو مستحسن سمجھتے ہیں۔

چنانچہ رڑکی میں ایک امام نے لمبی نماز پڑھائی جب لوگوں نے دھوپ کی شکایت کی تو جواب میں کہا کہ ارے کمبختو! تم دوزخ میں کیسے رہو گے جو ذرا سی دھوپ سے گھبرا گئے۔ لوگوں نے کہا۔ کمبخت! جہنم میں تو ہی رہے گا ہم کیوں جہنم میں رہتے جو تو ہمیں جہنم میں رہنے کا اس طرح عادی بناتا ہے۔

یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ لوگ دین میں اپنے رائے پر عمل کرتے ہیں کسی محقق کے حوالے اپنے کو نہیں کرتے۔ بس ان لوگوں نے یہ دیکھ لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دفعہ لمبا خطبہ بھی پڑھا ہے اور یہ دیکھ لیا کہ آپؐ نے بعض دفعہ سورۂ ق اور سورۃ القمر کی قرأت فرمائی ہے۔ اب لگے لمبا خطبہ اور لمبی قرأت کرنے۔ اگر کسی محقق سے پوچھتے تو وہ ان سب کا محل بتلاتا۔

آج کل ہماری حالت یہ ہے کہ یا تو شریعت کی مطلق پرواہ نہیں کہ نہ نماز ہے نہ روزہ، نہ زکوٰۃ ہے نہ حج۔ اور اگر پرواہ اور اہتمام ہے تو اس میں ایسا غلو ہے کہ مقتدیوں کی حالت کی ذرا مراعات نہیں۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی — تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

مولانا رومیؒ اسی کو فرماتے ہیں ؎

چوں گرسنہ می شوی سگ میشوی — چونکہ خوردی تند و بدرگ می شوی

"جب تم بھوکے ہوتے ہو تو کتے کی طرح جاتے ہو اور جب کھا لیتے ہو وحشت و بداصل بن جاتے ہو۔

تفسیر بالرائے

صاحبو! اگر تم اپنی رائے سے دین پر چل سکتے ہو تو پھر اہل اللہ کس مرض کی دوا ہیں اور اگر تم کو کتابیں دیکھ کر اطباء روحانی سے استغناء ہو سکتا ہے تو اطباء جسمانی سے استغناء کیوں نہیں ہوا کیونکہ یہاں بھی تو کتابیں اور قرابادین موجود ہیں۔ بس کتاب دیکھ کر علاج کر لیا کرو۔

یاد رکھو! کتابوں سے کام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ طبیب کتابی نسخوں میں اجتہاد کرتا ہے۔ کتر بیونت کرتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ کس کے لئے کون سی دوا اور کون سا نسخہ موافق ہے اور وزن کتنا ہونا چاہئے۔ اسی طرح دین کے راستہ میں بھی طبیب کامل امور اختیاریہ میں کتر بیونت کرتا ہے۔

اس قید کا فائدہ یہ ہے کہ یہ کتر بیونت اصول و مقاصد میں نہیں ہوتی بلکہ طریق و تدبیر میں ہوتی ہے۔ یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ آج کل بعض لوگ علماء سے اصول و مقاصد میں کتر بیونت کی درخواست کرتے ہیں کہ ذرا سا سود جائز کر دو۔ ذرا سی رشوت جائز کر دو۔ یہ سوال حماقت کا سوال ہے کیونکہ اصول و مقاصد میں کسی کی رائے کو دخل نہیں ہو سکتا۔ اور بعضے علماء سے بھی درخواست نہیں کرتے بلکہ خود ہی کتر بیونت شروع کر دیتے ہیں۔

چنانچہ ایک شخص نے یہ غضب کیا کہ سود کی حلت پر ایک رسالہ لکھ مارا اور اس میں لکھا کہ سود حرام نہیں اور حرم الربوا میں لفظ ربوا بالکسر نہیں بلکہ رُبا بالضم ہے جو ربودن سے ماخذ ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے غضب کو حرام کیا ہے کسی کا مال جبراً نہ چھینو۔ اس سے کوئی پوچھے کو جو ربا ربودن سے ماخوذ ہوگا، وہ عربی لفظ ہوگا یا فارسی۔ ظالم نے قرآن کو فارسی کا قرآن بنا دیا۔ مگر غنیمت ہے کہ اس نے ایسی تحریف کی جس کی غلطی پر مسلمان مطلع ہو سکتا ہے (اور بعضے ایسا دھوکا دیتے ہیں جس سے عوام گمراہ ہو جاتے ہیں۔

ایک طالب علم نے یہ غضب کیا کہ زمانہ امتحان میں دن کی نماز میں قصر کیا اور وجہ یہ بیان کی کہ مجھے فیل ہونے کا خوف تھا۔ اور خوف کی حالت میں قصر جائز ہے کیونکہ قرآن میں ہے کہ

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ

”ایسی حالت میں تم پر نماز قصر کرنے پر کوئی گناہ نہیں (آگے ان خفتم دوسری آیت کا ٹکڑا ہے معنی یہ ہیں کہ) اگر تم کو ڈر ہو کہ۔

دوسرے طالب علم نے جواب دیا کہ اول تو یہاں مطلق خوف مراد نہیں چنانچہ ظاہر ہے دوسرے یہ حکم مشروط بشرطین ہے ایک شرط تو یہ ہے جو بعد میں مذکور ہے اور ایک شرط فلا جناح سے پہلے مذکور ہے واذا ضربتم فی الارض۔ اور جو حکم مشروط بشرطین ہو اس کا ثبوت ایک شرط کے تحقق سے نہیں ہو سکتا کہا، واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں ان نمازوں کا قضا کروں گا۔

یہ تو بہت غنیمت تھے مگر ایک صاحب ان سے بھی بڑھ کر تھے ہمیشہ قصر کرتے تھے اور دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے تھے۔

کن فی الدنیا کانک غریب (جس کا ترجمہ یہ ہے) دنیا میں مسافروں کی طرح رہو۔
کوئی اس سے پوچھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی تو فرمایا کہ مسافروں کی طرح رہو۔ یہ تو نہیں فرمایا کہ بالکل مسافر ہو جاؤ کہ قصر بھی کرنے لگو۔ دوسرے تم نے اس حدیث پر صرف قصر صلوۃ کے ہی بارہ میں عمل کیا اور باتوں میں بھی مسافروں کی طرح کیوں نہ بنے کہ نہ روپیہ زیادہ جمع کرتے نہ جائیداد نہ مکان بناتے نہ گھر میں زیادہ سامان رکھتے۔ پہلے اپنی حالت پوری طرح مسافروں کی طرح سی بنائی ہوتی۔ اس کے بعد ہی نماز پر ہاتھ صاف کیا ہوتا۔ مگر سب سے پہلے لوگ دین پر ہاتھ صاف کرتے ہیں دنیا میں کمی نہیں کرتے۔ یہ کیسا حدیث پر عمل ہے۔

آج کل سارے مفسر ایسے ہیں کہ قرآن سے دنیا کے مطالب نکالتے ہیں کوئی قرآن سے سوراج ثابت کرتا ہے، کوئی پریڈ ثبوت دیتا ہے کوئی قومی جلسوں کی دلیل نکالتا ہے۔۔۔۔۔۔ واہیات؟ صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ تفسیر کے لئے چودہ علوم میں مہارت کی ضرورت ہے جو شخص ان علوم میں ماہر نہ ہو اس کو مفسر بننا جائز نہیں کیونکہ وہ تفسیر بالرائے میں مبتلا ہوگا۔

آج کل تو غضب یہ ہے کہ کفار تک قرآن کی تفسیر کا دعویٰ کرتے ہیں چنانچہ رامپور میں ایک انگریز کہہ رہا تھا کہ کران (قرآن) میں ہے کہ طاعون لگتا ہے کیونکہ قرآن میں آیا ہے کہ جہاں طاعون ہو وہاں مت جاؤ اور جو پہلے سے طاعون کی جگہ ہو وہاں سے باہر نہ جاؤ۔ یہ حکم اسی لئے تو ہے کہ باہر سے طاعون کی جگہ آؤ گے تو تم کو طاعون لگ جائے گا اور تم کو طاعون کی جگہ باہر جاؤ گے تو دوسروں کو طاعون لگ جائے گا۔

سبحان اللہ! اول تو یہ مضمون قرآن میں نہیں بلکہ حدیث میں ہے۔ پھر حدیث کا مضمون بھی جس قدر ہے اس میں یہ کہاں ہے کہ اس حکم کی علت طاعون لگنا ہے ممکن ہے کوئی دوسری علت ہو جیسے حفظ اعتقاد وغیرہ جو علماء نے بیان کی ہے۔ مگر آج کل آزادی کا یہ عالم ہے کہ کفار بھی احکام شرعیہ کی علتیں خود گھڑتے ہیں حالانکہ وہ قرآن کو خود پڑھنے پر قادر نہیں مطلب سمجھنا تو بہت دور ہے۔

چنانچہ میرے بھائی ریل میں سفر کر رہے تھے۔ ان کے درجہ میں ایک انگریز بھی تھا بھائی کے ہاتھ میں ٹائپ کا چھپا ہوا قرآن تھا۔ وہ انگریز کہنے لگا کہ میں اس کو دیکھ سکتا ہوں بھائی نے کہا، ہاں رومال میں لے کر دیکھ سکتے ہیں اس نے رومال میں لے کر قرآن کو دیکھا تو سرورق پر الٓر لکھا تھا۔ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ یہ کیا ہے آلو۔ بھائی نے حمائل اس کے ہاتھ سے لے لی اور کہا۔ آپ اس کو پڑھ نہیں سکتے۔ اس لیاقت پر ان لوگوں کو یہ دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے

قرآن وحدیث کے احکام کی علتیں بیان کرتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک انگریز کی حکایت ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ بعضے انگریزی خواں طالب علم باوجود مسلمان ہونے کے قرآن نہیں پڑھ سکتے وہ قرآن کے ہجے کرنے سے بھی عاجز ہیں یہ مسلمانوں کے بچے ہیں۔ مجھے تو ایسے لوگوں کے نکاح میں بھی شک رہتا ہے کیونکہ انگریزی خواں طلباء کے عقائد میں بھی بہت گڑبڑ ہے اعمال کا تو پوچھنا ہی کیا۔ صاحبو! خدا کیلئے نکاح کے وقت اتنا تو کم از کم دیکھ لیا کرو کہ لڑکا مسلمان بھی ہے یا نہیں۔

حقیقی تعزیت

یہاں تک تو نماز کے متعلق بیان تھا۔ اب میں صبر کا بیان کرنا چاہتا ہوں۔ سو یہ تو اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ صبر کے معنی ضبط نفس کے ہیں یعنی نفس کی خواہش کو دبانا اور اس کو ثابت قدم رکھنا۔ یہ وصف بھی ہمارے اندر آج کل بہت کم ہے اور اس تعریف سے آپ کو معلوم ہوگا کہ صبر کے معنی صرف یہی نہیں کہ کسی کے مرنے پر صبر کر لیا جائے چونکہ یہ موقع سخت ہے اس لئے عرف میں اسی موقع پر ضبط نفس کا نام صبر ہو گیا۔ اور اس میں کچھ شدت تو واقعی ہے دوسرے وہ اس لئے بھی اشد ہو گیا کہ لوگ اس موقع پر خود بھی غم کو بڑھاتے ہیں کہ بار بار اس کا تذکرہ کرتے اور سوچتے ہیں اور تعزیت کرنے والے بھی بار بار اسی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ آج کل تعزیت تعزیت نہیں بلکہ تعذیب ہے کہ تکلیف کو بڑھاتے ہیں۔ تعزیت کے معنی تسلی کرنے کے ہیں۔ مگر آج کل تسلی نہیں دی جاتی۔ بلکہ غم کو بڑھایا جاتا ہے۔

تعزیت تو یہ ہے جو ایک اعرابی نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے موقع پر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا تھی۔ آج کل اگر کوئی ایسا مضمون بیان کرے تو لوگ کہیں گے۔ لیجئے تسلی دینے آئے تھے ڈھیلا سا مار گئے۔ آج کل تو تعزیت اس کو کہتے ہیں کہ بیٹھتے ہی رونے لگو۔ یا رونے کی صورت بنا لو اور یوں کہو کہ یہ خبر سن کر بہت ہی غم اور صدمہ ہوا۔ تمہارے دل پر کیا گزری ہوگی۔ ہائے! یہ کیسا گھر برباد ہو گیا جس سے غم زدہ کا دل اور پاش پاش ہو جاتا ہے خصوصاً عورتوں کے کلمات تو ایسے زہر آلود ہوتے ہیں کہاں کے متعلق تو میں فتویٰ دیتا ہوں کہ غم کے وقت ان کے کلمات سننا جائز نہیں۔ مجھے تو ایک مرتبہ عورتوں کے کلمات تعزیت سن کر اختلاج قلب ہو گیا تھا جس کی مضرت دور تک پہنچ گئی تھی۔ ان کا سننا صحت جسم اور صحت دین دونوں کے لئے مضر ہے اب اس اعرابی کا مضمون سنئے۔ کہتا ہے ؎

اصبر نکن بک صابرین فانما   صبر الرعیة بعد صبر الراس

اے عبداللہ بن عباس! صبر کیجئے تا کہ آپکو دیکھ کر ہم بھی صبر کا سبق سیکھیں...... کیونکہ آپ مقتداء ہیں اور مقتداء کے صبر سے ہی رعیت کو صبر کا سبق حاصل ہوتا ہے اگر مقتداء بے صبر بن جائے تو رعیت کیوں کر صابر ہوگی۔"

سبحان اللہ! کیسی عجیب تعلیم ہے جس کو سن کر مقتدا پوری طرح صبر کے لئے آمادہ ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ آپکو اوّل تو اپنے علم کی وجہ سے صبر کرنا چاہئے۔ اگر یہ نہ ہو تو کم از کم ہمارے ہی خیال سے صبر کیجئے۔ آگے کہتا ہے۔

خیر من العباس اجرک بعدہ ۔ واللہ خیر منک للعباس

حضرت عباسؓ کے انتقال سے جو آپ کو غم کو ہوا اور اس پر اجر ملا وہ اجر آپ کے حق میں حضرت عباس سے بدرجہا بہتر ہے عباس کو لے کر کیا کرو گے۔ وہ تو دنیا ہی میں کام آتے اور ثواب تو جنت تک آپ کو پہنچا دیگا۔ اور حضرت عباسؓ کے لئے خدا تعالیٰ آپ سے بہتر ہیں۔ وہ آپ سے جدا ہو کر خدا کے پاس پہنچ گئے۔ پھر کاہے کا غم کہ نہ آپ کا نقصان ہوا نہ ان کا بلکہ دونوں کا نفع ہی ہو گیا۔

یہ ایسا مضمون ہے جو آج کل کے عرف میں تعزیت کا مضمون شمار نہیں ہوتا مگر حقیقت میں تعزیت یہی ہے چنانچہ عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مجھے کسی کی تعزیت سے اتنا نفع نہیں ہوا جتنا اس اعرابی کی تعزیت سے ہوا۔

غم کی حکمت و حقیقت

بعض جگہ جہاں بے تکلفی ہوتی ہے میں بھی یہی بات کہہ دیتا ہوں کہ میاں کس غم میں پڑے انسان کو خدا تعالیٰ نے عقل اور دین اسی موقع کے واسطے عطا فرمایا ہے۔ عقل سے کام لو اور دین کی باتوں میں غور کرو تو یہ بات کچھ زیادہ غم کی نہیں کیونکہ مرنے کی حقیقت یہ ہے جیسے پردیس سے وطن پہنچ جائے تو مرنے والا تو اصلی وطن میں پہنچ گیا اس پر کیا رنج۔ ہاں! ہم پردیس میں رہ گئے۔ ہم کو اس کی فکر چاہئے کہ خیرت سے ہم بھی اپنے وطن میں پہنچ جائیں۔ بس! اب صرف مفارقت کا صدمہ رہ گیا۔ سو وہ بھی چند روزہ ہے ایک دن ہم بھی وہیں جانے والے ہیں جہاں وہ گیا۔

ایک بات میں لاکھوں کی بتلاتا ہوں وہ یہ کہ طبعی غم اور ہے کسبی غم اور ہے طبعی غم کی مدت بہت کم ہے۔ وہ تو خود بخود بہت جلد زائل ہو جاتا ہے ہاں کسبی غم جو خود سوچ سوچ کر پیدا کیا جاتا ہے۔ اور تذکرہ کر کر کے بڑھایا جاتا ہے وہ البتہ اشد ہے مگر اس کا حدوث و بقا اختیاری ہے سوچ سوچ

موقوف کرو تذکرہ نہ کرو تو کبھی غم پاس بھی نہ آئے گا۔

رہا طبعی غم وہ البتہ غیر اختیاری ہے مگر وہ نہ تحمل سے باہر ہے نہ اس کی مدت زیادہ ہے پھر اس کی حکمت میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ نے یہ غم بھی محض رحمت کی وجہ سے دیا ہے کہ وہ ایک دولت ہم کو عطا فرمانا چاہتے ہیں۔ جب وہ حکمت حاصل ہو جاتی ہے تو خود ہی اس کو دور بھی کر دیتے ہیں۔

درد از یارست ودرماں نیز ہم　　　دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم

"درد دوست کا دیا ہوا ہے اور دوا بھی۔ دل اور جاں دونوں اس پر فدا ہیں۔"

اللہ تعالیٰ تم کو غم دینا چاہتے ہیں بلکہ ایک دولت دینا چاہتے ہیں جس کا آلہ غم کو بنایا گیا ہے پھر چونکہ غم مقصود نہیں اس لئے اس کو جلدی ہی زائل کر دیتے ہیں۔ بشرطیکہ تم خود اسکو نہ پالو اور بڑھانے کی کوشش نہ کرو۔

غم کی حکمت یہ ہے کہ انسان متمدن ہے اور تمدن موقوف ہے ہمدردی پر اور ہمدردی موقوف ہے رقت قلب پر۔ پس رقت کو تازہ کرنے کے لئے بعض دفعہ اسباب رقت یعنی غم وغیرہ نازل ہوتے ہیں۔ اگر اس کی تجدید نہ کی جائے تو یہ قوت بالکل معطل ہو جاتی ہے چنانچہ اطباء نے تصریح کی ہے کہ جس قوت سے کام نہ لیا جائے وہ بیکار ہو جاتی ہے۔

ذبح حیوانات میں بھی میرے نزدیک یہی حکمت ہے جس کو میں سمجھا ہوں کہ یہ بھی رقت بڑھانے کے واسطے ہے لوگ کہتے ہیں کہ ذبح سے قساوت بڑھتی ہے مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مسلمان کامل سے زیادہ رحم دل کوئی نہیں ہو سکتا اور قصائی جو سخت دل ہوتے ہیں۔ وہ اس لئے کہ وہ اپنے پیشہ کی غرض کے لئے ذبح کرتے ہیں اگر ان کی غرض پیشہ کی درمیان میں نہ ہو تو ان سے زیادہ رحم دل...... کوئی نہیں ہوتا۔

بہر حال غم کی حکمت یہ ہے کہ اس سے قلب کی رقت اور صفت رحمت تازہ ہوتی ہے اور یہ بڑی دولت ہے جو دین میں بھی کارآمد ہے اور دنیا میں بھی۔

تعزیت کی مدت

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جس شخص پر اسباب غم وارد نہ ہوئے ہوں اس کو دوسروں کی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوتا نہ اسکو دوسروں کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے۔ یہ راز ہے طبعی غم میں تین دن مقرر فرمائی ہے۔ اسی لئے تین دن کے بعد اہل بلد کو تعزیت جائز نہیں کیونکہ غم تو ہلکا ہو گیا اب تعزیت کرنا نشتر مار کر مرہم پٹی کرنا ہے۔

جیسے ایک سرحدی چوروں کے ہاتھ سے زخمی ہو گیا تھا کسی ہندوستانی نے اس کی بڑی خدمت کی یہاں تک کہ اچھا ہو گیا تو سرحدی نے کہا اگر تم نے کبھی ہمارے وطن آؤ تو ہم تمہارے احسان کا بدلہ دیں گے۔

اتفاق سے یہ سرحد کی طرف گیا اور اس کا مہمان ہوا اور منتظر رہا کہ دیکھئے میرے احسان کا کیا بدلا دیتا ہے۔ اس کی بیوی کو معلوم ہوا کہ یہ مہمان وہ ہندوستانی ہے جس نے شوہر کی خدمت کی تھی۔ تو اس نے اس سے کہا کہ اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ کیونکہ میرا خاوند تمہارا تذکرہ کیا کرتا تھا کہ ایک ہندوستانی نے ہمارے ساتھ بڑا احسان کیا ہے کہ ہم زخمی تھے ہم کو اچھا کیا اگر وہ یہاں آ جائے تو ہم بھی اس کو زخمی کر کے خدمت اور مرہم پٹی سے اچھا کریں گے وہ یہ سن کر بھاگا اور احسان کے بدلہ سے باز آیا۔

تو جو لوگ تین دن کے بعد تعزیت کرتے ہیں وہ بھی تندرست دل کو زخمی کر کے مرہم پٹی کرتے ہیں۔ البتہ باہر سے آنے والوں کو تین دن کے بعد بھی تعزیت جائز ہے کیونکہ صاحب واقعہ اس کی تعزیت کو ضرورت پر محمول کرے گا۔ اس لئے اس کے دل پر اس سے نشتر نہیں لگے گا۔ بلکہ اگر یہ غریب تعزیت نہ کرے بلکہ خاموش بیٹھا رہے تو صاحب واقعہ کو اس کی شکایت پیدا ہوگی کہ میرے غم کے متعلق ایک لفظ بھی ہمدردی کا نہ کہا پھر اس کے آنے سے کیا فائدہ ہوا۔ نیز آنے والے کا دل بھی سکوت سے منقبض ہوتا ہے اس کا دل تقاضا کرتا ہے کہ دو چار کلمے تسلی کے ضروری کہے۔ شریعت مقدسہ کی پاکیزگی ملاحظہ کیجئے کہ باہر سے آنے والوں کو تین دن کے بعد بھی تعزیت کی اجازت دے دی تاکہ طرفین کے جذبات کی رعایت ہو جائے مگر اہل بلد کے لئے میعاد مقرر ہے۔

مجھے ایک جنٹلمین کی حکایت بہت پسند آئی جو عقل و انتظام میں مشہور تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوا تو انہوں نے اس کے لئے بھی ایک مسل مقرر کر کے جو شخص زبانی یا تحریری تعزیت کرتا اس کا قول اور اپنا جواب مسل میں درج کر دیتے اور اس کے لئے ایک میعاد مقرر کر دی تھی۔ جب وہ میعاد گزر گئی مسل داخل دفتر کر دی گئی۔ اس کے بعد جو شخص آتا اور کچھ کہنا چاہتا۔ آپ اس سے پہلے ہی پوچھ لیتے کہ کیا آپ میرے والد ماجد صاحب کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ اگر وہ کہتا جی ہاں! تو کہہ دیتے کہ تعزیت کی مسل داخل دفتر ہو چکی ہے کیونکہ میعاد گزر گئی۔ اس لئے اب اس کے متعلق میں سننا نہیں چاہتا دوسری بات کیجئے۔

میرا اس حکایت سے یہ مقصود نہیں کہ آپ بھی مسل مقرر کیا کریں یہ تو ان کا غلو فی الانتظام تھا۔ بلکہ مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ تعزیت میعاد کے قابل ضرور ہے۔ عقل بھی اس کے لئے تعیین میعاد کی مقتضی ہے چنانچہ شریعت نے اس کے لئے تین دن مقرر کئے ہیں۔ تین کے عدد میں ایک خاص خاصیت ہے اس لئے مسح خفین اور سفر و ہجران مسلم وغیرہ کے لئے تین دن کی حد مقرر ہے اور تجربہ بھی ہے کہ تین دن کے بعد غم ہلکا ہو جاتا ہے۔

بعض لوگ شاید اس پر یہ کہیں کہ جس کے دل کو لگتی ہے۔ اس کو تو پھر بھی خیال آتا ہے۔ میں اس کو مانتا ہوں۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ تین دن کے بعد وہ حال نہ ہوگا جو ابتداء میں تھا۔

غم غلط کرنے کا طریقہ

دوسرے یہ کہ قاعدہ عقلیہ ہے۔ النفس لا تتوجہ الی شیئین فی ان واحد ایک آن میں نفس دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا۔ پس تم اپنے ذہن کو دوسرے کاموں کی طرف متوجہ کرو اپنا کاروبار شروع کردو۔ پھر غم کا غلبہ نہ ہوگا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہم نے ایسا بھی کیا مگر پھر بھی خیال آتا ہے تو میں اس کا بھی انکار نہیں کرتا۔ مگر جواب یہ ہے کہ جیسا غلبہ ابتداء میں تھا وہ ضرور کم ہو جائے گا۔

دوسرے اگر تم کو کبھی بخار آجاوے تو کیا کرتے ہو؟ دوا ہی پیتے ہو۔ اگر دوبارہ پھر آجاوے تو کیا کرو گے پھر بھی دوا پیو گے۔ تو ایسی ہی یہاں بھی برابر دوا کرتے رہو۔ یعنی نفس کو دوسری طرف متوجہ کرنے کی کوشش...... کرتے رہو۔

اب یہ سوال ہوگا کہ ہم کس خیال میں مشغول ہوں تو شریعت نے اس کو بھی حل کیا ہے اور یہ بھی دلیل ہے شریعت مقدسہ کے کامل ہونے کی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ. قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ

صبر کرنے والوں کو خوش خبری دیجئے ان کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

یعنی مصیبت اور غم کے وقت زبان کو انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کے ورد میں مشغول کیا جائے اور دل کو اس کے معنی کے تصور میں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں اور مالک کو ہر قسم کے تصرف کا اپنے مملوک میں اختیار ہے۔ غلام کو چاہئے کہ مالک کے تصرف پر راضی رہے اس لئے ہم کو بھی اس موقع پر تصرف حق پر راضی رہنا چاہئے۔

مگر بعض لوگ کمزور ہوتے ہیں۔ ان کے قلب کو عقلی جواب سے اطمینان نہیں ہوتا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ مسلم کہ ہم حق تعالیٰ کی ملک ہیں اور ان کو ہر تصرف کا اختیار ہے۔ مگر ہم کو میت سے خاص تعلق ہو گیا تھا۔ اور اب مفارقت ہوگئی ہے۔ اس مفارقت کا تحمل نہیں ہوتا۔ ان کیلئے دوسرا جواب ہے وانا الیہ راجعون۔ کہ گھبراؤ نہیں تم بھی وہی جانے والے ہو جہاں وہ گیا ہے مفارقت بھی ختم ہو جائے گی۔ یہ مفارقت چند روز ہے جیسا دنیا میں بھی بعض دفعہ سفر وغیرہ کی وجہ سے مفارقت ہو جاتی ہے۔

ناولوں کے مفاسد

بہر حال تسلی کا طریقہ یہ ہے کہ غم زدہ کو یہ نصیحت کرو کہ واقعہ کو از خود نہ سوچے بلکہ اپنے کام میں لگے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کے مضمون کو سوچے۔ جب اس سے طبیعت ٹھہر جائے تو کتابیں دیکھنے لگے۔ مگر شرط یہ ہے کہ مخرب اخلاق ناول نہ دیکھے جائیں کیونکہ ان سے قلب کا ناس ہو جاتا ہے۔ یہ گل بکاؤلی اور قصہ چہار درویش وغیرہ کتابیں بھی اگر چہ خبیث ہیں مگر اخبث نہیں کیونکہ ان میں شہوت رانی کی تدابیر نہیں بتلائی گئیں اور جو بتلائی گئی ہیں وہ کسی کے باپ کے قبضہ میں نہیں۔

مثلاً یہ لکھا ہے کہ ایک دیو آیا اور اس کو بکاؤلی کے باغ میں لے گیا اب بتلایئے کوئی یہ تدبیر کرنا چاہے تو دیو وغیرہ کہاں سے لائے گا۔ اور ناولوں میں ایسی تدابیر بتلائی گئی ہیں جن کو ہر شخص حاصل کر سکتا ہے اسی لئے قصہ گل بکاؤلی وغیرہ سے مفاسد کا ظہور نہیں ہوا اور ان ناولوں سے برے برے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ حیا تو بالکل جاتی رہتی ہے اور بعضے مشہور گھرانوں میں ان ناولوں کی وجہ سے بڑے بڑے واقعات ہو گئے ہیں اور اس میں سارا قصور والدین کا ہے کہ وہ ایسی کتابیں گھر میں کیوں گھسنے دیتے ہیں۔ شفیق باپ وہ چیز خود نہیں کھاتا جو بچوں کو مضر ہے۔ پس مردوں کا لازم ہے کہ ناولوں کو دیکھنا خود چھوڑ دیں تا کہ ان کے بیوی بچے اس کے زہر سے بچے رہیں۔ بلکہ بجائے ان کتابوں کے حضرات انبیاء علیہم السلام کے قصے دیکھو بزرگوں کے حالات دیکھو۔

میں بقسم کہتا ہوں کہ ان حکایات میں بعض دفعہ ایک ہی حکایت رہبر ہو جاتی ہے۔ اس پر تعجب نہ کیجئے۔ میں اس سے ترقی کر کے کہتا ہوں کہ بعض دفعہ ایک مختصر بات ہی رہبر ہو جاتی ہے۔

کانپور میں ایک بار میں پاخانہ میں بیٹھا تھا جو سڑک کے کنارے پر تھا کہ دو شخصوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ ایک شخص کسی کی شکایت کر رہا تھا کہ میں نے اس کے ساتھ ایسی بھلائی کی۔ اس طرح احسان کیا اور اس نے ہمیشہ میرے ساتھ برائی کی اب میں اس کو مزا چکھانا چاہتا ہوں تو دوسرے نے کہا تم بھلائی سے کیوں باز آتے ہو جب وہ برائی سے باز نہیں آتا۔

واقعی یہ بات آب زر سے لکھنے کے قابل ہے میرے دل پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ آج تک نہیں بھولا (مطلب یہ ہے کہ وہ تو برائی پر جما ہوا ہے اور تم سے بھلائی پر بھی نہیں جما جاتا۔ حالانکہ بھلائی ایسی چیز ہے کہ اس پر ہمیشہ جما رہنا چاہئے۔

پس تم بزرگوں کی حکایت اور انبیاء علیہم السلام کے قصے دیکھو! ان سے تمہارے دل کو بھی سکون ہوگا اور دین و دنیا بھی درست ہوگی۔ ایسی ہی کتابوں کے متعلق حضرت حافظ کا یہ ارشاد ہے

دریں دنیا رفیقے کہ خالی از خلل است — صراحی ے ناب و سفینہ غزل است

"ان دنوں وہ دوست جو برائی سے خالی ہو صرف خالص شراب کی صراحی اور غزل کا سفینہ ہیں۔"

مگر شرط یہ ہے کہ ان کتابوں کو بھی کسی عالم محقق سے تجویز کرالو۔ اپنی رائے سے کسی کتاب کا مطالعہ نہ کرو۔ جائیے! میں نے آپ کو اصلاح اخلاق کا سستا نسخہ دیدیا کہ دین کی کتابوں اور بزرگوں کی حکایت کا مطالعہ کرو۔ ان شاء اللہ اس سے بھی اصلاح ہو جائے گی۔ اگر اب بھی اصلاح نہ کرو تو یوں کہا جائے گا۔

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر — تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ممکن ہے بعض لوگ ایسے بھی ہوں جو اپنے دل میں یوں کہتے ہوں کہ بزرگوں کی حکایات کے مطالعہ سے اصلاح ہو جاتی ہے تو ہم ان کو دیکھیں ہی گے نہیں۔ جیسے ایک ڈوم سے سنا تھا کہ رمضان شریف کا چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے تو اس نے کہا کہ میں دیکھوں گا ہی نہیں۔ چنانچہ چاند سے چھپ کر ایک کوٹھری میں جا چھپا۔ وہاں ہی پاخانہ پیشاب شروع کیا تاکہ آسمان کی طرف نگاہ ہی نہ اٹھے۔ مگر کئی روز کے بعد بیوی نے تنگ آ کر گھر سے نکال دیا۔ ایک دن جنگل میں صبح کو تالاب کے کنارے آب دست کر رہا تھا کہ پانی میں چاند کا عکس نظر آ گیا تو کہنے لگا بڑ جا آنکھوں میں بڑ جا۔ (گھس جا) کردے روزہ فرض۔

تو اللہ کے بندو! تم خدا کے رستہ سے کیوں ڈرتے ہو۔ بخدا یہ تو بہت آسان رستہ ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے کریم ہیں کہ ان سے بڑھ کر کوئی بھی کریم نہیں۔ سلاطین دنیا میں تو قاعدہ یہ ہے کہ باغیوں کے لئے وارنٹ گرفتاری جاری ہوتے ہیں اور اگر کبھی باغی خود حاضر ہو جائے تو فوراً گرفتار کر لیا جاتا ہے یہاں کس قدر رحمت ہے کہ باغی خود آ جائے اور عاجزی سے معافی چاہنے لگے تو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔

وگر خشم گیرد بکردار زشت — جو باز آمدی ماجرا در نوشت

"اگر برے کاموں سے غصے ہو جائے تو جب تم ان سے باز آ جاتے ہو تو معافی دیدیتے ہیں۔"

اور وہ یوں فرماتے ہیں

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ — گر کافر و گبرو بت پرستی باز آ

ایں درگہہ ما درگہہ نومیدی نیست — صد بار اگر توبہ شکستی باز آ.....

''واپس آ، واپس آؤ جو کچھ بھی ہو واپس آؤ۔ تم کافر، آتش پرست یا بت پرست ہو تب بھی واپس آؤ۔ یہ ہماری درگاہ نا امیدی کی درگاہ نہیں۔ سو بار بھی اگر توبہ توڑ چکے ہو تو واپس آ جاؤ۔''

صبر اور طاعات

میں یہ کہہ رہا تھا کہ صبر دفقط واقعات موت ہی کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ صبر ہر نا گوار امر عام ہے یعنی ہر نا گوار بات پر نفس کو پابند کیا جائے اور اس کو شہوات میں آزادی نہ دی جائے۔ بلکہ ضبط سے کام لے کر دبا دیا جائے۔

اب ظاہر ہے کہ جس شخص میں یہ ملکہ راسخ ہو جائے گا اس کو تمام محرمات سے نفس کو روکنا آسان ہو جائے گا۔ بلکہ جس طرح نماز کو محرمات سے بچانے میں بھی دخل ہو گو معظم نفع طاعات کو آسان کرنا چاہئے اسی طرح صبر کو طاعات کے آسان کرنے میں بھی دخل ہے گو معظم نفع صبر کا ترک محرمات میں آسانی پیدا کرنا ہے اور طاعات کو آسان کرنے میں صبر کا دخل اس لئے ہے کہ طاعات میں بھی نفس کو نا گواری ہوتی ہے جب اس کو مکروہات پر محبوس کیا جائے گا اور اس کی عادت ہو جائے گی تو طاعات کی پابندی بھی آسان ہو جائے گی اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نماز اور صبر سے مدد لو۔

نماز کی گرانی کا علاج

اب ایک اشکال رہ گیا کہ نماز وصبر خود بھی تو مشکل ہے۔ پس ایسی چیز سے مدد لینے کی تعلیم دی جو خود بھی آسانی سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسکا ایک جواب تو یہ ہے کہ اعمال جن میں مدد لی جاتی ہے بہت سے ہیں اور یہ صرف دو ہی چیزیں ہیں۔ سو ہمت اور محنت سے دو باتوں کا حاصل کرنا کچھ دشوار نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کی بھی تدبیر بتلائی ہے چنانچہ ارشاد ہے:

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ

''ہاں بے شک نماز بہت گراں ہے مگر خاشعین پر''

اس کے جز اول پر تعارض کا شبہ ہو کہ ابھی تو نماز کو آسان کہہ رہے تھے ابھی اسکو بھاری مان لیا۔ بات یہ ہے کہ نماز فی نفسہ آسان ہے اور عارض مزاحمت نفس سے گراں ہو جاتی ہے۔ دوسرے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت میں بطور ارخاء عنان کے اس کو گراں مان لیا گیا ہے۔ تا کہ مخاطب و ابتدا ہی سے وحشت نہ ہو بلکہ مصلح کو اپنی موافقت کرتا ہوا دیکھ کر اس کی بات کو سن لے۔ کیونکہ قاعدہ یہ

ہے کہ مصلح اگر مریض کی بات کو مان کر اصلاح کرے تو مریض کا دل بڑھتا ہے۔

مثلاً طبیب نے مونگ کی کھچڑی بتلائی۔ مریض نے کہا کہ وہ بدمزہ ہوتی ہے۔ اب ایک صورت تو یہ ہے کہ اس کی بات کو رد کیا جائے۔ اس سے تو بحث کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ اور مریض ہرگز اس کی بات نہ مانے گا۔ بلکہ اپنی بات پر اڑ جائے گا۔ ایک صورت ہے کہ طبیب یوں کہے کہ ہاں واقعی ہوتی تو ہے بدمزہ ہی مگر اس واسطے مریض کے لئے تجویز کی جاتی ہے جو تھوڑی مقدار میں بقدر ضرورت کھائی جائے۔ کیونکہ اس کا معدہ قوی غذا کا اور زیادہ غذا کا متحمل نہیں ہوتا۔ اچھا تم اس کے ساتھ تھوڑا سا شوربہ یا چٹنی پودینہ کی یا دہی ملا لینا کچھ تھوڑا بہت مزہ آجائے گا۔ اس طرز گفتگو سے مریض کو وحشت نہ ہوگی۔ بلکہ وہ خوشی سے طبیب کی بات مان لے گا۔

اسی طرح یہاں کہتے ہیں کہ نماز واقع میں تو گراں نہیں۔ آخر بتلاؤ اس میں کون سے پتھر ڈھونے پڑتے ہیں۔ دو چار منٹ کی بات ہے۔ دو چار متعدد ارکان ہیں۔ اس میں گرانی کیا ہے۔ مگر جو لوگ بالکل آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ جانوروں کی طرف ان کو نماز کی بعض پابندیاں گراں گزرتی ہیں اور یہ گرانی نماز میں نہیں بلکہ انکی طبیعت اور مزاج کی خرابی سے۔ جیسے سانپ کے کاٹے کو نیم کی تلخی...... معلوم نہیں ہوتی ایسے ہی ان لوگوں کو اس کے برعکس نماز کی شیریں محسوس نہیں ہوتی۔ مگر اللہ تعالیٰ ان سے بحث نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی بات کو مان کر نماز کی گرانی کو ان کے دل پر سے رفع کرنا چاہتے ہیں۔

فرماتے ہیں! واقعی نماز بہت گراں ہے سبحان اللہ! کیسا شفقت کا عنوان اختیار فرمایا کہ گرانی کو تسلیم کر لیا۔ آگے فرماتے ہیں کہ مگر خاشعین پر نماز گراں نہیں ہے۔ پس تم خشوع حاصل کر لو۔ تم پر بھی نماز گراں نہ رہے گی۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ نماز کی گرانی کے اسباب میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کچھ قیود جسمانی اور نفسانی ہیں اس لئے نماز گراں ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمارا نفس میدان خیالات میں گشت کا عادی ہے۔ اسی لئے ارکان کے ساتھ بھی خیالات گشت کرتے رہتے ہیں۔ اس حالت میں ہماری نماز کوک بھری گھڑی کی مثال ہے کہ کوک بھرنے کے بعد خود بخود چلتی رہتی ہے کہ ہم کو کچھ خبر ہی نہیں ہوتی کہ کیا ہو رہا ہے اور یہ نماز کا نقص ایک حرکت ہے۔ جس کا علاج سکون قلب کا نام ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ سکون جسم بھی حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ سکون جسم کو سکون قلب میں دخل ہے پس خشوع قلب سے جسم بھی مقید و ساکن ہو جائے گا تو خشوع سے نماز آسان ہو جائے گی۔ لیکن اگر کسی کو یہ بھی مشکل ہو تو حق تعالیٰ اس کو بھی آسان فرماتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

''وہ جو سمجھتے ہیں کہ وہ رب کی ملاقات کرنیوالے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

کہ تم لقاء رب و رجوع الی اللہ کا استحضار کرو۔ اور یہ کچھ مشکل نہیں کیونکہ خیالات کا ... روکنا تو مشکل ہے۔ مگر ایک خیال کا استحضار تو مشکل نہیں اگر وہ دل سے ہٹ جائے تو پھر لے آؤ۔ اس طریقہ سے خشوع قلب جلد حاصل ہو جائے گا۔

خشوع کی حقیقت

مگر لوگ اس میں یہ غلطی کرتے ہیں کہ عدم حضور وساوس کو خشوع سمجھتے ہیں حالانکہ خشوع کی حقیقت عدم احضار وساوس ہے کہ قصداً خیال نہ لایا جائے اور جو بلا قصد آوے وہ مضر نہیں نہ خشوع کے منافی ہے بلکہ اس کو دفع کرو اس کی طرف التفات ہی نہ کرو۔

صوفیا نے لکھا ہے کہ وساوس کی مثال ہوا کی طرح ہے کہ جو شخص برتن میں سے تنہا ہوا نکالنا چاہے وہ عاجز ہو جائے گا کیونکہ لامحال ہے ہاں! برتن میں پانی بھر دو۔ جب بھر جائے گا پھر ہوا کا نام بھی نہ رہے گا۔ پس تم اپنے قلب میں لقاء رب و رجوع الی اللہ کا خیال اچھی طرح بھر لو پھر وساوس کا نام بھی نہ رہے گا۔

آئینہ جمال حق

اگر اس پر بھی وساوس آویں تو بے فکر رہو کیونکہ تم نے اپنا کام کر لیا۔ اسی کے تم مکلف تھے۔ اب تم شاہراہ عام پر پہرا کھڑا کرنے والے کون ہو۔ بلکہ اب دوسرے مراقبہ سے کام لو۔ جو حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ایسی حالت میں تجویز فرمایا ہے، جس سے یہ وساوس بھی آئینہ جمال حق بن جاتے ہیں۔ وہ یہ کہ یوں سوچے کہ اللہ اکبر! خدا نے میرے دل کو بھی کیسا دریا بنا دیا ہے، جس میں وساوس کی بے شمار موجیں اٹھ رہی ہیں جن کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ غرض! تم وساوس کو مطالعہ قدرت حق کا وسیلہ بنالو۔

تو دیکھئے قرآن کی کیسی پاکیزہ نظم ہے کہ اول تو تمام طاعات کے آسان کرنے کا طریقہ نماز تجویز کی۔ پھر نماز کی تسہیل کے لئے خشوع کی تعلیم فرمائی پھر خشوع کی تسہیل کے لئے مراقبہ لقاء تجویز فرمایا۔ اور یہ مراقبہ جس میں ... ہونے کی تعلیم فرمائی ہے ایسا عجیب مراقبہ ہے کہ تمام ... قلب کو یکسو کرنے والا ہے۔ اسکے لئے تسہیل کی کوئی ضرورت نہیں یہ تو خود ہی سہل ہے کیونکہ محبوب کے تصور کا مراقبہ ہے اور تصور محبوب اپنی ذات سے لذیذ ہے وہ کس طریقہ

تیسیر کا محتاج نہیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ نعوذ باللہ ہم کو تو خدا تعالیٰ سے محبت نہیں ہے تو میں کہوں گا کہ تم غلط کہتے ہو۔ کیونکہ ہر مسلمان کو خدا تعالیٰ سے محبت ہے بلکہ کفار کو بھی ہے اللہ تعالیٰ سے محبت ہے اسی لئے تو کفار کو اللہ تعالیٰ نے یہ دھمکی دی ہے۔

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ

"کہ کفار قیامت کے دن اللہ تعالیٰ (کے دیدار) سے محجوب رہیں گے۔"

اگر ان کو محبت نہ ہوتی تو یہ دھمکی نہ دی جاتی۔ کیونکہ یہ دھمکی محب ہی کے دل پر اثر کر سکتی ہے۔ غیر محب پر اس سے اثر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جس کو غیر حق سے بھی محبت ہے اس کو بھی خدا ہی سے محبت کیونکہ تمام مخلوق مظہر جمال الٰہی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو گنبد کے کلس پر آفتاب کی شعاع پڑنے سے گنبد بھلا معلوم ہو اور بار بار اس کی چمک کو دیکھنے لگے۔ تو حقیقت میں اس گنبد سے محبت نہیں بلکہ آفتاب سے محبت ہے۔ گو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گنبد پر عاشق ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ کسی کو کسی مخلوق کے ساتھ کسی کمال یا جمال کی وجہ سے محبت ہے حقیقت میں اس کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے کیونکہ مخلوق میں جو کچھ جمال و کمال ہے وہ جمال حق کا آئینہ ہے اسی کو فرماتے ہیں:

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ　　پس بچشم عاشقاں خودرا تماشا کردۂ

"اپنے حسن کو تو نے خوب رو لوگوں کے چہرے سے ظاہر کیا۔ اور پھر عاشقوں کی آنکھ سے اپنے آپ کو دیکھا ہے۔"

وحدت الوجود

وحدت الوجود یہی ہے کہ اس کی حقیقت صرف یہی ہے کہ تمام مخلوقات آئینہ جمال ہیں۔ یہ معنی نہیں کہ ہر مخلوق عین حق ہے۔ یہ تو کفر ہے اور کثرت ہے وحدت نہیں ہے۔ بھلا کثرت میں بھی کہیں وحدت ہوتی ہے۔ افسوس! جہلاء صوفیاء نے وحدت الوجود میں غلو کر کے کفار کو بھی مسلمانوں پر ہنسنے کا موقع دیدیا۔

چنانچہ ایک عیسائی کا قول ہے کہ مسلمان ہم کو تین خدا ماننے کی وجہ سے کافر کہتے ہیں۔ مگر صوفی کو کافر نہیں کہتے جو ہر چیز کو خدا کہتا ہے۔ واقعی صحیح اعتراض ہے اگر وحدت الوجود کا یہی معنی ہیں کہ ہر شے عین خدا ہے...... تو عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہا السلام کا خدا ہونا بھی لازم آئے گا۔ پھر ان کی الوہیت کے قائل کو کافر کس لئے کہا گیا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ

''ان لوگوں نے کفر کیا۔ جنہوں نے کہا مسیح بن مریم خدا ہے۔''

پس وحدت الوجود کا مطلب صرف یہی ہے کہ ہر چیز مظہر جمال حق ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مخلوق کے نقائص خالق کی طرف راجع ہوں یا مخلوق عین خالق ہو جائے۔

دیکھو آفتاب دیوار پر بھی طلوع کرتا ہے اور گھوڑے پر بھی اور اس وقت سب مظہر نور آفتاب ہوتے ہیں۔ مگر اس سے دیوار کا آفتاب ہونا لازم نہیں آتا نہ گھوڑے کے ناپاکی آفتاب تک پہنچتی ہے۔ پس جس شخص کو غیر حق سے محبت ہے اس کو بھی حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی سے محبت ہے مگر اس کو خبر نہیں اس کو چاہئے کہ اس وقت یہ سوچے:

چہ باشد آں نگار خود کو بندد ایں نگار ہا

''وہ خالق کیسا کچھ با جمال و با کمال ہوگا جس نے ایسی ایسی صورتیں بنائی ہیں۔''

اس تصور سے حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی پھر یہ سوچے کہ

عاشقی بامردگاں پائندہ نیست ❊ زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست

عشق بامردہ نباشد پائیدار ❊ عشق را با حی و با قیوم دار

یعنی خدا کے سوا سب فنا ہونے والے ہیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے بقاء ہے پس باقی کے ہوتے ہوئے فانی سے محبت کرنا حماقت ہے۔ اب غیر کی محبت بالکل جاتی رہے گی۔ اور محبت حق غالب ہوگی۔ جب محبت حق غالب ہوگی۔ تو اب اس کے لقاء کا تصور کرو کہ ایک دن تم کو اللہ تعالیٰ سے ملنا ہے۔ یہ خیال تمام خیالات کو قطع کر دے گا۔ جب خیالات قطع ہو گئے یکسوئی اور خشوع حاصل ہو گیا۔ یکسوئی سے نماز آسان ہو گئی۔ جب نماز آسان ہو گئی تو اس کے ذریعہ سے تمام طاعات سہل ہو جائیں گی۔

سبحان اللہ! کیسا عجیب علاج اور کیسی غریب ترتیب ہے۔ اب اگر کوئی اشکال فلسفی باقی ہو تو بسم اللہ پیش کیا جاوے میں سننے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے امید ہے کہ کوئی اشکال باقی نہ رہا ہوگا۔ اور اگر کسی کے دل میں کوئی شبہ ہو تو وہ یہ نہ سمجھے کہ علماء کے پاس اس کا جواب نہیں۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ ایک طالب علم جس نے درسیات سمجھ کر پڑھی ہوں تمام دنیا کے حکماء کو جواب دے سکتا ہے یہ تو پہلی آیت کے متعلق بیان تھا۔

معیت الٰہی

دوسری آیت میں اسی مضمون کو بیان فرما کر اللہ تعالیٰ نے ایک اور جملہ ارشاد فرمایا ہے جو پہلی آیت میں نہیں یعنی ان اللہ مع الصبرین زیادہ کیا گیا۔ اس جملہ کی مناسبت پہلی آیت کے مضمون سے یہ ہے کہ جیسے وہاں اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کے بعد نماز کی سہولت کا طریقہ بتلایا گیا ہے۔ اسی طرح چونکہ صبر تھی

کس قدر دشوار ہے کیونکہ نفس کو مکروہات پر مقید و محبوس کرنا آسان نہیں اس لئے ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ”کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں“

اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔ ایک یہ کہ معیت سے اعانت و مدد کی معیت مراد ہو یعنی تم صبر کر کے دیکھو دشوار نہ رہے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی اور ان کی امداد کے بعد کوئی دشوار نہیں دوسرے یہ کہ معیت سے حالیہ مراد ہو پس مطلب یہ ہوگا کہ صبر کی دشواری کو اس مراقبہ سے آسان کرو کہ اللہ تعالیٰ صابرین کے ساتھ ہیں۔ اس مراقبہ کے بعد صبر میں دشواری نہ رہے گی۔ کیونکہ جب عاشق کو یہ معلوم ہو کہ محبوب میرے ساتھ ہے میری تکلیف دیکھ رہا ہے تو اس کو کلفت کا احساس نہیں ہوتا اس صورت میں یہ مراقبہ ایسا ہے جیسا دوسری جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے۔

وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا

”کہ اپنے رب کے حکم پر جمے رہئے کیونکہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔“

یہ عجیب مراقبہ ہے اور اس میں بہت لذت ہے۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب ہم انکو نہیں دیکھتے تو کیا لذت ہوگی۔ تو یہ خیال غلط ہے کیونکہ جو لوگ کبھی عاشق ہوئے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر عاشق کو محبوب دیکھ رہا ہو اور اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اگر میں اس کی طرف دیکھوں گا تو وہ مجھے نہ دیکھے گا۔ تو اس صورت میں عاشق کو زیادہ لذت آتی ہے۔ اسلئے یہ مراقبہ نہایت لذیذ ہے پھر اسکے بعد کسی کلفت سے اسکو تکلیف نہ ہوگی۔ بلکہ اس میں لذت ہی آئے گی۔ اور زبان حال وقال سے یوں کہے گا۔

بجرم عشق توام می کشند وغوغا ئیست   تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائیست

”تیرے عشق کے جرم میں مجھے قتل کر رہے ہیں تو بھی سر بام آکے تماشا دیکھ کہ کتنا اچھا تماشا ہے۔“

اس تقریر سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بھی ہم کو مراقبات کی تعلیم فرماتے ہیں اور یہ تعلیم صوفیاء کی من گھڑت نہیں۔ تمام قرآن وحدیث تصوف سے بھرا ہوا ہے۔ اور وہ تصوف کیسا جو قرآن وحدیث میں نہ ہو۔

بس! اب میں ختم کرتا ہوں بحمد اللہ بقدر ضرورت دونوں آیتوں کا بیان ہو چکا ہے۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ جل وعلا ہم کو فہم سلیم اور توفیق عطا فرمائیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد

وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

السبر بالصبر

یہ وعظ ۲ محرم الحرام ۱۳۴۸ھ بروز سہ شنبہ تھانہ بھون میں بر مکان منشی خلیل الرحمٰن صاحب کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا جو دو گھنٹہ میں ختم ہوا۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا حاضرین کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔

وَلِیَبۡتَلِیَ اللّٰہُ مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ وَلِیُمَحِّصَ مَا فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝ (آل عمران آیت نمبر ۱۵۴)

(ترجمہ: اور جو کچھ ہوا اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن کی بات کی آزمائش کرے اور تاکہ تمہارے دلوں کی بات کو صاف کر دے اور اللہ تعالیٰ سب باطن کی باتوں کو خوب جانتے ہیں)

نعمت و مصیبت

یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے مصائب کی حکمتیں بیان فرمائی ہیں کیونکہ حالات دو قسم کے ہیں نعمت اور مصیبت اور ہر ایک میں ایک حکمت ہے مگر نعمتوں کی حکمتوں کی تو طبیعت کو تلاش نہیں ہوتی۔ بلکہ بلا علم حکمت بھی ان کی مصالح ہو جاتی ہیں کیونکہ نعمت سے مسرت ہوتی ہے اور مسرت کی وجہ سے منعم کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے بخلاف مصیبت کے کہ اس میں ناگواری ہوتی ہے۔ وہاں علم حکمت کی ضرورت ہے۔

عارفین کو اسی واسطے مصیبت کا احساس تو ہوتا ہے بلکہ بوجہ ادراک لطیف ہونے کے دوسروں سے زیادہ احساس ہوتا ہے۔ مگر ایک چیز ان میں ایسی ہے جس سے نہ ان کی خوشی حد سے بڑھتی ہے نہ غم ورنج۔ اور دونوں کا حد سے بڑھنا مذموم ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا "انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے" اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا

جب اسکو تکلیف پہنچتی ہے تو جزع فزع کرنے لگتا ہے اور جب اسکو فارغ البالی ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ مومنین نہ حالت شر میں حد سے بڑھتے ہیں نہ حالت خیر میں یعنی مومنین کاملین۔ کیونکہ ناقص حد سے نکل جاتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ

یہاں بھی اسی فرح سے ممانعت ہے جو حد سے نکل جائے ورنہ مطلق فرح تو مطلوب ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا

"کہہ دو اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے ہی خوش ہوں۔"

معلوم ہوا کہ فضل خداوندی سے خوش ہونا مطلوب ہے مگر اہل دنیا کی نظر چونکہ نعمت ہی پر ہوتی ہے منعم پر پوری طرح نظر نہیں ہوتی (گو اعتقاد النظر ہے مگر استحضار نہیں) اس لئے وہ خوشی میں حد سے نکل جاتے ہیں اور عارف کی نظر منعم پر اولا ہوتی ہے اس لئے لرزاں ترساں رہتا ہے کہ شاید سلب ہو جائے اسی لئے اس کی خوشی حد سے نہیں بڑھتی اور رنج و غم بھی حد سے نہیں بڑھتا کیونکہ میں اس میں بھی اس کی نظر اللہ تعالیٰ پر ہے اور ان حکمتوں پر بھی جو خدا نے مصائب میں رکھی ہیں۔ مگر اس کو مصیبت اور تکلیف کا احساس پورا ہوتا ہے کیونکہ تعلق مع اللہ کی وجہ سے اس کا ادراک لطیف ہوتا ہے۔

اسی لئے حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہر چیز کامل ہوتی ہے۔ قوی ظاہرہ بھی اور قوی باطنہ بھی۔ گو کسی عارض کی وجہ سے ضعف ہو جائے۔ جیسے یوسف علیہ السلام کے غم میں رونے سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی نگاہ کمزور ہو گئی تھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ بڑھاپے میں ضعف نقاہت ہو جائے۔ اور اسی لئے عارف کی خوشی بھی سچی خوشی ہوتی ہے جیسے بچوں کی خوشی ہوتی ہے بخلاف اہل دنیا کے کہ ان کی خوشی سچی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کے دل کو علائق دنیا کی وجہ سے پورا چین حاصل نہیں اسی لئے خوشی کا بھی پورا احساس نہیں ہوتا اور جب مصیبت آتی ہے تو اہل دنیا کا دل بیٹھ جاتا ہے۔

وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ "اگر ان کو کوئی تکلیف لاحق ہوتی ہے تو ناامید ہو جاتے ہیں۔"

اور عارفین کا دل نہیں بیٹھتا۔ وہ کسی مصیبت میں مایوس نہیں ہوتے کیونکہ ان کی نظر مصائب کی حکمتوں پر ہے۔ پس مصائب کی حکمت بیان کرنے میں یہ حکمت ہے کہ غم ہلکا ہو جاتا ہے جیسے کوکین لگانے سے آپریشن کی تکلیف کم ہوتی ہے اور بعض کو کلورا فارم سنگھا دیتے ہیں ان کو تکلیف کا کچھ بھی احساس نہیں ہوتا یہ متوسطین کی مثال ہے اور کوکین لگانے کی مثال کاملین کی ہے۔ اور بعض دفعہ نہ کوکین لگائی جاتی ہے نہ کلورا فارم سنگھایا جاتا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر مریض کے دل پر ایسے خیالات جما دیتا ہے۔ جن سے تکلیف کا احساس کم ہو جاتا ہے۔

اسی طرح حق تعالیٰ کے معاملات اپنے بندوں کے ساتھ ہیں کہ وہ بھی مصائب کا اثر مختلف طریق سے خفیف کر دیتے ہیں۔ مصائب میں حکمتیں متعدد ہیں اس لئے حق تعالیٰ نے کوئی حکمت کسی جگہ بیان فرمائی ہے اور کوئی حکمت دوسری جگہ۔

بس! آج کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں مصائب کی حکمتوں کا بیان ہوگا۔ اور آج کے بیان کو پہلے بیان کا تتمہ سمجھنا چاہئے کیونکہ اس میں بھی مصائب کی تخفیف کا ایک علاج مذکور ہوا ہے آج دوسرا علاج مذکور ہوگا۔

علم انبیاء

اس بیان کے داعی قوی تھے جیسا اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ یعنی واقعات موت اس کے محرک تھے اس لئے وہاں علاج بھی قوی تھا۔ اور یہاں واقعات اس سے ہلکے ہیں اس لئے آج علاج بھی ہلکا بتلایا جاوے گا۔ نیز تتمہ اور ذی تتمہ میں یہ بھی مناسبت ہے کہ پہلے بیان میں جو آیت تلاوت کی گئی تھی وہ غزوۂ بدر کے متعلق تھی۔

(وهی قوله تعالیٰ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو جو آپؐ کے ہاتھ میں قیدی ہیں فرما دیجئے)) **الآیه و کانت اعظم الغزوات وارفعها** ''اور یہ غزوہ بدر بہت عظیم المرتبت تھا''

اور آج کی آیت غزوۂ احد کے متعلق ہے۔ جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب غزوۂ احد میں مسلمانوں کی صف بندی کی گئی تو ایک گھاٹی کا جو مسلمانوں کی پشت پر تھی اور وہاں سے دشمن کے حملہ کا خطرہ تھا۔ یہ انتظام فرمایا کہ ایک دستہ مختصر جماعت کا اس کی حفاظت کے لئے مقرر فرما دیا کہ تم یہاں سے بدوں میری اجازت کے نہ ہٹنا۔ گو ہمارے اوپر کچھ ہی گزر جائے انبیاء علیہم

السلام ہر قوت میں کامل ہوتے ہیں۔انتظام میں بھی کامل ہوتے ہیں۔انبیاء بھولے نہیں ہوتے۔ان میں ضروری انتظام سب کامل ہوتا ہے ضروری کی قید اسے لئے بڑھائی گئی تا کہ واقعہ تابیر نخل سے کسی کو شبہ نہ ہو تابیر کے معنی یہ ہے کہ نر کھجور کے پھول مادہ کے اوپر اچھالے جاتے ہیں کہ وہ اس کے پتوں سے مس کرتے ہوئے نیچے گر جاتے ہیں۔اس تدبیر کی خاصیت یہ ہے کہ مادہ کو پھل بہت آتا ہے (کھجور میں بھی نر و مادہ ہوتا ہے۔ نر کی پہچان یہ ہے کہ اس کو پھل نہیں آتا صرف پھول آتا ہے)

ایک عرب سے ہماری ملاقت ہوئی۔تو انہوں نے عربی میں ایک خطبہ بھی سنایا جو تابیر کے وقت اہل عرب پڑھا کرتے ہیں جیسے ہمارے یہاں گڑیوں کے بیاہ میں ایک مخترع خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ایسے ہیں وہاں بھی بطور لہو ولعب کے تابیر کے وقت ایسے معاملات ہوتے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے اور آپ کو تابیر کا علم ہوا تو آپ کو شبہ ہوا کہ یہ کوئی ٹو ٹکا نہ ہو۔مگر یقین بھی نہ تھا۔اس لئے آپ نے نرمی کے ساتھ اس پر انکار فرمایا:

لئنکم لو لم تفعلو کان خیرا (رواہ مسلم)(المعجم الکبیر للطبرانی:۴:۳۳۴)

کہ اگر تم یہ کام نہ کرو تو غالبا مناسب ہو۔

صحابہ تو جان نثار تھے آج کل کی طرح معارضہ کرنے والے نہ تھے۔ان کی جاں نثاری کی یہ حالت تھی کہ ایک صحابی نے قبہ دار مکان بنایا تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے مکان پر گزر ہوا۔آپ نے پوچھا کس کا مکان ہے؟ معلوم ہوا کہ فلاں صحابی کا ہے۔آپ کو ان کا یہ فعل ناپسند ہوا کیونکہ بلاضرورت بلندی عمارات قوم عاد و ثمود کا خاصہ ہے۔

وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ

اس کے بعد وہی صحابیؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے کچھ بے رخی ظاہر فرمائی۔وہ بے تاب ہو گئے اور صحابہ سے اس کا سبب پوچھا۔سب نے اس سے لاعلمی ظاہر کی اور یہ کہا کہ اتنی بات تو ہوئی کہ حضور تمہارے قبہ دار مکان کو ناپسند فرمایا۔اتنا سنتے ہی وہ اپنے مکان پر آئے اور قبہ کو گرادیا۔پھر کمال یہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کا گزر دوبارہ وہاں کو ہوا اور آپ نے قبہ نہ دیکھا تو دریافت فرمایا کہ یہاں ایک قبہ تھا وہ کیا ہوا۔صحابہ نے عرض کیا۔یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے اس سے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔یہ خبر سن کر مالک قبہ نے اس کو گرادیا۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوش ہوئے اور ارشاد فرمایا جس کا حاصل یہ تھا

''کہ دنیا میں ایسی پختگی کی کیا ضرورت ہے، بس گزر کے لئے تھوڑی سی عمارت کافی ہے۔''

تو صحابہ ایسے جان نثار تھے۔ انہوں نے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ترک تابیر کی طرف دیکھا۔ اسی وقت سب نے تابیر کو چھوڑ دیا۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ اس سال پھل کم آیا۔ تب حضورؐ کو معلوم ہوا کہ یہ کوئی ٹونکا نہیں۔ بلکہ اس فعل میں طبعی خاصیت ہے اور یہ طبی تدبیر ہے۔ اس لئے آئندہ کے لئے آپ نے اجازت دے دی اور فرمایا۔ **انتم اعلم بامور دنیاکم**

''کہ اپنے دنیوی کاموں کو تم ہی زیادہ جانتے ہو۔'' (الصحیح لمسلم: الفضائل: ۱۴۱)

اسی سے تو تعلیم یافتہ جماعت نے یہ مضمون نکالا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دنیوی امور میں بالکل دخل نہیں دیا۔ بلکہ ان کو ہماری رائے پر چھوڑ دیا ہے کہ جو طریقہ مناسب سمجھیں اختیار کریں۔ یہ مولویوں کی ...... زیادتی ہے کہ دنیوی معاملات میں بھی دخل دیتے ہیں کہ فلاں تجارت حرام ہے فلاں جائز ہے اور اس طرح بیع کرنا جائز نہیں۔ اس طرح اجارہ کرنا فاسد ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں کہتا ہوں کہ اگر انتم اعلم بامور دنیاکم کا یہ مطلب ہے تو کیا قرآن کی ان آیتوں کو جن میں ربوا سود اکل الاموال بالباطل اور رشوت وغیرہ کو حرام کیا گیا ہے۔ قرآن سے نکال دو گے؟ اور وہ ہزار ہا حدیثیں بھی جن میں بیوع واجارات ونکاح وطلاق وہبہ ومیراث کے احکام مذکور ہیں حدیث کی کتابوں سے نکال باہر کرو گے۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو یہ دعویٰ کیونکر صحیح ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیوی معاملات میں دخل نہیں دیا۔

معلوم ہوا کہ تم نے اس حدیث کا مطلب غلط سمجھا۔ بلکہ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ امور دنیا جو تجربہ کے متعلق ہیں ان کو تم زیادہ جانتے ہو۔ باقی ان امور کے متعلق جو احکام میں ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی زیادہ جانتے ہیں۔

مگر چونکہ واقعہ تابیر سے کسی کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ نبی کیسے ہیں جن کو حقائق اشیاء کا صحیح علم حاصل نہیں۔ اس شبہ کو رفع کرنے کے لئے حضورؐ نے یہ فرمادیا انتم اعلم بامور دنیاکم جس کا حاصل یہ ہے کہ تجربیات کا جاننا نبی کے لئے ضروری نہیں بلکہ ضروری حقائق کا علم ضروری ہے۔ تو جن انبیاء کو سلطنت عطا ہوئی ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام وداؤد علیہ السلام اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم، ان کو انتظام سلطنت وتدبیر حرب وصلح بھی کامل عطا ہوئی ہے۔ ہمارے حضورؐ سلطان بھی تھے۔ جیسے پہلے بھی بعض انبیاء سلطان ہوئے ہیں۔ البتہ عیسیٰ علیہ السلام ظاہری سلطان نہ تھے۔ مگر ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں داخل ہو کر وہ بھی سلطان ہوں گے۔

کثرت رائے کی حقیقت

غرض! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نقشہ جنگ کا اس طرح انتظام فرمایا کہ اس گھاٹی پر ایک دستہ فوج مقرر فرمادیا کہ اس طرف سے کفار نہ آسکیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو کفار پر حملہ کا حکم دیا تو تھوڑی ہی دیر میں کفار کو شکست ہوئی (اور ان کا جھنڈا زمین پر گر پڑا۔ سات دفعہ اس کو اٹھایا گیا۔ مگر ہر دفعہ سرنگوں ہوا اور کفار بری طرح بھاگے) اب اس دستہ فوج میں جو گھاٹی پر متعین تھا، اختلاف ہوا۔ اکثر کی رائے یہ ہوئی کہ اب ہم کو یہاں رہنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے بھائیوں کو پورا غلبہ حاصل ہو چکا ہے اور وہ کفار کے تعاقب میں جارہے ہیں۔ ہم کو بھی اب جہاد و غنیمت میں حصہ لینا چاہئے۔ ان کے افسر نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو یہاں سے بدوں اجازت کے ہٹنے سے منع فرمادیا ہے تم کو یہاں سے نہ ہٹنا چاہئے۔ مگر بجز دس پانچ آدمیوں کے کسی نے افسر کی رائے نہ مانی۔ اور زیادہ تعداد وہاں سے ہٹ کر قتال و غنیمت میں مشغول ہوگئی۔ یہاں سے آپ کو کثرت رائے کی حقیقت واضح ہوگی کہ کثرت رائے کا ہمیشہ حق پر ہونا ضروری نہیں۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی قابلیت

یہاں اتنی بات سمجھ لینا چاہئے کہ ان صحابہؓ کا یہ خیال تو نہ تھا کہ اگر ہم غنیمت جمع نہ کریں گے تو غنیمت سے ہم کو حصہ نہ ملے گا کیونکہ شرکت غنیمت کے لئے شرکت جنگ لازم نہیں۔ غنیمت میں محافظان فوج بھی شریک کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ جنگ میں شریک نہیں ہوتے۔ بلکہ ان حضرات کو یہ خیال ہوا کہ بدوں شرکت جنگ کے شاید ہم کو جہاد کا ثواب نہ ملے یا کم ملے۔ اس خیال سے وہ گھاٹی چھوڑ کر تعاقب میں اور مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہوگئے۔

اس وقت تک حضرت خالد بن ولیدؓ مسلمان نہ ہوئے تھے بلکہ کفار کے ساتھ تھے اور جنگ آزمودہ ہمیشہ سے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی ان کے جاسوس بہت چھٹے ہوئے تھے (اور یہ ان کی جنگی قابلیت کی دلیل ہے کہ عین معرکہ کے وقت بھی جاسوسی محکمہ کو اپنے فرائض انجام دینے پر مامور کر رکھا تھا) عین اس وقت جب کہ کفار بھاگے جارہے تھے اور مسلمان ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ حضرت خالدؓ کو جاسوس نے اطلاع دی کہ مسلمانوں کے عقب کی گھاٹی خالی ہو چکی ہے۔ یہ سنتے ہیں حضرت خالدؓ نے اپنے کافی تعداد سواروں کو ساتھ لے کر گھاٹی کا رخ کیا اور دس پانچ

صحابی جو وہاں جمے ہوئے تھے ان کو تہ تیغ کر کے مسلمانوں کے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ حالت دیکھ کر کفار کا باقی ماندہ لشکر بھی بھاگتے بھاگتے رک گیا اور اس نے مڑ کر مسلمانوں پر حملہ کیا۔

اجتہادی غلطی

اب مسلمان دو طرف سے گھر گئے اور سخت مصیبت کا سامنا ہوا۔ اس حالت میں شیطان لعین نے پکار دیا الا ان محمداً قد قتل کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے اس آواز کا صحابہؓ کے کانوں میں پڑنا تھا کہ ان کے قدم اکھڑ گئے۔ کیونکہ قدم کا جمنا تو دل کے تابع ہے جب دل ہاتھ سے نکل گیا تو قدم کیونکر جمیں۔

پس صحابہ کے قدم اکھڑنے پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اگر ان کے قدم نہ اکھڑتے تو بعض[1] کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ان کے دل میں محبت نہ تھی رہا یہ کہ پھر اللہ تعالیٰ نے کیوں عتاب فرمایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھاگنے اور قدم اکھڑنے[2] پر عتاب نہیں فرمایا۔ بلکہ معصیت رسولؐ پر عتاب فرمایا ہے جو کہ فعل اختیاری تھا۔ اور قدم کا اکھڑ جانا مغلوب الحال لوگوں کے لئے غیر اختیاری تھا اور گو اس معصیت میں بھی اجتہادی غلطی تھی (کہ گھاٹی والے صحابہ نے ثواب کا مدار مباشرت عمل کو سمجھا حالانکہ اس کا مدار محض اطاعت پر ہے خواہ بصورت عمل ہو یا بصورت ترک عمل ۱۲) مگر اجتہادی غلطی پر بھی عتاب لطیف ہو سکتا ہے ہاں عقاب نہیں ہوتا۔

اجتہادی غلطی پر عتاب کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ تم نے پوری طرح سمجھ سے کیوں کام نہیں لیا۔ جب گھاٹی پر سے ہٹنے کا یہ نتیجہ سامنے آیا تو صحابہ خود شرمندہ ہوئے کہ ہم سے بہت بے جا حرکت ہوئی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سے رنج پہنچا تو زیادہ شرمندگی ہوئی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے عتاب سے اور بھی...... شرمندگی بڑھ گئی۔

حکمت ربی

تو اب اللہ تعالیٰ کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ ان کی شرمندگی حد سے بڑھے۔ اس لئے غم

---

[1] بعض کی قید اس لئے لگائی کہ بعض کو یہ شبہ اس لئے نہ ہوتا کہ محبوب کے قتل کی خبر سن کر یہ ضرور نہیں کہ محب عاشق بھاگ ہی جائے تو محبت کا ثبوت ہو۔ بلکہ اگر وہ دشمن سے انتقام محبوب کے لئے پہلے سے زیادہ غیظ وغضب کے ساتھ مقابلہ کرے اور قاتلین کو فنا کر دے یا خود فنا ہو جائے تو زیادہ دلیل محبت ہے کما فعله الذين ثبتوا ولم يفروا وهم اثنا عشر رجلا ۱۲ ظ۔ [2] يرد عليه قوله تعالىٰ وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علىٰ اعقابكم. وفيه الانكار على الفرار بسماع خبر قتل النبى صلى الله عليه وسلم كما ظاهر ۱۲ ظ. والجواب عنوان المراد بالانقلاب على الاعقاب هو ترك الاحكام. ۱۲۔

کو ہلکا کرنے کے لئے اس واقعہ کی بعض حکمتیں بیان فرماتے ہیں کہ تمہارا اس میں بھلا ہو گیا ہے۔ اسلئے غم نہ کرو۔ پھر اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ارشاد ہے کہ آپ بھی انکی خطا معاف فرمائیں اور ہم سے بھی ان کے لئے معافی کی...... درخواست کریں۔

وشاورهم فی الامر اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ کرتے رہا کیجئے۔''

اور معالات میں ان سے مشورہ بھی کرلیا کریں تا کہ ان کو بھی اطمینان ہو جائے کہ آپ ان کی طرف سے دل صاف کرلیا۔ اس میں محض حضور کی عنایات کو صحابہ کے حال پر بڑھانا مقصود ہے۔ یہ مقصود نہیں کہ آپ ان پر شخصی حکومت نہ کریں بلکہ جمہوری حکومت کریں۔ جیسا بعض عقل مندوں نے سمجھا ہے اگر ایسا ہوتا تو اس کے بعد **فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ** (پ۴) پھر جب آپ رائے پختہ کرلیں تو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجئے''

میں عزم کو تنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ کیا جاتا بلکہ **فاذا عزمتم یا اذا عزم اکثرهم**، ارشاد ہوتا **فاذا عزمت** سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ عزم میں صحابہ کے تابع نہ تھے۔

بہر حال حق تعالیٰ نے صحابہ کے غم کو جس طرح ہلکا کیا ہے۔ اس کی وہ حالت ہے جیسے بلا تشبیہ ماں باپ بچہ کے ساتھ کرتے ہیں کہ بچے کو حد سے زیادہ رنج دینا نہیں چاہتے۔ کبھی سزا دے کر جب یہ دیکھتے ہیں کہ اس کو زیادہ تکلیف یا بہت رنج ہوا تو گلے سے لگا لیتے ہیں۔ یہی معاملہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس کی شان یہ ہے کہ

درد از یارست درماں نیز ہم | دل فدائے اوشد و جان نیز ہم

''درد بھی دوست کا دیا ہوا ہے اور دوا بھی۔ دل بھی اس پر فدا ہے اور جان بھی''

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِي صُدُوْرِكُمْ ''تا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن کی بات کی آزمائش کرے''

ای فعل ما فعل من واقعات جمة لمصالح کثیرة منها ان یبتلی الله ما فی صدورکم یعنی جو کچھ یہ واقعات ہوئے ہیں۔ ان میں بہت سی حکمتیں ہیں منجملہ ان کے ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے تمہارے دل کی بات کا امتحان مقصود تھا۔ دل کی بات سے مراد ایمان ہے کہ ان واقعات میں تمہارے ایمان کی آزمائش تھی کہ دیکھیں مصیبت کے وقت بھی ہم سے تعلق رکھتے ہو یا نہیں کیونکہ...... احسان کے وقت تو ہر شخص آقا سے راضی رہتا ہے۔ ہاں! جب وہ تنخواہ

بند کر دے اس وقت بھی علاقہ رہے تو کہا جائے گا کہ واقعی اس کو تعلق ہے ورنہ عام حالت تو یہ ہے جو حق تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمائی ہے۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ

''سو آدمی کو جب اس کا پروردگار آزماتا ہے یعنی اس کو ظاہر انعام واکرام دیتا ہے تو وہ بطور فخر کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر بڑھادی اور جب اس کو دوسری طرح آزماتا ہے یعنی اس پر اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ شکایتاً کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر گھٹادی۔''

کہ انسان پر جب حق تعالیٰ کی طرف سے انعام ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ ہاں میرے رب نے میری قدر کی۔ اور جب کوئی آزمائش واقعہ ڈالا جاتا ہے اور رزق کی تنگی کر دی جاتی ہے تو یوں کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے بے قدر کر دیا۔ اور یہ نہیں سوچتا کہ شاید میری آزمائش مطلوب ہو۔ نیز یہ نہیں دیکھتا شاید میرے کسی عمل کی سزا دی گئی ہو۔ بلکہ حالت یہ ہے کہ مصیبت کے وقت لوگ یوں کہتے ہیں کہ نہ معلوم ہم کس خطا میں پکڑے گئے گویا بالکل معصوم ہیں کہ ان سے کوئی خطا نہیں ہوئی۔

ارے خطا تو ہم سے روزانہ ہوتی ہے۔ پس مصائب کو گناہوں کی سزا سمجھو یا ایمان کی آزمائش سمجھو۔ مگر یہ مت سمجھو کہ خدا تعالیٰ ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ کیونکہ یہ خیال خطرناک ہے کہ اس سے تعلق ضعیف ہو جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ تعلق زائل ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ اعتقاد کبھی نہ کرے کہ خدا مجھ سے ناراض ہے کیونکہ اول اول تو اس خیال سے دل کو قلق ہوتا ہے۔ پھر قلق حد سے بڑھ جاتا ہے۔ تو یوں کہنے لگتا ہے کہ جب وہ راضی نہیں ہوتے تو جانے دو۔

اسی لئے شیخ اکبرؒ نے لکھا ہے کہ گناہ پر ایک دفعہ خوب رو دھو کر توبہ کر لے۔ پھر قصداً اس کو یاد نہ کرے کیونکہ مقصود بالذات خدا کی یاد ہے نہ گناہوں کی یاد مقصود بالذات ہے نہ طاعات کی یاد۔ گناہوں کی یاد سے توبہ مقصود ہے جب وہ حاصل ہے تو اب قصداً گناہ کو یاد کر کے اس کی یاد کو مقصود بالذات نہ بناؤ۔ اور خود بخود بلاقصد کے یاد آجائے پھر توبہ اور استغفار کر لے جیسے حدیث میں ہے کہ مصیبت خود بخود یاد آجائے تو انا للہ پڑھ لے کہ اس وقت انا للہ پڑھنے کا بھی وہی ثواب ہوگا جو عین مصیبت کے وقت پڑھنے کا ثواب تھا اور طاعات کے یاد کرنے سے مقصود یہ ہے کہ نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے تاکہ شکر سے تعلق مع المنعم قوی ہو جب یہ مقصود حاصل ہو گیا تو اب قصداً طاعات کو بھی یاد نہ کرے ورنہ عجب و کبر پیدا ہو جائے گا۔

عسر اور یسر

انبیاء علیہم السلام کا کمال یہی تھا کہ وہ اللہ کی یاد کو مقصود بالذات بناتے تھے۔ طاعات کو مقصود بالذات نہ بناتے تھے۔ اور یہی حکمت ہے آپ کے سہو کی۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر　　گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

"پاک لوگوں کے کام کو اپنے پر قیاس نہ کر۔ لکھنے میں تو شیر اور شیر ایک جیسے ہیں۔ مگر معنوں میں بڑا فرق ہے۔" تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سہو کو اپنے سہو پر قیاس نہ کرو۔ حضورؐ کو جو سہو ہوا ہے تو حق تعالیٰ کی طرف [1] توجہ کامل کرنے سے ہوا ہے کہ اس وقت آپ کی توجہ نماز کی طرف نہ تھی۔ بلکہ نماز سے اعلیٰ کی طرف تھی۔

غرض جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ حق تعالیٰ کی یاد ہی انبیاء کے نزدیک مقصود بالذات نہ بناؤ کیونکہ اس سے یہ خیال ہوجاتا ہے کہ حق تعالیٰ مجھ سے ناراض ہیں اور یہ خیال خطرناک ہے۔

ظاہر میں تو شیخ کا یہ قول بھیانک معلوم ہوتا ہے مگر غور کر کے دیکھو بڑے کام کی بات ہے۔ گو عام لوگوں کے سامنے کہنے کی بات نہ تھی۔ مگر ضرورت کی وجہ سے زبان پر آگئی۔ اللہ تعالیٰ سامعین کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور بحمد اللہ اس وقت مجمع خاص ہی ہے امید ہے کہ اس کے سمجھنے میں غلطی نہ کی جائے گی۔

بہر حال واقعہ احد کی مصیبت میں حق تعالیٰ نے یہ حکمت بیان فرمائی۔ کہ اس سے تمہارے ایمان کی آزمائش مطلوب تھی کہ کون مخلص ہے کون منافق ہے۔ کیونکہ اس مصیبت کے وقت منافقین میں باہم سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ ان کو معرکہ میں آنے سے رنج تھا۔ کبھی کہتے۔

هل لنا من الامر من شیئ　کہ ہمارا کچھ اختیار بھی ہے۔ اور کبھی کہتے۔

لو کان لنا من الامر شیئ ما قتلنا ههنا

"اگر ہمارا بس چلتا تو ہم یہاں اس طرح قتل نہ کئے جاتے۔"

اور صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ عین اس پریشانی میں بھی ان کو نیند آرہی تھی۔ چنانچہ ایک صحابی کے ہاتھ

---

[1] اورد علیه الشیخ سیدی الخلیل قدس سره بان کمال التوجه الی الله تعالیٰ یستلزم التوجه الی الاحکام کملا کما یعرفه کل من له ذوق بالخصور التام بین یدی ربه ان کمال الامتثال للاحکام انما یکون حال التوجه التام الی الله تعالیٰ ثم قال بل سبب سهوه علیه السلام مارواه مالک فی المؤطا بلاغا لا انسی ولکن انسی لانس والله تعالیٰ اعلم فلیحرر ۱۲ قلت هذا الذی ذکر انما هو حکمته للسهو والکلام فی علة السهو واما حدیث الا ستلزام المذکور فهو مقام وما ذکرته هو حال والانبیاء علیهم السلام غالب احوالهم المقام لکن یطرا علیهم الحال تازة ولذا یقع علیهم السهو قلیلاً وهذا من ذوقی والله اعلم ۱۲۔ اشرف علی۔

سے کئی بار تلوار گر گر پڑی۔ ایسے سو رہے تھے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے چاروں طرف سے اسباب تخفیف جمع فرما دیئے ہیں کہ معرکہ میں مسلمانوں کو سلا بھی دیا بعد میں عتاب کر کے رلا بھی دیا۔ پھر ہنسا بھی دیا۔"

اور غور کیا جائے تو عتاب میں بھی عنایت تھی کیونکہ خطا پر عاشق کو کچھ کہہ لیا جائے تو اس کے دل کو تسلی ہو جاتی ہے کہ بس محبوب نے دل کی بات ظاہر کر کے بدلہ لے لیا ہے۔ اب اسکے دل میں کچھ نہیں رہا۔ ہے کہ بدوں سزا کے چین نہ آئے گا۔ بدوں اس کے میری تسلی نہ ہوگی۔ جیسے بعض صحابہؓ سے زنا کا صدور ہو گیا تھا۔ ان کو بدوں اجرائے حد کے چین نہ آیا۔ پس یہ عتاب بھی درحقیقت اسباب تخفیف ہی تھا۔

اب آپ کی سمجھ میں آیا ہوگا کہ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا کا مطلب کہ واقعی حق تعالیٰ مصیبت کے ساتھ ہی ایک راحت بھی دیتے ہیں۔ اگر عسر کو واحد اور یسر کو متعدد مانو۔ جیسا مشہور قاعدہ ہے تو ایک عسر کے ساتھ دو یسر ہوئے۔

تلافی مصائب کی صورت

صاحبو! جو لوگ اہل ایمان ہیں ان کے لئے اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ عسر واحد پر یسرین کا ترتب ہوتا ہے۔ یہ آیت صحابہ ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سب کے لئے عام ہے۔

پس مصیبت سے پریشان نہ ہو بلکہ اس کو ہلکا کرنے کی کوشش کرو چنانچہ ایک تدبیر تو یہ ہے کہ اس وقت اپنے اعمال کو یاد کرے کیونکہ اکثر مصائب بوجہ اعمال سیئہ کے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ "تم کو اے گنہگارو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے۔"

کہ جو مصیبت تم پر آتی ہے تمہارے اعمال کی وجہ سے آتی ہے اس پر انبیاء کے مصائب سے شبہ نہ کیا جائے کیونکہ وہاں صرف صورت مصیبت ہوتی ہے حقیقت مصیبت نہیں ہوتی۔ کیونکہ گو انبیاء علیہم السلام کو مصیبت کے وقت بوجہ ادراک لطیف اور صفائی قلب کے رنج تو ہوتا ہے مگر پریشانی نہیں ہوتی کیونکہ وہ معصوم ہیں ان پر تکالیف کا ورود معاصی کے نہیں ہوتا پھر وہ پریشان کیوں ہوں۔ پریشانی تو گناہ کا نتیجہ ہے۔

پس ہم کو مصیبت کے وقت اول تو اپنے گناہوں کو یاد کرنا چاہئے تا کہ اپنی خطا کا استحضار ہو کر مصیبت سے پریشانی زیادہ نہ ہو۔ کیونکہ ...... اپنی خطا پر جو سزا ہوتی ہے اس سے دوسرے کی شکایت نہیں ہوتی بلکہ انسان خود نادم ہوتا ہے کہ میں اسی قابل تھا۔

پھر اجر کو یاد کرے کہ اللہ تعالیٰ نے مصیبت کا بہت ثواب رکھا ہے حدیث میں آتا ہے کہ

مسلمان کو جو ایک کانٹا لگتا ہے وہ بھی اس کے لئے ایک حسنہ ہے۔

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں چراغ گل ہو گیا۔ آپؐ نے اناللہ پڑھا۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ! کیا یہ بھی مصیبت ہے فرمایا ہاں! جس چیز سے مسلمان کو تکلیف ہو وہ مصیبت ہے اور اس پر ثواب کا وعدہ ہے جب ادنیٰ ادنیٰ تکلیف پر ثواب کا وعدہ ہے تو زیادہ کلفت پر...... ثواب کیوں نہ ہوگا۔ پس ثواب کو یاد کر کے غم کو ہلکا کرنا چاہئے۔

پھر اس بات کو سوچے جو اس آیت میں بتلائی گئی ہے وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِي صُدُوْرِكُمْ اللہ تعالیٰ نے مصیبت دیکر ہمارے ایمان کو آزمایا ہے کہ اسکو مصیبت میں ہم سے تعلق ہے یا نہیں۔ پس مصیبت میں ثابت قدم رہنا چاہئے خدا کی شکایت نہ کرے۔ کوئی بات ایمان کے خلاف زبان و دل پر نہ لائے۔

تمحیص وابتلاء کا فرق

اس کے بعد وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوْبِكُمْ فرمانے میں نکتہ یہ ہے کہ تمحیص وابتلاء میں فرق ہے۔ جس کو ایک مثال سے سمجھو کہ سونے چاندی کو پرکھنے کا قاعدہ یہ ہے کہ اول کسوٹی پر رکھتے ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سونا چاندی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد اس کو آگ پر رکھتے ہیں تا کہ میل کچیل کو الگ کر دیا جائے۔ پس لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ کا حاصل تو یہ تھا کہ نفس ایمان کی آزمائش کی جاتی ہے کہ اس میں ایمان بھی ہے یا نہیں اور تمحیص کا حاصل یہ ہے کہ مصیبت کے ذریعہ سے ایمان کو میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔

رہا یہ کہ ایمان کے میل کچیل سے کیا مراد ہے تو سنئے کہ بعض لوگوں کا ایمان وساوس و معاصی سے مشوب ہوتا ہے۔ مصیبت کے ذریعہ سے وساوس و معاصی کا میل دھو دیا جاتا ہے کیوں کہ مصیبت کی خاصیت یہ ہے کہ دل کو اللہ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور وہ غفلت جو وساوس و معاصی سے قلب میں پیدا ہو گئی تھی مصیبت کے وقت دور ہو جاتی ہے۔ یہی تمحیص ہے اور یہ تفسیر اہل سنت کے مذہب پر سب سے زیادہ منطبق ہے کیونکہ وہ ایمان خالص و ایمان غیر خالص کے قائل ہیں بخلاف معتزلہ و خوارج کے کہ وہ معاصی کو مزیل ایمان یا موجب کفر کہتے ہیں۔ پس ان کے نزدیک یا ایمان اور عدم ایمان خواہ ایمان و کفر۔ وہ ایمان ناقص و کامل کا فرق نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک معاصی سے ایمان زائل ہو جاتا ہے۔ یا کفر بھی لازم آجاتا ہے۔

غرض! مصائب میں ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے ایمان کی آزمائش ہوتی ہے اور ایمان کے اندر معاصی و وساوس سے جو میل کچیل آجاتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے اور اس تمحیص سے بندہ پر عبدیت غالب ہو جاتی ہے اور دعویٰ اور غرور اور تکبر کا میل و کچیل کم ہو جاتا ہے اور اپنی حقیقت منکشف ہو کر سمجھ میں آجاتا ہے کہ آدمی کبھی دعویٰ نہ کرے۔

رحمت وقدرت حق تعالیٰ

دیکھئے! حق تعالیٰ نے نمرود کو ایک مچھر سے ہلاک کیا ہے۔ حالانکہ مچھر کی نسبت نمرود سے وہ نسبت تھی جو ایک بیل کے سینگ سے تھی۔

قصہ مشہور ہے کہ ایک مچھر بیل کے سینگ پر جا بیٹھا پھر اس سے کہنے لگا کہ معاف کرنا میں تمہارے سینگ پر بہت دیر سے بیٹھا ہوں بیل نے کہا مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ تو کب آیا اور کب چلا گیا۔ تو نے اطلاع کر کے خواہ مخواہ اپنے ذمہ احسان رکھا۔ نمرود کے ذہن میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی۔ کہ ایک مچھر مجھے ہلاک کر دے گا۔ مگر خدا تعالیٰ نے اس حقیر جانور سے اسکو ہلاک کر دیا۔ مچھر کو حکم دیا کہ اس کے دماغ میں گھس جا اور اسکا بھیجا کھانا شروع کر۔

بس! اب کیا تھا کہ لگا نمرود ناچنے ہزار دوائیں کیں مگر سب بے سود۔ پھر تماشا یہ کہ جب مچھر دماغ میں کاٹتا اس وقت ایسا بے چین ہوتا کہ اپنے سر پر نوکروں کے ہاتھوں سے جوتے لگواتا جب کچھ چین آتا (یہ تھا دعویٰ خدائی کا انجام کہ نوکروں کے ہاتھوں سے جوتے کھاتا)

صاحبو! واقعی خدا کی رحمت وقدرت ہے کہ وہ اس لشکر کو ہمارے دماغ سے روکتے ہیں کہ سوتے ہوئے ہمارے دماغ میں نہیں گھس جاتے۔ جیسے لشکر کے لئے حدود مقرر کر رکھی ہیں۔ بعض دفعہ تیل لگا کر جو سونے کا اتفاق ہوا تو جاگ کر یہ دیکھا کہ تکیہ کے اوپر چیونٹیوں کا لشکر موجود ہے مگر سر میں اور دماغ میں ایک نہیں ہوتی یہ خدا تعالیٰ کی حفاظت نہیں تو اور کیا ہے۔

مگر انسان اپنے اندر خاصیت سمجھتا ہے کہ یہ جانور اس خاصیت کی وجہ سے مجھ سے دور رہتے ہیں۔ افسوس حفاظت تو کرے خدا اور سائنس والے اپنے اندر خاصیت کے قائل ہو گئے۔ مگر ان سے کوئی پوچھے کہ یہ اس وقت کہاں جاتی رہتی ہے جب کان اور ناک وغیرہ میں بعض دفعہ جانور گھس جاتا ہے۔ اور ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں اس کا انکار نہیں۔

اصل بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں اور جب کبھی وہ کسی حکمت سے اپنی حفاظت کو اٹھا لیتے ہیں اس وقت انسان کا عجز ظاہر ہو جاتا ہے۔

مریخ پر آبادی

پھر دیکھئے تو کہ خدا اور اتنی کثیر مخلوق کا وہ انتظام فرماتے ہیں جس کی شمار نہیں ہو سکتی اول تو زمین ہی کتنی بڑی ہے پھر اس میں حیوانات اور کیڑے مکوڑے بھنگے وغیرہ کس قدر بے شمار ہیں پھر بعض لوگ آج کل مدعی ہیں کہ مریخ و قمر وغیرہ سیارات میں بھی آبادی ہے اور سائنس والے وہاں جانے کا قصد بھی کر رہے ہیں۔ اس کو بھی ملا لیجئے تو حیوانات کا اور عدد بڑھ جاتا ہے۔ ان سب کا محافظ وہ ایک خدا سبحان اللہ!

اس مقام پر ایک استطرادی مضمون یاد آ گیا۔ وہ یہ کہ بعض لوگ جو مریخ میں جانا چاہتے ہیں ہم تو اس ارادہ سے خوش ہیں کیونکہ ہمارے بہت سے کام نکلیں گے۔ اول تو معراج سے اشکال رفع ہوگا۔ دوسرے اخبارات میں وہاں کے حالات پڑھیں گے تو عجائبات قدرت کا علم ہوگا۔ اور شرعاً وہاں آبادی کا ہونا محال نہیں کیونکہ شریعت نے اس کی نفی نہیں کی۔ بلکہ غالب تو یہی ہے کہ سکوت کیا ہے اور احتمال کے درجہ میں بعض نصوص میں اس مسئلہ کو داخل بھی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ قرآن میں ایک مقام پر ارشاد ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ

"کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور ان دونوں میں جو حیوانات پھیلائے ہیں (اور دآبہ کا اطلاق ملائکہ پر نہیں ہوتا)

مفسرین نے تو اس میں یہ تاویل کی ہے کہ مراد مجموعہ ارض و سما ہے کہ مجموعہ میں دواب پیدا کئے اور مجموعہ پر حکم ایک جزو کے اعتبار سے بھی صحیح ہے چنانچہ

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ان دونوں سے موتی اور مونگا برآمد ہوتا ہے

میں مفسرین نے یہی تاویل کی ہے۔ بہر حال ممکن ہے کہ سیارات میں بھی کوئی حیوانی مخلوق ہو اور اس سے اہل سائنس کا غرور تو ٹوٹا کیونکہ وہ اہل مریخ کو اپنے سے اعقل مانتے ہیں پھر اس کے ساتھ سماوات اور اجرام علویہ کی مخلوق ملا لو اور اس کے بعد کشف کو بھی ملا لو۔

عبدالکریم جیلیؒ کا کشف ہے کہ ایک دریا زمین و آسمان سے باہر ہے جس کی ایک موج ساتوں آسمان و زمین سے دس لاکھ حصہ زیادہ ہے۔ مگر اس کی موج آسمان و زمین کے ساتھ ٹکرا جائے تو سب غرق ہو جائیں۔ مگر ملائکہ اس کی موجوں کو تھامے ہوئے ہیں۔ تاکہ آسمان و زمین سے نہ ٹکرائیں اور اس دریا میں نہ معلوم کتنی مخلوق دریائی ہوگی۔ تو حق تعالیٰ کی کیسی قدرت ہے کہ اپنی تمام مخلوق کی حفاظت اور کافی انتظام فرماتے ہیں اور واقعی اگر وہ حفاظت نہ فرمائیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔

چنانچہ اس حفاظت پر اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک رات اندھیرے میں خانقاہ سے میں اپنے گھر گیا تو گھر کا راستہ بھول گیا اور کسی کے گھر پہنچ گیا بڑی دقت سے راستہ ملا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور عظمت منکشف ہوئی۔

مصائب اور عبدیت

پس یہ فائدے ہیں مصائب میں کہ ان سے استحضار عظمت ہوتا ہے کیونکہ رنج و تکلیف اور بیماری میں عظمت حق زیادہ منکشف ہوتی ہے۔ اور اس کے مقابل اپنا عجز بھی زیادہ منکشف ہوتا ہے۔ پس مصائب سے انسان پر عبدیت کا غلبہ ہوتا ہے اور عبدیت اعلیٰ مقام ہے اور یہ مصائب میں زیادہ حاصل ہوتا ہے اسی لئے کسی نے کہا ہے:

اہل کاراں بوقت معزولی ۔۔۔ شبلیٔ وقت و بایزید شوند
بازچوں میر سند برسرکار ۔۔۔ شمر ذی الجوشن و یزید شوند

''اہل کار جب معزول ہو جاتے ہیں تو وقت کے شبلی و بایزید بن جاتے ہیں اور جب پھر کام پر لگ جاتے ہیں تو شمر اور یزید بن جاتے ہیں۔''

جب اہل کار معزول ہو جاتے ہیں اس وقت کوئی ان کی نماز اور وظیفہ اور دعا کی حالت دیکھے۔ اہل کار کے لفظ پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک حاکم ندی کے پل سے گھوڑا لے کر اتر گیا اور ملاح ٹھیکیدار کو محصول نہ دیا۔ ملاح نے اس کو ٹوکنا چاہا تو اس کے رفیق نے کہا بھائی انہیں کچھ نہ کہو۔ یہ الکہار ہیں۔ الکہار محصول نہیں دیا کرتے۔ تو اس نے اہل کار کو الکہار کہا۔ واقعی بعضے تو ایسے ہی ہیں کیونکہ معمولی کہار تو ایک ہی بی بی کا بوجھ اٹھاتا ہے اور الکہار بی بی کا بار بھی اٹھاتا ہے اور بابا کا بھی اور بوبو کا بھی۔ ان میں سب حروف علت جمع ہیں کیونکہ تمام مخلوق کو ستاتے ہیں۔ سب کا حق ان کی گردن پر رہتا ہے۔ ان کے حق میں سب علت ہی ہیں تو انسان کو معزولی اور بیماری کے وقت عظمت حق کا استحضار ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ اسی کی شکایت فرماتے ہیں۔

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِیَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ط وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا

کہ سمندر میں جب طوفان کا منظر سامنے آتا ہے تو تم خدا کے سوا سب کو بھول جاتے ہو۔ پھر جب سلامتی کے ساتھ خشکی میں تم کو پہنچا دیا جاتا ہے تو خدا سے پھر جاتے ہو۔ اور واقعی انسان

ہے بڑا ناشکر۔ آگے فرماتے ہیں۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا

کیا تم اس بات سے بے فکر ہو گئے ہو کہ خدا تعالیٰ تم کو خشکی ہی میں زمین کے اندر دھنسا دیں یا تم پر ایسی آندھی بھیجے جو کنکر پتھر برسانے لگے پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ۔

چنانچہ پچھلے دنوں کانگڑہ میں زلزلہ آیا تھا تو بہت سے آدمی زمین کے اندر دھنس گئے۔ بہت سے مکانات زمین کے اندر اتر گئے۔ ہردوئی میں ایسی تیز ہوا آئی تھی کہ آدمی اڑ گئے۔ اگر کسی کو اس سے بھی عبرت نہ ہو تو اور سنو!

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا

کیا تم اس بات سے بے فکر ہو گئے کہ خدا تعالیٰ تم کو دوبارہ سمندر ہی میں لے جائے۔ پھر تم پر ہوا کا سخت طوفان بھیج دے۔ پھر تم کو تمہارے کفر کے سبب غرق کر دے اور تم کو کوئی ہمارا پیچھا کرنیوالا نہ ملے۔

حاصل یہ کہ کیا تم کو یہ احتمال نہیں کہ شاید سمندر میں پھر سوار ہو جاؤ۔ اور وہی واقعہ پھر پیش آئے جو پہلے پیش آیا تھا۔ غرض! آدمی کو تکلیف سے سبق حاصل کرنا چاہئے صحت وعافیت کے بعد بھی بیماری اور تکلیف کے لوٹنے سے ڈرتا رہے اور ہر وقت گریاں بریاں رہے۔

اے خوشا چشمے کہ او گریاں اوست — اے خوشا آں دل کہ آں بریاں اوست

''وہ آنکھ اچھی ہے جو اس کی راہ میں رونے والی ہے اور وہ دل اچھا ہے جو اسکی راہ میں جلتا۔''

در تضرع باش تا شادں شوی — گریہ کن تا بے دہاں خنداں شوی

''زاری کرتا رہ تا کہ خوش ہو۔ روتا رہ تا کہ ہنسنے والا بنے۔''

در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست — مرد آخرت بیں مبارک بندہ ایست

ہر رونے کے پیچھے آخر ہنسنا ہے۔ انجام پر نظر کرنے والا ہی مبارک آدمی ہے۔''

پتھر کا گریہ

سیر میں ایک پتھر کی حکایت لکھی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا اس پر گزر ہوا۔ دیکھا کہ زار زار رو رہا ہے پوچھا کیوں روتا ہے کہا جب کہ میں نے یہ آیت سنی ہے۔

وَ قُوْدُ هَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ کہ جہنم کا ایندھن آدمی بھی ہیں اور پتھر بھی۔

اس وقت سے مارے خوف کے رو رہا ہوں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ! اس پتھر کو جہنم میں نہ ڈالا جائے۔ وہاں سے وحی آ گئی کہ ہم نے آپ کی دعا قبول کر لی۔ اس پتھر کو جہنم میں نہ ڈالا جائے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کی تسلی کر دی۔ بہت خوش ہوا اور رونا موقوف کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھ گئے۔ ایک مدت کے بعد موسیٰ علیہ السلام پھر یہاں سے گزرے تو دیکھا پھر رو رہا ہے۔ پوچھا اب کیوں روتا ہے جب کہ تیری تسلی کر دی گئی۔ اور تجھ کو بشارت مل گئی کہا اے موسیٰ علیہ السلام وہ بشارت رونے ہی کی بدولت ملی تھی اب رونے کو کیوں چھوڑوں جس کی بدولت اتنی بڑی دولت ملی ہے۔

ایسا ہی انسان کو کرنا چاہئے کہ اگر توبہ و استغفار اور دعا کر کے مصائب سے نجات پا جائے تو اس سبق کو چھوڑے نہیں تاکہ نعمت زائل نہ ہو جائے۔ خدا تعالیٰ سے واسطہ قطع نہ کرو۔ اپنا مذہب وہ نہ کرو جو یہاں ایک گنوار نے ظاہر کیا تھا۔ کہ اس کا بھتیجا نماز پڑھتا۔ اعتکاف کرتا، دعا کرتا تھا۔ تو وہ کہنے لگا نہ معلوم سوہرا! خدا کے آگے ہاتھ پھیلا پھیلا کر کیا مانگتا ہے۔ کھانے کو غلہ موجود، پہننے کو کپڑا موجود، روپیہ میں روپیہ ہے۔ جانوروں میں جانور۔ زمین میں زمین اور خدا ہے کیا مانگے ہے، گویا کھانے پینے کو مل جائے تو نعوذ باللہ! خدا سے کچھ واسطہ رکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ مگر دیکھئے اللہ تعالیٰ کیسے حلیم ہیں کہ ایسی گستاخی پر بھی رزق کو بند نہیں کرتے۔

حضرت ابن عطاءؒ کا الہام ہے کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ اے میرے بندے میں تو ایسا رزاق ہوں کہ اگر تو ہر وقت بھی یہ دعا کرے کہ اے اللہ! مجھے رزق نہ دے جب بھی میں تیری روزی کو بند نہ کروں گا تو کیا تیرا یہ خیال ہے کہ تیرے مانگنے پر بھی نہ دوں گا۔

محبت آمیز نکیر

حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت مسطحؓ کی امداد بند کرنے کا ارادہ فرمایا تھا کیونکہ قصہ افک میں حضرت عائشہؓ کے متعلق ان کی زبان سے بھی کچھ نکل گیا تھا۔ آج بھی اگر کوئی واقعہ ایسا ہو جائے تو کوئی جنید وقت بھی اپنا زبان کی پوری حفاظت نہ کر سکے گا۔ کچھ نہ کچھ ہر شخص کی زبان سے نکل ہی جاتا ہے۔

یہ حضرات صحابہؓ ہی کا کمال ہے کہ منافقین کے اس قدر شور و شعب میں صرف دو تین صحابہ کی زبان سے بے احتیاطی ہوئی۔ باقی سب محفوظ رہے۔ منجملہ ان دو تین کے ایک حضرت مسطحؓ بھی تھے ان کی زبان سے بھی کوئی بات نکل گئی جب وحی سے حضرت عائشہؓ کی برارت ثابت ہو گئی تو حضرت صدیقؓ

کو مسطح پر غصہ آیا کیونکہ یہ حضرت صدیقؓ کے قریبی عزیز بھی تھے اور حضرت صدیقؓ ان کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔ اس لئے یہ آپ نے قسم کھالی کہ اب سے مسطح کی امداد نہ کروں گا تو حق تعالیٰ نے آیت:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُؤْتُوْا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

میں حضرت صدیقؓ کو اس ارادہ سے منع فرمایا کہ روزی بند کرنے کی قسم نہ کھانا چاہئے۔ اور گو بظاہر اس آیت میں حضرت صدیقؓ پر نکیر ہے کہ اصحاب فضل کو یعنی جن کو فضیلت دینیہ حاصل ہے اور اصحاب وسعت کو یعنی جن کو خدا نے مالی وسعت دی ہے۔ اپنے قرابت دار اور مہاجر مسکینوں کی امداد بند کرنے کی قسم نہ کھانا چاہئے۔ اس میں حضرت صدیق اکبرؓ کی یہ تعریف ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ نے دینی فضیلت بھی عطا کی ہے اور دنیوی وسعت بھی عنایت کی ہے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ وسعت دنیویہ مذموم نہیں۔ لوگ۔ یہ سمجھتے ہیں کہ علماء کسب کمال سے منع کرتے ہیں۔ یہ غلط ہے بلکہ اس کے مآل سے منع کرتے ہیں اگر کوئی شخص مآل سے محفوظ ہونے کا انتظام کرلے تو اس کے لئے وسعت دنیویہ مذموم نہیں۔ پھر اس میں حضرت مسطح کی بھی تعریف ہے کہ وہ مسکین دنیویہ مذموم نہیں۔ پھر اس بلیغ عنوان میں جس قدر ترغیب و تحیص ہے ظاہر ہے۔

اس کے بعد حضرت صدیق اکبر کو ایک مراقبہ کی تعلیم ہے۔

اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ. وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائیں یعنی اگر تم اپنے خطا کاروں کی خطا معاف نہ کرو گے تو اگر خدا تعالیٰ بھی ایسا ہی کرنے لگیں تو کیا ہو؟ آخر تم بھی کسی کے خطاوار ہو۔ پس اگر یوں چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ تمہاری خطائیں معاف کردیں تو تم اپنے خطاواروں کو معاف کردیا کرو۔ یہ سن کر حضرت صدیقؓ پگھل گئے اور کہا۔ بلی احب ان یغفر اللہ لی۔ بے شک میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری خطا معاف فرماویں۔ اس کے بعد حضرت مسطح کی امداد بدستور جاری کردی اور مدت العمر کبھی بند نہ کی[1]۔

---

[1] قلت ولکن الغواشی وموتقه القلب شیٔ آخر فرب جرم لا یستطیع الانسان معه ان ینشرح صدراً بالمجرم کمن اراده باهله وولده سرر فیکن ان یعفو عنه ولکن یتعذر الفة القلب والا نبساط معه بعد ذلک دائما لما جبله الله علی الحیاد الغیرة التی هی شعبة من الایمان وربما ینفرا لمر من رؤیه مثل هذا المجرم و سماع صوته واقصد الی محل اقامته والا مرو النهی انما یتعلقان بالا ختیار یات لا بعضها ولقد وجدنا مشائخنا انهم ربما یعفون عن بعض الخطا یا والذنوب ولکن لا یرضون نجلطة المجرم ولا بحضوره عندهم نجطابه ولا بکتا به والله یعلم بما فی صدور العلمین. ۱۲ ظ

مراقبہ عظمت قدرت

صاحبو! ہم کو اپنے خطا واروں کا قصور معاف کر دینا چاہئے اگر ہم خدا تعالیٰ سے اپنے قصور کی معافی کے طالب ہیں۔ آخر ایسا کون ہے جو خدا کا قصور وار نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اپنے قصور کی معافی تو چاہو اور دوسروں کی خطا معاف نہ کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی تمہارے ساتھ یہی معاملہ کریں جو تم دوسروں کے ساتھ کرتے ہو۔

اس مکافات بالمثل پر ایک واقعہ یاد آ گیا۔ کسی عالم سے کسی سید نے کچھ مانگا اور یہی کہا کہ میں سید ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے سید ہونے کا کیا ثبوت ہے رات کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت خواب میں ہوئی کہ میدان قیامت قائم ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حوض کوثر پر امت کو پانی پلا رہے ہیں اس کو بھی پیاس لگی اور حوض کوثر پر حاضر ہوا۔ حضورؐ نے اس سے اعراض کیا اس نے کہا یا رسول اللہ! میں آپ کا امتی ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثبوت دو کہ تم میرے امتی ہو۔ تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے۔ اب تو یہ حیران ہوا اور رونے لگا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ہماری اولاد سے تو سید ہونے کا ثبوت مانگتے ہو اور خود ثبوت نہیں دیتے۔ اب اسکو تنبیہ ہوا اور بیدار ہو کر سید زادہ سے معافی چاہی۔

پس انسان کو ڈرنا چاہئے کہ جو برتاؤ وہ دوسروں سے کرتا ہے کہیں اس کے ساتھ بھی وہی برتاؤ نہ ہونے لگے اپنے تقویٰ وطہارت پر ناز کر کے گنہگاروں کو حقیر نہ سمجھو ان کی خطائیں معاف کر دیا کرو۔ تکبر کرنے سے اندیشہ سلب نعمت کا ہوتا ہے جو کچھ مستبعد نہیں۔

دیکھئے! سب سے زیادہ علم کی نعمت محفوظ سمجھی جاتی ہے۔ مشہور ہے کہ یہ ایسی دولت ہے کہ چور بھی اس کو نہیں چرا سکتا۔ مگر اللہ تعالیٰ اس کے تعلق بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جن کا علم سب سے زیادہ کامل ہے ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ بِهٖ عَلَیْنَا وَکِیْلًا اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّکَ ط اِنَّ فَضْلَهٗ کَانَ عَلَیْکَ کَبِیْرًا

''اگر ہم چاہیں تو اس وحی کو جو آپ کے پاس بھیجی گئی ہے سلب کر لیں پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کسی کو اپنا مددگار نہ پائیں گے۔ آگے آپ کی تسلی ہے کہ ہم محض رحمت کی وجہ سے آپ پر وحی بھیج رہے ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کا فضل آپ کے اوپر بہت زیادہ ہے۔ یعنی آپ بے فکر رہیں ہم

ایسا کریں گے نہیں کیونکہ ہم نے یہ علم آپ کو بوجہ رحمت وفضل کے عطا فرمایا ہے۔

وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ ط وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا'' کہ خدا نے آپ کو وہ علوم عطا فرمائے ہیں جو آپ کو پہلے سے حاصل نہ تھے اور اللہ تعالیٰ کا فضل آپ کے اوپر بہت بڑا ہے۔''

تو جب علم کے بھی سلب ہونے کا اندیشہ ہے تو اور چیزوں کا تو کیا پوچھنا ہے اس لئے انسان کو گناہوں سے توبہ کرنی چاہئے اور اپنے کمالات پر کبھی ناز نہ کرے۔ بلکہ ہمیشہ لرزاں ترساں رہے۔ اور لرزاں ترساں رہنے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا استحضار رکھے اس سے اپنے کمالات پر ناز نہیں ہوتا۔ اور یہ مراقبہ اختیار سے بھی ہوتا ہے اور کبھی بلا اختیار بھی میسر ہو جاتا ہے مصائب میں یہ مراقبہ خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ ہم کو چاہئے کہ آئندہ کے واسطے بھی اس مراقبہ عظمت وقدرت کو معمول بنالیں تاکہ عبدیت حاصل ہو۔

اصلاح قلب

خلاصہ یہ کہ مصائب میں ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے استحضار عظمت ہوتا ہے اور عبدیت حاصل ہوتی ہے اسی کی طرف لِیَبْتَلِیَ اللّٰہُ مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ وَلِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِکُمْ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ رہا یہ کہ اس آیت میں ایک جگہ صدورکم اور ایک جگہ قلوبکم کیوں فرمایا۔ اس میں اسلم یہ ہے کہ تفنن پر محمول کیا جائے جیسا کشاف سے کہا ہے اور اگر نکتہ ہی کی ضرورت تو احسن یہ ہے کہ کہا جاوے کہ دو لفظ اس لئے اختیار کئے گئے کہ صدر باعتبار اپنی حقیقت کے ظاہر ہے اور قلب باعتبار اپنے حقیقت کے باطن ہے تو اس میں اشارہ اس پر ہے کہ کبھی ظاہر کی اصلاح ہوتی ہے یعنی کبھی ابتلاء سے اولاً صدر کی اصلاح کی جاتی ہے جو کہ جوارح سے ہے اور اس کا اثر باطن تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی تمحیص سے قلب کی اصلاح کی جاتی ہے جو کہ باطن ہے اور اس کا اثر ظاہر تک پہنچ جاتا ہے۔

پس دو لفظ اختیار کرنے میں اشارۃً تنبیہ کردی گئی ہے کہ کسی جانب میں اصلاح ظاہر سے باطن کی اصلاح سہل ہو جاتی ہے۔ اور کسی حالت میں برعکس۔ غرض! جس طرح بھی ہو اصلاح کرنا چاہئے۔ اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں۔

مصیبت اور نعمت

اس تقریر سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ بیان پہلے بیان کا تتمہ ہے کیوں کہ دونوں میں مصائب کا علاج بتایا گیا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے بیان کا حاصل یہ تھا کہ جس قدر واقعات پیش

آتے ہیں یہ سب تجارت میں داخل ہیں کہ ایک چیز ہم سے لی جاتی ہے اور اس کے عوض دوسری چیز دی جاتی ہے اور تجارت بھی ایسی چیز ہے کہ

نیم جاں بستا ندو صد جاں دہد　　　آنچہ در ہمت نیا ید آں و ہد

''آدھی جاں لیتا ہے اور سو جاں دیتا ہے جو چیز، ہمت میں نہیں ہوتی وہ دیتا ہے۔

مگر ہم اس واسطے اس کی قدر نہیں کرتے کہ یہ نعمت ارزاں مل گئی ہے مولانا اسی پر ایک جگہ شکایت کے طور سے فرماتے ہیں۔

اے گراں جان خوار دیدستی مرا　　　زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

''اے گراں جاں! تو نے مجھے سمجھا کہ میں خوار ہوں اور مجھے تو نے ارزاں خریدا ہے۔''

ارزاں خریدنے پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ شاہجہان پور میں کچھ ولائتی پٹھان گھوڑا بیچنے آیا۔ ایک رئیس نے ایک گھوڑا پسند کر کے قیمت پوچھی۔ اس نے قیمت گراں بتلائی تو رئیس نے کہا تم بڑے گراں فروش ہوں کہا بجا ہے۔ مگر آپ بڑے ارزاں خرید ہیں۔ اس جواب سے وہ چپ ہی تو رہ گیا۔

تو جب یہ مصائب واقعات تجارت ہیں تو ان پر رونا کیسا۔ کیوں کہ تجارت میں کوئی رویا نہیں کرتا۔ اور آج کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ مصیب حالاً تو مصیبت ہے مگر مآلاً نعمت ہے کیونکہ اس سے منافع ومصالح حاصل ہوتے ہیں چنانچہ اوپر ان منافع کا بیان تفصیل سے گزر چکا ہے۔

منجملہ ان کے منفعت یہ ہے کہ مصیبت پر صبر کرنے سے ثواب ملتا ہے اور ثواب بھی بغیر حساب یعنی بے شمار جس کی کوئی حد نہیں۔ چنانچہ نص میں ہے

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ

صبر کرنے والوں کو ان کا ثواب پورا دیا جائے گا۔

اور بعض صوفیاء نے لکھا ہے کہ مصیب پر بغیر صبر کے بھی ثواب ملتا ہے اور صبر کا اجر اس کے علاوہ ہے۔ یہ قول میں اولاً ذوقی سمجھا تھا۔ لیکن بعد میں یاد پڑتا ہے کہ حدیث سے بھی اس کی تائید مل گئی تھی۔ تو اب مصیبت فی نفسہٖ نعمت ہوگئی۔

اس پر شاید یہ سوال ہو کہ اگر کسی نے صبر نہ کیا اور مصیب میں کلمہ کفر بک دیا تو کیا پھر بھی مصیب پر ثواب ملے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مصیب کا مقتضی تو ثواب ہی تھا۔ مگر کلمہ کفر نے اس کے ثواب کو باطل کر دیا۔

جیسے نماز کا مقتضی ثواب ہی ہے مگر کوئی نماز پڑھ کر کلمہ کفر بک دے تو ثواب حبط ہو جائے گا۔ہاں اگر مصیبت کے بعد کلمہ کفر نہ بکے صرف بے صبری ہی ظاہر کرے تو مصیب کا ثواب الگ ملے گا اور بے صبری کا گناہ الگ ہوگا۔جیسے نماز کے بعد غیبت کر دے۔رہا یہ کہ زیادہ کون ہوگا مصیبت کا ثواب یا بے صبری کا گناہ۔تو اس کا فیصلہ میزان عمل سے ہوگا۔مگر چونکہ مجھ کو وہ حدیث اس وقت پوری طرح یاد نہیں جس میں مجرد مصیبت پر اجر کا وعدہ ہے اس لئے میں جزم کے ساتھ اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔بلکہ تین احتمال ہیں۔

ایک یہ کہ نص مقید ہو بعدم الشکویٰ جیسے انفاق فی سبیل اللہ کا اجر عدم المن کے ساتھ مقید ہے کہ صدقہ کر کے احسان نہ جتائے۔اگر احسان جتلایا تو ثواب حبط ہو جائے گا۔اسی طرح ممکن ہے کہ مجرد مصیبت کا اجر اس بات کے ساتھ مقید ہو کہ اس پر شکوہ شکایت اور بے صبری نہ کی جائے۔اس صورت میں صوفی کا قول رد ہوگا۔

دوسرے یہ کہ نص مصرح ہو یعنی اس میں تصریح[1] ہو کہ مصیبت پر باوجود بے صبری کے بھی اجر ملے گا۔اس صورت میں قول صوفی صحیح ہوگا۔

تیسرے یہ کہ نص ساکت ہو تو قول صوفی حجت تو نہ ہوگا۔مگر انا عند ظن عبدی بی کی بناء پر نفس مصیبت پر بھی مستقل ثواب کی امید کی جا سکتی ہے۔تو یہ کیسی تجارت ہے کہ نفع پر نفع ہے کہ مصیبت سے دنیا میں بھی نفع کہ ایمان پختہ ہوتا ہے گناہ دھل جاتے ہیں۔خدا تعالیٰ سے تعلق خاص ہو جاتا ہے۔اور آخرت بھی نفع ہے کہ مصیبت کا الگ ثواب،صبر کا الگ ثواب۔

کریم کی عادت

کریم کی عادت ہے کہ اپنے کرم سے وہ ثمن میں بھی ترقی کر دیا کرتا ہے۔کہ پہلے ایک قیمت دی تھی اور پھر قیمت بڑھا دی کہ پہلا ثمن کم تھا لو اور لو۔

بیع میں زیادتی تو ہم نے بھی دیکھی ہے کہ مکہ میں دو آنے کے انجیر میں نے خریدے۔

---

[1] قلت ثم فتشن عن كتب الحديث وقال قداخراج الطبرانى فى الاوسط والكبير بسند ضعيف عن ابن مسعود رضى الله عنه رفعه من مات له ولد ذكر او انثى فلم او لم يسلم رضى اولم يرض او لم يصبر لم يكن له ثواب الا لا بنه كذا فى جمع الفوائد (ص ۱۲۱)ج ۱ قلت ولكن لايصح دعوىٰ العموم فى كل مصيبةلمورد النص فى واقعته عين والمصائب مختلفة فى الا جر لا يجوز قياس احديها على الاخرى فى الثواب فلا مجال للراى فيه اللهم الا ان يكون فى درجة الرجاء عملا بقوله تعالىٰ فى الحديث القدسى اناعند ظن عبدى بى ۱۲ اظ وقلت هذا الفرق خلاف الظاهر العموم نعم يمكن التفاوت فى مقدارالاجرحسب التفاوت فى المصيبة. ش۱۲۔

دکاندار نے ترازو میں تول کر بہت سے انجیر توقع سے زیادہ میرے رومال میں دے دیئے۔ میں ان کو اٹھا کر چلنے لگا۔ تو اس نے آواز دی یا شیخ یا شیخ (وہاں سب شیخ جلاہے بھی اور سید بھی۔ کیونکہ شیخ کے معنی بزرگ ہیں وہ ہر شخص کو تعظیماً اسی لفظ سے پکارتے ہیں۔ میں لوٹا تو اس نے اتنے ہی تول کر اور دیئے اور کہا جاؤ اب تمہارا حق پورا ہو گیا۔

سبحان اللہ! کیسی امانت تھی کہ خود بلا کر بیع کو پورا کیا۔ یہاں کے تاجر تو غنیمت سمجھتے کہ اچھا ہوا خود چل دیا۔ یہ تو بیع میں زیادت کی مثال تھی اور کریم ثمن میں بھی زیادت کیا کرتا ہے اور ایشیائی بادشاہ اور نواب تو ذرا ذرا سی بات پر بے شمار دولت دے دیا کرتے تھے۔

میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ خانخاناں کسی دورہ میں تھے اور ان کے ساتھ نوکر چاکر اور درباری لوگ دوست احباب بھی تھے اور خزانہ بھی بہت کچھ تھا۔ جب پہلی منزل پر اترے ہیں اور اترنے سے پہلے ان کا خیمہ اسی طرح لگایا گیا جس طرح دربار کا اجلاس ہوتا ہے۔ اس وقت ایک شاعر نے آکر یہ شعر پڑھا

منعم بہ کوہ و دشت و بیاباں غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

"دولت من پہاڑ، جنگل اور بیاباں میں مسافر نہیں ہوتا۔ جہاں گیا خیمہ لگایا اور بارگاہ بنالی۔"

منعم خانخاں کا تخلص بھی ہے۔ اس شعر پر ان کو بہت حظ آیا اور ایک ہزار روپے دینے کا حکم دیا۔ اس کے بعد کوچ ہوا اور دوسری منزل آئی تو شاعر نے پھر وہی شعر آکر پڑھا

منعم بہ کوہ و دشت و بیاباں غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

خان خاناں نے ایک ہزار روپیہ پھر دیا۔ تیسری منزل پر اس نے پھر یہ شعر پڑھا تو انہوں نے پھر اس کو ایک ہزار روپے دیئے۔ اب درباریوں نے شاعر کو ڈرا دیا کہ بس بھاگ جا تجھے بہت مل گیا ہے کہیں یہ سب نہ چھن جائے کیونکہ ایشیائی بادشاہوں کا یہی حال ہے ؎

گاہے بسلامے بخندند گاہے بدشنامے خلعت دہند

(کبھی مسکرا کر سلامتی دیتے ہیں اور کبھی گالیوں کی خلعت سے نوازتے ہیں)

شاعر کی بھی سمجھ میں بات آگئی وہ بھاگ گیا۔ چوتھی منزل پر خان خاناں پہنچے تو شاعر کا انتظار کیا۔ خدام سے پوچھا آج وہ شاعر کہاں چلا گیا۔ لوگوں نے عرض کیا وہ تو بھاگ گیا۔ کسی نے اس کو ڈرا دیا کہ یہ رقم بھی کہیں چھن نہ جائے بھاگ جا تجھے بہت مل گیا۔

خان خاناں نے کہاں۔ افسوس! غریب کو خواہ مخواہ ڈرایا۔ بخدا میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ جب تک سارا خزانہ ختم نہ ہوجاتا۔ میں اسکو برابر دیتا رہتا۔ کیونکہ اس کے اس شعر سے مجھ کو بے حد حظ آیا تھا۔

یہ حکایت تو کتابی ہے اور ایک حکایت والد صاحب مرحوم سے میں نے سنی ہے کہ ایک دفعہ ہارون رشید مع وزیر کے جنگل کی سیر کو چلے۔ ایک بوڑھے کو دیکھا کہ باغ میں گٹھلیاں بو رہا ہے۔ خلیفہ نے وزیر سے کہا کہ اس سے پوچھو کیا بو رہا ہے۔ وزیر نے پوچھا کہا، کھجور کی گٹھلیاں بو رہا ہوں۔ خلیفہ نے پوچھا کہ یہ کتنے برس میں پھل لے آئیں گی۔ کہا بیس پچیس سال میں۔ خلیفہ ہنسا کہ بوڑھے میاں کے پیر تو قبر میں لٹک رہے ہیں۔ اور بیس پچیس سال آئندہ کا سامان کررہے ہیں وزیر نے یہ بات بوڑھے سے کہی تو کہنے لگا کہ اگر سب باغ لگانے والے یہی سوچا کرتے جو تم سوچتے ہو تو آج تم کو ایک کھجور بھی نصیب نہ ہوتی۔ میاں دنیا کا کام یوں ہی چلتا ہے کہ کوئی لگاتا ہے کوئی کھاتا ہے۔

خلیفہ نے یہ معقول جواب سن کر کہا نعم (یعنی بے شک صحیح ہے اور ہارون کا یہ قاعدہ مقرر کیا ہوا تھا کہ جس شخص کی بات پر ہم نعم کہہ دیں اس کو ایک ہزار درہم یا دینار دیئے جائیں چنانچہ) وزیر نے اسی وقت ایک ہزار کا توڑا اس کے حوالے کیا۔ اس کے بعد دونوں چلنے لگے تو بوڑھے نے کہا میری ایک بات سنتے جاؤ کہا بولو کیا کہتے ہو؟ کہنے لگا کہ کسی کا بیج تو بیس پچیس سال میں پھل لاتا ہے مگر میرا بیج ایک ہی ساعت میں پھل لے آیا خلیفہ نے کہ نعم۔ وزیر نے ایک ہزار کا دوسرا توڑا اس کے حوالے کیا پھر آگے چلنے لگے تو بوڑھے نے کہا ایک بات اور سنتے جاؤ کہ کسی کا بیج تو سال بھر میں ایک بار پھل لاتا ہے اور میرا بیج ایک ساعت میں دوبار پھل لے آیا۔ خلیفہ نے کہا نعم وزیر نے ایک ہزار کا تیسرا توڑا اس کے حوالے کیا۔ اور خلیفہ سے کہا کہ بس اب تیز چلئے۔ یہ بوڑھا تو بڑا عقلمند ہے ہم کو لوٹ[1] ہی لے گا۔

صاحبو! جب سلاطین دنیا کی یہ عطا ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر خوش ہو کر اتنا دیتے ہیں تو حق تعالیٰ اگر بے شمار عطا فرماویں تو کیا تعجب ہے۔ حق تعالیٰ کی عطا تو دیکھئے کہ کس قدر دیتے ہیں۔ مصیبت پر الگ ثواب ہے۔ صبر پر جدا اجر ہے مصیبت سے عافیت حاصل ہو اور شکر کرو تو اس پر الگ ثواب ہے مصیبت دور کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اس پر الگ ثواب ہے پھر خلود رہا الگ کہ ان نعمتوں کو زوال ہی نہیں ہے۔

---

[1] کیونکہ اس نے سلسلہ اعداد شروع کردیا تھا جو کہ غیر متناہی سلسلہ ہے جس کی کہیں انتہا نہیں وہ اس کے بعد یوں کہتا کہ میرا بیج تین بار پھل لایا پھر کہتا چار بار پھل لایا۔ اس لئے وزیر نے سلسلہ غیر متناہی سے بچنے کے لئے وہاں سے چلنے کا مشورہ دیا کیونکہ متناہی سے غیر متناہی سلسلہ کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ ۱۲ ظ۔

جنت کی غذا

خلود پر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ جنت میں ہمیشہ کھائیں پئیں گے تو پاخانہ کہاں کریں گے؟ اگر جنت ہی میں پاخانہ کیا تو وہ بم پولیس ہو جائے گی اور پاخانہ نہ کیا۔ بلکہ سب جز و بدن ہو گیا تو اجزاء بڑھتے اتنے موٹے ہو جائیں گے کہ اٹھنا بھی محال ہو جائے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کھانے کے بعد پاخانہ کرنا جب ضروری ہے کہ غذا میں فضلہ ہو۔ جنت کی غذا میں فضلہ بالکل نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے سارے اجزاء ویسے ہی ہوں گے جیسے دنیا کی غذا کا وہ حصہ ہے جس کا خون بنتا ہے پاخانہ نہیں بنتا۔ رہا یہ کہ پھر موٹے ہو جائیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ جنت میں حرکت وطیراں بہت رہے گا۔ کبھی یہاں سے وہاں اڑ گئے کبھی یہاں سے وہاں بھاگ گئے اس طرح غذا تحلیل ہوتی رہے گی اور زیادہ موٹا پا نہ آئے گا۔

متناہی عمل پر غیر متناہی ثواب

بعض نے خلود پر یہ اشکال کیا ہے کہ عمل متناہی کا ثواب غیر متناہی عقل کے خلاف ہے اسکا جواب یہ ہے کہ تم بے وقوف ہو، انعام چاہے جتنا بھی زیادہ ہو اسکو خلاف عقل کوئی نہیں کہہ سکتا۔ دوسرے ہم کو یہ مسلم نہیں کہ عمل متناہی ہے کیونکہ خلود ایمان کا بدلہ ہے اور ہر مومن کی نیت یہ ہے کہ میں ہمیشہ مومن رہوں گا۔ خواہ ہزار سال کی عمر ہو یا ایک لاکھ برس کی، کوئی مسلمان زوال ایمان کا وسوسہ بھی نہیں لاتا۔

ونية المؤمن ابلغ من عمله ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک نیت عمل سے بھی زیادہ ہے'' (إتحاف السادة المتقين: ۱۰:۱۵)

اس لئے مومن کی اس نیت کا صلہ غیر متناہی کے سوا کچھ نہیں۔ اسی طرح کافر کو خلود جہنم بھی اسی لئے ہے کہ وہ اپنے عقیدے کفر پر ہمیشہ جمے رہنے کا قصد رکھتا تھا۔ غرض پہلے بیان کا حاصل یہ تھا کہ مصیبت مصیبت ہی نہیں بلکہ تجارت ہے۔

مصیبت کے منافع

آج کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ مصیبت مصیبت تو ہے مگر اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کا استحضار کر کے اس کو نعمت سمجھو اور مصلحت مختلف علاجوں کے بتلانے میں یہ ہے کہ طبائع مختلف ہیں بعض طبائع مصیبت کو بلا واسطہ نعمت نہیں سمجھ سکتیں تو ان کا اس طرح علاج کیا گیا کہ تم اس کو مصیبت ہی نہ سمجھو۔ مگر اس میں یہ منافع بھی نہیں ہیں ان کو سوچو۔

ایک نفع مصیبت کا یہ ہے کہ اس سے باطن کا بہت جلا ہو جاتا ہے ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ

برسوں کے مجاہدات سے باطن کو وہ نفع نہیں ہوتا جو ایک ساعت کے حزن سے ہوتا ہے۔ خاص کر ایمان کو اس سے پختگی ہوتی ہے جو تمام امور باطنہ میں سب سے افضل ہے۔ چنانچہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ مصیبت سے ایمان کی ترقی و تمحیص ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جاتا ہے جو سالک کا اصل مطلوب ہے۔ نیز عبدیت کا بھی غلبہ ہو جاتا ہے جو اعلیٰ...... مقام ہے اب آیت کا ایک جملہ رہ گیا ہے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ م بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ''اللہ تعالیٰ سب باطن کی چیزوں کو خوب جانتے ہیں''

میرے ذوق میں اس جملہ سے ایک شبہ کا جواب دیا گیا ہے وہ یہ کہ بعض لوگوں کو لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ سے یہ وسوسہ ہو سکتا ہے کہ دوا سے تو علاج اسی مرض کا ہوتا ہے جس کا ہم کو علم اور اور ہم اس کے علاج کا قصد کریں۔ اور اگر ہم نے ایک مرض کا علاج کیا جسکا ہم کو علم تھا تو اس سے دوسرے مرض کا تو ازالہ نہ ہوگا جس کا علم نہیں۔ جیسا بعض لوگوں کو استغفار میں بھی یہی خیال ہے کہ توبہ واستغفار سے وہی گناہ معاف ہوتا ہے جس کا نام لیا جائے۔ یا دل میں خیال کیا جائے اور جس گناہ کا اس وقت خیال بھی نہ ہو وہ معاف نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ ان لوگوں کو یہ وسوسہ ہوا کہ مصائب سے تمحیص کامل نہ ہوگی۔ کیونکہ ہم کو اپنے بہت سے امراض کا علم نہیں ہوتا اور بہت سے گناہ ہم کر کے بھول جاتے ہیں تو یہ گناہ کیونکر معاف ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ م بِذَاتِ الصُّدُوْرِ میں اس شبہ کا جواب دیا ہے کہ تمہارا یہ گمان صحیح نہیں کہ علاج سے اسی مرض کا ازالہ ہوتا ہے جسکا مریض کو علم ہو بلکہ طبیب کا علم کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے قلوب کو پوری حالت معلوم ہے۔ تو وہ ان مصائب سے سب امراض کا علاج کر دیں گے اور سارے گناہ دھو دیں گے اور استغفار میں بھی یہی بات ہے کہ اجمالی استغفار سب گناہوں کی مغفرت کے لئے کافی ہے۔

اسی طرح حدیث میں ہے واستغفرک مما تعلم ولا اعلم (میں تجھ سے گناہوں کی مغفرت چاہتا ہوں جس کو آپ جانتے ہیں اور میں نہیں جانتا) یہ دوسری رحمت ہے جو مصائب سے حاصل ہوتی ہے۔ پس ان منافع ومصالح کو پیش نظر رکھ کر مصیبت کی پریشانی کو ہلکا کرنا چاہئے۔ اور مایوس نہ ہونا چاہئے اور آئندہ کے لئے بھی اعمال صالح کی پابندی کا عہد کرنا چاہئے کہ ہمیشہ عبدیت کا یہی برتاؤ رکھوں گا۔ جو مصیبت میں تھا۔ اور ان مضامین کو یاد کر کے غم وحزن کو کم کرنا چاہئے۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں۔ اور عمل صالح کی توفیق عطا فرمائیں۔

وصلی الله علی سید الخلق سیدنا محمد وعلیٰ
اله واصحابه اجمعين. والحمد لله رب العلمين.

الجبر بالصبر

یہ وعظ ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ بروز دو شنبہ بوقت صبح تھانہ بھون میں بر مکان منشی اکبر علی صاحب مرحوم نے کرسی پر بیٹھ کر ان کے لڑکے کی تعزیت کے سلسلہ میں بیان فرمایا جو پونے چار گھنٹہ میں ختم ہوا مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند کیا۔ ۵۰۰ سے زائد کا مجمع تھا۔ عورتیں علاوہ پردہ میں تھیں۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ .

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم.

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ فِیْٓ اَیْدِیْکُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓی اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰہُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ خَیْرًا یُّؤْتِکُمْ خَیْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْکُمْ وَ یَغْفِرْلَکُمْ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

(ترجمہ: اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو جو آپؐ کے ہاتھ میں قیدی ہیں فرما دیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب میں کچھ بھلائی (مراد ایمان ہے) دیکھیں گے تو تم کو اس مال سے بہتر (عوض) عطا فرمائیں گے جو تم سے اس وقت بطور فدیہ لیا گیا ہے اور تمہاری مغفرت فرما دیں گے بے شک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بڑے مہربان ہیں)

تمہید

مجھ کو اس وقت جو مضمون بیان کرنا ہے یہ آیت اس باب کی تو نہیں ہے مگر اس کے مناسب ہے۔ پھر ایک مناسب سے دوسرے مناسب تک پہنچ کر مقصود کا بیان ہو جائے گا۔ اور گو مقصود کیلئے خاص آیات

بھی موجود ہیں۔ مگر مجھے اس وقت تعمیم مطلوب ہے اور وہ تعمیم اس مناسب سے زیادہ واضح ہوگی۔ کیونکہ اس میں مقصود کی علت بھی مذکور ہے یعنی ابتاء نعم البدل کی جو کہ مقصود ہے علت کی کہ ایمان ہے مذکور ہے جس کے اشتراک سے مضمون زیادہ عام ہوجائے گا۔ اس لئے اس کو تلاوت میں اختیار کیا گیا ہے۔

تعمیم کا یہ حاصل ہوگا کہ یہ آیت مقصود کو اور اس کے نظائر و اشباہ سب کو شامل ہو جائے گی۔ اس بیان کا محرک بعض واقعات کا پیش آنا ہے جو اہل واقعات کی طبیعت پر گراں ہیں۔ اس لئے گرانی کے ہلکا کرنے کی ضرورت ہے اور وہ واقعات مشترک النوع مختلف الاصناف ہیں۔

اصناف میں بعض وہ ہیں، جو چھوٹوں کے فوت ہونے سے تعلق رکھتے ہیں یعنی بچوں کے انتقال سے اور ایک واقعہ ایسا ہے جس میں فوت ہونے والے بعض کے لحاظ سے بڑے تھے۔ بلکہ اکثر کے لحاظ سے بڑے تھے اور بعض کے لحاظ سے ہمسر تھے اور وہ اپنے بھائیوں کے لحاظ سے بھی ہمسر تھے گو کچھ تھوڑا بہت عمر میں فرق ہو مگر اخوت کا تعلق ایسا ہے کہ اس میں ہمسری کا رنگ غالب ہوتا ہے تھوڑے سے فرق سے اس میں ہمسری فوت نہیں ہوتی۔

یہ واقعات تو اقارب میں پیش آئے اور کل ایک دوست مہمان آئے ہیں ان کے بچہ کا انتقال ہوگیا ہے۔

تو اب یہ مضمون اقارب و احباب سب کے لئے خاص طور پر مفید ہے اور چونکہ اس وقت تعمیم کے ساتھ بیان ہوگا۔ اس لئے ہر ناگوار واقعہ میں اس سے نفع ہوگا۔ اور کم و بیش ہر شخص کو دنیا میں کوئی نہ کوئی واقعہ ناگوار ضرور پیش آتا ہے اور جس کو پیش نہ آیا ہو اس کو آئندہ پیش آنے کا احتمال ہے۔ اس لئے یہ مضمون سب کی ضرورت کا ہے۔

اسی لئے علوم دینیہ کی ہر شخص کو ضرورت ہے تاکہ وقوع کے وقت اس سے کام لیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے واقعات کا بھی پہلے سے انتظام فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا

اب تو بے وقت لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق سمت) قبلہ سے جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس (بات) نے بدل دیا۔

یہ آیت تحویل قبلہ کے متعلق ہے کیونکہ قبلہ کے احکام اول اول بدلتے رہتے تھے پہلے مسلمانوں کا قبلہ بھی بیت المقدس تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو عارضی قبلہ بنایا تھا اور آئندہ اسکو منسوخ کرنا تھا اور اس پر کفار کی طرف سے اعتراض واقع ہونے والا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا اہتمام فرمایا کہ

آئندہ واقع ہونے والے اعتراضات سے مسلمانوں کو زیادہ رنج نہ پہنچے۔ تو پہلے ہی سے اطلاع فرمادی کہ بیوقوف اور نادان لوگ تمہارے اوپر اس طرح اعتراض کریں گے تم ان سے دلگیر نہ ہونا۔

حقیقی کمال

اس اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ اعتراض سے اثر تو ہوتا ہی ہے اکابر پر بھی اثر ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی صبر کرتا ہے کوئی جواب دیتا ہے اور انتقام لیتا ہے۔ ہمارے اکابر کا معمول یہ ہے کہ وہ ایسے مواقع پر صبر کرتے ہیں اور اس میں ایک لطیف راز ہے جو ذوقاً میرے قلب میں اللہ تعالیٰ نے ڈالا ہے۔

وہ راز یہ ہے کہ یہ حضرات ہر شخص کو اس کے مقصود تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اور چونکہ معترض کا مقصود[1] ایذا ہے۔ اسلئے اسکو مقصود میں کامیاب کرنے کے لئے جواب نہیں دیتے کہ اگر جواب دیں گے تو اس کا مقصود حاصل نہ ہوگا کیونکہ جواب دینے سے شفاء غیظ ہو جاتا ہے اور اعتراض کا اثر ہلکا ہو جاتا ہے۔ پس وہ ایک مسلمان جاجی خوش کرنے کے لئے جواب نہیں دیتے۔

غرض! اہل اللہ بے حس نہیں ہوتے۔ ان کو بھی اعتراض سے اثر ہوتا ہے ان کا بھی دل دکھتا ہے مگر وہ بعض وجوہ سے صبر کرتے ہیں۔ اگر اعتراض سے اثر نہ ہو تو صبر میں فضیلت ہی نہ ہوگی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے:

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ۔ ''اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔''

فرمایا ہے کہ جب ان کو غصہ آتا ہے تو معافی اور درگذر سے کام لیتے ہیں۔ لم یغضبو نہیں فرمایا کہ ان کو غصہ ہی نہیں آتا۔ کیونکہ غصہ کا آنا کمال نہیں کمال یہ ہے کہ غصہ آئے اور اس کے مقتضی پر عمل نہ ہو۔

بعض لوگ اہل اللہ کو فانی سمجھ کر ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں کہ بے دھڑک جو چاہتے ہیں اعتراض کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان پر اثر نہ ہوگا سو وہ خوب سمجھ لیں کہ اثر ان پر بھی ہوتا ہے اور وہ صبر کرتے ہیں اور ان کے صبر کا وبال اشد ہے۔ حضرات صحابہؓ کو بھی اعتراض سے ناگواری ہوتی تھی کیونکہ اس میں اجر ہے۔ مگر ناگواری زیادہ ہو تو ناقابل برداشت ہو جاتی ہے جس سے دنیا اور دین کے کاموں میں خلل واقع ہونے لگتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام

---

[1] وفیہ ان هذا المقصود حرام والا عانة على الحرام والا سلم ان يقال انهم لا يجيبون عملا بقوله تعالىٰ ولمن صبر وغفر ان ذلك لمن عزم الامور (پ۲۵) وانما كان من عزم الامور لما فيه من مجاهدة النفس وتسكين الدهماء لما فى الانتقام والا نتصار للنفس اثارة الفتنة وزيادتها ولذا سمى الله تعالىٰ جزاء سيئة وان كان عدلا فى الحقيقة ولكنه بزيد الشرو بورث البغضاء وفيه ان ندامن الاحوال لا من الاعمال والا عانة من الاعمال ۱۲۔

فرمایا کہ گونا گواری ہو مگر ہلکی ہوتا کہ قابل برداشت ہو جائے اور اجر زیادہ ہو۔

حاصل انتظام کا یہ ہے کہ پہلے سے خبر دیدی کہ بے وقوف لوگ عنقریب اعتراض کرینگے۔

راحت کی صورت

ظاہر ہے کہ پیش آنے والی بات سے پہلے ہی مطلع کر دینا ناگواری کو کم کر دیتا ہے کیونکہ ناگواری خلاف توقع سے ہوا کرتی ہے مثلاً آپ کسی شخص سے یہ توقع کر کے ملنے جائیں کہ وہ آپ کی بہت زیادہ تعظیم ومدارات کرے گا۔ اس کے بعد اگر اسکی طرف سے ذرا بھی خاطر کرنے میں کمی ہوگی تو بہت رنج پہنچے گا اور اگر اس سے کوئی توقع نہ ہو تو اب اس کی بے رخی اور روکھے پن سے زیادہ ملال نہ ہوگا کیونکہ اس سے کچھ امید ہی پہلے سے نہ تھی۔ غرض ناگواری ہمیشہ خلاف توقع سے ہوتی ہے۔

اسی لیے حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ نے ایک بار اپنے استاد الاستاد کا مقلہ بیان فرمایا کہ راحت اگر چاہتے ہو تو کسی سے توقع نہ رکھنا۔ پھر مولانا نے حاضرین جلسہ سے فرمایا کہ تم مجھے کیسا سمجھتے ہو؟ خدام نے عرض کیا کہ حضرت ہمارے مربی اور محسن ہیں اور ہم سے زیادہ ہمارے حال پر شفقت فرماتے ہیں۔ فرمایا۔ مگر میں تم سے خیر خواہی کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھ سے بھی توقع نہ رکھنا۔ اسکا اثر یہ ہوگا کہ اس حالت میں جو کچھ خدمت مجھ سے ہوگی اس کو غنیمت سمجھو گے اور خلاف توقع ہونے کی وجہ سے مسرت ہوگی اور کسی وقت میں خدمت میں کمی کروں تو تم کو شکایت اور ناگواری نہ ہوگی۔

یہی راز اس کا ہے کہ میں نے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے حاجی صاحبؒ کے وصال کے بعد بیعت نہیں کی۔ حالانکہ مجھے رغبت تھی۔ مگر میں نے اسی لئے بیعت نہیں کی کہ حضرت کی عنایات تو میرے حال پر بدوں بیعت کے بھی بہت ہیں اور جس تعلق کے لئے بیعت کی جاتی ہے وہ مجھے بدوں بیعت کے بھی حضرت سے حاصل ہے اور بیعت سے یہ ہوگا کہ حضرت کے حقوق مجھ پر زیادہ ہو جائیں گے اس وقت اگر کسی بات میں بھی کمی ہوئی تو ممکن ہے حضرت کو ناگواری ہو اور اب حضرت کو میری طرف سے کسی قسم کے حقوق کا انتظار نہیں میں جس قدر بھی حق تعلق ادا کروں وہ سراسر موجب انشراح ہے تکدر کا احتمال ہی نہیں اور بیعت کے بعد تکدر کا احتمال بھی تھا۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص اس کو میرے نفس کی تاویل سمجھے مگر حقیقت میں جو وجہ تھی وہ میں نے بیان کردی۔

بہر حال چونکہ ناگواری ہمیشہ خلاف توقع سے ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے مطلع فرمایا دیا کہ تم پر اعتراضات بھی ہوں گے اس لئے ان کے لئے بھی آمادہ ہو جاؤ۔

پریشانی کی وجہ

یہیں سے نکتہ معلوم ہوتا ہے اس کا کہ اللہ تعالیٰ نے اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ فرمایا ان اصابتھم نہیں فرمایا کیونکہ اذا یقین کے موقع پر استعمال ہوتا ہے اور ان احتمال کے موقع پر اذا اصابتھم میں بتلا دیا گیا ہے کہ مصیبت تو آوے ہی گی۔

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نوشید　　زجام دہر مے کل من علیھا فان

''جو بھی پیدا ہوا ضروری طور پر اسے فنا کی شراب زمانے کے پیالے سے پینی ہوگی۔''

اس علم کے بعد مصیبت سے وہ غم نہیں ہوتا جو دفعۃً آنے سے ہوتا ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ اہل اللہ بڑے عاقل ہیں جو موت کو ہر دم یاد کرتے رہتے ہیں کیونکہ ان پر موت دفعۃً آنہ آئے گی۔ اس لئے ان کو موت سے وحشت بھی نہ ہوگی۔ دنیا دار اپنے کو عاقل سمجھتے ہیں یہ غلط ہے وہ بہت سے بہت آکل ہیں عاقل نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے دل میں حساب و کتاب معاش کا لگاتے رہتے ہیں اور بڑے بڑے منصوبے قائم کرتے ہیں اور وہ حساب و کتاب پورا ہوتا نہیں کیونکہ

ما کل ما یتمنی المرء یدرکہ　　تجری الریاح بما لاتشتھی السفن

''انسان کی ہر آرزو پوری نہیں ہوا کرتی کیونکہ ہوائیں کبھی کشتی کے خلاف بھی چلتی ہیں۔''

تو جب خلاف امید واقعات ان کو پیش آتے ہیں اس وقت سخت پریشانی کا سامنا ہوتا ہے اور اہل اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ ہر وقت یہ سمجھتے ہیں۔ شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود۔ اور اس کا محض احتمال کافی نہیں کیونکہ احتمال تو سارے عالم کو ہوتا ہے کہ شاید آج موت آجائے بلکہ ان کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے اس شخص کی حالت ہوتی ہے جس کے پاس بادشاہ کا پیام پہنچ جائے کہ آج ہم تم کو بلانے والے ہیں۔ تیار رہنا۔ اور کوئی وقت مقرر نہ کرتے تو آپ دیکھیں گے کہ اس شخص کا سارا دن اہتمام ہی میں گزر جاتا ہے۔

اسی طرح اہل اللہ ہر وقت اپنے معاملات کو صاف کرتے رہتے ہیں تا کہ جس وقت بلاوا آجاوے خوشی سے چلنے کو تیار ہو جائیں۔

مقروض کا فرض

صاحبو! احتمال وہی معتد بہ ہے جس کے مقتضا پر عمل ہو ورنہ یوں تو ڈاکو بھی ڈاکہ ڈالنے کے وقت سزا کا احتمال ہوتا ہے مگر جب اسکے مقتضا پر عمل نہ ہو تو ایسا احتمال چولہے میں ڈالنے کے قابل ہے۔ پس اہل اللہ

کوشاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود کا احتمال مع العمل ہوتا ہے کہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد سے سبکدوشی کی فکر کرتے رہتے ہیں۔ اگر نمازیں فوت ہوئی ہوں انکو قضا کر لیتے ہیں یا قضا کرتے رہتے ہیں۔

اس پر تم شاید یہ کہو کہ دس سال کی نمازیں ایک دن میں کس طرح قضا ہوں گی اور جب قضا نہ ہو سکیں تو ہر دم موت کے لئے کیونکر تیار ہو سکیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جس شخص کو ادا کا اہتمام ہو گیا اور اپنی وسعت کے موافق کام بھی کرنے لگا۔ تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں مثل ادا کرنے والے ہی کے ہے۔ پس وہ اپنی وسعت کے موافق ادا کرتا رہے اور جو رہ جائے اس کے متعلق وصیت کر جائے جو ثلث مال سے زیادہ میں صحیح نہیں اور اس میں بھی بندوں کے حال پر عنایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے حقوق کو (بوجہ ان کے احتیاج کے) اپنے حقوق سے (بوجہ استغفار کے) مقدم رکھا۔ پس فرما دیا کہ نماز روزہ وغیرہ کے فدیہ کی وصیت ثلث سے زائد میں نہ کرو۔ کیونکہ اس میں ورثہ کا نقصان ہے اور ہمارا کوئی نقصان نہیں۔

ہم تو اگر چاہیں ویسے بھی معاف کر دیں گے۔ پس اگر کسی شخص کے ذمہ لوگوں کا ایک لاکھ روپیہ قرض ہو اور وہ آج ادا کرنے کا ارادہ کرے تو جتنا اس سے ہو سکے ادا کرنا شروع کرے جس کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ اپنے کو زیادہ تنگی میں ڈالے۔ بلکہ اپنے حوائج ضروریہ سے جو فاضل ہو اس کو قرض میں دینا شروع کرے خواہ ایک ہی روپیہ ماہوار ادا کرنا شروع کر دے تو وہ آج ہی سے اللہ تعالیٰ کے یہاں سبکدوش قرار پائے گا۔ مگر یہ ضروری ہے کہ فضول خرچوں کو بند کر دے اب اگر اس نے ایک لاکھ میں سے پچاس ہی ادا کئے اسکے بعد موت آ گئی تو وہ عند اللہ کالمودی ہے۔

یہ جو میں نے کہا ہے کہ مقروض کو فضول خرچ بند کر دینا چاہئے اس پر ایک قصہ یاد آیا کہ مولانا نواب قطب الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت مقروض تھے ایک دفعہ آپ نے دہلی کے سب بزرگوں کی دعوت کی۔ شاہ محمد اسحٰقؒ صاحب کو بھی مدعو کیا اور مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کو بھی مدعو کیا۔ سب حضرات نے تو دعوت قبول کر لی۔ مگر مولانا مظفر حسین صاحب نے منظور نہ کیا۔ نواب صاحب نے شاہ اسحٰق صاحب سے ان کی شکایت کی۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ مولوی مظفر حسین کیا تم کو نواب صاحب کی آمدنی میں بھی شبہ ہے۔ اور کیا تمہارے نزدیک ہم نے مشتبہ مال کی دعوت قبول کی ہے۔ مولانا مظفر حسین صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میں آپ کے سامنے کیا چیز ہوں۔ جو نواب صاحب کے مال کو مشتبہ سمجھوں۔ مگر میں نے اس واسطے دعوت سے عذر کیا کہ نواب صاحب مقروض ہیں اور دعوت میں وہ

رئیسانہ خرچ کریں گے جو تین چار سو روپیہ سے کم نہ ہوگا۔ اور مقروض کو ایسا کرنا جائز نہیں۔ ان لازم ہے کہ جو رقم دعوت میں خرچ کریں اس کو قرض ہی میں ادا کردیں تو عند اللہ کچھ سبکدوشی ہو جاوے۔

شاہ صاحب نے یہ بات سن کر فرمایا کہ بھائی اس طرف ہمارا ذہن بالکل نہیں گیا۔ واقعی تمہاری رائے صحیح ہے اور اب ہم بھی دعوت قبول نہ کریں گے۔

چنانچہ سب بزرگوں نے انکار کردیا اور یہی کہا کہ آپ کو بجائے دعوت میں رقم لگانے کے قرض میں ادا کرنا چاہئے حالانکہ ان کے قرضہ میں اس رقم سے کچھ سہارا نہ لگتا تھا کیونکہ قرض بہت تھا۔ مگر عند اللہ اتنا ادا کرنا معتبر ہے دنیا داروں کے یہاں تو قاعدہ یہ ہے کہ ایک لاکھ سے ایک روپیہ ادا کرنا معتبر نہیں مگر عند اللہ معتبر ہے یعنی وہ اس سے راضی ہو جاتے ہیں۔

دنیاداروں کی تو یہ حالت ہے کہ ایک راجہ پر ایک لالہ کا قرض تھا اس نے عدالت میں نالش کی۔ حاکم نے لالہ سے کہا کہ سود معاف کردو اور اصل لے لو اس نے انکار کیا کہ ہمارا تو کاروبار سود ہی پر ہے اور یہی ہماری کمائی ہے اس کو کیونکر معاف کردوں۔ حاکم نے کہا بہت اچھا تم اصل بھی لو اور سود بھی لو۔ چنانچہ اس نے مع سود کے ڈگری کردی۔ مگر فیصلہ میں یہ لکھا کہ قرض قسط وار وصول کیا جائے اور قسط ایک روپیہ سال مقرر کردی۔ کیونکہ حاکم کو یہ اختیار ہے کہ جتنی چاہے قسط مقرر کردے۔ اس فیصلہ سے لالہ تو گویا زندہ درگور ہوگیا۔ اس کے نزدیک یہ ادا قابل شمار نہ ہوئی۔ مگر عند الحاکم معتبر ہے۔

وہ شبہ جاتا رہا کہ اگر کسی کے ذمہ دس سال کی نمازیں قضا ہوں یا دس لاکھ روپیہ قرض ہو تو وہ ایک دن میں کیونکر سبکدوش ہو سکے گا۔ سو میں نے بتلا دیا کہ ایک دن کے اندر ہی انسان تمام حقوق سے حکماً سبکدوش ہو سکتا ہے۔

موت سے وحشت

اہل اللہ موت کو یاد کرتے ہیں اور اس کے مقتضا پر عمل بھی کرتے ہیں۔ اس سے ان کو آخرت کا نفع ہوتا ہے دنیا میں بھی راحت ہوتی ہے کیونکہ جب وہ ہر دم موت کو یاد کرتے ہیں تو کسی مصیبت سے وہ پریشان نہیں ہوتے کیونکہ جب ان کو موت سے جو اشد الحوادث ہے وحشت نہیں تو اور کسی حادثہ سے پریشانی کیوں ہوگی اور دنیا دار کو موت سے بہت وحشت ہے اس لئے وہ ہر ایسی مصیبت سے پریشان ہو جاتا ہے جس میں موت کا خطرہ ہو۔

چنانچہ شاید مولانا جامیؒ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بڑھیا کی لڑکی جس کا نام مہستی تھا

بیمار ہوئی تو بڑھیا اس کی محبت میں کہا کرتی کہ اے موت مجھے لے لے اور بچی کو چھوڑ دے ایک دن وہ گھر میں بیٹھی تھی کہ اس کی گائے محلّہ میں کسی کے گھر چلی گئی اور ہانڈی میں منہ ڈال دیا۔ ہانڈی اس کے منہ میں پھنس گئی اور وہ اسی حلیہ سے گھر میں آئی تو بڑھایہ سمجھی کہ یہ موت ہے جس کو میں روزانہ پکارا کرتی تھی تو وہ گھبرا کر کہتی ہے کہ

گفت اے موت من نہ مھستیم　　پیر زال غریب محنتیم

"اے موت! میں مہستی نہیں ہوں مہستی تو وہ سامنے پلنگ پر پڑی ہے میں تو غریب بڑھیا ہوں۔"

موت کے خیال سے ہی ساری محبت اور ما متا جاتی رہی۔ اب وہ موت سے کہتی ہے کہ مہستی وہ پڑی ہے اسے لے لے۔

انسان کی خودغرضی

بات یہ ہے کہ انسان بڑا خودغرض ہے اس کو اولاد سے محبت بھی اپنے حظ ونفس کے لئے ہے کہ ان کے تماشے اچھے معلوم ہوتے ہیں اور یہ جو بعض لوگ کسی کی محبت میں جان دیتے ہیں شاید کوئی یہ سمجھے کہ وہ دوسرے کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے یہ غلط ہے بلکہ وہ بھی حظ ونفس کے لئے جان دیتا ہے کیونکہ وہ رنج عشق کے تحمل سے اپنے کو عاجز سمجھتا اور جہل کی وجہ سے موت کی تکلیف کو اس سے اخف سمجھتا ہے اس لئے وہ موت کو اس کلفت پر اپنی ہی راحت کے لئے ترجیح دیتا ہے۔ پس انسان سب خودغرض ہیں۔ خواہ دین کی غرض ہو یا دنیا کی۔ پھر دینداروں میں بھی کوئی ثواب کی نیت کرتا ہے کوئی ثواب سے بھی بالا ہے۔ مگر وہ بھی خودغرض ہے کیونکہ وہ رضائے حق کا طالب ہے اور یہ غرض سب سے بالا ہے۔

جیسے ایک صاحب حال بزرگ کے سامنے کسی نے دوسرے کو کہا پانی پلا دے ثواب ہوگا یہ سن کر فرمایا ہائے ثواب کیلئے پانی پلاتے ہو محبوب کیلئے نہیں پلاتے۔ ظاہر میں یہ بزرگ بے غرض معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ بھی غرض مند تھے کیونکہ وہ ایسی غرض کے طالب تھے جس سے بڑھ کر کوئی غرض نہیں۔

حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ نے ایک بار رسالہ ارشاد مرشد مجھے دیا کہ مطبع نظامی میں طبع کرا دیا جائے کیونکہ مطبع نظامی میں تصحیح وخوبی طبع کا اہتمام تمام مطبعوں سے زیادہ تھا چنانچہ رسالہ طبع کرا کر میں حضرت کی خدمت میں لے گیا حضرت نے اسکے مصارف دریافت فرمائے تو میں نے عرض کیا حضرت عبدالرحمٰن خان صاحب بڑے سخی ہیں۔ انھوں نے اس کا کچھ عوض تھیں لیا محض ثواب کیلئے طبع کر دیا ہے فرمایا کہ عبدالرحمٰن خان کو تم سخی کہتے ہو وہ بڑے بخیل ہیں کہ ایک روپیہ کے

بدلہ میں سات سو روپے کے طالب ہیں۔ انھوں نے یہاں بھی اپنی تجارت کو نہیں چھوڑا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ انسان سب خود غرض ہیں۔ اس لئے اپنی جان سے زیادہ کسی کو کسی سے محبت نہیں اس لئے دنیا دار لوگ موت سے مصائب سے بہت گھبراتے ہیں اور اہل اللہ چونکہ موت کو یاد کرتے رہتے ہیں اور اس کے لئے ہر دم تیار رہتے ہیں اس لئے اب ان کو نہ بیوی کے مرنے کا رنج ہوتا ہے نہ بچہ کا۔ کیونکہ وہ تو خود ہی موت کے لئے تیار ہے اور ان کی ہر بات سے دوسروں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہر دم موت کے لئے تیار ہیں۔

چنانچہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی خدمت میں ایک شخص روتا ہوا آیا کہ حضرت میری بیوی مر رہی ہے دعا فرما دیجئے کہ حق تعالیٰ اس کو شفا عطا فرمائیں۔

حضرتؒ نے ہنس کر فرمایا کہ عجیب بات ہے ایک شخص قید خانہ سے چھوٹ رہا ہے اور دوسرا روتا ہے کہ یہ قید خانہ سے کیوں رہا ہو رہا ہے۔ وہ کہنے لگا حضرت میری روٹی کون پکائے گا۔ فرمایا جی ہاں جب تم ماں کے پیٹ میں تھے تو وہ وہاں بھی تم کو روٹی پکا کر کھلاتی ہوگی۔

پھر فرمایا کہ میاں تم بھی چند روز میں وہیں پہنچنے والے ہو جہاں وہ جا رہی ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ آیا بیوی کو موت سے بچانے اپنی ہی موت کی بشارت لے چلا۔

اس وقت تک تو حضرت ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک ایسی بات پر برہم ہو گئے جو آج کل برہم ہونے کی بات نہیں سمجھی جاتی بلکہ حب دین کی بات سمجھی جاتی ہے وہ کہنے لگا کہ حضرت فلاں شخص نے مجھے مدینہ لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب وہ وعدہ سے ہٹنے لگا ہے دعا فرما دیجئے کہ وہ مجھے مدینے لے جائے۔ بس حضرت یہ سنتے ہی برہم ہو گئے فرمایا۔ ہمارے سامنے شرک کی باتیں نہ کرو۔ (غیر اللہ پر اتنی نظر کہ اس کے ہی لے جانے سے تو تم مدینہ پہنچو گے)

حضرت کی مجلس میں بیٹھ کر بات بات سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہر دم موت کے لئے تیار ہیں اور ہر کام میں خدا تعالیٰ پر نظر ہے۔ اب ایسے شخص پر موت گراں کیوں ہوگی اور کسی مصیبت سے کیوں پریشان ہوگا۔

غرض جس مصیبت کے لئے انسان پہلے سے آمادہ رہے اس پر وہ مصیبت خفیف ہو جاتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ میں صحابہ کو پہلے سے مطلع فرما دیا کہ تحویل قبلہ کے وقت تم پر اعتراضات ہوں گے ان کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا اہتمام فرمایا ہے کہ آئندہ واقعات سے مسلمانوں

کوزیادہ رنج وکلفت نہ ہواوراسی لئے شریعت کی تعلیم کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس تعلیم میں اس کا لحاظ فرمایا ہے کہ پریشانی اورغم اس سے ہلکا ہوجاتا ہے۔

میں ایسا ہی مضمون بیان کرتا ہوں کہ اس کے استحضار سے کسی غم میں ثقل نہ رہے گا۔

یہاں تک داعی اور محرک کا بیان تھا۔

اب میں مضمون کا حاصل حقیقت کے لحاظ سے بتلانا چاہتا ہوں تواس مضمون کی حیثیت اس عنوان سے جوآج بیان ہوگا۔شاید کبھی سننے میں نہ آئی ہوگی۔اس لحاظ سے یہ تعلیم جدید ہے۔ گوفی الواقع علوم دینیہ سب قدیم ہیں مگر ہمارے علم وسماع کے لحاظ سے بعض علوم جدید ہوتے ہیں کیونکہ ہم نے ان کوسنانہیں یا خاص عنوان سے نہیں سنا۔

مصیبت کی حقیقت

خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ جنگ بدر میں (اور بدرایک موقع کا نام ہے جہاں غزوہ ہوا تھا) کچھ کفارقید ہوکرآئے تھے جن کوفدیہ لے کرچھوڑ دیا گیا۔حق تعالیٰ کویہ امرناپسند ہوا۔جس کا اوپر ذکر ہوچکا ہے اس کے بعدان قیدیوں کے متعلق ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ

اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں کوجوآپ کے ہاتھوں میں قیدی ہیں فرمادیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب میں کچھ بھلائی دیکھیں گے (مرادایمان ہے) توتم کواس مال سے بہتر (عوض) عطا فرمائیں گے۔جوتم سے (اس وقت فدیہ لیا گیا ہے اورتمہاری مغفرت فرمادیں گے۔

مراد یہ ہے کہ اس جملہ میں اعطائی الدنیا مراد ہے اور جملہ ثانیہ میں اجرآخرت مراد ہے ویغفر لکم یعنی آخرت میں تمہاری مغفرت فرمادیں گے واللہ غفور رحیم کہ اللہ تعالیٰ تو بہت مغفرت فرماتے والے اوررحم فرمانے والے ہیں (اس لئے تم کواس وعدہ میں تردد نہ کرنا چاہئے)

حاصل آیت کا یہ ہے کہ اگرتمہارے دل میں ایمان ہوتوتم کواس مالی ۔۔۔نقصان کا اندیشہ نہ کرنا چاہئے جوفدیہ سے اس وقت پہنچا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تم کودنیاوآخرت میں اس کانعم البدل عطا فرمائیں گے۔اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ ہرنقصان ومصیبت کانعم البدل ملتا ہے اور ہر چند کا موردآیت کا خاص ہے مگر جس امر پراس وعدہ کومرتب فرمایا ہے وہ مورد کے ساتھ خاص نہیں

بلکہ عام ہے اس لئے آیت سے یہ قاعدہ مفہوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ ہر مصیبت کا نعم البدل ملتا ہے۔ یہاں تو تعمیم پر کوئی صیغہ صراحۃً دال نہیں مگر دوسری نصوص سے اس تعمیم کی تائید ہوتی ہے۔ اس وعدہ اور قاعدہ کو ملحوظ رکھ کر ایک اور حقیقت واضح ہوئی وہ یہ کہ مصیبت کی حقیقت تجارت ہے۔ یہی حقیقت ہماری نظر سے غائب ہوتی ہے اس لئے مصیبت سے رنج زیادہ ہوتا ہے۔

اب دیکھو کہ تجارت میں انسان یہ چاہا کرتا ہے کہ میرے مال کی نکاسی ہو کہ جو چیزیں میرے ہاتھ کے تلے ہیں ان کا لینے والا، خریدنے والا ہو۔ اگر خریدار کوئی نہ آئے تو تاجر گھبرا جاتا ہے۔ خاص کر ایسی اشیاء میں جو باقی رہنے والی نہیں جیسے کل کے روز برف بہت ارزاں دہلی کے بھاؤ پر مل گئی تھی کیونکہ خریدار کم ہوئے اور برف کا رہنا دشوار تھا اس لئے دہلی کے بھاؤ پر یعنی اپنی خریداری پر ہی دے گیا۔ شہروں میں تو ایسا بہت ہوتا ہے کہ شام کو برف نہایت ارزاں ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ تاجر اپنے مال تجارت کے پڑا رہنے پر رنجیدہ ہوتا ہے نکل جانے پر رنجیدہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ اپنے خریداروں کے ہاتھ ایک محدود نفع پر بیچتا ہے مگر پھر بھی وہ خریداروں کا مشتاق رہتا ہے کہ کوئی میرا مال لے لے۔ مرابحہ نہ ہو تو تولیہ ہی ہو۔ تولیہ نہ ہو تو میلی کچیلی صافی ہی سہی یعنی نفع نہ ہو تو کچھ خسارہ ہی سہی چنانچہ بعض دفعہ ایسے مال کو جس کا خریدار کوئی نہ ہو کسی قدر خسارہ سے بھی فروخت کر دیتا ہے۔

جب تجارت کی یہ حقیقت ہے تو صاحبو! اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ یہ واقعات رنج و مصیبت تمام تر تجارت ہی ہیں اور تجارت بھی ایسی جس سے بڑھ کر نفع کسی تجارت میں نہیں ہوتا تو کیا پھر بھی نالہ وشیون باقی رہے گا۔ میں رنج طبعی کا منکر یا مانع نہیں جو فطری طور پر ہوتا ہے۔ بلکہ میں آگے اس کی ضرورت پر کلام کروں گا کہ طبعی رنج تو ہونا چاہئے ورنہ ثواب واجر ہی نہ ہوگا۔ مگر میں اس وقت رنج عقلی کے متعلق گفتگو کر رہا ہوں کہ واقعات رنج و مصیبت کی حقیقت معلوم کرنے کے بعد رنج عقلی نہ ہونا چاہئے۔

عمل صبر و شکر

خلاصہ یہ ہے کہ حالات دو کی دو قسمیں ہیں۔ گوار و ناگوار۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔ اختیاری و غیر اختیاری۔ یہ کل چار قسم کے حالات ہوئے جن میں سے ہر ایک کے متعلق جدا جدا حقوق ہیں اور مومن اگر ان کے حقوق ادا کرتا رہے تو اس کو نعم البدل ملتا ہے اسی لئے مومن کسی حالت میں نقصان میں نہیں۔ بلکہ ہر حالت میں نفع میں ہے اسی لئے حدیث میں ہے نعم الرجل المومن ان اصابتہ سراء حمد وان اصابتہ ضراء صبر وفی کل اجر (لم أجد الحديث فی ''موسوعۃ أطراف الحدیث'') او

کما قال ''مومن آدمی بڑی اچھی حالت میں ہے اگر اسکو راحت پہنچتی ہے حمد وشکر کرتا ہے اگر تکلیف پہنچتی ہے صبر کرتا ہے اور ہر ایک میں اسکو اجر ملتا ہے یعنی شکر میں بھی اجر ہے اور صبر میں بھی۔''

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امور غیر اختیاریہ میں جو اجر ہے وہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو اختیاراً اس وقت مومن سے صادر ہوتے ہیں یعنی راحت میں حمد۔ جس کی حقیقت یہاں شکر ہے اور وہ ایک عمل ہے جو اس نے حق تعالیٰ کے حضور میں پیش کیا ہے اس کے عوض میں اجر ملتا ہے اور مصیبت میں صبر کرنا بھی ایک عمل ہے جس پر اجر ملتا ہے۔ پس دونوں صورتوں میں نعم البدل اسی عمل پر ملا جو اختیاری ہے۔ پس جس طرح اعیان کے اعطاء واخذ کے عوض میں بھی انسان کے اوپر کچھ حقوق ہیں۔ یعنی صبر وشکر مثلاً حق تعالیٰ بندہ کو نعمت مال عطا فرما دیں یا نعمت اولاد تو اس کے عوض میں اس کے اوپر شکر واجب ہے یا اس سے مال واولاد کو لے لیں تو اس پر صبر واجب ہے۔

اسی طرح اعراض واعمال پر بھی یہ حقوق ہیں مثلاً نماز، روزہ وغیرہ کی توفیق عطا فرمائیں یا ذکر میں انوار وعلوم عطا فرمائیں تو اس پر شکر لازم ہے اور اگر ذکر میں انوار وکیفیات سلب ہو جائیں تو اس پر صبر لازم ہے اور یہاں خود اعمال پر بھی اجر ملتا ہے اور ان کا شکر ادا کرنے پر اجر ہے چنانچہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے عوض تو اس کو وہ اجر ملتا ہے جو خیال سے باہر ہے حدیث میں ہے۔

اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر (مسند أحمد ۲: ۴۳۸، الترغیب والترھیب ۴: ۵۲۱)

تو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، پس جملہ اعمال صالحہ کا بجالانا بھی ایک تجارت ہوئی جسکے نفع کی یہ شان ہے

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را ... کہ بیک گل می خری گلزار را

نیم جاں بستاند وصد جاں و ہد ... آنچہ درو ہمت نیاید آں وہد

ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے جہاں ایک پھول کے بدلے گلزار ملے۔

آدھی جان لیتا ہے اور سو جان عطا فرماتا ہے جو چیز تیرے وہم میں بھی نہیں ہوتی وہ دیتا ہے۔''

عبادت اور تجارت

اور اگر عبادت کا تعلق اموال سے ہو تو وہ بھی تجارت ہے جس کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے صراحۃً لفظ ارشاد فرمایا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اسی بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ انکو جنت ملے گی۔

جس میں تجارت کی حقیقت پر صاف طور سے تنبیہ ہے (وقال تعالیٰ

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ

''تو ہاں! اس شخص کو چاہئے کہ اللہ کی راہ میں ان (کافر) لوگوں سے لڑیں جو آخرت (کو چھوڑ کر) اس کے بدلے دنیوی زندگی کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔'' **وفيه لفظ الشراء بمعنى البيع وقال الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ۔** یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے گمراہی لے لی ہے بجائے ہدایت کے تو سودمند نہ ہوئی ان کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے۔ **وفيه ان اختيار الكفر صفقه خاسرة وقال تعالىٰ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ط لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔** چونکہ تجارت کی طرف طبائع عام طور سے راغب ہیں۔ اسی لئے تجارت کا عنوان اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمایا کہ تم جو اعمال کرتے ہو وہ درحقیقت ایک معاملہ تجارت ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تم کر رہے ہو۔ افسوس! نماز کو ہم لوگوں نے اسی لئے مصیبت سمجھ لیا ہے کہ اس کی حقیقت نہیں سمجھی۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ اس کی حقیقت تجارت ہے کہ ایک چیز دیدی اور ایک چیز لے لی۔ تو نماز سے کبھی گرانی نہ ہو اور نہ اس کو بیگار کی طرح ٹالا جائے۔ بلکہ جس طرح تاجر اپنے مال کو صاف ستھرا رکھتا ہے اور خوب صورت بنا کر خریدار کو دیتا ہے اسی طرح ہم بھی نماز کو خوب صورتی کے ساتھ ادا کیا کرتے۔ یہ تو گوارا حالات کے متعلق بیان تھا۔

اب ناگوار حالات کے متعلق سنئے۔ کہ ان میں بھی تجارت کی حقیقت موجود ہے اور گو اس حقیقت سے جہل عام ہے نعمتوں میں بھی اور مصائب میں بھی اگر نعمتوں میں اس جہل کا وہ ضرر نہیں جو مصائب میں ہے کیونکہ نعمتوں میں رنج تو نہیں ہوتا جس سے پریشانی بڑھ کر دین اور دنیا کے کاموں میں خلل واقع ہو بخلاف مصائب کے وہاں اس حقیقت کے جہل سے رنج کا اثر دل پر چھا جاتا ہے جس سے تمام کاموں میں خلل واقع ہو جاتا ہے اس لئے یہاں علاج کی ضرورت ہے اب میں مصائب کے متعلق بھی اس حقیقت کو ثابت کرنا چاہتا ہوں۔

مصیبت اور تجارت

احادیث کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصائب میں بھی تجارت کے الفاظ حضورؐ نے

استعمال فرمائے ہیں۔ چنانچہ آپ کی صاحبزادی کا بچہ مرنے لگا اور انہوں نے حضور کو بلایا تو آپ نے تسلی کیلئے فرمایا:

ان لله ما اخذ ولله ما اعطى وكل عنده باجل مسمى فلتصبر ولتحتسب (الصحيح للبخاري ۲: ۱۰۰)

فرمایا اللہ ہی کا دیا جو کچھ ہو یا اور اللہ ہی کا ہے جو لیا۔ پس صبر کریں اور ثواب کی امید رکھیں۔

یہاں اخذ واعطاء ہے اور اخذ واعطاء ہی تجارت کی حقیقت ہے یہاں محض صوری تجارت ہے حقیقی تجارت نہیں کیونکہ حقیقت تجارت تو یہ ہے کہ اپنی چیز دے اور دوسرے کی لی اور یہاں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہم بچہ کو کوئی چیز بطور اباحت کے دیں (اباحت کی قید اس لئے بڑھائی۔ تاکہ آگے شرعی اعتراض وارد نہ ہو) پھر کسی مصلحت سے وہ چیز اس سے لے لیں۔ اور دوسری دے دیں۔ مثلاً کسی کو اپنی اولاد کو اصول تجارت سکھلانا مقصود ہے۔ وہ اس کو ایک آبگینہ کا ٹکڑا دیتا ہے اور ایک اشرفی کے بدلہ میں بچہ سے اس کو خرید لے تاکہ وہ آبگینہ کی حقیقت اور روپیہ واشرفی کی قیمت سے واقف ہو جائے تو یہ درحقیقت تجارت نہیں بلکہ صورت تجارت ہے۔

اسی طرح حق تعالیٰ نے بعض چیزیں بندہ کے نامزد کر دی ہیں جو اباحت ہی کے طور سے ہے گو اس پر ملک کے آثار بھی مرتب کیے گئے ہیں مگر حضرت کی حق ملک کے اعتبار سے یہ نامزدگی اباحت ہی ہے۔ ہاں دوسروں کے اعتبار سے ملک کہنا صحیح ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے طلباء کو مدرسہ سے کتابیں دی جاتی ہیں تو مدرسہ کی ملک کے اعتبار سے تو یہ کتابیں طلباء کے نامزد بطور اباحت کے ہیں مگر بعض آثار اس میں ملک کے بھی ہیں چنانچہ ایک طالب علم سے دوسرا طالب علم بلا اذن کے کتابیں نہیں لے سکتا۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے بھی بعض مصالح کی وجہ سے بعض اشیاء کو ہمارے لئے نامزد فرما دیا ہے۔

ایک مصلحت تو یہ ہے کہ نامزدگی میں بندہ کو حظ آتا ہے کہ میرا مال میری بیوی، میرا بچہ میری زمین، میرا مکان وغیرہ وغیرہ، دوسرے یہ کہ تاکہ اس سے کوئی چھین نہ سکے۔ اگر نامزدگی نہ ہو اور بندہ کی ملک نہ ہو تو کسی کے پاس کوئی چیز سلامت نہ رہے اور یہیں سے میں کہتا ہوں کہ حقیقت شریعت کی محتاج ہے یعنی وہ حقیقت جو عام طور پر صوفیاء کے ذہن میں ہے (ورنہ طریقت وحقیقت شریعت ہی کے اجزاء ہیں) مگر جس حقیقت کو جہلاء صوفیا گاتے پھرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ وہ بھی شریعت کے محتاج ہے۔ اگر شریعت نہ ہو تو صوفی صاحب کے تسبیح ومصلیٰ اور نذرانے اگر کوئی

ملانا لے جائے پھر وہ برا نہ مانیں کیونکہ

در حقیقت مالک ہر سے خداست　　　　این امانت چند روزہ نزد ماست

”حقیقت میں ہر شے کا مالک خدا تعالیٰ ہے یہ امانت چند دن کے لئے ہمارے پاس ہے۔“
جب بندہ کی کوئی شے نہیں۔ نہ اس کو حق ملک حاصل ہو۔ تو ملانوں کو یہ کہنے کا حق ہے کہ کچھ دنوں خدا کا مال تم نے برتا اب ہم برتیں گے اعتراض اور ناگواری کی کیا بات ہے۔

ایک جبری۔ کی بے صبری

جیسے مولانا نے ایک جبری کو حکایت لکھی ہے کہ وہ ایک شخص کے باغ میں گھس کر مالک کے سامنے انگور توڑ کر کھانے لگا۔ مالک نے کہا میاں! یہ کیا حرکت ہے نہ اجازت لی نہ قیمت دی اور میرے باغ میں لگے تصرف کرنے۔ جبری نے کہا بس بس! خاموش بیٹھا رہ باغ بھی خدا کا۔ پھل بھی خدا کا۔ میں بھی خدا کا، تو روکنے والا کون ہے۔ مالک باغ بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے اپنے غلام کو آواز دی کہ ایک رسی اور کھٹکا لانا۔ غرض! دونوں نے رسی میں جبری کو باندھا اور کٹائی شروع کر دی اب لگا چلانے۔ مالک باغ نے کہا کہ رسہ بھی خدا کا، کھٹکا بھی خدا کا میں بھی خدا کا تو بھی خدا کا۔ پھر چلاتا کیوں ہے چونکہ چوٹ کا تحمل نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے یہ جواب نہ دے سکا کہ یہ چلانا بھی خدا کی طرف سے ہے۔ اس لئے اعتراض لغو ہے۔ بلکہ ہوش درست کر کے کہنے لگا

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار　　　　اختیار ست اختیار ست اختیار

اس نے کہا میں نے توبہ کر لی جبر کچھ نہیں اختیار ہی اختیار ہے وہ چوٹ کھا کر صوفی نہ رہا۔ بلکہ مولوی ہو گیا۔
تو صاحبو! اگر یہ حقیقت واضع کر دی جائے تو سب آدمی بالشویک ہو جائیں جن کا دعویٰ ہے کہ سب انسان مساوی ہیں کسی کو کسی سے مالدار بننے کا حق نہیں۔ بلکہ جس کے پاس زیادہ مال ہوتا ہے اس سے لے کر غریبوں میں تقسیم کر دیتے ہیں حضرت حاجی صاحبؒ نے مثنوی کے اس شعر کا

سر پنہاں ست اندر زیر و بم　　　　فاش گر گویم جہاں برہم زنم

یہی مطلب بیان فرمایا تھا کہ اگر مسئلہ واحدۃ الوجود ظاہر کر دوں تو عالم میں فساد ہو جائے۔ کم فہموں کی نظر سے امتیاز اٹھ جائے یہ جو عالم میں نظام و امن قائم ہے یہ شریعت ہی کی بدولت ہے کہ یہ زید کا حق ہے یہ عمرو کا حق ہے دوسرے کے حق میں تصرف حرام ہے تو ان مصالح کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بندہ کے نامزد بعض چیزیں کر دی ہیں۔ مگر ان کا تو یہ مطلب نہیں کہ تم اس نامزدگی سے حق تعالیٰ کا

بھی مقابلہ کرنے لگو۔ اگر کوئی آقا اپنے غلام سے کہہ دے کہ یہ پلنگ تمہارا ہے تو اس میں مصلحت یہ ہے کہ دوسرے غلام اس کو تنگ نہ کریں۔ بلکہ اس کی نامزد چیز میں بلا تکلف اسکو تصرف کرنے دیں۔ اب اگر یہ غلام آقا کو بھی اس پلنگ پر بیٹھنے سے روکنے لگے تو یقیناً وہ بڑا نمک حرام ہوگا

مصلحت خداوندی

صاحبو! یہی حالت ہماری ہو رہی ہے خدا تعالیٰ کے ساتھ کہ خدا تعالیٰ نے تو ہماری مصلحت کے لحاظ سے نامزدگی فرمائی تھی۔ ہم خدا تعالیٰ کے تصرف کو بھی ان چیزوں سے روکنا چاہتے ہیں۔ اور اگر وہ کوئی تصرف کرتے ہیں تو ہم پیٹ پھاڑ کر مرے جاتے ہیں حالانکہ جو چیز بادشاہ کے نامزد ہو جائے اور اس کے خزانہ میں پہنچ جائے وہ تو زیادہ محفوظ ہو جاتی ہے ہمارے نامزد رہتی تو خطرات کا اندیشہ تھا۔

چنانچہ جس بچہ کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا اس کے بارے میں یہی آیا ہے کہ اس کی فطرت میں کفر تھا۔ اگر زندہ رہتا کافر ہوتا۔ اور ماں باپ کو اس سے بہت محبت تھی۔ اندیشہ تھا کہ ماں باپ پر بھی اس کے کفر کے اثر پہنچتا۔ کیونکہ جس طرح اولاد ماں باپ کے اثر سے بگڑتی ہے اس طرح کبھی والدین بھی اولاد کے اثر سے بگڑ جاتے ہیں تو اب جو اولاد بچپن میں مر جائے ان کے متعلق سوچنا چاہئے کہ نہ معلوم یہ جوان ہو کر کیسے ہوتے ممکن ہے جوانی میں یہ ایسے ہوتے کہ ہم کو ان سے نفرت ہوتی اور ہم خود ان کی موت کی تمنا کرتے اور اب معصومی کی حالت میں انتقال ہوا ہے تو یہ سب خطرات سے محفوظ ہو گیا کیونکہ معصوم بچے جمہور کے نزدیک جنتی ہیں۔

امام صاحبؒ سے جو اس مسئلہ میں اللہ اعلم بما کانو عاملین منقول ہے جس کا حاصل توقف ہے تو اس کی وجہ یا تو عدم بلوغ نصوص ہے اور اس میں کچھ نقص نہیں کیونکہ تدوین علوم واحادیث سے پہلے علماء کو نصوص تدریجاً ہی...... پہنچتی تھیں تو ایک وقت میں اگر کسی عالم کو کوئی حدیث نہ پہنچے تو کیا تعجب ہے اور تو اور حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایک وقت ایسا گزرا ہے جس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں

مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا

آپ کو خبر نہ یہ تھی کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان کی انتہائی کمال کیا چیز ہے لیکن ہم نے اس قرآن کو ایک نور بنایا جس کے ذریعہ سے (بواسطہ آپ کے) ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا

کہ اے رب میرے علم میں اضافہ فرما۔

کہ زیادت علم کی دعا فرماتے رہا کیجئے۔ جس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کے علوم میں بھی تدریجاً ترقی ہوتی تھی۔

دوسری بات میرے ذہن میں امام صاحب کے توقف کے متعلق یہ آئی ہے کہ امام صاحب نے اس عنوان میں ہم کو ایسے امور کی تحقیق سے منع فرمایا ہے۔ جن پر دین کا مقصود موقوف نہیں چونکہ بچوں کے دخول جنت وعدم دخول کی تحقیق پر کوئی دینی مقصود موقوف نہیں ہے تو جس کو اس کی تحقیق نہ ہوئی ہو وہ اس کے درپے نہ ہو۔ اس لئے امام صاحب نے سائل کو مجمل جواب دیا۔ اس کے سامنے تحقیق بیان نہیں فرمائی کیونکہ اس کا سوال فضول تھا۔ امام صاحب نے بہت سے فروع میں اسی اصل کو ملحوظ فرمایا ہے آج کل ایسے فضول سوالات بہت کئے جاتے ہیں جن پر دین کا کوئی مقصود موقوف نہیں۔

مثلاً یہ سوال کیا جاتا ہے کہ فلاں کا بڑا گناہ ہے یا چھوٹا گناہ ہے۔ میں جواب دیا کرتا ہوں کہ اگر چھوٹا گناہ ہوا تو کیا ارتکاب کا قصد ہے اگر کہے ہاں! تو میں کہتا ہوں کہ کیا کبھی اپنے چھپر میں چنگاری لگانے کے متعلق بھی یہ سوال کیا ہے کہ یہ چنگاری چھوٹی ہے یا بڑا انگارہ ہے اور اگر یہ معلوم ہو کہ چھوٹی چنگاری ہے تو کیا اس کو چھپر میں لگانے کی جرأت کرو گے؟ اگر کہو نہیں کیونکہ ذرا سی چنگاری بھی کبھی بڑھ جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسی پر چھوٹے گناہ کو قیاس کرلو جو شخص چھوٹے گناہ پر جرأت کرتا ہے وہ کل بڑے پر بھی جرأت کرے گا۔

اسی طرح یہ سوال کیا جاتا ہے کہ چند مردوں کو ثواب بخشا جائے تو تقسیم ہو کر پہنچے گا یا بلا تقسیم کے سب کو برابر پہنچے گا۔ اگر تقسیم ہو کر پہنچتا ہے تو ابا جان کو تو بہت کم ملے گا۔

میں کہتا ہوں کہ تم اس فکر میں کیوں پڑے اگر تقسیم ہو کر بھی ثواب پہنچا تو اللہ تعالیٰ کو بڑھانا بھی تو آتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک چھوارہ کے صدقہ کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ جبل احد سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ اب بتلاؤ کہ پہاڑ میں کتنے ارب چھوارے ہوں گے اور اتنے ارب میں اگر تقسیم جاری ہو تو کیا حرج ہے۔

ارے میاں! اللہ تعالیٰ کے یہاں تو ذرا سا عمل قبول ہو جائے تو بہت ہے پھر تم کس فکر میں پڑے ہو ہمارے حاجی صاحب قدس سرہٗ نے خوب فرمایا ہے

گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ وفریاد ہم ۔۔۔ بس ہے اپنا ایک ہی نالہ اگر پہنچے وہاں

مگر اب علماء بھی ان مسائل کی تحقیق کے درپے ہو جاتے ہیں اور ہم نے بھی لڑکپن میں ایسی

تحقیق کی ہے مگر اب معلوم ہوا کہ یہ مشغلہ فضول تھا۔ پس عوام کو یہ چاہئے کہ فضولیات کی تحقیق نہ کریں۔ اور علماء کو چاہئے کہ ان فضولیات کا جواب نہ دیں۔

علیؓ ومعاویہؓ

مولانا محمد نعیم صاحب لکھنوی سے ایک شخص نے حضرت علیؓ ومعاویہ رضی اللہ عنہما کے متعلق سوال کیا۔ مولانا نے سائل سے پوچھا کہ یہ سوال کس کا ہے اور وہ اور تم کیا کام کرتے ہو؟ کہا کہ سوال فلاں حافظ صاحب کا ہے اور وہ رنگریز ہیں اور میں درزی ہوں۔ فرمایا کہ تم کپڑے سیتے رہو اور ان حافظ صاحب سے کہہ دو کہ کپڑے رنگتے رہیں۔ علیؓ جانیں اور معاویہؓ جانیں۔ تم سے ان کے معاملہ کا کیا تعلق؟ میں اطمینان دلاتا ہوں کہ قیامت کے دن ان کا مقدمہ تمہارے اجلاس میں نہ آئے گا۔

اسی طرح ایک شخص نے میرٹھ میں ایک عالم سے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین شریفین مومن تھے یا نہیں۔ عالم نے کہا کہ آپ نماز پڑھتے ہیں یا نہیں؟ کہا ہاں پڑھتا ہوں۔ کہا اچھا بتلاؤ نماز کے اندر کتنے فرض ہیں؟ اب وہ خاموش ہیں فرمایا جاؤ تم کو نماز کے فرائض کی خبر نہیں جس کا سب سے اول قیامت میں حساب ہوگا۔ اور زائد باتوں کی تحقیق کے درپے ہو۔

ان فضولیات کی تحقیق میں نفس کا کید یہ ہے کہ فرائض وواجبات کی تحقیق میں تو عمل کرنا پڑتا ہے اور عمل دشوار ہے اور فضولیات کے سوال میں لوگ تو اس کو دیندار سمجھیں گے کہ ایسے ایسے باریک سوال کرتے ہیں اور کرنا کچھ پڑتا نہیں۔ اس لئے عام طور سے لوگ فضول سوال کر کے دیندار مشہور ہونا چاہتے ہیں۔ خیر عوام تو جاہل ہیں مگر بعض علماء کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ بھی ایسے سوالات کا جواب دیتے ہیں۔ میں ایسا روگ نہیں پالتا۔

چنانچہ ایک جنٹلمین نے بھی چندروز ہوئے سود وغیرہ کی بابت سوال کیا۔ میں نے کہا میں فلسفی نہیں ہوں۔ اس لئے میرے ذمہ مصالح واسرار وفلسفہ احکام کا بیان کرنا ضروری نہیں صرف خدا رسول کا حکم بیان کرنا میرے ذمہ ہوگا۔ اس لئے میں قال اللہ وقال الرسول کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔

عظمت حق

امام صاحب نے اس احتیاط کی وجہ سے اس مسئلہ میں جواب واضح نہیں دیا۔ بلکہ توقف کے عنوان سے سائل کو سوال لاطائل سے روکنا چاہا۔ دوسرا راز امام صاحب کے ایسے جواب میں یہ ہے کہ

اطفال کا جنتی ہونا اصل میں اخبار احادیث سے ثابت تھا۔ مگر عوام احادیث اور متواتر میں فرق نہیں کرتے اس لئے احتیاط کی اور یہ احتیاط وہ کرے گا جس کو عظمت حق کا ذوق ہو۔ اس سے بڑھ کر دیکھئے ملائکہ وانبیاء علیہم السلام قطعاً معصوم ہیں۔ مگر حالت یہ ہے انبیاء تھراتے ہیں تو جہاں عظمت کا غلبہ ہوگا وہاں احتیاط ضرور ہوگی اس لئے امام صاحب نے اس مسئلہ میں توقف کے ساتھ جواب دیا۔ تاکہ عوام اس پر جزم کر کے بے فکر نہ ہو جائیں اور عشرہ مبشرہ کے بارہ میں توقف اس لئے نہیں فرمایا کہ وہاں جو نصوص ہیں وہ معنیٰ متواتر اور اجماعی ہیں لیکن اب ممکن ہے کہ مسئلہ اطفال بھی ظن سے بڑھ گیا ہو بوجہ انضمام اجماع متاخر کے۔ گو وہ اجماع بھی مختلف فیہ ہو کیونکہ بعض اجماع مختلف فیہ بھی ہیں جیسا اہل علم کو معلوم ہے۔ لہذا اب ہم کو اس پر یقین کر لینا چاہئے کیونکہ اب یہ مسئلہ گویا متفق علیہ ہے۔ دوسرے ہمارا علاج اسی میں ہے کہ ہم بچوں کو معصوم اور بے گناہ سمجھیں کیونکہ ہم لوگ بچوں کے مرنے سے زیادہ دلگیر ہوتے ہیں ہم کو تسلی کی زیادہ ضرورت ہے اور زیادہ تسلی اس میں ہے اب اس کے دلائل سنیئے۔

اولاد اور شفاعت

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے تین بچے مر گئے ہوں وہ اس کے لئے جہنم کی آگ سے آڑ بن جائیں گے۔ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کے دو بچے مرے ہوں، فرمایا وہ بھی۔ پھر کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کا ایک ہی بچہ مرا ہو۔ فرمایا وہ بھی پھر کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ جس کا ایک بھی بچہ نہ مرا ہو۔

قال انا فرط لا متی ولن یصابوا بمثلی (سنن الترمذی: ۱۰۶۲، مسند احمد ۱: ۳۳۵)

فرمایا تو میں اپنی امت کا آگے جا کر سامان کرنے والا ہوں اور میری موت جیسا حادثہ میری امت پر کوئی نہ آئیگا۔

اس لئے ان کے واسطے میری وفات کا صدمہ ہی مغفرت کو بس ہے۔ نفدیک بابا ء ناو امھا تنا یا رسول اللہ۔

فلو ان رب الناس بقی محمدا سعدنا ولکن امرہ کان ما ضیا

"اگر اللہ تعالیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو باقی رکھتے تو یہ ہماری سعادت تھی مگر خدا کا حکم نافذ تھا اس لئے وہ اس جہان سے چلے گئے۔

یعنی میں آگے جا کر اپنی امت کے لئے مغفرت کی سعی وسفارش کروں گا۔

اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ جیسے بے اولادوں کے لئے حضورؐ کی شفاعت کافی ہے۔ایسی ہی اولادوالوں کے لئے بھی کافی تھی اولاد کی شفاعت کی کیا ضرورت تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کو زیادت تسلی کے لئے اس کی ضرورت تھی دو وجہ سے ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو ادب وخوف کے ساتھ شفاعت فرمائیں گے اور بچہ ضد کے ساتھ شفاعت کرے گا۔ یہ بچے جس طرح یہاں والدین پر ضد کرتے ہیں۔قیامت میں اللہ تعالیٰ پر بھی ضد اور نازو نخرے کریں گے چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ بچہ جنت کے دروازے پر جاکر کھڑا ہو جائے گا۔اس سے کہا جائے گا اندر جاؤ کہے گا نہیں جاتے۔ پوچھیں گے کیوں؟ کہے گا جب تک ہمارے ماں باپ ہمارے ساتھ نہ ہوں گے اس وقت تک ہم جنت میں نہیں جاسکتے تو اس سے حق تعالیٰ فرمائیں گے۔

ایھا الطفل المراغم ربه ادخل ابویک الجنة

''اے اپنے پروردگار سے ضد کرنے والے بچے جا اپنے ماں باپ کو بھی جنت میں لے جا۔''

دوسرے عقلا عدد بڑھنے سے زیادہ قوت ہوتی ہے گو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو انضمام ضمیمہ کی ضرورت نہیں۔آپ تنہا ہی اکفی ہیں۔مگر طبعا عدد بڑھنے سے تسلی زیادہ ہوتی ہے۔

نیز حدیث میں آتا ہے کہ جب کسی مسلمان کا بچہ مرتا ہے اور ملائکہ اس کی روح کو لے کر آسمان پر پہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے ارشاد فرماتے ہیں۔

اخذ تم ولد عبدی قالوا اللھم نعم ثم یقول ھل قبضتم ثمرة فؤاد عبدی قالوا اللھم نعم فیقول فماذا قال عبدی قالو اللھم حمدک وصبر فیقول ابنوا العبدی بیتا فی الجنة وسموه بیت الحمد کمال قال.

کیا تم نے میرے بندہ کے بچہ کو لے لیا۔وہ کہتے ہیں اے اللہ ہاں! پھر فرماتے ہیں کیا تم نے میرے بندہ کے جگر گوشہ کو لے لیا وہ کہتے ہیں اے اللہ ہاں!۔ پھر فرماتے ہیں کہ میرے بندہ نے کیا کہا فرشتے عرض کرتے ہیں اے اللہ اس نے آپ کی حمد کی (مراد شکر ہے) اور صبر کیا۔اس پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں (کہ گواہ رہو کہ میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا اور) اس کے لئے جنت میں ایک محل تیار کرو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔

یہ تو چھوٹوں کے مرنے پر وعدہ ہے جس سے ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ بچوں کے مرنے پر نعم البدل عطا فرماتے ہیں۔یعنی مغفرت اور جنت کا محل اور بڑوں کے مرنے پر بھی اسی طرح اجر وثواب کا وعدہ ہے۔

صبر کی ترغیب

حدیث میں ہے: **من اخذت صفية (اى حبيبه) فصبر لم يكن له ثوب الا الجنة.** (لم اجد الحديث فی "موسوعة أطراف الحديث")او كما قال

''حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں جس شخص کے محبوب (اور پیارے) کو لے لوں (جو عام ہے ہر محبوب کو۔ خواہ بڑا ہو یا چھوٹا ہو یا ہمسر ہو جیسے بھائی ہو اور بیوی وغیرہ) پھر وہ صبر کر لے تو اسکا اجر جنت کے سوا کچھ نہیں۔

یعنی وہ جنت میں ضرور پہنچے گا) یہاں نعم البدل کا وعدہ ہے اور جنت سے بہتر نعم البدل کیا ہوگا۔ اسی مضمون کو ایک بدوی نے بہت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے جب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بہت صدمہ ہوا۔ تو بدوی نے آ کر اشعار میں ان کو تسلی دی۔ اشعار تو اہل عرب کی گھٹی میں ہیں۔ بچہ بچہ یہاں تک کہ عورتیں بھی عرب میں شاعر ہوتی ہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بدوی سے بہتر کسی نے تسلی نہیں دی۔ چنانچہ کہتا ہے

اصبر نكن بك صبرين فانما صبر الرعية بعد صبر الراس

''اے ابن عباس! آپ صبر کیجئے تا کہ ہم بھی آپ کی وجہ سے صابر بنیں۔

مطلب یہ ہے کہ آپ مقتدائے دین ہیں۔ آپ کے افعال کا سب اتباع کرتے ہیں۔ پس ایسے حوادث میں آپ صابر رہیں گے۔ تو ہم بھی مصائب میں صابر رہا کریںگے۔ اگر آپ نے صبر نہ کیا تو عوام بھی صبر نہ کریں گے۔

سبحان اللہ! کیسے اچھے عنوان سے صبر کی ترغیب دی۔ آگے کہتا ہے

خير من العباس اجرک بعده والله خير منک للعباس

آپ کے لئے حضرت عباس کے زندہ رہنے سے وہ اجر بہتر ہے جو ان کے وصال پر آپ کو ملا کیونکہ حضرت عباسؓ اگر زندہ رہتے تو بہت سے بہت حضرت عباسؓ آپ کو ملتے اور آپ کے حق میں ثواب ان سے بہت ان سے بہتر ہے کیونکہ ثواب کی حقیقت ہے رضائے خدا۔ تو یوں کہئے کہ حضرت عباسؓ کے وصال پر صبر کرنے سے خدا آپ کو ملا اور یقینا خدا تعالیٰ سب سے بہتر ہیں اور حضرت عباسؓ کے لئے خدا آپ سے بہتر ہے۔ کیونکہ وہ مر کر خدا کے پاس پہنچ گئے اگر نہ مرتے تو دنیا میں رہتے جس میں رؤیت الٰہی نہیں ہو سکتی اور حضرت عباسؓ اگر آج نہ مرتے تو کسی نہ کسی دن ضرور مرتے کیونکہ حرارت غریزیہ کی رفتار

ایک خاص حد پر منتہی ہو جاتی ہے کبھی نہ کبھی ضرور ختم ہوگی خواہ مرض سے ہو یا بدوں مرض کے۔

چنانچہ کانپور میں ایک بوڑھے میاں اسی طرح ختم ہو گئے کہ گھر میں آ کر ماما سے کھانے کو کہا۔ ماما کھانا لے کر آئی تو یہاں بڑے میاں ختم ہو چکے تھے۔ حالانکہ وہ مریض نہ تھے بس وہی بات تھی حرارت غریزیہ اپنی حد پر پہنچ کر ختم ہوگئی تھی۔

اسی طرح مرنے والے کے متعلق یہ سوچے کہ اگر وہ اس وقت نہ مرتا بلکہ زیادہ دن تک بیمار رہ کر صاحب فراش بن کر مرتا تو شاید مبغوض ہو کر مرتا کہ اعزہ بھی گھبرا جاتے اور اس میں بھی اس کا ضرر تھا کیونکہ تم اسکو اس حالت میں یاد نہ کرتے۔ ثواب بھی نہ پہنچاتے۔ کیونکہ ثواب اسی کو پہنچاتے ہیں جسکے مرنے کا صدمہ ہوتا ہے اور جس کے مرنے پر خوشی ہو کہ اچھا ہوا پاپ کٹا۔ اسکو بہت کم یاد کیا جاتا ہے۔

اسی طرح تمہارا بھی نفع اسی میں ہے کہ اپنا عزیز محبوب حالت میں مرے کیونکہ تم اس کو یاد کرتے ہو تو وہ بھی تمہارے واسطے دعا کرتا ہے۔ پس تم کو اس سے نفع پہنچتا ہے اور اس کو تم سے نفع پہنچتا ہے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ فلاں شخص تو عالم اور بزرگ ہیں ان کو ہماری دعا اور ایصال ثواب کی کیا ضرورت ہے تو مرنے کے متعلق یہ نفع عام نہ ہوا۔

عالم ارواح

صاحبو! وہاں چھوٹے بڑے کا حساب نہیں بلکہ وہاں بعض مواقع پر چھوٹے بڑوں کو اور شاگرد استاد کو۔ اور مرید پیر کو بخشوائیں گے اور ہر شخص کو اپنی مغفرت کے لئے چھوٹی چھوٹی باتوں کی تلاش ہوگی۔

چنانچہ ایک شخص گرفتار ہو کر جہنم کی طرف جاتا ہوا ایک ولی کو راستہ میں دیکھ کر پہچانے گا۔ اور کہے گا کہ میں نے فلاں دن آپ کو وضو کرایا تھا آج میری مدد کیجئے یہ سنتے ہی وہ بزرگ اس کی شفاعت کریں گے اور بخشوالیں گے۔

حضرت حاجی صاحبؒ پر یہ حقیقت خوب منکشف تھی۔ اسی لئے حاجی صاحب بیعت میں بہت جلدی فرماتے تھے حضرت کے یہاں قیود و شرائط نہ تھے اور فرماتے تھے کہ ہم تو اس نیت سے بیعت کرتے ہیں کہ یہ دونوں جانب سے دستگیری ہے۔ پس قیامت میں ہم میں اور اس میں جو مرحوم ہوگا وہ مغضوب کو ساتھ لے گا۔ اور عکس کا احتمال ''سبقت رحمتی'' کے خلاف ہے انشاء اللہ دونوں میں سے ایک تو مرحوم ہو ہی گا۔ سبحان اللہ! حضرت کو اپنے مریدوں کے متعلق بھی یہ امید تھی کہ شاید وہی ہم کو بخشوالیں۔

غرض یہ تجارت کیسی عمدہ ہے کہ ہر حالت میں اجر اور نعم البدل ہی ملتا ہے پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ نعم

البدل کے ساتھ آپ کی اصلی چیز بھی آپ کو واپس دیدیں گے۔ کیونکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جتنے اعزہ مرتے ہیں اولاد ہو یا بھائی اور باپ اور بیوی وغیرہ سب کی مفارقت چندروزہ ہے برزخ ہی میں مل جائیں گے۔ اور آخرت میں ملنا تو سب ہی جانتے ہیں۔ یہ واقعات تو اس عالم میں پہنچ کر ہوں گے اور عین موت کے وقت یہ حالت ہوتی ہے کہ ملائکہ مسلمان کی روح قبض کر کے حریر کے ٹکڑے میں عزت کے ساتھ لپیٹ کر لے جاتے ہیں پھر راستہ میں فرشتے باہم جھپنا جھپٹی کرتے ہیں وہ کہتا ہے مجھے دو۔ وہ کہتا ہے کہ اب میں لوں گا۔ پھر آسمانوں کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے ہیں اور تمام فضائے زمین وآسمان اس کی خوشبو سے معطر ہو جاتی ہے۔ پھر آسمان والے اچھے اچھے القاب واسماء سے اس کو یاد کرتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں۔ پھر ارواح انسانیہ اس کا استقبال کرتی ہیں اور بہت عزت کے ساتھ اس کو عالم ارواح میں لے جاتی ہیں۔ اور اس سے باتیں کرتی ہیں۔ جیسے مہمان سے میزبان باتیں کیا کرتا ہے اور ضروری باتیں کر کے زائد سوالات بھی کرتی ہیں کہ فلاں شخص کیسا ہے فلاں کیسا ہے جن میں سے بعض کی نسبت یہ نو وارد کہتا ہے کہ وہ تو مجھ سے پہلے مر چکا ہے کیا وہ یہاں نہیں آیا۔ اس پر سب ارواح افسوس کر کے کہتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم میں گیا یہاں نہیں آیا۔

صاحبو! ان واقعات کو یاد کرو اور سمجھ لو کہ ہمارا عزیز عزت وآسائش میں پہنچا ہے اور جو یہ سمجھے کہ میرا عزیز آسائش میں ہے اس کو رنج کیوں ہو۔

تواضع اور رحم

رہا یہ کہ احتمال تو عذاب کا بھی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال بھی مفید ہے۔ تم اس احتمال سے اس کو ثواب پہنچاؤ اور اس کے بعد امید رکھو کہ ان شاء اللہ بخش دیا گیا۔

رہا یہ کہ احتمال تو پھر بھی رہا کیونکہ ایصال ثواب کے بعد وحی تو نہ آئیگی اور یقین مغفرت اب بھی نہ ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دنیا بامید قائم تو آخرت بھی بامید قائم۔ تم اسباب مغفرت کو جمع کر کے مغفرت کی امید رکھو۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے معاملات میں ظنیات سے بھی تسلی ہو جاتی ہے۔ اور قطعیات سے تسلی تو انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتی۔

صاحبو! تجربہ یہ ہے کہ ان ظنیات ہی سے آپ کو تسلی ہو جائے گی آپ ان باتوں کو دل میں مستحضر کر کے دیکھئے۔ ان شاء اللہ آپ کو اس سے بہت کچھ تسلی ہو گی اور غم ہلکا ہو جائے گا۔

چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ میرا بچہ مر گیا ہے

جس کا مجھے بہت افسوس ہے کوئی ایسی بات سناؤ جس سے میرا غم ہلکا ہو جائے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے ان **الاطفال من دعا میص الجنة**
(لم اجد الحديث في "موسوعة أطراف الحديث")

کہ یہ بچے جو مر جاتے ہیں یہ جنت کے دعامیص ہو جاتے ہیں۔

دعموص ایک کیڑا ہے جو پانی کے اندر ادھر سے ادھر بھاگا پھرتا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ بچے جنت میں ادھر ادھر بھاگے پھریں گے۔ ہر ایک درجہ میں گھستے پھریں گے کہ انکو کوئی روک ٹوک نہ ہوگی جس گھر میں چاہیں گے چلے جائیں گے جیسے یہاں دنیا میں بھی بچے کسی گھر سے نہیں رکتے جس کے گھر میں چاہتے ہیں گھس جاتے ہیں اور ہر جگہ ان کو چاہ ہوتی ہے کیونکہ چھوٹا بچہ تو جانور کا بھی بھلا معلوم ہوتا ہے انسان کا بچہ تو کیوں نہ بھلا معلوم ہوگا۔ ہر شخص کو چھوٹے بچہ پر پیار بھی آتا ہے اور اس کی تکلیف پر رحم بھی آتا ہے حتیٰ کہ بھنگی کے بچہ پر بھی رحم آتا ہے۔

رام پور کا قصہ ہے کہ قاضی سراج الحق صاحب مرحوم کے گھر میں بھنگن کمانے گئی اور اپنے بچے کو باہر دروازہ پر بٹھلا گئی وہ رونے لگا۔ قاضی صاحب باہر بیٹھک میں بیٹھے تھے وہ بچے کے رونے کی آواز سن کر بے قرار ہو گئے اور فوراً اس کو گود میں اٹھا لیا اور اس کو بہلاتے رہے۔ لوگ بھنگیوں کے بچوں کو گود میں لینے سے اپنے کپڑوں اور بدن کو ناپاک سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ خشک بچہ کو گود میں لینے سے نہ[1] ہمارا بدن ناپاک ہوتا ہے۔ ہاں اگر بھیگا ہوا ہو اور غالب گمان یہ ہو کہ اسکے کپڑوں کو اور بدن پر نجاست لگی ہوئی ہے تو بے شک اس سے جسم اور لباس کے ناپاک ہو جانے کا احتمال ہے۔ مگر یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ ایک لوٹا پانی سے سب پاک ہو سکتے ہیں۔ مگر عام طور پر کوئی بھنگیوں کے بچوں سے لوگ گھن کرتے ہیں۔ اس لئے قاضی صاحب نے واقعی یہ بڑا کام کیا۔ ان کو بہت اجر ملا ہوگا ہم جیسوں سے تو ایسا نہ ہوسکتا۔ مگر جس سے یہ کام ہو سکے اسکو بڑا ثواب ملے گا کیونکہ اللہ اس میں تواضع بھی ہے اور انسان کے بچہ سے ہمدردی بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کو تواضع و رحم یہ دو صفتیں بہت محبوب ہیں یہ تو آخرت کا نفع ہے اور دنیا کا نفع یہ ہے کہ وہ

---

[1] اس تعلیم اسلامی میں غور کرنا چاہئے کہ اسلام نے کسی قوم کی چھوت چھات سے مسلمانوں کو ناپاک نہیں بتایا۔ بخلاف دوسرے مذاہب کے کہ ان کے یہاں چھوٹی قوموں کو ہاتھ لگ جانا سخت وبال کا سبب ہے کہ ان کا دھرم خراب ہو جاتا ہے گویا وہ انسان کو کتے اور سور سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔ ۱۲ ظ

بھنگن[1] تو قاضی صاحب کی جان نثار ہوگئی ہوگی۔ جب تم اپنی چھوٹی قوموں کی اولاد سے ایسی ہمدردی کروگے تو وہ ہروقت تمہاری خدمت کے لئے جان ودل سے حاضر رہیں گے۔

تو جس طرح یہاں پر بچے ہر شخص کو محبوب ہیں اور ہر ایک کو ان پر رحم آتا ہے اور کسی گھر سے ان کو روکا نہیں جاتا اسی طرح جنت میں یہ بچے جہاں چاہیں گے بھاگے بھاگے پھرینگے۔

سو ان حالات کو سوچ کر تسلی حاصل کرو۔ جیسا کہ راوی کہتے ہیں کہ یہ حدیث سن کر حالانکہ خبر واحد تھی جو ظنی ہوتی ہے مجھے بہت تسلی ہوئی کہ سارا غم جاتا رہا۔

اب تو ہماری حالت یہ ہے کہ ہم لوگ صرف ایک پہلو دیکھتے ہیں کہ ہائے بچہ مرگیا۔ دوسرے پہلو کو نہیں دیکھتے کہ وہ مرکر کہاں اور کس حالت میں گیا۔ ان باتوں کو سوچو تو ضرور غم ہلکا ہوجائیگا۔

آخرت کا نعم البدل

اور سنئے حدیث میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو صحابہ کو غیب سے اس طرح تسلی دی گئی۔

ان فی اللہ عزاء من کل مصیبة وخلفا من کل فائت فبا اللہ فثقوا وایاہ فارجوا فانما المحروم من حرم الثواب (اتحاف السادۃ المتقین ۵: ۱۱۴)

"کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر مصیبت سے تسلی کیلئے کافی ہے اور ہر فوت ہونیوالی چیز کا عوض ہیں اسی پر بھروسہ رکھو اور اسی سے امید رکھو۔ کیونکہ محروم تو وہ ہے جو ثواب (یعنی رضائے حق) سے محروم رہے۔"

صاحبو! یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ تمہارے عزیز کے بدلے تم کو خدا ملتا ہے پس اب تو ایسے موقع پر یوں کہنا چاہئے ؎

روز ہا گر رفت گو رو باک نیست　　　تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

اگر دن ختم ہوگئے تو کیا ڈر ہے۔ اللہ تعالیٰ موجود ہے تیرے سوا کون پاک ہے۔

کیا اس سے بھی آپ کی تسلی نہ ہوگی کہ آپ کو اپنے عزیز کے بدلہ میں خدا مل جائے جس کی جنت بھی ہے اور دوزخ بھی ہے۔ یقیناً جنت کے ملنے سے خدا کیا ملنا بدرجہا بہتر ہے۔

---

[1] ذرا مخالفین اسلام اس موقع میں غور کریں اور بتلائیں کہ کیا کوئی برہمن اور پنڈت اور اعلیٰ ہندو ذات کا آدمی بھی ایک بھنگن کے بچہ کو گود میں اٹھا سکتا ہے اور اس کے ساتھ اپنی اولاد جیسا برتاؤ کرسکتا ہے ہرگز نہیں۔ پھر حیرت ہی نہیں کہ اب بھی یہ لوگ مسلمانوں کو بے رحم اور اپنے کو رحمدل کہتے ہیں۔ بخدا مسلمانوں سے زیادہ رحمدل کوئی قوم نہیں ہوسکتی۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آ گئی کہ ہارون رشید جو مسلمانوں کا بڑا بادشاہ اور خلیفہ تھا۔ عید کے دن جشن کیا اور یہ اعلان کر دیا کہ دربار میں جتنی چیزیں موجود ہیں اس میں سے جس چیز پر جو شخص ہاتھ رکھ دیگا وہ اسی کی ہو جائے گی۔ درباریوں نے اس اعلان کے بعد ہاتھ رکھنا شروع کر دیا۔ کسی نے جواہرات پر ہاتھ رکھا کسی نے سونے چاندی پر۔ ایک باندی نے جو ہارون رشید کو پنکھا جھل رہی تھی۔ خلیفہ کی کمر پا ہاتھ رکھ دیا۔ خلیفہ نے اس حرکت پر برہم ہر کر سوال کیا کہ یہ کیا حرکت ہے کہا حضور کا اعلان عام تھا کہ جو جس پر ہاتھ رکھ دے وہ اسی کی ہے۔ اس میں کوئی استثنا نہ تھا تو میں نے دیکھا کہ یہ درباری بے وقوف ہیں جو سونے چاندی اور جواہرات پر ہاتھ رکھ رہے ہیں تو میں نے سوچا کہ ایسی چیز پر ہاتھ رکھنا چاہئے جس کے ہاتھ میں سب چیزیں ہیں اس لئے میں نے حضور پر ہاتھ رکھ دیا کہ جب آپ میرے ہوں گے تو سب چیزیں میری ملک ہو جائیں گی۔

اس جواب کو سن کر ہارون بہت خوش ہوئے اور (فرمایا کہ میں تیرا ہو گیا) واقعی باندی بہت سمجھ دار تھی تو بتلایئے ان واقعات مصیبت میں کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ ان کے ذریعہ سے خدا ہم کو ملتا ہے جس کی جنت ہے اور دوزخ بھی۔

شاید کسی کے دل میں یہ وسوسہ آیا ہو کہ دوزخ ہماری ہو گئی تو کیا نفع ہوا۔ کیا ہم دوزخ میں رہیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ افسوس آپ نے بات کو سمجھا ہی نہیں دنیا میں جیل خانہ بادشاہ کی ملک ہوتا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ بادشاہ جیل خانہ میں رہتا ہے۔ اس کا یہ طلب ہرگز نہیں ہوتا۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم جس کو چاہو گے بخشوالو گے اور جہنم سے نکلوالو گے۔

اس پر شاید آپ یہ کہیں کہ کیا کفار کو بھی بخشوالیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ جس کے تعلق سے جہنم بواسطہ آپ کی ملک ہوتی ہے۔ جب وہ کفار کو بخشا چاہیں گے تو تم بھی نہ چاہو گے۔ یہ تو آخرت کا نعم البدل تھا۔

اب یہ سمجھئے کہ دنیا میں بھی ہر فوت ہونے والی چیز کا نعم البدل ہم کو عطا ہوتا ہے خواہ مال و اولاد فوت ہو یا کوئی عزیز و قریب۔ چنانچہ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصیبت کے وقت کے لئے ہم کو دعا تعلیم فرمائی۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اللهم عند ک احتسب مصيبتى فاجرنى فيها وابدلنى بها خيرا منها. (سنن ابی داؤد:۳۱۱۹)

''اے اللہ! میں آپ سے اس مصیبت کا ثواب مانگتی ہوں۔ پس مجھے اس کا اجر عطا فرمایئے اور اس کا نعم البدل دیجئے۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ جب میرے شوہر ابو سلمہؓ کا انتقال ہوا تو میں نے یہ دعا پڑھی مگر وابدلنی بھا خیرا منھا کہتے ہوئے دل رکتا تھا کیونکہ میں اپنے دل میں یہ کہتی تھی کہ ابو سلمہ سے بہتر کون ہوگا اور حضورؐ کے ملنے کا وہم بھی نہ ہوتا تھا کیونکہ

آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے دل پر جبر کر کے یہ بھی کہا تو خدا تعالیٰ نے مجھے ابو سلمہ کے عوض حضورؐ عطا فرمائے۔

تجارت آخرت

اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت کی حقیقت تجارت ہے کہ ایک چیز لی گئی اور دوسری چیز دی گئی۔ نصوص میں تجارت پر صاف اشارات موجود ہیں اسی لئے اعمال کا وزن ہوگا جیسا تجارت میں وزن ہوا کرتا ہے اور جب وہاں اعمال بھی جو کہ اعراض ہیں اعیان بن جائیں گے جیسا کہ وزن کا مقتضی ہے تو اعیان تو اعیان ہی ہیں۔ اور مصائب کے بارہ میں لفظ اخذ و اعطاء و ابدال وارد ہے۔ یہ بھی معنی تجارت پر دال ہے اور تصدق اموال میں لفظ...... اقراض اور بذل نفس مال میں لفظ اشتری وارد ہے۔ غرض جو چیز بھی ہمارے ہاتھ سے جاتی ہے اس کا عوض اور نعم البدل ہم کو ملتا ہے۔ اعمال کے متعلق مجھے ایک اور نص یاد آ۔ جس میں لفظ ایتاء بمعنی اعطاء ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ

''اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اس حالت میں کہ ان کے دل لرزاں و ترساں ہوتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف واپس جانیوالے ہیں۔ یہ لوگ بھلائی میں ترقی کرتے اور اس کی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو گناہ کر کے ڈرتے ہیں فرمایا نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو تصدق اور صلوٰۃ اور صیام بجالا کر ڈرتے ہیں کہ شاید قبول نہ ہوں اور خدا کے سامنے جا کر ہم کو شرمندگی ہو (وہاں یہ کہا جائے کہ تم نے کیسا عمل ہمارے یہاں بھیجا)

حضرت عائشہؓ کے سوال سے یہ معلوم ہوا کہ اس آیت میں یؤتون اعطاء مال کے ساتھ

خاص نہیں۔ بلکہ ہر عمل کو شامل ہے جبھی تو انہوں نے اس کو اعمال گناہ پر محمول کیا۔ اور بعض لوگوں نے اس میں یوں کہا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے سوال یاتون کی قرأت کے متعلق کیا ہے جو بمعنی یفعلون ہے اس صورت میں ایتاء سے استدلال ثابت نہ ہوگا کیونکہ ترمذی کی حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ یوتون کے متعلق سوال کیا۔ اور قرأت شاذہ بوجہ شذوذ کے ثابت نہیں اور یہ حدیث صحیح ہے پس صحیح کو غیر صحیح پر محمول نہیں کر سکتے اور اس کو مان بھی لیا جاوے۔ تب بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفسیر عام ہونا ضروری ہے ورنہ شاذ کا مفسر اور متواتر کا غیر مفسر رہنا لازم آوے گا۔ تو اس تفسیر کا تعلق ایتاء سے بھی ہوگا۔ پس یہ استدلال باقی رہا۔ جب یہ ہے تو آیت میں ایتاء بمعنی ایتاء مال نہیں ہے۔ بلکہ بمعنی ایتاء الوجود[1] ہے جس کا حاصل ایجاد ہے۔

معنی یہ ہوئے کہ وہ جس عمل صالح کو وجود دیتے ہیں اس کو کر کے ڈرتے رہتے ہیں کہ دیکھئے قبول ہوا یا نہیں بے فکر نہیں ہو جاتے تو یہاں لفظ ایتاء بمعنی اعطاء ہے جو تجارت کے مناسب ہے۔

یہ ہیں وہ نصوص جن سے اعمال و احوال کا تجارت ہونا معلوم ہوتا ہے ان ہی میں سے ایک وہ آیت بھی ہے جس کو میں نے تلاوت کیا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ

"ان قیدیوں سے فرما دیجئے کہ اگر تمہارے دلوں میں خیر ہوگی۔ (یعنی ایمان) تو اللہ تعالیٰ تم کو اس سے بہتر چیز دیں گے جو تم سے لی گئی ہے۔

یہاں بھی نقصان مال پر نعم البدل کا وعدہ ہے جس کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ مومن کو ہر نقصان کا عوض اور نعم البدل ملتا ہے اور ان نصوص مذکورہ پر نظر کر کے ہم کو اس نص اخیر کی تعلیم کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ دوسری نصوص سے تعلیم ثابت ہے گو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مما اخذ منکم میں ما عام ہے مال کو اور غیر مال کو جس میں سب اعمال اور اعیان داخل ہیں خصوصاً جبکہ قاعدہ فقہیہ یہ ہے کہ اعتبار عموم نص ہے خصوص مورد کا اعتبار نہیں مگر مجھے خود اس قاعدہ ہی کے عموم میں کلام ہے۔ اسلئے میں اس آیت پر تعمیم کا مدار نہیں کرتا بلکہ مجموعہ نصوص کے اعتبار سے اس مضمون کو عام کرتا ہوں۔ مگر اس کی تلاوت اس لحاظ سے ہوئی ہے کہ ایک مناسب

---

[1] فالا یتاء علی ھذا عام لکل عمل کعمومہ فی قولہ تعالیٰ ثم سئلوا الفتنۃ لا توھا ای لا خذ بھا ولبا شرو ھا ولا یتوقف العموم علی قرائۃ یاتون ما اتو من الاتیان واسھل التوجیھات فیھا ان یکون یاتون تفسیراً لیئو تون قطنۃ قراءۃ.

سے دوسرے مناسب کی طرف اشارہ کرنا ابلغ ہے اور تمام نصوص کا پڑھنا دشوار تھا۔ بلکہ کسی ایک کا اختیار ضروری تھا جس کے لئے وجہ مرجح میں نے بالکل تمہید کے شروع میں بیان کر دی۔

میزان عمل

خلاصہ یہ کہ معاملات تشریعیہ کا تجارت ہونا تو ظاہر ہے کہ ایک عمل ہم نے پیش کیا ادھر سے اس کی قیمت مل گئی مگر اس کے علاوہ ہمارے ساتھ جس قدر معاملات تکوین ہمیں بھی ہوتے ہیں ان سب کی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر غم بہت ہلکا ہو جائے گا۔ باقی طبعی غم کا میں انکار نہیں کرتا۔ وہ تو ہوگا اور ہونا چاہئے کیونکہ اسی کی وجہ سے اجر ملتا ہے اور اس سے شان عبدیت ظاہر ہوتی ہے اگر انسان پر رنج وغم وارد نہ ہو تو فرعون بے سامان ہو جائے گا مگر ضرورت اس کی ہے کہ اس غم کو ہلکا کیا جائے کیونکہ غم کا بڑھنا خود مصیبت ہے جس سے راحت فوت ہونے کے علاوہ بعض اوقات جو اصل دولت ہے اجر۔ وہ بھی ضائع ہو جاتی ہے اور غم ہلکا ہونے کی وہی تدبیر ہے جس کا ذکر ہو رہا ہے یعنی جب انسان یہ سمجھے گا کہ ہر معاملہ میں حق تعالیٰ مجھ کو نعم البدل عطا فرماتے ہیں تو غم ہلکا ہو جائے گا پھر وہ نعم البدل بھی اس قدر ہے کہ اس کا اندازہ لگانا دشوار ہے اور مصائب پر صبر کرنا تو نہایت دشوار عمل ہے۔ اس پر تو وہ غیر متناہی ملے تو کیا عجب ہے جس پر آیت : اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ مستقل رہنے والوں کا صلہ بے شمار ہی ملے گا۔

میں متنبہ بھی فرمایا ہے وہاں تو خفیف خفیف عمل پر بھی بے اندازہ اجر مل جاتا ہے چنانچہ حدیث ترمذی میں ہے کہ ایک بار اللہ اکبر کہنے سے آسمان و زمین کی درمیانی فضا بھر جاتی ہے اور سبحان اللہ کہنے سے آدھی میزان عمل اور الحمد للہ سے پوری میزان عمل بھر جاتی ہے۔

یہ اس لئے فرمایا کہ شاید کسی کو اللہ اکبر کا ثواب سن کر یہ احتمال ہو کہ نہ معلوم میزان عمل بھی کسی چیز سے بھری ہوگی۔ کیونکہ ممکن ہے وہ آسمان و زمین کی فضا سے بھی زیادہ ہو تو ایک عمل سے اگر فضا بھی بھر جاتا ہے تو ممکن ہے وہ آسمان و زمین بھرنے کے لئے کافی نہ ہو اور ہم کو سابقہ پڑے گا میزان ہی سے۔ خصوص طالب علموں کو ایسے احتمالات بہت ہوتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک تو کٹورا بھی حوض کے برابر ہو سکتا ہے۔

دور قدیم کے طلباء

جیسا ایک حکایت ہے کہ ایک بادشاہ و وزیر میں گفتگو ہو رہی تھی۔ باشاہ کہتا تھا کہ طلباء عربی بہت عاقل ہوتے ہیں وزیر کہتا تھا کہ ان سے بڑھ کر بیوقوف کوئی نہیں۔ اتفاق سے ایک طالب علم جوتیاں

چٹخاتے خستہ حال سامنے سے گزرے بادشاہ نے ان کو بلایا اور وزیر سے کہا کہ ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔ دیکھو یہ طالب علم اتفاق سے میرے سامنے آ گیا میں نے اس کو انتخاب کر کے نہیں بلایا۔ اب میں اس کی عقل کا امتحان کر کے تم کو دکھلاتا ہوں کہ عربی طلبا کیسے عاقل ہوتے ہیں۔ طالب علم کو بادشاہ نے عزت سے بٹھلایا اور سامنے ایک حوض تھا۔ اس کی طرف اشارہ کر کے اول وزیر سے سوال کیا۔ کہ بتلاؤ اس میں کتنے کٹورے پانی کے آ سکتے ہیں۔

وزیر نے کہاں بدوں شمار کے اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ حوض کو خالی کیا جائے اور کٹورہ بھر بھر کر پانی اس میں ڈالا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کتنے کٹورے پانی آ سکتا ہے۔

بادشاہ نے اس کے بعد طالب علم صاحب سے دریافت کیا کہ مولانا آپ بتلائیں کہ اس میں کتنے کٹورے پانی آ سکتا ہے طالب علم نے کہا کہ یہ سوال مہمل ہے۔ پہلے کٹورا تو متعین ہونا چاہئے کہ وہ کٹورا کتنا بڑا ہے اگر کٹورا حوض کے برابر ہے تو ایک کٹورا پانی آ سکتا ہے اگر اس سے آدھا ہے تو دو کٹورے، اگر تہائی ہے تو تین، اگر سواں حصہ ہے تو سو کٹورے اگر ہزارہواں حصہ ہے تو ایک ہزار کٹورے۔ اور اگر لاکھواں حصہ ہے تو ایک لاکھ کٹورے۔ غرض جو نسبت مساحت میں حوض کے کٹورے کو ہو گی اسی نسبت سے اس میں کٹورے آسکیں گے۔ اس لئے اول کٹورا متعین کرنا چاہئے اس کے بعد سوال کرنا چاہئے۔

بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ اب انصاف کی بات تو یہ ہے کہ تم قلم دان وزارت اس طالب علم کے حوالے کر دو اور خود جا کر طالب علمی کرو۔ مگر تمہارے خاندان میں وزارت چلی آ رہی ہے اس لئے معاف کرتا ہوں اور تم کو اس عہدہ پر بحال کرتا ہوں۔ اسکے بعد مولوی صاحب سے کہا کہ مولانا آپ کو بہت تکلیف دی گئی معاف کیجئے گا اب آپ جا سکتے ہیں۔

وہ سلام کر کے چلتے ہوئے اور ان کے دل میں وزارت کی ذرا بھی ہوس پیدا نہ ہوئی حالانکہ بادشاہ ان کی قابلیت وزارت کو تسلیم کر چکا تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں طلباء کو دنیا کی ہوس نہ تھی۔ طلباء اس زمانہ میں سب صوفی ہوتے تھے۔ اسی لئے پہلے زمانہ میں خانقاہوں کی اور تعلیم تصوف کی ضرورت نہ تھی کیونکہ سب ماں کے پیٹ سے صوفی ہی پیدا ہوتے تھے اور ان کا وہی مذاق ہوتا تھا جو حضرت غوث اعظمؒ کا اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ملک سنجر...... بادشاہ ملک نیمروز نے آپ کے مصارف کے لئے آپ کو ایک معتد بہ حصہ ملک کا پیش کرنا چاہا۔ آپ نے رباعی میں جو لکھا

؎ چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد   در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم

زانکه یافتم خبر از ملک نیم شب　　　　منٗ ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

''سنجر کے جھنڈے کی طرح میرے بخت کا منہ کالا ہوا اگر میرے دل میں ملک سنجر کی آرزو ہو جب سے مجھے آدھی رات کو اٹھنے کا چسکا لگا۔ ملک نیمروز کو میں ایک جو کے بدلے بھی نہیں خریدتا۔''

ایک عالم کی حکایت رسالہ القاسم دور قدیم میں لکھی تھی کہ وہ خدمت دین میں مشغول رہا کرتے تھے کسب معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ایک نانبائی آپ کا معتقد تھا۔ اور جان نثار تھا۔ اور ایسے شخص سے مانگ کر کھانا بھی جائز ہے اس سے آپ نے کہہ رکھا تھا کہ بھائی جب کبھی ہم کو بھوک ستائے گی ہم بے تکلف تمہارے پاس آجایا کریں گے مگر ایک شرط ہے وہ یہ کہ ہمارے سامنے وہ ٹکڑے رکھ دینا جو مسافروں کے آگے سے بچ جاتے ہیں۔ اگر سالم روٹی دو گے تو ہم نہ کھائیں گے۔

نانبائی نے اس خیال سے یہ شرط منظور کرلی کہ اس کے خلاف میں مولانا کو تکلیف ہوگی اور ٹکڑوں سے بھی رہ جائیں گے چنانچہ جب بھوک لگتی۔ مولوی صاحب اس کی دکان پر پہنچ جاتے اور وہ مسافروں کے سامنے کے ٹکڑے بچے ہوئے ان کے آگے رکھ دیتا۔ انکو پانی میں بھگو کر کھا لیتے اور پھر علمی...... مشغلہ میں مشغول ہوجاتے۔

اتفاق سے ایک دن جو گئے تو نانبائی نے کہا کہ آج تو ٹکڑے نہیں ہیں یا تو مسافروں نے ٹکڑے چھوڑے نے نہیں یا کوئی بہت کھانے والا آگیا ہوگا جو ٹکڑے بھی کھا گیا۔ تو مولوی صاحب خوش خوش فرماتے ہوئے واپس آگئے

تِلْکَ اِذًا کَرَّةٌ خَاسِرَةٌ کہ آج کی واپسی تو بڑے خسارہ کی ہوئی

''آپ کو فاقہ میں بھی لطیفہ سوجھا کیونکہ قرآن سے اقتباس کرنا تو لطائف میں سے ہے۔''

طلباء کی حکایتیں اس قسم کی بہت سی ہیں۔ ایک حکایت تو والد صاحب سے سنی ہے کہ طلباء ایک گھڑا بنالیا کرتے تھے جس کا منہ تنگ کردیا کرتے۔ جو خط گھر سے آتا اس کو بغیر دیکھے پڑھے گھڑے میں ڈال دیتے۔ اسی طرح برابر گھڑے میں خطوط ڈالتے رہتے۔ یہاں تک کہ جب ساتھ آٹھ سال میں علم سے فارغ ہوتے اس وقت وہ گھڑا توڑا جاتا۔ اور تمام خطوط پڑھتے۔ کسی میں رنج کی خبر ہوتی تو اس کو دیکھ کر رو لیتے۔ کسی میں خوش خبری ہوتی اس کو دیکھ کر ہنس لیتے۔

گہ گریم و گہ خندم دیوانہ چنیں باشد

کبھی روتا ہوں کبھی ہنستا ہوں دیوانے ایسے ہیں ہوتے ہیں۔

ایک حکایت اور سنی ہے کہ ایک دن ایک طالب علم کے پاس تیل نہ تھا تو وہ بڑے پریشان ہوئے۔ اتفاق سے اسی وقت ایک رئیس کا جلوس نکلا جس میں مشعلیں اور فانوس وغیرہ بہت روشن تھے۔ آپ کتاب ہاتھ میں لے کر اس جلوس کے ساتھ ہو لئے اور مطالعہ کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جلوس رئیس کے محل تک پہنچا۔ آپ بھی اس کے ساتھ محل میں چلے گئے۔ خدام نے روکنا چاہا مگر رئیس نے منع کر دیا۔ یہاں تک کہ روشنی کے فانوس وغیرہ خاص آرام کے کمرہ میں پہنچے۔ آپ وہاں بھی چلے گئے اور ایک تخت پر بیٹھ کر کتاب دیکھتے رہے اور ایسے مستغرق تھے کہ نہ کسی عورت کی طرف نظر اٹھائی نہ باندی کی طرف۔

رئیس ان کے اس استغراق پر محو ہو گیا۔ جب مولوی صاحب مطالعہ سے فارغ ہوئے اس وقت ہوش آیا اور کتاب بند کر کے ادھر ادھر دیکھ کر گھبرا گئے کہ میں کہاں آ گیا اور کس طرح آ گیا۔

رئیس نے ان کی پریشانی دیکھ کر عرض کیا کہ مولانا آپ ذرا پریشان نہ ہوں آپ نے تو مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ واقعی علمی شوق اسی کا نام ہے جو آپ کے اندر دیکھا۔ اب میری درخواست یہ ہے کہ آپ میرے ہی غریب خانہ پر مقیم رہیں یہیں کھانا کھایا کریں۔ میں آپ کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھوں گا۔ مولوی صاحب بولے کہ میں اس قید کو پسند نہیں کر سکتا۔ میں آزاد رہنا چاہتا ہوں۔ ہاں البتہ مجھے اس کی تکلیف ہے کہ بعض دفعہ میرے پاس تیل نہیں ہوتا جس سے مطالعہ کا حرج ہوتا ہے اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے پس اگر آپ اتنا کر دیں تو عنایت ہوگی کہ کسی بنیے سے کہہ دیجئے کہ جب میں تیل لینا چاہوں تو مجھے تیل دے دیا کرے اور آپ کے حساب میں دام لکھ دیا کرے مجھ سے داموں کا مطالبہ نہ کیا کرے اس سے زائد کی مجھے ضرورت نہیں چنانچہ رئیس نے تیل کا انتظام کر دیا۔ ایسے ہی لوگوں کی بابت کوئی بزرگ فرماتے ہیں۔

خاکساراں جہاں را بحقارت منگر　　　　تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

دنیا کے خاکساروں کو حقارت سے نہ دیکھ تو کیا جانتا ہے کہ اس گرد میں شاید کوئی سوار ہو۔

اور شیرازی فرماتے ہیں۔

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں　　　　کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

میں میکدے کا گدا ہوں لیکن مسی کے وقت آسمان پر ناز اور ستاروں پر حکم چلاتا ہوں۔

صحیح استغراق

اسی طرح کا ایک قصہ استغراق کا حضرت شبلیؒ کا ہے کہ ایک دن وہ حضرت جنیدؒ کے گھر میں

بلا اطلاع گھس گئے۔ حضرت جنیدؒ کی بیوی پردہ کے خیال سے اٹھنے لگیں۔ حضرت جنیدؒ نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا اور کہا ان سے پردہ کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ اس وقت اپنے حواس میں نہیں چنانچہ وہ دیر تک[1] بیٹھے ہوئے ہنس ہنس کر مقامات میں گفتگو کرتے رہے اور حضرت جنیدؒ اپنی بیوی کو اٹھنے سے روکتے رہے یہاں تک کہ کسی بات پر حضرت شبلیؒ پھوٹ کر روئے تو حضرت جنیدؒ نے بیوی کو اشارہ کیا کہ اب چلی جاؤ۔ اب ان کو ہوش آ گیا ہے۔

تو بعض دفعہ استغراق ایسا قوی ہوتا ہے جس میں صاحب استغراق کو مطلق خبر نہیں ہوتی کہ یہاں کوئی عورت بھی ہے یا نہیں۔ مگر اسکا پہچاننا حضرت جنیدؒ جیسوں کا کام ہے۔

تو ایک زمانہ میں تو طلباء کی یہ حالت تھی اور اب یہ حالت ہے کہ ایک طالب علم نے میرے ایک دوست رئیس کو خط لکھا کہ میں عربی پڑھنا چاہتا ہوں اور گھر سے بوجہ تنگی کے خرچ نہیں آ سکتا۔ آپ میرے لئے پندرہ روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر دیجئے۔ اس کے ساتھ ہی میرے نسبت یہ بھی لکھ دیا کہ اس نے مجھ کو یہ مشورہ دیا ہے وہ صاحب بہت عاقل ہیں۔ خدا مال دے تو اس کے ساتھ عقل بھی دے انہوں نے وہ خط میرے پاس بھیج دیا کہ اس شخص کے متعلق کیا رائے ہے میں نے لکھا کہ اس کذاب کو ایک پیسہ نہ دیا جائے وہ کبھی کبھی میرے پاس بھی آتے ہیں۔ میں اس کی خبر لوں گا۔ مگر وہ خط بہت دنوں سے میرے پاس رکھا ہوا ہے اب تک تو وہ صاحب آئے نہیں۔ یا تو ان کو جواب نہ جانے سے شبہ ہو گیا کہ واقعہ کی مجھے اطلاع ہو گئی یا ان صاحب نے لکھ دیا کہ اس نے آپ کی امداد سے منع کر دیا ہے اس لئے معذوری ہے (یا اس شخص نے دوسرے طلباء کے ذریعہ سے خانقاہ میں اس خط کے متعلق تذکرہ سن لیا) اس لئے انہوں نے آنا ہی بند کر دیا۔

میں کٹورہ والے طالب علم کا ذکر کر رہا تھا۔ غرض جب طلباء کے نزدیک کٹورہ بھی حوض کے برابر ہو سکتا ہے تو میزان عمل ان کے نزدیک زمین و آسمان سے بڑا ہو تو کیا بعید ہے کیونکہ میزان عمل تو اللہ تعالیٰ کی میزان ہے اس لئے حضورؐ نے شبہ کو رفع کرنے کے لئے فرمایا کہ:

الحمد لله يملا الميزان الحمدللہ سے میزان عمل بھر جاتا ہے

(مسند احمد ۵:۳۶۵، سنن الدارمی: ۱:۱۶۷)

اب وہ شبہ رفع ہو گیا کہ شاید میزان خالی رہے۔

---

[1] فكان داخلاً في غير اولى الاربة من الرجال فلا يصح قياسه على الاعمى وقدامر بالحجاب عنه في قوله صلى الله عليه وسلم افعميا وان انتما لكون الاعمى من اولى الاربة يميل اليه النساء وهويشعر بمكانهن ايضاً بالحدس والقول وصوت الحلى فيميل بقلبه اليهن بخلاف المستغرق فانه ح كالحيوان او كا الطفل الذين لا يشتهى. ۱۲ظ۔

تاویل کا دروازہ

اس پر شاید کسی کو یہ وسوسہ ہو کہ بس اب نماز روزہ کی کیا ضرورت ہے ایک بار الحمد للہ کہہ لینا کافی ہے۔ بڑا قصہ تو میزان عمل کا ہے وہ تو اس سے بھر ہی جائے گا۔

جیسے ایک طالب علم نے گاؤں میں جا کر وعظ کہا اور یہ کہا کہ بے نمازی سور کتے کے مثل ہیں اس جملہ پر گاؤں والوں کو جوش آ گیا اور سب نے چڑھائی کر کے مولوی صاحب کو مارنا چاہا۔ میزبان نے یہ رنگ دیکھ کر مولوی صاحب سے کہ آج خیر نہیں لوگ آپ پر چڑھائی کر کے آ رہے ہیں کہا کیوں؟ کہا! آپ نے وعظ میں بے نمازیوں کو سور کتا بنایا تھا، بولے بس اتنی بات پر چڑھائی کر رہے ہیں کہا ہاں جی کہنے لگے تم بے فکر رہو۔ میں ابھی سب کو ٹھنڈا کئے دیتا ہوں۔ یہ تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ واقعی یہ تاویل کا دروازہ کھلا رہے تو بات کا بدلنا کچھ بھی مشکل نہیں چنانچہ گاؤں والے آئے اور مولوی صاحب پر حملہ کرنا چاہا۔ انہوں نے پوچھا کہ بھائی آخر میری کچھ خطا بھی ہے؟ کہا اس سے بڑھ کر کیا خطا ہوگی کہ تم نے ہم کو سور کتا بنایا۔ کہا میں نے تم کو نہیں کہا تھا۔ بلکہ بے نمازیوں کو کہا تھا۔ گاؤں والوں نے کہا پھر ہم بھی تو بے نمازی ہیں۔ مولوی صاحب بولے ہرگز نہیں تم بے نمازی کیوں ہوتے۔ بتلاؤ کیا تم نے کبھی نئے کپڑے پہن کر آخری جمعہ کی نماز نہیں پڑھی بولے جی ہاں۔ آخری جمعہ کی نماز پڑھ لی ہے کہا اور عید بقرعید کی نماز۔ بولے وہ بھی پڑھتے ہیں کہا پھر تم بے نمازی کدھر سے ہوئے بے نمازی تو وہ ہے جو ایک دفعہ بھی عمر بھر میں خدا کے سامنے نہ جھکا ہو بس اس جواب سے سب خوش ہو گئے۔

تو جیسے اس طالب علم نے عید بقرعید کی نماز سے گاؤں والوں کو نمازی ...... بنا دیا تھا۔

میزان گناہ وثواب

ایسے ہی شاید کوئی نہ سمجھے کہ سبحان اللہ، الحمد للہ سے میزان عمل تو بھر ہی جائے گا پھر اور عمل کی کیا ضرورت۔ اسکے دو جواب میں ایک الزامی، ایک تحقیقی۔ الزامی جواب تو یہ ہے کہ سبحان اللہ! الحمد للہ سے میزان کا ایک پلہ ہی تو بھرے گا (کیونکہ اگر وہ بھی بھر گیا تو آپ جنت میں نہ جا سکیں گے۔ بلکہ اعراف میں رہیں گے۔ اور اگر وہ بہت زیادہ بھر گیا کہ اعمال صالحہ کے پلے سے بھی بھاری ہو گیا تو جہنم میں جانا پڑے گا۔ اس لئے دوسرے پلہ کی فکر بھی لازم ہے جس میں گناہ رکھے جائیں گے اور ترک صلوٰۃ وترک صیام وترک زکوٰۃ وترک حج یہ سب معاصی ہیں۔ اگر گناہوں کا

پلہ بھاری ہو گیا تو نیکیوں کا پلہ بھر جانے سے کیا ہوگا۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سبحان اللہ والحمد للہ کا ثواب بیان فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کلمات کی یہ خاصیت ہے یہ ایسا ہے جیسے طبیب یہ کہے کہ بنفشہ میں یہ خاصیت ہے کہ وہ دماغ کا تنقیہ کرتا ہے اور مواد مفاسد کا دفع کرتا ہے۔ مگر سب جانتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب تک اس کے ساتھ کوئی مضر شے استعمال نہ کیا جائے جو اس کی خاصیت کو باطل کر دے۔ اب اگر کوئی سنکھیا کھا کر بنفشہ پی لے تو بتلایئے بنفشہ سے کیا خاک نفع ہوگا۔ اور اگر اس صورت میں بنفشہ کی خاصیت کا ظہور نہ ہو تو کیا حکیم کے دعوے کو غلط کہا جائے گا ہرگز نہیں۔

عنایت ربی

ایسے ہی یہاں سمجھوں کہ سبحان اللہ الحمد للہ کی واقعی یہ خاصیت ہے کہ میزان عمل کو بھر دیتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ ایک سبحان اللہ الحمد للہ پر اس قدر ثواب عطا فرماتے ہیں۔ دنیا میں تو والدین سبق کے ایک ایک لفظ پر ایک ایک پیسہ بھی نہیں دیتے۔ البتہ بعض لوگ مکتب جانے پر ایک ہفتہ میں بچوں کو ایک آنہ تو دے دیتے ہیں اور ایک صاحب نے بیان کیا کہ ہمارے ابا جان مہینہ بھر تک حقہ بھرنے میں دو پیسے منصوری دیا کرتے تھے جو وزن میں تو ڈبل تھے مگر قوت میں کم تھے۔ اگر کسی بچہ کو باپ نے عید بقر عید کے موقع پر ایک روپیہ دے دیا تو خوشی کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ خصوص پہلے زمانے میں جب کہ روپیہ کم تھا۔

ہمیں یاد ہے کہ والد صاحب نے عید کے دن ہم دونوں بھائیوں کو دو دو آنے کے پیسے دیئے بھائی اکبر علی نے تو لے لئے میں نے لینے سے انکار کر دیا والد صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے کیوں واپس کر دیئے۔ میں نے کہا یہ تو تھوڑے ہیں۔ فرمایا کہ ہمارے والد تو ہم کو عید کے دن دو پیسے دیا کرتے تھے اور ہم اس سے ہی بہت خوش ہو جایا کرتے تھے۔ میں نے کہا ہم میں اور آپ میں فرق ہے فرمایا وہ کیا۔ میں نے کہا آپ غریب کے بیٹے تھے اور ہم امیر کے بیٹے ہیں۔ اس پر بھائی اشارہ سے کہنے لگے کہ یہ کیا کہتے ہو گستاخی کرتے ہو میں نے کہا اس میں گستاخی کیا ہے۔ ہم ان کو اپنے دادا پر ترجیح دے رہے ہیں اس میں تو اپنے والد کی تعظیم ہے۔ والد صاحب ہنسنے لگے اور ایک ایک روپیہ عنایت فرمایا جب ہم خوش ہوئے۔

مگر آج کل ایک روپیہ کی بھی قدر نہیں۔ اب تو بچے دو تین روپے سے کم میں خوش نہیں ہوتے۔ غرض ہم اپنی اولاد کو ایک ہفتہ کی پڑھائی کے صلہ میں ایک آنہ دیتے ہیں اور یہ بھی سب نہیں دیتے بلکہ بعض والدین ہی ایسا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایک سبحان اللہ کے عوض میں اس قدر دیتے ہیں کہ اٹھائے نہ اٹھے۔

اس پر مجھے ایک بات یاد آئی وہ یہ کہ دیانند نے تناسخ کو ثابت کر کے اور (وہ ثبوت بھی اسی کے زعم میں ہے ورنہ درحقیقت اس کے پاس اس کی کچھ دلیل نہیں) نجات ابدیہ پر اعتراض کیا ہے کہ مسلمان جو اعمال صالحہ کے عوض میں نجات ابدیہ کے قائل ہیں یہ عقل کے خلاف ہے کیونکہ اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کسی آدمی پر پانچ من بوجھ لاد دیا جائے جس سے اس کا کوبچ نکل جائے۔ پس متناہی عمل کا غیر متناہی صلہ ہونا چاہئے۔

مجھے حیرت ہے کہ اس شخص کو عاقل کس نے کہہ دیا۔ پس ایسی دلیل سے آپ اس کی دلیل عقل کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور گو یہ اس بے عقل کی بات کا جواب دینا ہمارے ذمہ لازم نہ تھا۔ عقلاء خود اس کو سن کر ہنسیں گے مگر ضعفاء کی حفاظت کے لئے اس کا جواب دیا جاتا ہے۔

وہ یہ کہ انسان پر پانچ من بوجھ لادنا اس وقت موجب تکلیف ہے جب کہ ایک دم سے لاد دیا جائے اور غیر متناہی ثواب غیر متناہی مدت میں دیا جائے تو اس میں کیا اشکال ہے۔ اور مسلمان جو نجات ابدیہ کے قائل ہیں تو وہ اس کے ساتھ اس کے بھی تو قائل ہیں کہ اہل جنت ہمیشہ زندہ رہیں گے ان کو کبھی موت نہ آئے گی (دوسرے لادنے کی بھی ایک ہی کہی ہے۔ بھلا نجات ابدیہ سے کمر پا لادنا کیونکر لازم آ گیا۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم ایک شخص کو اس قدر خزانہ دیں جو کبھی ختم نہ ہو اور وہ خزانہ ایک مقام پر محفوظ کر کے کنجی اس شخص کے حوالے کر دی جائے کہ ضرورت کے وقت جتنا چاہے نکالے اور خرچ کرے اور اگر اس شخص کے نزدیک عمر غیر متناہی عطا ہونا ہی لادنے کے مثل ہے تو اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے کیونکہ عمر طویل سے کسی پر بھی کچھ گرانی نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ قویٰ دماغیہ وجسمانیہ معطل نہ ہوں بلکہ ایسی زندگی کا تو کفار میں دنیا ہی کے اندر ہر کس طالب ہے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ. وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْيُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ (پ ۱)

غرض آپ کو ہر عمل صالح پر بے انتہا اجر ملتا ہے اور ہر مصیبت میں نعم البدل عطا ہوتا ہے یہاں تک کہ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن جب اہل نعم اہل مصائب کے اجر کا مشاہدہ کریں گے تو وہ تمنا کریں گے کاش! دنیا میں ہماری کھالیں مقراض سے قطع کی جاتیں تا کہ آج ہم کو بھی یہ ثواب حاصل ہوتا۔ پس اس ثواب کے استحضار سے آپ کو غم ہلکا کرنا چاہئے اور سمجھ لینا چاہئے کہ یہ سب مصائب درحقیقت تجارت میں داخل ہیں۔

حق تفویض

یہ تو علاج عام ہے جو عوام کے لئے نامناسب ہے اور ایک علاج خاص ہے جس کو خواص استعمال کرتے ہیں اس کا نام تفویض ہے جس کی حقیقت قطع تجویز ہے یعنی وہ اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں کہ وہ جو چاہیں ان میں تصرف کریں۔ اپنی طرف سے وہ کوئی حالت یا نظام تجویز نہیں کرتے اور تمام تر پریشانی کا سبب تجویز ہی ہے کہ ہم نے ہر چیز کا ایک نظام خاص اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے کہ یہ کام اس طرح ہونا چاہئے۔ اولاد کو اس طرح پڑھنا چاہئے پھر اس نظام کے خلاف واقع ہونے سے کلفت ہوتی ہے اور زیادہ حصہ اس نظام کا جو ہماری طرف سے تجویز ہوتا ہے غیر اختیاری ہے تو غیر اختیاری امور کے لئے نظام تجویز کرنا حماقت نہیں تو کیا ہے۔ اسی طرح تجویز کے لئے حدیث میں ہے۔

اذا اصبحت فلا تحدث نفسک بالمساء و اذا امسیت

فلا تحدث نفسک بالصباح (إتحاف السادة المتقين ١٠: ٢٦٣، ٢٥١)

کہ جب صبح ہو تو شام کے متعلق اپنے دل میں خیال نہ لاؤ اور شام ہو تو صبح کے متعلق خیال نہ لاؤ۔

راحت اسی میں ہے اسی لئے اہل اللہ نے تجویز کو قطع کر کے یہ مذہب اختیار کر لیا ہے۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو | دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اگر تو زندہ رکھے تو یہ تیرا عطیہ ہے اگر مارے تو ہماری جان تم پر فدا ہو۔ دل تمہارا عاشق ہے جو آپ کی رضا ہم اس پر راضی ہیں۔ اور یہ مذہب بنالیا ہے۔

ناخوش تو خوش بود برجان من | دل فدائے یار دل رنجان من

"آپ کی طرف سے ناخوشی میرے لئے خوشی ہے۔ دل آزار یار پر میرا دل قربان ہے۔"

انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہم خدا کے ہیں ان کو اختیار ہے کو وہ جو چاہیں تصرف کریں۔ پھر اس کے بھی دو طریق ہیں کبھی تو استحضار ثواب سے تفویض حاصل ہوتی ہے کہ اس سے ہم کو ثواب ملے گا۔

شاید آپ یہ کہیں کہ یہ تو وہی پہلا علاج ہو گیا۔ مگر نہیں بلکہ دونوں میں فرق ہے۔ پہلی صورت میں تو استحضار ثواب خود علاج تھا۔ اور اس صورت میں اصل علاج تفویض ہے اور استحضار ثواب تقویت تفویض کے لئے تفویض کی جاتی ہے۔ استحضار ثواب کو بھی اس میں دخل نہیں ہوتا گو ثواب بھی مل جائے مگر یہ ثواب کے لئے تفویض نہیں کرتا گو کہ ثواب سے استغناء بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے کو مستحق نہیں سمجھتا۔ صرف استحقاق کی نفی ہوتی ہے کہ اگر ثواب نہ ملے تو عین عدل ہے کیونکہ میں

اس کا مستحق نہیں۔ یہ شخص محض اس لئے تفویض کرتا ہے کہ محبوب کا حق یہی ہے کہ اس کے سامنے اپنی رائے اور تجویز کو فنا کر دیا جائے۔ یہ تفویض کا علیٰ درجہ ہے کیونکہ جو...... تفویض ثواب کے لئے ہوتی ہے وہاں عمل مفوت ثواب سے انقطاع تفویض کا احتمال ہو سکتا ہے اور تفویض للرضا میں یہ احتمال نہیں رہا۔ یہ کہ تفویض کے بعد بھی بقاء رضا میں تو شبہ واحتمال ہو سکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو جب تک تفویض باقی ہے رضا بھی باقی ہے دوسرے صوفی ابن الحال ہوتا ہے وہ آئندہ کی فکر نہیں کرتا۔ وہ بقاء رضا میں بھی تفویض سے کام لیتا ہے۔ مگر یہ علاج چونکہ خاص ہے اس لئے میں نے اس کو تتمیم کے طور پر بیان کر دیا ہے ورنہ اصل علاج عام وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے کہ استحضار ثواب کا مراقبہ کرے اور یہ بات سمجھ لے کہ ہر مصیبت پر نعم البدل ملتا ہے اور آخرت میں تو ملتا ہی ہے۔

مشاہدہ مصلحت وحکمت

دنیا میں بھی نعم البدل ملتا ہے اور خدا پر بھروسہ کر کے میں نہایت زور سے کہتا ہوں کہ دنیا میں بھی اس کو نعم البدل کا مشاہدہ ضرور ہوگا۔ مگر اس کے لئے ایک شرط ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ کے معاملات میں غور کرتا رہے تو ہر واقعہ کی مصلحت سمجھ میں آ جائے گی۔

بحمد اللہ مجھے تو خدا نے یہ دولت عطا فرمائی ہے کہ مجھے تو ہر واقعہ میں کھلی آنکھوں سے مصلحت وحکمت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

چنانچہ آج کل مجھے عذر ہے اس کی نسبت میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس کا میرے دل پر کس قدر حظ ہے کیونکہ میں عرصہ سے یہ چاہتا تھا کہ سفر منقطع کر دوں کیونکہ مجھے سفر سے کلفت ہوتی تھی اور میں اس کے لئے بہانہ تلاش کرتا تھا لیکن مجھے خبر نہ تھی کہ میرے جسم میں ایک ایسی چیز موجود ہے جو میری اس کلفت کے رفع کا ذریعہ بن جائے گی۔ یعنی مجھے آنت اترنے کا مدت سے مرض تھا لیکن اس میں کوئی تکلیف نہ تھی۔ اب کچھ عرصہ سے اس میں خاص تکلیف شروع ہوگئی کہ اپنے موقع پر سے اس کا ہٹنا تکلیف کا سبب ہوتا ہے اور ادنیٰ سبب سے وہ ہٹ جاتی ہے جس سے تحرز خصوص سفر میں مشکل ہے لہذا اب میں نے سفر منقطع کر دیا۔ خدا نے مجھے یہ عذر ایسا دیا جس سے میری تکالیف کا انسداد ہو گیا۔

اس طرح ہر وقت کوئی نہ کوئی مصلحت اور فائدہ ہر واقعہ میں سمجھ میں آ جاتا ہے حتیٰ کہ کسی عزیز کی موت میں بھی اور مصیبت ورنج کے واقعات میں بھی اور کم از کم یہ فائدہ تو ہر واقعہ میں مشاہد ہے کہ اس سے اخلاق کی اصلاح ہو جاتی ہے اور اپنی حقیقت وعجز کا مشاہدہ ہو جاتا ہے اور یہ بہت بڑا فائدہ ہے۔

توصاحبو! اگر غم بھی ہو مگر غم کی حکمت سمجھ میں آجائے تو غم ہلکا ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء واولیاء کو غم سے پریشانی کم ہوتی ہے۔ پس انسان کو جو مصیبت پیش آئے اس وقت یہ سمجھ لے کہ مجھے اس میں نفع ضرور ہوگا آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی۔ گو دنیوی نفع ابھی سمجھ میں نہ آئے مگر غور کرتے کرتے وہ بھی سمجھ میں آنے لگے گا اور نہ سمجھ میں آئے تو آخرت کا نفع تو ہے ہی۔ اور وہی ہمارا اصلی گھر ہے۔ اس کے نفع کو مقدم سمجھنا چاہئے گو دنیا کا نفع بھی من وجہ مطلوب ہے مگر آخرت کے برابر نہیں اور یوں تو آدمی سفر میں، ریل میں، اور سرائے میں بھی اپنی راحت کا اہتمام کرتا ہے کہ جگہ اچھی اور گرمی سردی کا آرام ہو تو اسی درجہ میں دنیا کی راحت کا بھی بقدر ضرورت اہتمام کرنے کا مضائقہ نہیں کیونکہ دنیا کی مثال آخرت کے سامنے سرائے جیسی ہے اس لئے دنیا کی نہیں کیونکہ دنیا کی مثال آخرت کے سامنے سرائے جیسی ہے اس لئے دنیا کی مصلحت ومنفعت بھی ایک درجہ میں مطلوب ہے اور شریعت نے بھی اجازت دی ہے۔

شریعت کا خلاصہ

یہاں سے ایک شبہ کا جواب بھی ہو گیا کہ وہ یہ کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ علماء شریعت دنیا کمانے سے اور دنیا کی راحت ومنفعت سے روکتے ہیں وہ غلط کہتے ہیں۔

فتوح میں ایک صاحب نے مجھ سے خود کہا کہ میں نے تو تمام شریعت کا خلاصہ یہ سمجھا ہے کہ نہ غم میں روؤ، نہ خوشی میں ہنسو۔ بس پتھر بن کر رہو اور مر جاؤ۔ میں نے کہا سبحان اللہ! آپ نے خوب خلاصہ نکالا۔ بلکہ شریعت کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی حال میں پریشان نہ رہو۔ بلکہ راحت سے رہو غم میں بھی اور خوشی میں بھی۔ کیونکہ شریعت غم کے ہلکا کرنے کا طریقہ بتلاتی ہے اور راحت کے متعلق ایسے امور کی تعلیم دیتی ہے جس میں اسباب راحت میں ترقی ہو زوال نہ ہو۔ واللہ! لوگوں نے شریعت کو سمجھا نہیں۔ اس لئے یہ نیا خلاصہ نکالا ہے۔

یہ خلاصہ ویسا ہی ہے جیسے مولانا جامیؒ نے قصہ یوسفؑ وزلیخا کا خلاصہ نکالا تھا۔ وہ سفر میں ایک شخص کے رفیق تھے روٹی تھوڑی تھی اس نے مولانا جامیؒ کو باتوں میں لگانا چاہا تا کہ خود روٹی زیادہ کھا جائے اور کہا مولانا آپ نے یوسف وزلیخا کا قصہ لکھا ہے۔ ذرا وہ قصہ بیان تو کیجئے مولانا جامیؒ سمجھ گئے کہ اس کا مقصود کچھ اور ہے فرمایا جی ہاں قصہ تو بہت لمبا ہے مگر خلاصہ اس کا یہ ہے "پیرے بود پسرے داشت گم کردہ باز یافت" (ایک بڑے میاں تھے ان کا ایک لڑکا تھا وہ گم ہو گیا پھر مل گیا۔) یہ کہہ کر کھانے لگے۔

نیز یہ ایسا خلاصہ تھا جیسے ایک صاحب نے یہاں خانقاہ میں رہ کر تصوف کا خلاصہ نکالا تھا کہ

مجھے تو یہاں کی تمام تر تعلیم کا خلاصہ یہ معلوم ہوا کہ پیر کی تعظیم خوب کرتے رہو۔

میں نے کہا سبحان اللہ! اچھا خلاصہ نکالا ہے گویا مشائخ مخلوق کو اپنا بندہ بنانا چاہتے ہیں نعوذ باللہ! اور نہ معلوم یہ خلاصہ انہوں نے کس تعلیم سے سمجھا۔ حالانکہ یہاں تو تعظیم کی ممانعت ہے ہاں اطاعت کا حکم ہے کیونکہ اس طریق میں بدوں تقلید وانقیاد کے کام نہیں چل سکتا۔ ان حضرات کا نام بدر تھا میں نے ان کو بدر کر دیا۔ یعنی ان کو سکون سے حرکت میں لے آیا (اس کی لطافت اہل ذوق لسان سے مخفی نہیں کیونکہ رقابت سکون ہے اخراج تحریک ہے اسی طرح بدر میں دال کا سکون ہے اور بدر میں حرکت ہے)

ترقی کی حقیت

میں یہ کہہ رہا تھا کہ جن لوگوں نے شریعت کا خلاصہ یہ نکالا ہے کہ دنیا میں پتھر بن کر رہو۔ انہوں نے شریعت کو اور علماء کے مطلب کو نہیں سمجھا۔

ایک مولوی صاحب جو مالدار بھی تھے ان سے ترقی مال کے متعلق میری گفتگو ہوئی مگر وہ سمجھتے نہ تھے۔ بالآخر میں نے کہا کہ میاں تم تو مولوی ہو۔ میں تم کو علمی اصطلاح سمجھتا ہوں کہ علماء کی تعلیم کا حاصل اس باب میں یہ ہے کہ مال مقصود بالذات نہ بناؤ۔ ورنہ بدذات ہو جاؤ گے بلکہ مقصود بالغیر تو بالخیر رہو گے ورنہ مطلقا جمع مال سے علماء منع نہیں کرتے۔

وہ کیسے منع کر سکتے ہیں جب کہ حدیث میں حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ مصرح ہے کہ ایک مرتبہ وہ غسل فرما رہے تھے کہ سونے کی ٹڈیاں ان پر برسنے لگیں اور وہ ان کو جمع کرنے لگے وحی آئی اے ایوبؑ! کیا میں نے تم کو اس سے مستغنی نہیں کر دیا ہے (کیونکہ ایوب علیہ السلام بہت مالدار تھے) تو آپؑ نے عرض کیا۔ بلٰی یا رب ولکن لا غنی بی عن بر کتک کہ بے شک اے پروردگار آپ نے مجھے اس سے غنی کر دیا ہے لیکن میں آپ کی نعمت کی ترقی سے مستغنی نہیں ہوں۔

اگر مال جمع کرنا مطلقاً مذموم ہوتا تو ایوب علیہ السلام کا یہ جواب مقبول نہ ہوتا۔ نیز حضرت کعب بن مالک نے ایک دفعہ اپنا تمام مال صدقہ کرنا چاہا تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

امسک علیک بعض مالک ھو خیر لک (الصحیح للبخاری ۲: ۱۳۹،

الصحیح لمسلم: التوبۃ: ۵۳، سنن الترمذی: ۳۱۰۲، مسند أحمد ۳: ۴۵۴)

"کہ اپنے مال میں سے کچھ حصہ اپنے واسطے بھی رکھ لو یہ بہتر ہوگا۔"

چنانچہ انہوں نے خیبر کا حصہ روک لیا۔

نیز خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ اپنے ازواج مطہرات کو سال بھر کا نفقہ دے دیا کرتے تھے۔ یہ بھی ایک گونہ جمع مال ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ کا مقولہ ہے کہ حلال مال کی قدر کرو۔ اس کو فضول ضائع نہ کرو۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ جس میں مال کا جمع کرنا دین کے واسطے مضر تھا اور اب وہ زمانہ ہے کہ مال کا جمع نہ کرنا دین کے واسطے مضر ہے پھر فرمایا کہ اگر ہمارے پاس یہ چند درہم و دینار نہ ہوتے تو یہ اہل دولت تو ہم کو اپنا رومال بنالیتے یعنی ہم کو پامال کر دیتے۔

اب کس کا منہ ہے جو علما کو بدنام کرے کہ یہ دنیا کمانے اور مال جمع کرنے سے روکتے اور ترقی کے مخالف ہیں۔ پھر میں کہتا ہوں کہ آج کل جن اہل ترقی کو ترقی کی فکر ہے ان کو صرف آمدنی کی فکر ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ خرچ بھی بہت کرتے ہیں پھر اس طرح ترقی کیسے ہوگی۔

ترقی کی صورت

ترقی کی صورت تو یہ ہے کہ ترقی آمدنی کے ساتھ خرچ کو بھی کم کیا جائے۔ پس ان لوگوں کو اپنے حامی ترقی کہنا غلط ہے جو دعویٰ بلا دلیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

شیخ الٰہی بخش صاحب رئیس میرٹھ کا مقولہ ہے کہ آمدنی کی فکر سے زیادہ خرچ کی فکر لازم ہے اگر خرچ کی فکر ہو تو تھوڑی بھی کافی ہو جاتی ہے اور خرچ کا انتظام نہ ہو تو بہت آمدنی بھی کافی نہیں۔ آج کل لوگوں کی زیادہ پریشانی کا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے خرچ کا انتظام نہیں کرتے۔ اسلئے پچاس اور ساٹھ کی تنخواہ بھی ان کو قلیل معلوم ہوتی ہے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ مدرسے سے پہلے میں نے ذہن میں اپنے لئے دس روپے تنخواہ تجویز کی تھی کہ بس ہم دو میاں بیوی کے لئے اتنا بہت ہے۔ مگر آج کل تو پندرہ روپے کی تنخواہ کا نام بھی لینا عار ہے۔

چنانچہ ہمارے ہی قریب ایک قصبہ میں چند مستورات نے جمع ہو کر اپنے اپنے شوہروں کی تنخواہوں کا تذکرہ کیا۔ ان میں سے ایک عورت کے خاوند کی تنخواہ شاید بیس روپے تھے۔ جب اس کی باری آئی تو وہ یہ کہتی ہوئی شرمائی کہ بیس روپے تنخواہ ہے اس لئے وہ یوں کہتی ہے کہ تنخواہ تو ان کی بیس ہی روپے ہے مگر ماشاءاللہ اوپر کی آمدنی کافی ہے۔ ایک عورت نے کہا اے کم بخت توبہ کر حرام مال پر ماشاءاللہ کہتی ہے۔

غرض شریعت تو دنیا میں راحت کے ساتھ رہنے کی بھی اجازت بلکہ تعلیم دیتی ہے لیکن اس کو مقصود

بالذات بنانے کو روکتی ہے۔ پس اگر دنیا کا کچھ نقصان ہو جاوے اور اس میں دین یا آخرت کا نفع ہو جاوے تو وہ نقصان حقیقت میں کچھ نقصان نہیں وہ ایک تجارت ہے اپنے دل کو سمجھالینا چاہئے میں نے اوپر کہا تھا کہ دنیوی نقصان سے خود دنیا میں نفع ہوتا ہے، جو غور میں سمجھ میں آتا ہے، مجھ کو اس پر ایک حکایت یاد آ گئی۔

بریلی میں ایک صاحب یتیم خانہ کے مہتمم تھے انہوں نے میرے نام ایک فتوے کے لئے خط لکھا اور پتہ میں اپنا نام کے ساتھ گورنر یتیم خانہ لکھا آج کل ایک آفت یہ بھی ہو گئی کہ جاہ مقصود بالذات ہو گیا جاہ کے لئے اپنے لئے خانہ ساز عہدے پھر ان عہدوں کے نام انگریزی نام تجویز کرتے ہیں تو ان صاحب نے اپنے کو گورنر لکھا مگر وہ ایسے گورنر تھے کہ جواب کے لئے آپ نے ٹکٹ تک نہ بھیجا تھا۔ میں اس وقت تک ایسے خطوط کا جواب بیرنگ دے دیا کرتا تھا اس کا جواب بھی میں نے بیرنگ بھیج دیا تو گورنر صاحب نے واپس کر دیا اور مجھے ایک آنہ دینا پڑا کیونکہ اس وقت ایک ہی آنہ محصول تھا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں میرا جانا بریلی ہو گیا۔ میں نے بھائی سے یہ قصہ بیان کیا کہ میں ان گورنر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے ان سے ایک آنہ وصول کرنا ہے۔ یہ کیسے گورنر ہیں کہ استفتاء بھیجیں اور جواب کے لئے ٹکٹ نہ رکھیں اور برنگ جواب دیا جائے تو محصول بھی ہمارے ذمہ ڈالیں۔ اس وقت بعض لوگ اور بھی بیٹھے تھے جب وہ چلے گئے تو بھائی نے کہا کہ تم نے غضب کیا۔ اس وقت ان گورنر صاحب کے صاحبزادے بھی موجود تھے میں نے کہا یہ اچھا ہوا کہ میرا مدعا حاصل ہو گیا کیونکہ میں تو ان کو اس تہذیب پر تنبیہ کرنے کے لئے ہی ملنا چاہتا تھا۔ اب مجھے ان سے ملنے کی ضرورت نہیں صاحبزادے ضرور مطلع کر دیں گے۔

دیکھئے ان گورنر صاحب کی حرکت سے میرا ایک آنہ کا نقصان تو ہوا۔ مگر اس میں بھی حکمت تھی وہ یہ کہ میں نے آئندہ کے لئے قانون مقرر کر لیا کہ ایسے خطوط کا جواب ہی نہیں دیتا جن میں ٹکٹ نہ ہو یہ مجھ کو نفع ہوا۔

صاحبو! میرے پاس کوئی چھ مہینے رہے تو میں ان واقعات الہیہ کی اسرار و حکم اس کو برابر بتلاتا رہوں گا جو روزانہ مجھے پیش آتے رہتے ہیں۔ ہاں البتہ ان کے واقعات کا میں ذمہ دار نہیں کیونکہ اپنے واقعات کا علم انہی کو ہو سکتا ہے اور وہی اس کے منافع و حکم کو سمجھ سکتے ہیں۔

تفاخر و تکبر

گورنر کے قصہ پر ایک مضمون ذہن میں آ گیا کہ آج کل تفاخر و تکبر کا مرض ایسا عام ہوا ہے کہ علماء میں بھی یہ مرض سرایت کر گیا ہے چنانچہ بعض نوجوان اہل علم اپنے ناموں کے ساتھ فاضل دیو بند لکھنے لگے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ہاں تم فاضل ہو مگر فضیلت سے نہیں بلکہ فضول سے کیونکہ جو لوگ واقعی صاحب فضیلت تھے ان کی تو یہ حالت تھی کہ اپنا نام بھی پورا نہ لکھتے تھے۔

حضرت شیخ العلماء مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے ہمیشہ اپنے دستخط میں بندہ محمود ہی لکھا۔ نام بھی پورا نہ لکھنا۔ فاضل یا عالم تو وہ اپنے کو کب لکھتے۔ بلکہ حقیت یہ ہے کہ وہ اپنے کو عالم ہی نہیں سمجھتے تھے۔

ایک دفعہ خود فرمایا کہ ساری عمر کے علمی مشغلہ سے ہم کو تو یہ حاصل ہوا کہ جہل مرکت سے جہل بسیط میں آ گئے یعنی اپنے جہل کا علم ہو گیا۔

اسی تفاخر کا یہ اثر ہے کہ اپنے ناموں کے ساتھ نسبتیں لکھتے ہیں کوئی سبحانی بنتا ہے کوئی یزدانی۔ آج کل چھوٹی قوموں کو ابھی انصاری بننے کی فکر ہو رہی ہے۔ ایک صاحب نے مجھے لکھا کہ اسلام میں مساوات ہے اس لئے چھوٹی قوموں کو ذلیل کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے لہذا مناسب ہے کہ ان کو بڑے بڑے القاب سے یاد کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ولا تنابزو بالالقاب۔ سبحان اللہ آیت کا مطلب آپ نے خوب سمجھا۔ آیت کا مطلب تو ہے کہ اس کو برے لقب سے یاد نہ کرو یہ تو مطلب نہیں کہ غیر واقعی بڑے بڑے القاب سے یاد کیا کرو) پھر آپ نے لکھا کہ چھوٹی قوموں کو اعظمی، حنفی، نعمانی وغیرہ القاب دیئے جائیں۔

میں نے لکھا کہ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ شریعت وغیرہ میں جو کفارت کے احکام مقرر کئے ہیں وہ مصالح پر مبنی ہیں اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ انتساب الی غیر الآباء حرام ہے تو اگر ان لوگوں کو بڑے بڑے القاب مذکورہ دیئے گئے تو چند روز مین لوگ انکو حضرت امام اعظمؒ کی اولاد سمجھنے لگیں گے جیسا کہ ایک صاحب نے اپنے نام کے ساتھ نعمانی لکھنا شروع کیا تھا۔ اور عام لوگ ان کو امام صاحب کی اولاد سمجھنے لگے۔ پھر اس تفاخر کے یہاں تک ترقی کی کہ بعض لوگ انسان سے حیوان بننے لگے۔ کوئی اپنے نام کے ساتھ طوطی ہند لکھتا ہے کوئی بلبل ہند۔ میں نے کہا کہ اب چند روز میں لوگ خر ہند اور زاغ ہند بھی بننے لگیں گے۔

حدود کی تمیز

اب میں اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ بڑا سبب دنیوی نقصان پر یشان ہونے کا یہ بھی ہے کہ مال و جاہ کو مقصود بالذات سمجھنے لگے۔ اس لئے اس کے فوت کے وقت اس کے نعم البدل پر نظر نہیں جاتی۔ کیونکہ مقصود باذات کا کوئی بدل نہیں ہوتا۔ اگر ان کو مقصود بالذات نہ سمجھا جاوے تو اس کے بدل ملنے

پر قناعت ہو جاوے اس مرتبہ میں علماء اس کو مطلوب بنانے سے منع کرتے ہیں۔ ورنہ علماء کسب حلال اور جمع مال سے مطلقاً منع نہیں کرتے۔ بلکہ کسب حلال کو تو فرض کہتے ہیں کیونکہ حدیث میں اس کا امر ہے۔

چنانچہ میں نے ایک دفعہ ایک بیان میں کہا تھا کہ ترقی کے ہم مخالف نہیں البتہ بعض ترقی کے مخالف ہیں اور اس کو آپ بھی تسلیم کریں گے کیونکہ اگر ہر ترقی مطلوب ہے تو ورم بھی ایک ترقی ہے اس کا علاج کیوں کیا جاتا ہے۔ پس جو درجہ آپ کے یہاں ترقی ورم کا ہے وہی درجہ ہمارے یہاں بعض ترقی کا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مال کے درپے نہ ہو کہ دین برباد ہو جائے۔

مبادا دل آں فرو مایہ شاد   کہ از بہر دنیا دہد دین بباد

''اس فرو مایہ کا دل کبھی خوش نہ ہو جو دنیا کی خاطر اپنے دین کو کھو دیتا ہے۔''

اگر مال کے ساتھ دین پوری طرح محفوظ رہے تو پھر تم ترقی دنیا سے کون روکتا ہے جتنی چاہو ترقی کرو۔ خواہ بادشاہ ہو جاؤ خواہ وزیر ہو جاؤ۔ خواہ ہفت اقلیم کو فتح کرلو۔ مگر حدود کے اندر رہو لیکن تجربہ سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے حدود کی تمیز آپ کو خود نہ ہوگی۔ بلکہ اس کے لئے آپ کو اول کسی عالم کے پاس رہنے کی ضرورت ہوگی جو مسائل و احکام سے آپ کو واقف کرے پھر محقق شیخ کے پاس رہنے کی ضرورت ہوگی۔ وہ آپ کو صدرا، شمس بازغہ نہ پڑھائے گا۔ بلکہ اس کی صحبت و تقریر ہی سے آپ کو حدود کا امتیاز ہو جائے گا۔ اکبر حسین صاحب جج مرحوم فرماتے ہیں۔

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اور صحبت علماء و مشائخ کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ آپ اپنی ملازمت وغیرہ کو ترک کر کے ان کے پاس رہیں۔ بلکہ اسکی آسان صورت یہ ہے کہ اپنی تعطیلات کا کچھ حصہ ان کی خدمت میں گزارو۔ چھوٹی چھوٹ تعطیلوں کو تو اپنی تفریح وغیرہ میں صرف کرو۔ وہاں بڑی چھٹی کی تنصیف کر کے نصف حصہ ان کے پاس رہو اور نصف حصہ اپنے وطن وغیرہ میں رہو۔ اتنا بھی اگر آپ کرتے رہیں تو کافی ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو یوں کہا جائے گا کہ آپ کو دین کی طلب ہی نہیں۔

ابھی کچھ دن گزرے ہیں ایک صاحب عہدہ دار میرے پاس آئے تھے وہ کچھ شبہات بیان کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ آپ کے شبہات کے جوابات تو حاضر ہیں مگر ممکن ہے کہ ان کے جوابات سے آپ کی تسلی نہ ہو کیونکہ آپ کے شبہات تو برسوں کے پرانے ہیں اور آپ تشفی چاہتے ہیں۔ ایک جلسہ میں یہ ٹھیک نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ آپ چھ مہینے یہاں رہیں تو امید ہے کہ آپ کی تسلی ہو جائے گی۔ اگر

کسی کو یہ ڈر ہو کہ ہم متقی بن جائیں گے تو دنیا کے مزے جاتے رہیں گے تو میں کہتا ہوں کہ تم یہ نیت کرلو کہ متقی نہ بنیں گے۔ مگر خدا کے لئے علماء و مشائخ کی صحبت میں رہ کر ایک دفعہ دین کو سمجھ تو لو۔ اس کا یہ اثر ہوگا کہ تم متقی بننے کے لئے کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ بلکہ تم خود بخود عمل کے مشتاق ہو جاؤ گے اور تم . اس وقت اعمال دینیہ میں وہ حظ اور لذت آئے گی کہ دنیا کی تمام لذتوں کو بھول جاؤ گے۔

دین میں تصرف

علی گڑھ کے ایک طالب علم ایم۔اے میرے پاس آتے جاتے ہیں۔ پہلے وہ آزاد تھے۔ مگر اب ان کی یہ حالت ہے کہ دین کا انکو عشق ہو گیا ہے اور ان کی حالت یہاں کے صلحاء کی برکت سے اس کا مصداق ہوئی

بگفتا من گل ناچیز بودم　　ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہمنشین درمن اثر کرد　　وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

''اس نے کہا میں ناچیز مٹی تھی مگر ایک مدت تک پھول کے ساتھ رہی تو ہمنشینی کا یہ اثر ہے کہ میں بھی خوشبو رکھتی ہوں ورنہ حقیقتاً میں وہی ناچیز مٹی ہوں۔''

اب وہ دنیا سے اس قدر متنفر ہیں کہ ان کے چچا نے ایک دفعہ ان سے فرمائش کی کہ ایک بنئے کا نام سودی قرض کا رقعہ لکھ دو انہوں نے صاف انکار کر دیا چچا کو ناگوار ہوا۔ ان کے والد کو اطلاع ہوئی ان کو بھی ناگوار ہوا اور کہا تم نے چچا کے حکم کی مخالفت کیوں کی۔ کہا وہ مجھ سے خدا کے حکم کی مخالفت کراتے تھے اور مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں میری ذات میں وہ کوئی تصرف کریں اس کے لئے میں جان و دل سے حاضر ہوں۔ مگر دین میں تصرف کریں تو یہ مجھ کو گوارا نہیں۔ پھر خدا نے غیب سے یہ سامان کیا کہ ان کے چچا کو خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یا کسی بزرگ کی زیارت ہوئی اور انہوں نے ان کو اس حرکت پر تنبیہ کی اور بھتیجے کی تائید کی۔ چچا نے خواب سے بیدار ہو کر توبہ استغفار کیا اور بھتیجا کو خواب میں یہ سب واقعہ لکھ کر ان سے معافی طلب کی۔ اور سب راضی ہو گئے۔

واقعی اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے سب کام غیب سے خود درست کر دیتے ہیں۔ اب آپ کی یہ حالت ہو گی کہ اگر پہلے بیس روپے کافی نہ ہوتے تھے تو اب دس روپے کافی ہوں گے اور دین برباد کر کے دنیا کمانے کی ہوس نہ ہو گی۔

دنیا کی ہوس

ہوس نہ ہونے پر قصہ یاد آ گیا ایک سب جج تھے ان کے پاس دو تعلقداروں کا مقدمہ آیا۔ ان

میں ایک نے ایک لاکھ روپے رشوت میں پیش کئے۔ سب جج صاحب نے اپنے نوکر کو حکم دیا اس نالائق کو باہر نکال دو۔ ہر چند کہ تعلقدار کے سامنے ایک سب جج کی کوئی حیثیت نہیں مگر ایسے وقت وہ بھی کچھ نہیں بول سکتا جو خوشامد میں رشوت دیتا ہو۔ اور دوسرا اس سے استغنا برتتا ہو۔ دوسرے فریق کو خبر ہوئی کہ ایک لاکھ روپیہ واپس کر دیا گیا وہ سوا لاکھ روپیہ لے کر آیا۔ سب جج نے اس کو بھی نوکروں سے نکلوا دیا۔ بتلایئے وہ کیا بات تھی کہ ایک شخص نے سوا دو لاکھ روپے پالات ماردی۔ یقیناً اس کو رشوت لینے میں تکلیف تھی اور اس پر لات مارنے میں راحت تھی۔ مگر چونکہ وہ عالم نہ تھے اس لئے ایک حرکت انہوں نے خلاف بھی کی۔ وہ یہ کہ غصہ میں فرمایا کہ پہلے میرا خیال اس مقدمہ میں انصاف کرنے کا تھا۔ مگر چونکہ ان دونوں نے میرا دل بہت دکھایا ہے اس لئے اب ایسا فیصلہ کروں گا کہ دونوں سر پکڑ کر روئیں گے چنانچہ ایسا ہی فیصلہ کیا اور لطیفہ یہ ہوا کہ فیصلہ سنانے سے پہلے ان کی بدلی بھی ہوگئی۔ مگر انہوں نے دو چار دن خوب محنت کر کے رات اور دن کا سارا وقت فیصلہ لکھنے میں صرف کیا اور جانے سے ایک دن پہلے فیصلہ سنا کر مقدمہ ختم کر کے چلے گئے۔ پھر دونوں نے ہر چند ہائی کورٹ وغیرہ میں اپیل کی مگر ظالم نے ایسا مدلل فیصلہ لکھا تھا کہ کہیں نہ ٹوٹ سکا۔

صاحبو! اب ایسے شخص کو دنیا کی ہوس کیونکر ہوسکتی ہے۔ بلکہ اب اسکو تھوڑی آمدنی کافی ہوگی اور تھوڑی سی عزت کافی ہوگی۔ اور تمام افکار سے آزاد ہو کر صرف ایک کی فکر میں گرفتار رہے گا۔ اور اس آزادی پر خوش ہو کر یوں کہے گا ؎

نہ بر اشتر سوارم نہ چوں اشتر زیر بارم ۔۔۔ نہ خداوند رعیت نہ غلام شہر یارم

''نہ اونٹ پر سوار ہوں اور نہ اونٹ کی طرح زیر بار ہو۔ نہ رعیت کا مالک ہوں اور نہ بادشاہ کا غلام''

اور یوں کہے گا۔

گر دو صد زنجیر آرے بگسلم ۔۔۔ غیر زلف آں نگارے مقبلم

''اگر دو سو زنجیریں بھی لائے گا تو میں توڑ دوں گا۔ سوائے اس محبوب مقبول کی زلفوں کی زنجیر کے۔'' کیونکہ وہ زنجیر تو ایسی ہے کہ۔

اسیرت نخواہد رہائی ز بند ۔۔۔ شکارت نجوید خلاص از کمند

''تیرا اسیر قید سے رہائی نہیں چاہتا۔ تیرا شکار کمند سے نکلنا نہیں چاہتا۔

انسان کی محبت

وہ تو ایسی قید ہے جیسے کسی عاشق کو اس کا محبوب جو کہ مدتوں کے بعد ترس ترس کر ملا ہو۔ پیچھے سے آ کر اس طور سے کہ اسکو خبر بھی نہ ہو اس کو بغل میں دبائے اور اتنا زور سے دبائے کہ اسکو طبعاً ناگوار بھی ہو مگر پیچھے مڑ کر دیکھا تو محبوب کے چہرہ پر نظر پڑی تو گویہ قید ہے کہ جاتے ہوئے کو روک لیا۔ ایک جگہ محبوس کر دیا۔ قید بھی با مشقت ہے زور سے دبایا کیونکہ معشوق تو تازہ موٹا تھا۔ اس کو کوئی فکر و غم تھوڑا ہی تھا جو دبلا ہوتا۔ اور عشاق اکثر بوجہ غم عشق کے لاغر و نحیف ہوتے ہیں۔ جیسا مولانا فرماتے ہیں ۔

عشق معشوقاں نہاں ست دستیر　　　عشق عاشق بادو صد طبل و نفیر
ایک عشق عاشقاں تن زہ کند　　　عشق معشوقاں خوش و فربہ کند

معشوق کا عشق چھپا ہوا ہوتا ہے اور عاشق کا عشق بجتے ہوئے باجوں کے ساتھ نکلتا ہے لیکن عاشقوں کا عشق زہ کی طرح تن کھینچ رکھتا ہے اور معشوقوں کا عشق موٹا کرتا ہے۔

اب اگر محبوب اس سے یوں کہے کہ تجھ کو تکلیف ہوتی ہو تو چھوڑ دوں اور ساتھ ہی یہ چرکہ بھی لگاوے کہ تجھے چھوڑ کر اسی طرح رقیب کو بغل میں لے لوں کہ وہ بھی اسکو مدت سے مشتاق ہے تو یقیناً عاشق یوں کہے گا

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

''تیری تلوار سے ہلاک ہونا دشمنوں کے نصیب میں نہ ہو۔ تیرے خنجر کی آزمائش کے لئے دوستوں کے سر سلامت رہیں۔'' اور کہے گا ۔

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے　　　یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

تو جب ایک انسان کی محبت کا یہ حال ہے جو آپ ہی جیسا آدمی ہے مگر ذرا چمڑے کا رنگ کھلا ہوا ہے تو حق تعالیٰ کی محبت کا کیا حال ہونا چاہئے جس کی نظر کوئی بھی نہیں۔ شیخ فرماتے ہیں

ترا عشق ہمچو خودے ز آب و گل　　　رباید ہمہ صبر و آرام دل
عجب داری از سالکان طریق　　　کہ باشند بحر معنی غریق
دما دم شراب الم درکشند　　　وگر تلخ بیند دم درکشند

''اپنے ہی جیسے انسان سے تمہارا عشق صبر و آرام کھو دیتا ہے تمہیں سالکان طریق پر تعجب ہوتا ہے جب کہ وہ بحر معانی میں غرق ہوتے ہیں۔ ہر وقت وہ رنج کی شراب پیتے ہیں اور اگر تلخ ہو تو

دم نہیں مارتے۔'' اور مولانا فرماتے ہیں۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود　　　گوئے گشتن بہرا واولےٰ بود

''مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کیا کم ہوگا۔ اس کے لئے گیند بن کر لڑھکنا ضروری ہے۔''

مولانا نے مجنوں کے واقعہ پر یہ شعر لکھا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ مجنوں ایک دفعہ لیلیٰ کی زیارت کو اونٹنی پر سوار ہو کر چلا۔ اونٹنی کے ساتھ اسکا بچہ بھی تھا جو پیچھے رہ جاتا تھا اور اونٹنی بار بار اس کو مڑ کر دیکھتی اور جس وقت مجنوں اپنے خیال میں مستغرق ہو جاتا اور بھاگ ڈھیلی ہو جاتی اور اونٹنی پیچھے کو لوٹ جاتی پھر اسکو ہوش آتا اور یہ اسکو آگے بڑھاتا پھر مستغرق ہو جاتا۔ اور اونٹنی پیچھے لوٹ جاتی۔ جب بار بار ایسا ہوتا اور راستہ کچھ طے نہ ہوا تو بے قرار ہو کر کہا۔

هویٰ ناقتی خلفی وقدا می الهوی　　　فانی وایا ها لمختلفان

میری اونٹنی کی محبت پیچھے ہے یعنی پیچھے چلنے والے بچے سے اور میری محبت آگے ہے یعنی لیلیٰ سے۔ اسلئے میں اور وہ دونوں مختلف ومتضاد ہیں۔''

اور اوپر سے فوراً کود پڑا۔ اونٹنی کو بٹھلا کر اترنے کا بھی انتظار نہ کیا اوپر سے کودا تو میاں کا پیر بے کار ہو گیا چلنے کے قابل بھی نہ رہا تو اب آپ نے لڑھکنا شروع کیا اور کہا۔

فان قطعت رجلی مشیت علی العصا　　　وان قطعت اخریٰ حبوت رحبلیت

''اگر میرا ایک پیر کٹ جائے تو لاٹھی کے سہارے آؤں گا اگر دوسرا کٹ جائے تو گھسٹ کر آؤں گا۔'' مولانا اس پر فرماتے ہیں کہ۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود　　　گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

چونکہ وہ لڑھک رہا تھا اس لئے گوئے گشتن فرمایا۔ جب لیلیٰ کی محبت میں یہ حال ہو گیا تو محبوب حقیقی کی عشاق پر کیا تعجب کرتے ہو۔ اب اس کو نہ کسی کا مرنا معلوم ہوگا نہ جینا۔ ہر حال میں خوش رہے گا۔ اب اس کو مال وزر خدا تعالیٰ سے مانع ہوگا نہ فاقہ اور تنگ دستی۔ کیونکہ بعض لوگ مال وزر کے ساتھ بھی خدا سے علاقہ رکھتے ہیں اور بعض لوگ خالی ہاتھ ہو کر بھی خدا تعالیٰ سے دور ہیں ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

چو ہر ساعت از تو بجائے رود دل　　　بہ تنہائی اندر صفائے نہ بینی

''جب ہر وقت تمہارے ہاتھ سے دل جاتا ہے تو تنہائی میں صفائی نہ دیکھو گے''

اور اگر سلطنت ہو۔ زمینداری ہو مگر دل خدا تعالیٰ سے لگا ہوا ہے تو پھر یہ حال ہوگا۔

گرت مال وزر ہست وزرع تجارت   چو دل با خدا ایست خلوت نشینی

''اگر چہ مال و دولت ہے کھیتی ہے تجارت ہے جب دل خدا کے ساتھ ہے تو تم خلوت نشین ہو'' مگر ابتداء میں ایسی قوت نہیں ہوتی ۔ بلکہ چند روز اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ

قال را بگذار و مرد حال شو   پیش مرد کاملے پامال شو

''کہنے کی باتیں چھوڑ مرد حال بن جا۔ اور کسی کامل کے آگے گھٹنے ٹیک کر پامال ہو تب کام بنے گا۔''

صحبت بزرگاں

اگر کسی میں فطری قوت ہو کہ مادرزاد ولی ہو۔ ابتداء ہی سے خدا کے ساتھ تعلق ہو تو مبارک ہو ورنہ اگر کسی میں یہ قوت فطری نہ ہو تو جس طرح ورزش سے جسم میں قوت آجاتی ہے واللہ! اسی طرح یہاں بھی بزرگوں کی صحبت سے اور ان کی تعلیم پر عمل کرنے سے دل میں قوت آجاتی ہے۔ مگر صحبت کا نام سن کر ڈر مت جانا وہ تم سے چکی نہیں پسوائیں گے بے فکر رہو۔ بلکہ آسان اور سہل طریق سے دل میں خدا کی محبت پیدا کر دیں گے پھر دل میں ایسی قوت ہوگی کہ نہ بیماری سے گھبرائے گا نہ فقر و فاقہ سے نہ کسی عزیز کے مرنے جینے سے۔

چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام بیماری میں بھی خوش تھے حالانکہ بیماری ایسی سخت تھی کہ تمام جسم میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ اعزہ و اقارب سب نے چھوڑ دیا تھا صرف آپ کی بی بی رحمت علیہا السلام خدمت گزار تھیں اور اسی حالت میں تمام اولاد مر گئی۔ مویشی اور غلام بھی مر گئے پہلے بڑے مالدار تھے اب مفلس ہو گئے تو حضرت رحمت نے عرض کیا کہ اے حضرت! یہ تو بتلاؤ کہ ہم راحت و آرام میں کتنی مدت رہے فرمایا اسی سال۔ فرمایا اسی سال تو کم از کم کلفت برداشت کر لیں۔ پھر حق تعالیٰ سے عرض کریں گے ورنہ یہ کیا کہ بس خدا تعالیٰ کی نعمتیں اسی سال کھائیں۔ چار دن کے لئے اگر وہ آزمائے ہوتو اس سے گھبرا جائیں اور اس کی آزمائش کا تحمل نہ کریں۔

بتلایئے پھر اس سے بڑھ کر کیا راحت ہوگی کہ کلفت نہ رہے راحت ہو جائے۔

خلاصہ یہ کہ دنیا میں مومن کو جس قدر تکالیف پہنچتی ہیں سب کا نعم البدل اس کو دونوں جہان میں ملتا ہے پس درحقیقت یہ ایک تجارت ہے کہ ایک چیز دی گئی اور ایک چیز لی گئی۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو ان شاء اللہ رنج و غم کو ترقی نہ ہوگی۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل صالح کی صبر کی توفیق ہو۔ چونکہ طبیعت مضمحل ہے اس لئے زیادہ بیان کی ہمت نہیں۔ قدر ضرورت پر اکتفا کرتا ہوں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا و مولنا محمد و علیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین.

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین.

الامتحان

آفات سماوی کے متعلق یہ وعظ جامع مسجد کانپور میں یکم ربیع الاول ۱۳۳۷ھ بروز جمعہ منبر پر بیٹھ کر بیان فرمایا۔ احمد عبد الحلیم صاحب لکھنوی نے قلمبند کیا۔ حاضرین کی تعداد ایک ہزار تھی یہ بیان اڑھائی گھنٹے میں ختم ہوا۔

خطبہ ماثورہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ (پ ۲۰)

الٓمّٓ (بعضے مسلمان جو کفار کی ایذاؤں سے شرما جاتے ہیں کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ان کو آزمایا نہ جائے گا)

انعام وابتلاء

یہ تین آیتیں ہیں سورۂ عنکبوت کی جن میں ایک نہایت ضروری مضمون مذکور ہے۔ گو اس کی ضرورت تو ہر وقت ہے مگر بعض اوقات کے ساتھ اس کو زیادہ خصوصیت ہے اور حاصل اس کا ایک غلطی کو رفع کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ جس مضمون سے کسی غلطی کا رفع ہو وہ مضمون نہایت ضروری ہوگا خصوص جب کہ وہ غلطی بہت سے مفاسد کی جڑ ہو تو اس کا رفع اور بھی ضروری ہوگا کیونکہ غلطی کا رفع کرنا گویا مرض کا علاج کرنا ہے اور ہر عاقل جانتا ہے کہ امراض کا علاج نہایت ضروری ہے۔ یہی شان ہے اس مضمون کی کہ اس میں ایسی غلطی کا رفع ہے جو بہت سی غلطیوں کا سبب ہے اور اس

کا حاصل یہ ہے کہ بندہ کے ساتھ خدا تعالیٰ کا جو معاملہ ہے اس کے متعلق کبھی غلطی ہو جاتی ہے کیونکہ معاملات دو قسم کے ہیں ایک موافق طبیعت اور ایک خلاف طبیعت یہ جو موافق طبیعت ہو وہ نعمت ہے اور جو خلاف طبیعت ہو اسے ابتلاء کہنا چاہیئے۔

آگے میں اسی عنوان سے گفتگو کروں گا۔ یعنی موافق طبیعت کو نعمت اور خلاف طبیعت تو ابتلاء کہوں گا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے ساتھ دو قسم کا معاملہ ہوتا ہے کبھی صحت کی حالت ہے کبھی مرض کی۔ صحت انعام ہے اور مرض ابتلاء اسی طرح کبھی ارزانی ہے کبھی قحط تو ارزانی نعمت ہے اور قحط ابتلاء۔ اسی طرح کبھی امن ہے کہ راحت اور اطمینان سے بسر ہوتی ہے۔ بے فکری اور چین سے گزرتی ہے اور کبھی خوف ہے جس میں ہر وقت اندیشہ رہتا ہے جیسے مخالفین کی کثرت یا اعداء کا تسلط وغیرہ ظاہر ہے کہ ہر حالت یا تو موافق طبیعت ہوگی یا خلاف طبیعت۔

ان کے متعلق انسان سے دو قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں جو حالت انعام کی ہے اس کے متعلق تو یہ غلطی ہوتی ہے کہ وہ اسے منفعت محضہ خیال کرنے لگتا ہے اور مضرت کا احتمال ہی نہیں ہوتا۔ جس سے یہ نعمت غفلت و عجلت و کبر اور حق تعالیٰ سے بے فکری اور ناز و معصیت اور لوگوں کی تحقیر اور ظلم کی طرف منجر ہو جاتی ہے۔ اور ان میں بعض صریح معاصی ہیں بعض غیر صریح۔ گویا یہ حالت سبب ہے بہت سے گناہوں کا۔ مثلاً کسی کو اولاد مل گئی یا بہت سا مال مل گیا اور اس کو محض نعمت سمجھ کر بے فکر ہو گیا اور جو مضرتیں اس میں ہیں ان کا احتمال ہی نہیں ہوا۔

کثرت مال کا اثر

مثلاً مال میں یہ مضرت ہے کہ اس سے غفلت عن اللہ پیدا ہوتی ہے ہم نے بہت کم ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کو فراغت نصیب ہو پھر بھی توجہ الی اللہ کی فکر ہو الا ماشاء اللہ۔ مال کے ساتھ تو زیادہ تر خدا سے غفلت بے پروائی، غرباء کی تحقیر، بے رحمی اور ظلم ہی کی زیادت ہوتی ہے چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى (پ ۳۰)

انسان اس لئے سرکشی کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے اب وہ حد سے ہی نکل جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اگر عقل اور تہذیب میں بھی کمی ہو تو بندوں کا مقابلہ کرتے کرتے خدا کا مقابلہ کرنے لگتا ہے۔ فرعون کی سرکشی کی یہی وجہ تھی اس نے کبھی مصیبت اور بلا کی صورت نہ دیکھی تھی چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اس بات کو اپنی مناجات میں ظاہر بھی فرمایا ہے

اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَہٗ زِیْنَۃً وَّاَمْوَالًا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِکَ (پ ۱۱)

''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ یا الٰہی آپ نے فرعون اور اس کے امراء اور وزراء اور ساتھیوں کو دنیا دی۔ زندگی میں کثرت مال اور زیبائش کا سامان عطا کیا ہوا ہے کہ وہ اس کے غرور ونشہ میں آپ کے پسندیدہ راستہ سے بھٹک گئے اور سرکشی میں مبتلا ہو گئے۔''

لیضلوا میں لام عاقبت کا ہے یعنی مال و دولت اور ساز وسامان کی کثرت کا انجام یہ ہوا کہ وہ سرکشی اور طغیانی میں مبتلا ہو گئے اور اپنے ساتھ اوروں کو بھی گمراہ کیا۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کو خطاب ہے کہ فرعون کے پاس جایئے وہ حد سے نکل گیا ہے۔ فرعون کے پاس ملک تھا۔ مال تھا لشکر تھا۔ یہ سب نعمتیں ہیں مگر عقل نہ تھی۔ اس سے اس کو یہ نقصان پہنچا کہ اس نے خدا سے بھی سرکشی کی فرعون عاقل نہ تھا محض آکل تھا۔ یعنی کھانے پینے عیش اڑانے کے سامان اس کے پاس تھے۔

اگر اسی کا نام عقل ہے تو سب سے زیادہ عقل ہاتھی کو ہونا چاہئے۔ اسے جنگل میں دیکھئے کیسی مار دھاڑ کر کے اپنی خوراک بہم پہنچاتا ہے اور خوب کھاتا ہے کوئی جانور اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ سوائے شیر کے کہ کبھی وہ بھی غالب آتا ہے کبھی یہ۔ جہاں یہ چرنے جاتا ہے سب جانور ڈر کر الگ ہو جاتے ہیں۔ اور یہ تمام جنگل مسمار کر دیتا ہے۔ کسی کو اس کے پاس پھٹکنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ تو اگر کھانے پینے مار دھاڑ کرنے ہی کا نام عقل ہے تو سب سے عاقل ہاتھی ہو۔ حالانکہ وہ جانور ہے عاقل نہیں ہے۔

پس معلوم ہوا کہ عقل اور ہی کسی چیز کا نام ہے۔ عقل کے معنی لغت میں روکنے والا ہیں۔ اسی سے عقال رسی کو کہتے ہیں کہ وہ جانور کو بھاگنے سے روکتی ہے تو عقل کا حاصل یہ ہوا کہ وہ ایک ایسی قوت مدرکہ ہے جو مضرت سے روکتی ہے۔

مضرت میں منفعت

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ مضرت کیا چیز ہے اور منفعت کیا چیز ہے۔ سو اصل میں مضرت کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور منفعت کی بھی کیونکہ ہر منفعت میں کچھ نہ کچھ مضرت بھی ہے اور ہر مضرت میں کچھ نہ کچھ منفعت بھی ہے اب عقل کا یہ کام ہے کہ وہ یہ بتادیتی ہے کہ کہاں منفعت کا پہلو غالب ہے اور کہاں مضرت کا۔

مثلاً ایک شخص کو بہت شدت کی پیاس لگی ہوئی ہے حلق خشک ہوا جاتا ہے، دم نکلا جاتا ہے۔

ایسے وقت اس کے پاس صرف دودھ ہے جس میں سے کچھ سانپ بھی پی گیا ہے جس کی وجہ سے زہریلا ہوگیا ہے۔ اب بعض دوست تو یہ کہتے ہیں کہ میاں دودھ پی بھی لو تمہارا حلق تو تر ہو جائے گا اور پیاس تو بجھ جائے گی اور بعض کہتے ہیں کہ اسے ہرگز نہ پینا کیونکہ اس میں زہر ہے اس وقت تو حلق تر ہو جائے گا۔ مگر پھر حیات ہی منقطع ہو جائے گی۔

تو دیکھئے یہاں پر دو باتیں جمع ہیں۔ منفعت بھی ہے کہ پیاس بجھ جائے گی اور مضرت بھی ہے کہ حیات منقطع ہو جائے گی۔ اس وقت عقل یہ فیصلہ کرے گی کہ گو دودھ پی لینے میں قدرے منفعت بھی ہے۔ مگر یہ منفعت معتد بہا نہیں اسلئے نہیں پینا چاہئے۔

الغرض! منفعت قابل اعتبار وہ ہے جو ضرر پر غالب ہو۔ اسی طرح ضرر قابل اعتبار وہ ہے جو نفع پر غالب ہو۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ اس کے ساتھ اور ملایئے کہ دنیا کی منفعت سے آخرت کی منفعت بڑھی ہوئی ہے اور دنیا کی مضرت سے آخرت کی مضرت بڑھی ہوئی ہے دنیا کی منفعت و مضرت آخرت کی منفعت و مضرت کے آگے کوئی چیز نہیں۔ ان دونوں مقدموں کے ملانے کے بعد عقل یہی فتویٰ دیگی کہ جس کام میں دنیا کی منفعت ہو مگر آخرت کی مضرت ہو ایسی منفعت کو چھوڑ کر آخرت کی مضرت سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ اسی طرح کسی کام میں دنیا کی مضرت ہو اور آخرت کی ...... منفعت ہو تو عقل یہ کہے گی کہ اسی چھوٹی سی مضرت کو بڑی منفعت کے لئے گوارا کرنا چاہئے۔ بس یہ ہے اصلی عقل۔

مگر آج کل لوگوں نے دنیا کمانے کا نام عقل رکھ لیا ہے۔ اگر اسی کا نام عقل ہے تو فرعون سب سے زیادہ بڑا عاقل ہوگا مگر اس کا جاہل اور احمق ہونا تمام مسلمانوں کو مسلم ہے بس نعمت کے اندر صرف منفعت کا اعتقاد رکھنا غلطی ہے۔ جب نعمت کے ساتھ خدا سے غفلت ہوئی تو اس کے ساتھ اس سے زیادہ مضرت ملی ہوئی ہے۔

الغرض! کوئی مضرت زیادہ نہ ہو تو منفعت نہ ہو اور کوئی منفعت ایسی نہیں جس میں مضرت نہ ہو لیکن اگر مضرت زیادہ نہ ہو تو منفعت گوارا کر لی جائے گی اور اگر مضرت کا حصہ زیادہ ہو منفعت سے تو منفعت کو ترک کر دیا جائے گا چنانچہ نافع سے نافع دوا اور عمدہ غذا مضرت سے خالی نہیں اور مضر سے مضر دوا اور بدتر سے بدتر غذا منفعت سے خالی نہیں۔

پس تمام ادویہ واغذیہ من وجہ نافع ہوئیں اور من وجہ مضر۔ مگر تمام عقلاء ادویہ واغذیہ کے بارے میں غالب کو دیکھتے ہیں۔ جس میں غلبہ نفع کو ہو اس کو نافع اور جس میں غلبہ ضرر کو ہو اس کو مضر سمجھتے ہیں۔

اسی طرح اعمال وافعال واحوال کو سمجھنا چاہئے کہ وہ بھی من وجہ نافع ہیں اور من وجہ مضر۔ لہذا عقل کا مقتضا یہ ہے کہ دونوں پر نظر کرے یعنی جس کا نافع ہونا ظاہر ہو وہاں مضرت میں غور کرنا چاہئے کہ اس میں کوئی نقصان تو نہیں اور جہاں مضرت ظاہر ہو وہاں معمولی منفعت پر نظر نہ کرنا چاہئے۔

مثلاً سنکھیا ظاہر ہے کہ مہلک ہے اس لئے کوئی عقلمند اس ضرر کو دیکھ کر اس پر نظر نہ کرے گا کہ اس میں یہ نفع بھی ہے کہ خاص ترکیب سے استعمال کرنے سے حرارت غریزیہ کو مشتعل کرتا ہے اور مٹھائی کے منافع ظاہر ہیں کہ کھا کے جی خوش ہوتا ہے خوش ذائقہ اور مرغوب طبائع ہے۔ سو یہاں اس تحقیق کی ضرورت ہے کہ اس میں کچھ ضرر تو نہیں۔

نعمت میں مضرت

چنانچہ تحقیق کے بعد معلوم ہوگا کہ اس میں بعض کے لئے مضرت بھی ہے کہ صفرا پیدا کرتی ہے اور معدہ کو خراب کرتی ہے۔ اسی طرح صحت ایک نعمت ہے جس کی منفعت ظاہر ہے کہ اس سے دل خوش ہوتا ہے قوت درست رہتی ہے۔ طبیعت میں فرحت وانبساط ہوتا ہے۔ کام میں جی لگتا ہے۔ نیز فراغت وتمول بھی نعمت ہے اور اس کی منفعتیں بھی ظاہر ہیں۔ ان میں اس بات کی تحقیق کی ضرورت ہے کہ منفعت کیساتھ کوئی مضرت تو نہیں۔ چنانچہ تحقیق سے معلوم ہوگا کہ ان میں ایک مضرت بھی ہے اور بہت بڑی ہے وہ یہ کہ کبر، ناز، عجب، غرور، غفلت، غریبوں کی تحقیر، کمزوروں پر ظلم، یہ انہی دو نعمتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ان مضرتوں کا مقتضا یہ نہیں ہے کہ ان کو نعمت ہی نہ سمجھے اور ناشکری کرے کیونکہ یہ مضرتیں غنا اور صحت کے لئے لازم بالذات نہیں ہیں بلکہ ہماری کم عقلی کی وجہ سے انکو لازم ہو گئی ہیں پس وہ نعمت تو ضرور ہیں تو اب ضرورت اس کی ہے کہ ان نعمتوں کی منفعت سے مستفید ہو اور مضرت سے بچنے کی کوشش کرے۔

اسی طرح مثلاً مرغ کا گوشت کھانا ظاہر میں نافع ہے کہ اس میں لذت بھی ہے فرحت بھی ہے۔ یہ منفعت بھی ہے کہ حرارت غریزیہ بڑھاتا ہے مگر اس کے ساتھ مضرت پر نظر کرنا چاہئے۔ وہ یہ کہ کثرت سے اس کا گوشت کھانا مورث بواسیر ہے کیونکہ اس میں حرارت زیادہ ہے اس ضرر کا تدارک یہ ہے کہ دھنیا وغیرہ ڈال کر حرارت کی تعدیل کر لی جاوے اور کثرت سے نہ کھایا جائے۔

الغرض نعمتوں میں مضرتوں کی تحقیق سے مقصود یہ ہے کہ ان مضرتوں کا انسداد کیا جاوے۔ نہ یہ کہ نعمتوں کی تحقیر کر کے منعم کی ناشکری کی جاوے۔ مثلاً خدا نے کسی کو بے فکری سے کھانے کو دیا تو

یہ نعمت ہے اور اس میں مضرت عجب و نازکی ہے۔ اس کا علاج اور تدارک یہ ہے کہ تدبر اور تفکر سے کام لے اور سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر محض اپنا فضل فرمایا ہے ورنہ میں بالکل نااہل تھا مجھ میں کوئی کمال بھی نہ تھا۔ بلکہ اپنے گناہوں پر نظر کر کے سوچے کہ میں تو سزا کا مستحق تھا اور اگر بالفرض مجھ میں کوئی کمال بھی تھا تو مجھ سے بہت زیادہ کمال رکھنے والے پریشان حال پھرتے ہیں پھر اس کا فضل ہی تو ہے جو اس نے مجھے ان نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ اب میں ناز کس بات پر کروں ؎

اگر روزی بد انش برفزود ے		زناداں تنگ تر روزی تر نبودے

''اگر روزی عقل کے ساتھ بڑھتی تو بے عقل سے زیادہ تنگ دست کوئی نہ ہوتا۔''

بہت لوگ جاہل ہیں مگر تعلیم یافتہ لوگوں سے زیادہ متمول ہیں۔

جہالت اور دولت

چنانچہ ایک صاحب بڑے امیر کبیر میرے پاس آئے بڑی دور سے آئے تھے مگر عقل خاک نہ تھی۔ نہایت سادہ لوح تھے وہ میرے پاس اپنی بیوی کو زندہ کرانے آئے تھے۔ ان کے ساتھ نوکر چاکر یار دوست سب ہی تھے۔ مگر امراء کے مصاحب بڑے خود غرض ہوتے ہیں۔ ایک نے بھی تو ان سے یہ نہ کہا کہ کس خبط میں پڑے ہو کہیں مردہ بھی کسی کے ارادہ سے زندہ ہوسکتا ہے وہ بھی یہ سوچ کر ساتھ آ گئے کہ اچھا ہے مزے سے سیر ہی کریں گے۔ یہاں آ کر رئیس صاحب نے مجھ سے اپنی غرض ظاہر کی مجھے ہنسی آئی اور ان کو بہت سمجھایا مگر کسی طرح نہ سمجھے اور کہنے لگے کہ اولیاء اپنی کرامت سے زندہ کر سکتے ہیں۔ میں نے قسم کھائی اور کہ اول تو میں ولی نہیں دوسرے اولیاء کی کرامت اختیار میں نہیں ہوتی۔ بیچارے میرے سامنے ساکت تو ہو گئے مگر علیحدہ جا کر اپنے مصاحب سے کہنے لگے کہ مولانا زندہ تو کر سکتے ہیں مگر مصلحت کے خلاف ہوگا اس لئے نہیں کرتے۔

اس کے بعد ان کی ایک حکایت اس سے بھی عجیب معلوم ہوئی کہ ایک مرتبہ سالی سے کچھ تکرار ہوگئی اور باہم نزاع ہو گیا۔ مقدمہ بازی کی نوبت آئی تو آپ ناراض ہو کر اپنی بیوی کی قبر پر اس قصہ کی اطلاع کرنے پہنچے کہ تمہاری بہن نے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا۔ قبر پر پہنچ کر نوکر کے ذریعہ سے پیغام دلوایا کہ ان سے کہو کہ شیخ صاحب کا تم کو یہ حکم ہے کہ چونکہ تمہاری بہن نے ہمیں ناراض کر دیا ہے۔ اگر وہ کچھ ثواب بھیجیں تو تم ہرگز ہرگز نہ لینا۔ اگر تم نے ان کا ثواب بھیجا ہوا لیا تو ہم تم سے ناراض ہو جائیں گے۔ پھر آئندہ اور کچھ بھیجنا تو در کنار پچھلا بھیجا ہوا بھی چھین لیں گے

پھر تم بھوکوں مرجاؤ گی (معلوم نہیں اب دوبارہ کیوں کر مرے گی خدا بچائے جہالت سے) نوکر کہتا تھا کہ مجھے شرم آئی کہ قبر پر کھڑا ہو کر یہ خرافات کیسے کہوں۔ مگر پیٹ کی ضرورت سے کہا۔

اب تیسری عقلمندی یہ دیکھئے کہ جب پیغام دلوا چکے تو نوکر سے پوچھتے ہیں کہ کچھ جواب آیا کہ نہیں۔ اس نے کہا نہیں تو آپ نے حکم دیا کان لگا کر اچھی طرح سنو اس نے پھر سنا اور کہا اب تک جواب نہیں آیا۔ اچھا تم قبر کے برابر لیٹ جاؤ اور پھر کان لگاؤ۔ بیچارہ مجبور ہو کر قبر کے برابر لیٹا۔ پوچھا! کچھ جواب آیا کہا نہیں (وہاں کچھ ہو تو جواب آئے) کہنے لگے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ادھر متوجہ نہیں ہیں۔ شاید کسی کام میں ہوں۔ نوکر کہتا تھا کہ اس کے بعد میں نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ اب ان کے ساتھ قبرستان نہیں جاؤں گا۔ کون ان کے ساتھ یہ مجنونانہ حرکات کرے تو ان امیر صاحب کی عقل کا تو یہ حال تھا مگر مال و دولت بہت کچھ تھا۔ سچ ہے

کم عاقل عاقل اعیت مذاهبه　　　وجاهل جاهل تلقاه مرزوقا

''بہت سے عقل مند ایسے ہیں جو کہیں جا نہیں سکتے اور بہت سے جاہل ایسے ہیں جن کے بے شمار رزق ہے۔''

هذا الذی ترک الاوهام حائرة　　　وصيرا العالم النحرير زنديقا

''اس نے اوہام کو حیران کر چھوڑا اور بڑے بڑے عالموں کو ملحد بنا چھوڑا''

رزق اور عقل

مولانا رومیؒ نے ایک عاقل کی حکایت تحریر فرمائی ہے کہ پا پیادہ جنگل میں چلا جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک بدوی اونٹ پر سوار ملا۔ اس سے پوچھا کہ میاں اس اونٹ پر کیا لا در کھا ہے کہا ایک طرف گیہوں اور ایک طرف بالو۔ پوچھا یہ کیوں؟ کہا ایک طرف گیہوں بھر دیئے تھے دوسری طرف کی بوری خالی تھیں وزن برابر کرنے کو اس میں بالو بھر دی۔ عاقل نے کہا اس کی کیا ضرورت تھی۔ ہم تمہیں آسان ترکیب بتا دیں۔ میاں بالو کو تو...... پھینک دو اور گیہوں کے دو حصے کر کے آدھے ایک بوری میں بھر دو آدھے دوسری بوری میں۔ اس میں اونٹ بھی ہلکا رہے گا اور وزن بھی برابر ہو جائے گا۔ سوچ کے کہنے لگا واقعی بات تو بہت ٹھیک بتائی۔ چنانچہ اونٹ کو بٹھایا اور بالو پھینک کر دونوں طرف آدھے آدھے گیہوں بھر دیئے۔ اب اونٹ بھی ہلکا ہونے کیوجہ سے زیادہ رفتار سے چلنے لگا۔ تو بدوی اس عاقل کا بہت شکر گذار ہوا اور اسکو پیادہ پا پریشان دیکھ کر کہا آؤ ہم تم

کو بھی سوار کرلیں چنانچہ اس کو سوار کر کے آگے چلا۔ پھر دل میں سوچا کہ جس کی اتنی بڑی عقل ہے یہ تو بڑا مالدار ہوگا (وہ بیوقوف عقل پر رزق کا مدار سمجھتا تھا) کیونکہ جب میرے پاس باوجود بے وقوف ہونے کے ایک اونٹ ہے تو نا معلوم اس کے پاس کتنے ہوں گے۔

غرض! نہ رہا گیا اور اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس کتنے اونٹ ہیں؟ کہا ایک بھی نہیں۔ پوچھا بکریاں کتنی ہیں کہا ایک بھی نہیں پھر پوچھا آخر کچھ ہے بھی کہا کچھ نہیں (وہاں تو ایک گدھا بھی نہ تھا اونٹ، گائیں اور بکریاں کہاں سے آتیں) کہنے لگا معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری عقل بڑی منحوس ہے۔ میں ایسے منحوس کو اپنے اونٹ پر بھی نہیں بٹھلاتا۔ یہ کہہ کر اسے اتار دیا۔ پھر کہنے لگا بھائی سنو! میں تمہاری رائے کو بھی قبول نہیں کرتا کہیں تمہاری رائے کی نحوست سے میں بھی تم جیسا نہ ہو جاؤں۔ ایک بوری میں گیہوں اور ایک میں بالو بھر کے چل دیا۔ عقل کی برکت تو ظاہر ہوگئی کہ اونٹ سے بھی اتارے گئے۔

اب سمجھ لیجئے کہ رزق کا مدار عقل پر نہیں ورنہ زیادہ عقل والے کم عقلوں سے زیادہ مالدار ہوتے۔ حالانکہ زیادہ عقل والے آپ کے سامنے موجود ہیں اور بہت پریشان ہیں لیاقت سے رزق ملنا قارون کا عقیدہ ہے۔

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے جب اس سے کہا کہ اَحۡسِنۡ كَمَآ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ یعنی زکوٰۃ دے خدا کی اطاعت کر۔ بندگان خدا کے کے ساتھ احسان کر۔ جس طرح خدا نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو اس کے جواب میں وہ کہتا ہے اِنَّمَآ اُوۡتِيۡتُهٗ عَلٰى عِلۡمٍ عِنۡدِىۡ

''کہ مجھے (خدا نے نہیں دیا) بلکہ ایک ہنر کی دولت مجھے یہ سب کچھ حاصل ہوا ہے۔''

بعض اہل علم نے کہا ہے کہ وہ ہنر کیمیا تھا۔ بعض نے کہا تجارت میں مہارت تھی۔ بعض نے کہا امور سیاسیہ میں کامل تھا اور دربار فرعون کا مشیر تھا۔

غرض! کسی نہ کسی ہنر میں وہ ماہر تھا وہ اس زمانہ کے اعتبار سے بہت بڑی لیاقت رکھتا تھا۔ اس پر اسے ناز تھا کہ اپنے تمول کو اسی کی طرف منسوب کیا اور اسی کی طرف منسوب کرنے کا مفسدہ یہ ہوا کہ اسے کسی کی پرواہ نہ رہی جہاں تک کہ خدا کی بھی پرواہ نہ رہی فرعون نے بھی یہی کہا تھا۔

دولت اور غفلت

اس زمانہ میں بھی بہت سے لوگ فرعون اور قارون کے ہم خیال ہیں۔ میرے وطن ہی کا قصہ ہے کہ وہاں ایک مسلمان خوش حال ہے اور نماز و روزہ کا بہت پابند ہے۔ اس کے عزیزوں

میں اور ایک بوڑھا نہایت جاہل ہے (اس کا نام لے) کہنے لگا کہ فلانے کی عقل ماری گئی ہے جو پانچوں وقت ہاتھ پسار پسار کر دعا کرتا ہے۔ ارے سرے تجھے ہاتھ پسارنے کی کیا ضرورت ہے کیا تیرے پاس کھانے کو نہیں پہننے کو نہیں (معاذ اللہ) گویا دعا کرنے کی ضرورت روٹی کپڑے ہی کے واسطے تو ہے کہ جس کو روٹی کپڑا مل جائے وہ دعا نہ کیا کرے اور اگر دعا اسی کے لئے ہو تب بھی مالدار کو دعا کی ضرورت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جیسا دیا ہے وہ چھین بھی سکتا ہے وہ رزق دے کر مجبور نہیں ہو گیا کہ دے چکا تو اب چھین نہیں سکتا۔ اللہ کی تو بڑی شان ہے ایک چور کو بھی یہ قدرت ہے کہ اسکے گھر میں نقب لگا کر ابھی سارا مال ختم کر دے۔

غرض! ذرا سے تغیر میں مال ختم ہو جاتا ہے مثلاً کوئی مقدمہ قائم ہو جائے یا کوئی بیماری ایسی آجاوے کہ سارا روپیہ حکیم اور ڈاکٹر کی فیس ہی میں خرچ ہو جائے۔ مال کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔ یہ تو ذرا سے بہانہ میں نکل جاتا ہے اسی لئے عربی میں مثل مشہور ہے:

المال غادو رائح مال آنے جانیوالی چیز ہے

ان باتوں کو سوچ کر سمجھنا چاہئے کہ یہ جو کچھ مال و دولت میرے پاس ہے اس میں میرا کچھ بھی دخل نہیں محض خدا تعالیٰ کا عطیہ ہے خالص اسی کا فضل ہے کہ مجھ سے اچھے اچھے میرے تابع اور دست نگر ہیں یہ ہے علاج غفلت کا اسی طرح تکبر کہ غرباء سے بات نہیں کرتے۔ امراء انہیں ذلیل سمجھتے ہیں الا ماشاء اللہ! بعض سمجھدار ایسے بھی ہوتے ہیں جو

نہد شاخ پر میوہ سر بر زمین ''میووں سے بھری شاخ زمین پر سر رکھ دیتی ہے''

کا مصداق ہیں کہ باوجود امارات اور دولت کے نہایت متواضع ہیں مگر غالب حالت اس کے خلاف ہی ہے ان متکبروں کو سمجھنا چاہئے کہ تم کس پر تکبر کرتے ہو۔ حقیقت میں تم ایسی چیز پر تکبر کرتے ہو جس کا حصول تمہارے اختیار میں نہیں اور حصول تو کیا اختیار میں ہوتا اس کا ابقاء بھی تو اختیار میں نہیں۔

تکبر کا عملی علاج

پھر ایسی چیز پر تکبر کرنے سے کیا فائدہ؟ یہ تو تکبر کا علمی علاج ہے اور عملی علاج یہ ہے کہ غرباء کی تعظیم و تواضع کریں خوشی سے نہ ہو سکے تو بہ تکلف ہی کریں۔ انسے خوش خلقی اور نرمی اور شیریں کلامی سے پیش آئیں وہ جب ملنے آئیں تو کھڑے ہو جایا کریں ان کی دل جوئی کریں۔ علیٰ ہذا القیاس۔

ہر مرض کا ایک خاص علاج اسی کے مناسب ہوتا ہے اور اس کی بہت سی کتابیں ہیں مثلاً

احیاء العلوم اور اربعین عربی میں، کیمیائے سعادت فارسی میں اور مذاق العارفین اردو میں موجود ہے۔ اربعین اور کیمیائے سعادت کا اردو ترجمہ تبلیغ دین اور اکسیر ہدایت ہے انکا مطالعہ کرنا چاہئے۔ان کے دیکھنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہر مرض کی شرح اور اسکا علاج معلوم ہو جائے گا اور اس سے یہ نفع ہوگا کہ بہت سے مفاسد سے آپ بچ سکیں گے۔

اسی طرح نعمت میں بھی مضرت کی تحقیق سے یہ فائدہ ہوگا کہ اس مضرت سے حفاظت ہو سکے گی۔ابتلاء کی مضرت تو ظاہر ہے۔مثلاً قحط ہے کہ اس سے تکلیف ہوتی ہے۔بہت غریب بھوکوں مر جاتے ہیں اچھے اچھے گھر تباہ ہو جاتے ہیں۔اور بڑے بڑے امیر مقروض ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح خوف میں پریشانی اور دھڑکا ہے کہ جنگ کا نہ معلوم کیا اثر ہو دشمن ہم پر غالب آ جائیں تو ہلاکت اور بے آبروئی کا سامنا ہے۔اسی طرح بیماری کہ جو بیمار ہے وہ تو تکلیف میں ہے ہی اور جو بیمار نہیں تو اگر مرض خاص ہے تو اوپر والوں کو تیمارداری کی تکلیف ہے اور امراض عامہ میں وحشت و دہشت بھی ہے۔وباء طاعون، بخار، انفلوئنزا میں ایک ایک محلّہ کے پانچ پانچ چھ چھ گھر ویران ہو گئے۔ ان میں تالے پڑ گئے تو ایسے واقعات میں زیادہ پریشانی ہوتی ہے۔ان کی مضرت تو ظاہر ہے ہی۔

مگر ہماری غلطی یہ ہے کہ ان واقعات کی منفعت پر نظر نہیں کرتے مضرت تو کھلی ہوئی ہے مگر ہم کو ان کی منفعت پر اصلاً التفات نہیں تو خوب سمجھ لیجئے کہ ان میں نفع بھی ہے اور اتنا بڑا نفع ہے کہ نعمت میں بھی نہیں مگر ہماری غفلت ملاحظہ ہو کہ ادھر توجہ ہی ہیں۔

خدا سے بے تعلقی

سبب اس کا یہ ہے کہ خدا سے بے تعلقی ہے اس سے محبت نہیں ہے نہ ان کی محبت کا علم ہے جو ان کو بندہ کے ساتھ ہے نہ اجمالاً نہ تفصیلاً۔اگر انسان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو اور دل میں ان کی عظمت ہو اور اس کا بھی علم ہو کہ اللہ تعالیٰ کو ہم سے محبت ہے وہ بندوں کے خیر خواہ ہیں۔اگر یہ علم تفصیلی نہ بھی ہو صرف اجمالاً ہی ہو تو بندہ اتنا ہی سمجھے کہ جب اللہ تعاولیٰ ایسے کریم خیر خواہ اور رحیم ہیں اور حکیم بھی ہیں تو انہوں نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہوگا بہتر ہی کیا ہوگا۔

دیکھئے ماں کو اولاد سے محبت ہوتی ہے تو وہ اپنی اولاد کے ساتھ کبھی برائی نہیں کرتی۔اگر وہ کسی وقت بچہ کو کوئی تکلیف دیتی ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ماں اپنے بچہ کو کوئی منفعت پہنچانا چاہتی ہے جو بدوں تکلیف کے حاصل نہیں ہو سکتی۔تو خدا تعالیٰ تو ماں سے زیادہ رحیم ہیں۔وہ بھلا بغیر آپ کی منفعت کے

آپ کو تکلیف کیوں دیں گے۔ بلکہ ماں کی تکلیف میں تو شبہ ہے کہ شاید اس نے غلطی کی ہو اور جس نفع کے لئے وہ تکلیف دے رہی ہے وہ نفع مرتبہ نہ ہو یا ویسے ہی غصہ میں بے قصور، بلاوجہ تکلیف دے رہی ہو مگر خدا کی جناب میں تو یہ شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ رحیم بھی ہیں اور ماں رحیم تو ہے مگر حکیم نہیں۔

رحمت عامہ اور نافرمان

ایک غزوہ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جارہے تھے کہ ایک عورت کو آگ سلگاتے ہوئے دیکھا۔ اسکا بچہ بھی پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کو آگ سے بچاتی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ منظر دیکھ کر صحابہ سے فرمایا تمہارے خیال میں یہ بات آسکتی ہے کہ یہ عورت اپنے بچہ کو آگ میں ڈال سکتی ہے صحابہ نے عرض کیا نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بخدا اللہ تعالیٰ کو اپنے بندہ سے ماں سے بھی زیادہ محبت ہے۔

بھلا سنئے! جو لوگ اطاعت کرنے والے ہیں ان سے تو خدا کو محبت کیوں نہ ہو۔ خدا کی رحمت تو نافرمان کے ساتھ بھی بہت کچھ ہے۔ کیا خدا کو یہ قدرت نہیں کہ بجلی گرا کے سب نافرمانوں کو ایک دم سے ہلاک کردے مگر ہلاک کرنا تو کیسا اکثر کوئی ظاہری تکلیف بھی تو ظالموں کو نہیں ہوتی۔

فرعون، قارون، سامری ان سب کو دیکھئے کیسے نافرمان تھے۔ مخلوق کو تکلیفیں ان سے پہنچیں انبیاء کے دل ان سے دکھے مگر ان کے سر میں کبھی درد بھی نہ ہوا۔ اور دنیا کی دولت سے اخیر تک مالا مال رہے۔ شیخ سعدیؒ نے سچ کہا ہے اور خوب کہا ہے

اے کریمے کہ از خزانہ غیب   گبرو ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں راکجا کنی محروم   تو کہ بادشمناں نظر داری

"اے بخشش کرنے والے تو اپنا خزانہ غیب سے یہودی اور آتش پرست تک کو روزی دیتا ہے۔ پھر تو اپنے دوستوں کو اپنے الطاف سے کیونکر محروم کرے گا جب کہ تو دشمنوں پر بھی نظر رکھتا ہے۔"

اگر کوئی نوکر ہماری نافرمانی کرے تو ہمارا بس چلے تو بدوں خون پئے نہ رہیں اور اسی پر اکتفا نہ کریں۔ بلکہ اس کے ساتھ اس کے خاندان بھر سے انتقام لیں پھر بھی دل ٹھنڈا نہ ہو۔ تو کیا خدا تعالیٰ اپنے نافرمانوں کو برباد نہیں کرسکتے ان کو کون چیز مانع ہے مگر باوجود اس قدرت وعظمت کے انکی تو یہ شان ہے۔
گنہ بیندو پردہ پوشد بحلم "ہمارے گناہ دیکھتے ہیں مگر پردہ پوشی کرتے ہیں کیونکہ وہ حلیم ہیں۔"

یعنی نافرمان پر سزا دینی کیسی۔ فضیحت بھی تو نہیں کرتے۔ بلکہ وہی سواریاں ہیں وہی آرام و عیش ہے بلکہ نافرمانوں کو مال و دولت اتنا دیتے ہیں کہ دیکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انکو زیادہ چاہتے ہیں اللہ اللہ کیا ٹھکانہ ہے حلم کا دشمنوں کو بھی روزی دیتے ہیں کہ خوب کھاؤ اوراسی واسطے دیتے ہیں کہ شاید توبہ کرلیں۔ یہ ہے رحمت عامہ۔ مگر باوجودیکہ لوگ توبہ نہیں کرتے اس پر بھی رحمت کم نہیں ہوتی۔ بلکہ برابر روزی اور مال و دولت دیتے رہتے ہیں کہ شاید باز آجائیں۔

مصائب اور فرمانبردار

جب نافرمانوں کے ساتھ یہ رحمت ہے تو فرماں برداروں کے ساتھ کس قدر ہوگی۔ اب اگر کسی وقت ان کو کچھ تکلیف پیش آتی ہے تو وہ ضرور کسی ایسے نفع کے لئے ہے جو سلسلہ اسباب میں بدوں اس تکلیف کے حاصل نہیں ہوسکتا اور اسکا حاصل ہونا ہے بہت ضروری۔ اسلئے بندہ کو تکلیف میں مبتلا کیا جاتا ہے۔

دیکھئے کسی بچہ کے دنبل نکل آئے تو ماں کیا کرے گی۔ یقیناً اس میں نشتر دلوائے گی۔ گو بچہ کو کتنی ہی تکلیف ہو اور وہ کتنا ہی روئے اور آپ بھی اس وقت دیکھ کر یہی کہیں گے کہ ماں کی خیر خواہی کا مقتضاء یہ ہے کہ وہ اس وقت بچے کے رونے کی پروانہ کرے اور دنبل کا اپریشن کرادے مگر بچہ سے پوچھئے تو وہ کہے گا کہ ماں سے زیادہ میرا بدخواہ اور دشمن کوئی نہیں ہے کہ اپنے سامنے میرا بدن لہولہان کرا رہی ہے مگر عاقل سمجھتا ہے کہ ماں کو تکلیف دینا مقصود نہیں ہے بلکہ رفع تکلیف مقصود ہے اور اس لیے تھوڑی سی تکلیف ضروری تھی۔ راحت اس کے بعد ہوگی۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

طفل مے لرزد ز نیش احتجام مادر مشفق ازاں شد شاد کام

خون نکالنے والے کے نشتر سے بچہ کانپ جاتا ہے اور مہربان ماں اسی سے خوش ہوتی ہے۔

بھلا نشتر لگانا تو بڑی بات ہے۔ بچے تو سر منڈاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں چنانچہ کوئی بچہ شرارت کرتا ہو اور اس سے یہ کہئے کہ اچھا ہم نائی کوئی بلاتے ہیں وہ تمہارے سر پر استرا چلائے گا۔ بس مارے ڈر کے ساری شرارت بھول جاتے ہیں مگر وہی نشتر لگانے والا جس کے فعل کو بچے بدخواہی پر محمول کرتے ہیں اور اس کے نام سے سہمتے ہیں ان کے باپ سے کہتا ہے کہ لایئے حضور انعام دلوایئے۔

دیکھئے میں نے کس صفائی سے کام کیا ہے باپ کہتا ہے اچھا لو پانچ روپے لے لو۔ وہ کہتا ہے نہیں حضور یہ تو تھوڑے ہیں۔ وہ کہتا ہے اچھا دس روپے لے لو۔ پھر نشتر کے بعد غسل صحت ہوتا ہے تو اسے

جوڑا اور خلعت ملتا ہے۔ مگر لڑکا یہ سمجھتا ہے کہ سب نے مل کر مجھے تو ذبح کرایا اور خود خوشیاں منا رہے ہیں۔

اب بتلایئے اس بچہ کے متعلق آپ کیا فتویٰ دیں گے یقیناً یہی کہیں گے کہ لڑکا احمق ہے اسکا یہ گمان غلط ہے کیونکہ جسے ذبح کرانا سمجھتا ہے اسی کی بدولت آج یہ خوشی نصیب ہوئی۔ اگر وہ ذبح نہ کرایا جاتا تو شاید یہ دن نصیب نہ ہوتا۔ بلکہ قبر میں پہنچ چکا ہوتا۔

اب خدا تعالیٰ کے ساتھ ہمارا جو برتاؤ ہے اس کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ معاذ اللہ ہم لوگوں کا بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ اس احمق لڑکے کا سا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ ہمیں بلا وجہ بلا ضرورت خواہ مخواہ تکلیف دی ہے اس تکلیف میں ہماری کوئی منفعت نہ تھی۔ حالانکہ یہ بھی اپریشن ہی ہے والدین بچے کے دنبل کا اپریشن کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قلوب کا اپریشن کرتے ہیں جب کہ دلوں میں غفلت بڑھ جاتی ہے۔ اور گناہوں کی ظلمت سے دل پر پردے پڑ جاتے ہیں تو مصیبت اور بلا کے نشتر سے دلوں کا خراب مادہ نکالا جاتا ہے اور ان کی اصلاح کی جاتی ہے۔ پس یہاں بھی بالفعل تکلیف ہے اور وہاں بھی مگر انجام دونوں کا راحت ہے۔

قرب قیامت

فرق اتنا ہے کہ وہاں راحت قریب ہے کہ پندرہ بیس ہی دن میں دنبل میں نشتر دینے کے بعد صحت ہو جاتی ہے اور یہاں بعید ہے کہ قیامت میں اس کا ظہور ہوگا جب کہ مصائب کا ثواب ملے گا مگر قیامت کو ہم لوگ دور سمجھتے ہیں ورنہ حقیقت میں وہ بہت ہی قریب ہے۔

انهم یرونه بعیداً ونره قریباً۔ (پ۲۹)

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اس دن کو دور سمجھتے ہیں اور ہم نزدیک سمجھتے ہیں۔''

تو آپ چاہے اس کو بعید ہی سمجھئے مگر خدا تعالیٰ کے نزدیک تو قریب ہے اور اس میں کچھ تعجب کی بات نہیں کہ ایک چیز آپ کے نزدیک دور ہو اور خدا کے نزدیک قریب ہو۔

دیکھئے چیونٹی کے نزدیک ایک فرلانگ اتنا دور ہے جتنا آپ کے نزدیک یہاں سے امریکہ اور آپ کے نزدیک ایک فرلانگ بہت ہی قریب ہے اسی طرح خدا کے نزدیک وہ میعاد بہت قریب ہے۔

اگر اس مثال کے بعد کسی کی سمجھ میں قیامت کا قریب نہ آوے تو وہ یوں سمجھ لے کہ قیامت کبریٰ گو دور سہی مگر قیامت صغریٰ یعنی موت تو قریب ہے کیونکہ زندگی کا ایک لمحہ کے لئے بھی بھروسہ نہیں کوئی آج مرا تو بس اسی وقت سے سزا و جزا کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اس کے لئے تو

قیامت آ گئی قیامت کبریٰ ہی میں کیا ہوگا۔ یہی سزا و جزا تو ہوگی۔ بس قیامت کے دن اسی سزا و جزا میں ذرا وسعت ہوجائے گی۔

یہاں سے ایک اور بات بھی سمجھ لو کہ یہ جو بد دین لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر آواگون (تناسخ) نہ ہو تو یہ اشکال لازم آتا ہے کہ مجرم نے جرم تو کیا اب اور سزا ملے گی ہزاروں برس کے بعد۔

تو اول تو اس تقریر کے بعد یہ اشکال لازم نہیں آتا کیونکہ موت بھی...... قیامت کا مقدمہ ہے۔ سزا و جزا کا سلسلہ اس کے بعد ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور اگر مان لیا جائے کہ جزا و سزا ہزروں برس کے بعد ہوگی تو کیا دنیا میں ایسا نہیں ہوتا کہ باوجود جرم ثابت ہو جانے کے پھر بھی مجرم کو مہلت دی جاتی ہے کہ ہم تو برابر ایسے واقعات دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں کہ ایک شخص نے آج قتل کیا اور چار ماہ بلکہ چار سال کے بعد پھانسی ہوئی اور اس تاخیر کی وجہ سے صرف عدم ثبوت جرم نہیں بلکہ ثبوت جرم کے بعد بھی مہلت دی جاتی ہے ثبوت کے بعد بھی اپیل اور پیروی کی اجازت دی جاتی ہے۔

جب دنیا کے حکام ایسا کرتے ہیں اور ان کا یہ فعل نظر استحسان دیکھا جاتا ہے تو خدا کے یہاں ایسا ہونے میں کیوں تعجب ہوتا ہے۔ ہاں جرم موجب سزا کی پاداش میں سزا یا اچھے کام کے صلہ میں جزا نہ ملنا البتہ موجب اشکال اور اعتراض کے قابل ہے (جس کا وہاں وہم بھی نہیں ہوسکتا) لیکن سزا و جزا کی تاخیر میں عقلاً و عادتاً کوئی اشکال یا اعتراض نہیں ہوسکتا۔ الغرض مرنے کے بعد ہی سلسلہ جزا و سزا شروع ہوجاتا ہے۔

اعمال کی لذت وکلفت

برزخ کی لذت یا کلفت بھی کامل ہوتی ہے گو قیامت کی لذت وکلفت سے کم ہو تو قیامت کی لذت کلفت اکمل ہوگی۔ کیونکہ سزا و جزا میں ترقی قیامت ہی کو ہوگی۔ پس آخرت کو دور نہ سمجھو کیونکہ موت ہی آخرت کا پیش خیمہ ہے۔ اور اگر موت بھی کسی کو دور معلوم ہوتی ہو تو میں ترقی کر کے یہ کہتا ہوں کہ موت سے بھی پہلے اعمال کی لذت یا کلفت حاصل ہوجاتی ہے۔ مگر اس دعوے کے سمجھنے کے لئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے۔

مقدمہ یہ ہے کہ یہ تو ساری دنیا کو مسلم ہے کہ نیم کی پتی تلخ ہوتی ہے اور مٹھائی شیریں۔ لیکن اگر نیم کی پتی مار گزیدہ کو کھلایئے اور اس سے پوچھئے کہ مزہ کیسا ہے تو وہ کہے گا میٹھی ہے۔ کیونکہ قاعدہ یہی ہے کہ مار گزیدہ کو زہر کے اثر سے نیم کی پتی میٹھی معلوم ہوتی ہے۔

اگر کسی کو سانپ کے کاٹنے کا شبہ ہو گیا ہو تو نیم کی پتی چبا کر دیکھے اگر میٹھی معلوم ہو تو شبہ صحیح ہے اور اگر کڑوی معلوم ہو تو شبہ غلط۔ تو کیا؟ اس کے میٹھا کہنے سے تلخی کا عام حکم غلط ہو گیا ہرگز

نہیں۔ وہ حکم تو صحیح ہے بلکہ اسکی قوت مدرکہ سانپ کے زہر سے خراب ہوگئی ہے اس لئے یہی کہا جائے گا کہ اس کا ذائقہ درست نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کسی پر صفرا غلب ہو تو اسکو مٹھائی کڑوی معلوم ہوگی۔ یہاں بھی مٹھائی کی شیرینی کا عالم حکم صحیح ہے مگر غلبہ صفرا کی وجہ سے اس کے ذائقہ کی غلطی ہے کہ ایک شے کے مزے کا واقع کے خلاف ادراک کر رہا ہے۔ الغرض! ذوق صحیح ہو تو یقیناً نیم کی پتی کڑوی و مٹھائی شیریں معلوم ہوگی۔

اب دعویٰ کرتا ہوں اور بقسم کہتا ہوں کہ کوئی طاعت فوراً جزا سے خالی نہیں ہوتی۔ اسی طرح کوئی معصیت فوراً سزا سے خالی نہیں ہوتی۔ مگر اس کے لئے ذوق کے صحیح ہونے کی ضرورت ہے۔ اہل ذوق کو طاعت سے اس قدر انبساط اور فرح ہوتا ہے جیسا انبساط قریب قریب جنت میں ہوگا اور اس وقت دنیا کی سلطنت کی بھی ان کی نظروں میں کچھ حقیقت نہیں ہوتی مگر ہمیں یہ انبساط اور فرح کیسے ہو۔

ہم کو تو دنیا کے سانپ نے ڈس لیا ہے جس سے مذاق ہی بگڑ گیا ہے ہم بھی ذوق پیدا کر لیں تو اس کی لذت محسوس ہو۔ اسی طرح معصیت سے قلب میں اس قدر تنگی اور پریشانی ہوتی ہے کہ سر پر ہزاروں تلواریں پڑیں تب بھی ایسی کلفت نہ ہو۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

بر دل سالک ہزاراں غم بود — گر ز باغ دلخلا لے کم بود

''سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں اگر دل کے باغ سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے۔''

یہ تو اس کلفت کا بیان تھا جو معصیت و غفلت کی وجہ سے قلبی کیفیت کے گھٹنے سے پیدا ہوتی ہے اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کا نور کم...... ہوگیا، سیاہ ہوگیا۔ اطاعت کی لذت کو ایک عارف کہتے ہیں۔

بفراغ دلز مانے نظرے بماہ روئے — بہ ازآں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

''دل کی فرصت کے ساتھ ایک لمحہ محبوب پر نظر کرنا چتر شاہی اور ہر روز کی بک بک سے بہتر ہے۔''

یعنی ایک ساعت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف اطمینان سے توجہ میسر ہو جائے تو اس کے آگے سلطنت بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس کو خاقانی یوں کہتے ہیں۔

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی — کہ یک دم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

تیس سال کے بعد یہ حقیقت خاقانی پر ظاہر ہوئی کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ایک لحظہ بھی ملک سلیمانی سے بہتر ہے۔

اہل اللہ کا استغناء

یہ مت سمجھو کہ طاعت کی لذت آخرت ہی میں ملتی ہے آخر اہل اللہ جو ساری دنیا کو چھوڑ کے خوش خوش اور مگن پھرتے ہیں تو کیا سب پاگل ہو گئے ہیں کہ ملتا ملاتا کچھ نہیں اور خواہ مخواہ خوش ہیں۔

صاحبو! جس کے پاس کچھ دولت نہ ہو وہ اتنا خوش نہیں رہ سکتا۔ بلکہ دنیوی دولت والے بھی انکے برابر خوش نہیں ہو سکتے۔ اگر کہو کہ یہ خوشی نری بناوٹ ہے تو اول تو بناوٹ کب تک بناوٹ رہ سکتی ہے پھر یہ بناوٹ کس فائدہ کیلئے۔ دوسرے وہ خوشی اتنی بڑی ہوتی ہے کہ بناوٹ سے لاکھ خوشی پیدا کیجئے کبھی وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔

حضرت! جو مستی شراب میں ہے وہ بناوٹ سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ شراب نہ پینے والا لاکھ جھومے وہ بات پیدا نہیں کر سکتا۔ شراب پینے والے کی طرف وہ بے خود نہیں بن سکتا۔ اس کی بناوٹ فوراً ظاہر ہو جاتی ہے۔ پس سمجھ لو کہ اہل اللہ کا یہ استغنا ان کی یہ آزادی اور یہ بے پروائی کہ نہ امیر کی پرواہ ہے نہ وزیر کی بناوٹ سے نہیں ہو سکتی۔ اہل اللہ کے استغناء کے واقعات بہت زیادہ ہیں۔

ایک واقعہ مجھے اس وقت بھی یاد آ گیا کہ جہانگیر بادشاہ ایک مرتبہ حضرت سلیم چشتیؒ کی زیارت کو آئے۔ حضرت سلیم چشتیؒ اپنی گدڑی جوئیں دیکھنے کے لئے خادم کے سپرد کر کے اسی وقت حجرے میں تشریف لے گئے تھے۔ خادم نے جو شاہی تزک واحتشام دیکھا گھبرا گیا۔ اور گھبرا کر شیخ کو پکارا کہ حضرت ذرا باہر آیئے۔ شیخ باہر تشریف لائے پوچھا کیوں کیا ہے؟ کہا بادشاہ سلامت آ رہے ہیں۔ فرمایا کیا کروں اگر آ رہے ہیں کوئی میں نے ان کی دعوت کی تھی۔ وہ تو اپنی خوشی سے آ رہے ہیں آنے دے۔ میں تو تیری اس گھبراہٹ کی آواز سے یہ سمجھا کہ کوئی بڑی سی جوں نکل آئی ہے۔ اس کے دکھانے کو بلا رہا ہے۔ اسلئے باہر آ گیا بادشاہ کے لئے تو نے خواہ مخواہ مجھے پکارا۔

اللہ اکبر! ان حضرت کی نگاہ میں جہانگیر کی اتنی بھی قدر نہیں جتنی ایک جوں کی ہے۔ صاحبو! کیا یہ استغناء اور یہ آزادی یوں ہی خالی خولی تھی یہ تو ناممکن ہے اور اگر خالی ہی تھی تو کوئی اور تو کر کے دکھلاوے۔

تعلق مع اللہ

شاید اب کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر خالی خولی استغناء نہ تھا تو پھر کس وجہ سے تھا۔ ان کے پاس کون سی دولت تھی جس نے بادشاہوں سے بھی ان کو بے پرواہ کر دیا تھا۔ تو سن لیجے کہ ان کے پاس تعلق مع اللہ اور توحید کامل کی دولت تھی جس کی بابت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش　　چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش
امید ہراسش نباشد ز کس　　بریں است بنیاد توحید و بس

''موحد کے سر پر تلوار چلاؤ یا اس کے پاؤں میں سونا ڈال دو برابر ہے۔ اس کو کسی سے نہ امید ہوگی نہ خوف ہوگا۔ بس یہی توحید کی بنیاد ہے۔''

ان کے دل میں سوائے حق تعالٰی کے نہ کسی کی عظمت تھی نہ خوف نہ منفعت کی امید تھی نہ مضرت کا اندیشہ ان کی تو حالت ہوتی ہے کہ

نہ براشتر برسوارم نہ چواشتر زیر بارم　　نہ خداوند رعیت نہ غلام شہر یارم

''نہ اونٹ پر سوار ہوں نہ اونٹ کی طرح زیر بار ہو۔ نہ رعیت کا حاکم ہوں اور نہ حاکم کا غلام ہوں۔''

انہیں کسی کا بھی خوف نہیں ہوتا سوا خدا کے کیونکہ کہ سب سے بڑی بلا موت سمجھی جاتی ہے اسی کے خوف سے ذرا ذرا سی بات میں احتیاط کی جاتی ہے تا کہ حیات نہ جاتی رہے مگر وہ اسے بھی ہنسی دل لگی سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس کے آنے کی منتیں نہ مانتے ہیں ہیں اور یہاں ہماری یہ حالت ہے کہ موت سے بچنے کے لئے منتیں مانتے ہیں۔ کہ اب نمونیا سے بچ گیا تو بس بزرگوں کا نمونہ ہی بن جاؤں گا مگر وہاں مرنے کی تمنا ہے چنانچہ عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں

خرم آں روز کزیں منزل ویران بروم　　راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　تا درمیکدہ شاداں وغزل خواں بروم

''کتنا اچھا دن ہوگا کہ اس ویران دنیا سے جائیں گے۔ جان کی راحت طلب کرتا ہوں اور محبوب کے لئے جاتا ہوں۔ میں نے منت مانی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہوا تو میکدہ (جنت) کے دروزے تک خوش خوش اور غزل خواں جاؤں گا۔''

یعنی مر جائیں گے تو شاداں شاداں خوش خوش میکدہ میں جائیں گے یعنی جنت میں۔ کیونکہ وہاں شراب بہت ہے اور حلال بھی ہے اور اہل اللہ کی تو بات ہی کیا ہے وہ تو موت سے خوش ہوتے ہی ہیں۔

مشاہدہ جمال الٰہی

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت ہر مسلمان خوش ہوتا ہے کیونکہ دنیا کے جیل خانہ سے رہائی پا جاتا ہے۔ ایک اور بزرگ مرتے وقت فرماتے تھے۔

ے وقت آں آمد کہ من عریاں شوم   جسم بگذارم سرجاں شوم

یعنی اب وقت آ گیا ہے کہ یہ قفس ٹوٹے گا اور مشاہدہ جمال الٰہی سے مشرف ہوں گے۔ غزل خوانی سے مراد ذکر اللہ ہے۔ مومن مرنے کے بعد بھی ذاکر رہتا ہے بلکہ اس وقت ذکر اور بڑھ جائے گا کیونکہ یہاں تو تعلقات میں غفلت بھی ہو جاتی ہے اور مرنے کے بعد ذکر اللہ ہی غذا ہوگا۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب قبلہ نے انتقال کے وقت مولوی اسمٰعیل صاحب سے فرمایا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میرے جنازے کے ساتھ ذکر بالجہر کیا جائے انہوں نے کہا حضرت یہ تو نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک نئی بات ہے۔ جس کو فقہاء نے اس خیال سے کہ عوام سنت نہ سمجھ لیں پسند نہیں کیا فرمایا بہت اچھا جو مرضی ہو۔

خیر بات آئی گئی ہوئی۔ اور کسی کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی کیونکہ خلوت میں گفتگو ہوئی تھی۔ مگر جب جنازہ اٹھا تو ایک عرب کی زبان سے نکلا اذکروا اللہ۔ بس پھر کیا تھا بے ساختہ سب لوگ ذکر کرنے لگے اور لا الٰہ الا اللہ کی صدائیں برابر قبرستان تک بلند رہیں۔ بعد میں مولوی اسمٰعیل صاحب اس گفتگو کو نقل کر کے کہتے تھے کہ ہم نے حضرت کو تو منوا دیا مگر اللہ تعالیٰ کو کیونکر منوائیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت کی تمنا پوری کر دی۔ سچ ہے

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں   مید ہد یزداں مراد متقیں

اللہ تعالیٰ متقین کی مراد پوری کرتا ہے انہیں اللہ کا نام سننے سے زندگی میں بھی لذت آتی ہے اور مرنے کے بعد بھی اور موت کے بعد غفلت کا کوئی سبب نہیں تو پھر غافل کیونکر ہو سکتے ہیں۔ الغرض یہ معنی ہیں۔

تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم (تا کہ میکدہ کی جانب خوش و خرم اور غزل پڑھتا ہوا چلا جاؤں)

کہ ان کی شان ذکر اللہ اور خدا کی محبت ہے اور مرنے کے بعد وہ خدا کی رحمت و محبت کا پوری طرح مشاہدہ کریں گے تو ان کے ذکر و محبت میں ترقی ہوگی۔

مومن کی شان

الغرض! جب ایسا ذوق صحیح ہو تو ہر چیز کا اثر فوراً محسوس ہوگا۔ طاعت میں شگفتگی اور معصیت میں قلق ہوگا۔ بلکہ خلاف اولیٰ میں بھی۔ چنانچہ ایک بزرگ کسی کے یہاں تشریف لے گئے دروازہ پر پہنچ کر پکارا۔ اندر سے جواب آیا کہ نہیں ہیں پوچھا کہاں ہیں جواب ملا خبر نہیں۔ تو یہ بزرگ صرف اتنی بات پر تیس برس تک روتے رہے کہ میں نے ایسا فضول سوال کیوں کیا کہ کہاں ہیں

میرے نامۂ اعمال میں ایک فضول بات درج ہوگئی۔ حالانکہ مومن کی شان یہ ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ

اور مومنوں کی شان یہ ہے کہ لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔''

اب اندازہ کیجئے کہ جسکو ایک لغو بات سے اس قدر تکلیف ہوئی اسکو گناہ کی کلفت کا کس درجہ احساس ہوگا۔

صاحبو! گناہ تو گناہ وہ ان مباحات سے بھی پرہیز کرتے ہیں جن میں معتد بہ نفع نہ ہو اور کیوں نہ کریں۔ حدیث شریف میں ہے

من حسن اسلام المرء تركه مالا يعنيه (الكامل لابن عدى ۳: ۴۰۷، ۵۸۸۴، ۶: ۲۳۴۱)

یعنی بیکار باتوں کا چھوڑنا آدمی کے حسن اسلام سے ہے۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اچھا قاعدہ بتا دیا کہ وہ کام ہی نہ کرے جس میں فائدہ نہ ہو۔ اسی وجہ سے وہ بزرگ اس پر روئے کہ میں نے یوں کیوں پوچھا کہ وہ کہاں ہیں۔ اللہ اکبر! جس کو اتنی سی بات سے اتنا قلق ہو کہ تیس برس گریہ وزاری میں کاٹے اسے گناہ سے کس قدر صدمہ ہوگا۔

بہرحال اعمال کی سزا و جزا دنیا میں فوراً مل جاتی ہے لیکن اگر کسی کا ذوق صحیح نہ ہو تو وہ یہی سمجھ لے کہ آخرت میں تو ضرور ہی ہوگی اور اس تاخیر میں کچھ مضائقہ نہیں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں آخر اس میں کیا حرج ہے کہ قتل اب کیا، پھانسی چھ ماہ یا چند سال بعد ہوئی یا ایک نے بی اے (اور سول سروس) اب پاس کیا اور چھ ماہ کے بعد ڈپٹی ہوا۔ سزا و جزا کی تاخیر سے دنیا میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ پھر اگر خدا تعالیٰ کے یہاں بھی ایسا ہوا تو کیا حرج ہے۔ خدا کے یہاں آپ یہ چاہتے ہیں کہ چٹ روٹی پٹ دال۔ تو خوب سمجھ لو کہ ایسے مہمل اعتراضات سے خدا تعالیٰ کے اصول نہیں بدلتے۔

لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا

تم اللہ تعالیٰ کے قانون میں کسی قسم کا فرق اور تبدیلی ہرگز نہ پاؤ گے۔ اسکا دستور ہر زمانے میں یکساں ہے۔ اور کفار کے بارہ میں اس تاخیر کی حکمت وہ خود ارشاد فرماتے ہیں

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ وَاُمْلِىْ لَهُمْ. اِنَّ كَيْدِىْ مَتِيْنٌ

کہ ہم کفار کو ڈھیل دے کر بے خبری میں پکڑنا چاہتے ہیں۔

حق تعالیٰ کا ہے تسداز اں وتعالیٰ اگر دیر گیرد سخت گیرد

اور فرماتے ہیں: وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ

کہ ہم قیامت کے دن کو بعض مصلحتوں کی وجہ سے کچھ مدت کیلئے ملتوی کئے ہوئے ہیں۔
مگر اس کا آنا یقینی ہے اس وقت ہر شخص کو جزا و سزا ملے گی۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ اہل بلا کو قیامت میں ان کی تکلیف اور مصیبت پر اتنا اجر ملے گا کہ اہل تنعم تمنا کریں گے کہ کاش ہم دنیا میں ہماری کھال مقراضوں سے کاٹی جاتی تا کہ مصائب کا اجر حاصل کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر کلفت میں منفعت بھی ہے۔

اخباری مذاق

مگر جو لوگ ناواقف ہیں وہ اس کو مضرت محضہ سمجھ کر بگڑنے لگتے ہیں بلکہ بعض تو حد سے بڑھ جاتے ہیں چنانچہ ایک جاہل نے رمضان میں روزہ رکھا۔ اتفاق سے اسی دن اس کی بھینس مر گئی یہ کھیت پر کام کر رہا تھا۔ بیٹے نے جا کر خبر دی تو سنتے ہی آپ کو بہت غصہ آیا فوراً لوٹا اٹھا کر پانی پی لیا اور کہا لے اور رکھوا لے روزہ۔
معاذ اللہ! خدا کے ساتھ یہ برتاؤ۔ خیر وہ شخص تو بدتہذیب تھا زیادہ افسوس تو ان کے حال پر ہے جو تہذیب کے پیرایوں میں اللہ تعالیٰ کی شکایت کرتے ہیں صاحبو! اگر انہی پیرایوں میں کوئی آپ کی شکایت کرے تو کیا آپ کو ناگوار نہ ہوگا چنانچہ ایسے پیرائے اخباروں میں بھی اختیار کئے جاتے ہیں مثلاً اموات کا عدد بیان کرنا کہ آج اتنے آدمی مر گئے۔ اس سے بجز خدا تعالیٰ کی شکایت اور اعتراض اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کو پریشان کرنے کے اور کچھ بھی غرض نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی غرض ہوتی تو اس کو بیان بھی کیا جاتا۔ مگر آج کل اس سے بے حد دلچسپی ہے اور یہ اخباری مذاق کہلاتا ہے۔ اس زمانہ میں یہ مذاق عموماً غالب ہو گیا ہے۔ مگر نہایت ہی لغو ہے۔
ان اخبار والوں کی یہ حالت ہے کہ عوام میں جن مضامین سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ ان ہی کو شائع کرتے ہیں خواہ کوئی نفع ہو یا نہ ہو بلکہ خواہ ضرر ہی ہو۔ خیر یہ بے چارے تو معذور ہیں کیونکہ اصل میں یہ لوگ تاجر ہیں۔ انہیں تو اپنا پیٹ بھرنا مقصود ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ آج کل طاعون بہت ہے۔ لوگوں کو اس کی خبروں کا انتظار ہے۔ ان کے چھاپنے سے اخبار خوب نکلے گا وہی چھاپنے لگے۔ انہیں اس سے کچھ بھی غرض نہیں کہ اس سے خدا کی شکایت ہوتی ہے یا لوگوں کی پریشانی بڑھتی ہے۔ جس چیز کا چرچا زیادہ دیکھتے ہیں اسی کے متعلق مضامین بھی لکھتے ہیں اگر دینداری کا چرچا غالب ہو جائے تو دینداری کے مضامین لکھنے لگتے ہیں۔ کفر کا مذاق بڑھ جائے تو کفر کے مضامین لکھنے لگتے ہیں۔ انہیں تو اپنی تجارت سے غرض ہے۔ مردہ چاہے دوزخ میں جائے یا بہشت میں یاروں کو اپنے حلوے مانڈے سے کام۔

انہوں نے دیکھا کہ لوگ طاعون کی خبروں کے منتظر ہیں اور کچھ نہیں تو یہی چھاپنا شروع کر دیا کہ طاعون میں اتنے مبتلا ہوئے اور اتنے فوت ہوئے کہو اس سے کیا نفع؟

عوام کا مذاق

اور عام لوگوں کا آج کل عجیب مذاق ہو گیا ہے کہ محض خبر ہی کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اصل یہ ہے کہ خبر کی غایت ہمیشہ انشا ہوتی ہے اور جس کی غایت انشاء نہ ہو وہ محض فضول ہے وجہ فضول ہونے کی یہ ہے کہ خبر کا منشاء انشاء تھا اور اس سے یہ خالی ہے۔ غرض! یہ کلیہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خبر خود مقصود نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی غایت انشاء ہوتی ہے۔

مثلاً ایک شخص حکیم صاحب کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے بخار ہے تو مقصود اس کا اس خبر سے جملہ انشائیہ ہے یعنی مجھے نسخہ لکھ دیجئے یا دوا دے دیجئے یا مثلاً ایک جاسوس حاکم کو خبر دیتا ہے کہ سرحد تک غنیم آ گیا۔ مقصود اس سے بھی جملہ انشائیہ ہے کہ مدافعت کا انتظام کیجئے یا مثلاً ایک خفیہ پولیس نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ فلاں شخص باغی ہے اس کا بھی مطلب یہ ہے کہ انسداد بغاوت کا انتظام کیجئے یا ایک نوکر نے آقا کو خبر دی کہ مکان کا قفل ٹوٹا ہوا ہے اس کا بھی مطلب یہ ہے کہ چوری کا تدارت کیجئے۔

یا ایک بزرگ کے پاس کسی نے آ کر عرض کیا کہ میرے اوپر مقدمہ قائم ہو گیا ہے اس کا بھی مقصود یہ ہے کہ دعا کیجئے۔ الغرض بے شمار مثالیں کہاں تک عرض کروں۔

اسی طرح شرعی اخبار میں قاعدہ ہے مثلاً قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کہہ دیجئے اللہ ایک ہے۔

جملہ خبریہ ہے مقصود اس سے یہ ہے کہ اس کا اعتقاد رکھو مثلاً

لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا اللہ تعالیٰ نے جو کچھ راحت یا غم ہمارے لئے مقدر فرما دیا ہے اس کے علاوہ اور کچھ ہم کو نہیں پہنچ سکتا۔ (پ ۱۰)

یہ جملے خبریہ ہیں۔ ان کا مقصود وہی جملہ انشائیہ ہے جو اس کے متصل مذکور ہے یعنی:

عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ مومنوں کو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

بس اس قاعدہ پر غور کر لیجئے اور جس خبر میں انشاء نہ ہو سمجھ لیجئے کہ محض عبث ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ ان خبروں سے کلکتہ میں آج ایک ہزار مرے اور کل بمبئی میں ڈیڑھ ہزار مرے کیا مطلب ہے؟ ارے بھائی مرے تو ہم کیا کریں؟ اسکا کچھ بھی جواب نہیں۔ تو یہ خبر چھاپنا یا اس کا تذکرہ کرنا فضول ہی ہے اور اگر کوئی غرض ہے تو بتائے۔ اگر کسی نے یہ سوچ ساچ کر یہ کہہ دیا کہ مقصود یہ ہے کہ دعا کیجئے تو یہ

اس موقع پر ان خبروں کی غایت نہیں کہی جاسکتی۔ غایت تو وہ ہے جو پہلے سے متکلم کے ذہن میں ہو۔ یہ کیا جب جرح قدح کی گئی تو سوچ ساچ کر کہہ دیا دعا کیجئے۔ اگر یہ غایت تھی تو کبھی کسی وقت تو زبان پر آئی ہوتی۔ غرض! یہ سب باتیں محض نکات بعد الوقوع ہیں ورنہ دراصل یہاں کوئی بھی غایت نہیں ہے۔

اگر کوئی کہے کہ عقلاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ افعال اختیاریہ کا صدور بلا تصور غایت نہیں ہوسکتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ غایت تو یہاں بھی ہے مگر معتد بہ نہیں۔ ہاں اخبار والوں کی غایت تو محض تجارت ہے کہ اخبار خوب بکے گا۔ اور اخبار دیکھنے والوں کی غایت محض تذکرہ اور مشغلہ، تفریح اور تبادلہ ءخیالات ہے کہ تم ہم سے اپنا حال کہو اور ہم تم سے کہیں پھر دونوں مل کر ماتم کریں گے فائدہ کیا ہے۔ کچھ نہیں۔

خبروں کا اثر

شاید کوئی سمجھے کہ ان کو مسلمانوں سے کچھ ہمدردی ہے۔ سو یہ بھی نہیں۔ اگر ہمدردی ہوتی تو ایک دکان دواؤں کی غریبوں کے لئے کھلواتے۔ مگر یہ کبھی نہیں ہوتا۔ صرف چرچا ہی مقصود ہے۔ خیر اگر ان میں کوئی ضرر نہ ہوتب بھی اس قدر روک ٹوک نہ کی جاتی۔ مگر ان میں تو دین کا بھی ضرر ہے اور دنیا کی بھی مضرتیں ہیں کیونکہ بہت سے آدمی محض خبریں ہی سننے سے ڈر کر مر گئے۔ ہم نے ایسے واقعات آنکھ سے دیکھے ہیں۔ بالخصوص عورتوں کے دل تو بہت ہی کمزور ہوتے ہیں۔ ان پر ایسی خبروں کا زیادہ اثر ہوتا ہے وہ پردہ دار ہیں۔ خود تو شہر کی حالت سے آگاہ نہیں ہوسکتیں۔ ان کے پاس یہ باہر کی نکلنے والیاں خبریں لاتی ہیں۔ کہ بیوی آج شہر میں یہ ہورہا ہے کل وہ ہورہا تھا آج اتنے مر گئے۔ کل اتنے مرے تھے اور بیوی صاحب ہیں کہ گھر کا دھندا چھوڑ کر ان خبروں کے سننے میں منہمک ہیں۔ اگر باہر سے آنے والیاں کبھی کوئی بات بیان نہ کریں تو یہ خود تقاضا کرتی ہیں کہ کہو اب شہر میں کیا حالت ہے۔ اس پر وہ بیوی صاحب کو خوش کرنے کو اگر کچھ بھی نہ ہو تو تب بھی کچھ نہ کچھ مبالغہ کے ساتھ بیان کر دیتی ہیں۔ اب یہ ہول اور دہشت سے پریشان ہوتی ہیں اور اکثر بیمار بھی ہوجاتی ہیں۔

چنانچہ ایسا ہی ایک واقعہ میرے یہاں آج کل ہوا کہ ایک بیوی پہلے ہول سے بیمار پڑیں اس کے بعد اسی میں انتقال ہوگیا۔ ایک جگہ طاعون کے زمانہ میں ایک حاملہ کو خبریں سن سن کر بہت ڈر لگتا تھا کیونکہ بیماری شہر میں بڑی شدت سے تھی۔ مردوں نے مصلحت پر نظر کر کے انہیں یہ سمجھا دیا کہ بیماری اب نہیں ہے اور شہر میں سکون ہے کہ ایک دن شام کو ایک دم بہت سی آذانوں کی آواز جوان کے کان میں پڑی جس کو طاعون کے رفع کے لئے ایجاد کیا ہے پھر ہول بڑھا اور سمجھی کہ شہر

میں ابھی تک بیماری ہے جب ہی اتنی اذانیں ہو رہی ہیں بس اسی ہول میں اسقاط ہو گیا۔

بعض جگہ وبا کے زمانے میں بہت سی اذانوں کا رواج ہو گیا ہے حالانکہ اس کی کوئی اصل نہیں اور ایسی بے اصل تدبیروں سے بجائے نفع کے ضرر ہوتا ہے۔

چنانچہ دیکھئے اسی سے اس عورت کا حمل ساقط ہو گیا۔ حضرت اصل تدبیر وہ ہے جو شریعت نے تعلیم دی ہے کہ گناہوں سے بچو۔ توبہ استغفار کرو۔ اور نیک کاموں کی پابندی کرو۔ فرائض وواجبات میں کوتاہی نہ کرو۔ حقوق ادا کرو۔ مگر لوگوں سے یہ کام تو ہوتے نہیں کیونکہ اس میں نفس کے خلاف کچھ کرنا پڑتا ہے انہوں نے اذانیں دینا یا چندہ کر کے دیگ پکانا سیکھ لیا ہے کیونکہ اس میں مشقت زیادہ نہیں بلکہ اس میں ایک گونہ حظ نفس ہے۔ بس یہ علاج وبا کا ایسا اس ہے جس کے متعلق مولانا فرماتے ہیں۔

ہر چہ کردند از علاج و از دوا　　رنج افزوں گشت و حاجت ناروا

بے خبر بودنداز حال دروں　　استعیذ اللہ مما یفترون

(جو کچھ انہوں نے علاج اور دوا کیا اس سے مرض میں ترقی اور اضافہ ہوا اور مقصد پورا نہ ہوا تو وہ باطنی حال سے بے خبر ہیں اور جو کچھ افترا کرتے ہیں اس سے اللہ کی پناہ)

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند　　آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

(اس نے کہا کہ انہوں نے ہر دوا کو استعمال کیا مگر کوئی دوا کارآمد نہ ہوئی)

اس علاج سے مرض نہیں جاتا اور بیماری کا تذکرہ کرنا، اموات کی شمار معلوم کرنا۔ اور گھروں میں اس کا چرچا کرنا یہ تو کسی درجہ میں بھی علاج نہیں۔ بلکہ اس سے تو اور مرض کو ترقی ہوتی ہے لوگوں کے دل کمزور ہوتے ہیں یہ تو دنیوی مضرت کا بیان تھا اور اس میں دین کا بھی ضرر ہے جس کے سمجھنے کے لئے ایک مقدمہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

عظیم گستاخیاں

پہلے یہ سوچو کہ یہ سب کرتا کون ہے یعنی یہ مصیبت کون ڈالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے اور وبا اور بیماری کا اللہ کے حکم سے آنا سب کو معلوم ہے قتل وغیرہ میں تو گو جان اس کی خدا ہی نے لی مگر اس میں بظاہر ایک بندہ کا دخل ہو گیا اس لئے وہ بندہ کا فعل کہلاتا ہے اور تمام تر شکایات اسی کی طرف عائد ہوتی ہیں۔ لیکن وبا اور بیماری سے جو کوئی مرتا ہے تو اس میں براہ راست خدا کا فعل سمجھا جاتا ہے اس میں جس قدر شکایت یا ناگواری ہوگی تو چونکہ یہ افعال

بلا واسطہ خدا کے ہیں اسلئے وہ شکایت خدا کی ہوگی۔

ایک مثال سے اس کو سمجھئے کہ مثلاً ایک حاکم کے یہاں مقدمہ پیش ہوا اس نے روئیداد پر نظر کر کے ایک کو مظلوم سمجھا اور دوسرے کو ظالم سمجھ کر حکم دیدیا کہ اسے پھانسی دیدو۔ چنانچہ اس کو پھانسی ہوگئی۔ اب ایک شخص کہتا ہے کہ ہائے فلاں شخص کو پھانسی دیدی گئی۔ افسوس! بڑے صدمہ کی بات ہے بہت ہی بے جا واقعہ ہوا۔ اب یہ شکایت کس کی ہے یقناً اس جج کی ہے جس نے یہ فیصلہ کیا ہے اور اسی وجہ سے ان حضرت کی یہ مجال نہیں ہوسکتی کہ جج کے اجلاس پر افسوس ظاہر کریں اور اس قسم کا ایک لفظ کہیں گو پیچھے جو کچھ چاہیں کہہ لیں کیونکہ اسے خبر نہیں۔

اسی طرح ایک شخص کے بیٹے پر مقدمہ قائم ہوگیا۔ حاکم کے اجلاس پر باپ بھی پیروی کے لئے حاضر ہوا۔ آخر میں حاکم نے سزا کا حکم سنا دیا اور اس کو باپ کے سامنے ہتھکڑیاں پہنا کر جیل بھیج دیا گیا۔ گو باپ کو یہ فیصلہ بے انتہا ناگوار ہوگا۔ مگر یہ مجال نہیں کہ اجلاس پر کچھ بھی منہ سے کہہ سکیں۔

تعجب ہے کہ ایک حاکم پر تو اعتراض کرنے کی بلکہ ایہام اعتراض کی بھی کسی کو جرأت نہیں۔ مگر خدا تعالیٰ پر اعتراض کرنے کی کیسے ہمت ہوتی ہے اگر یہ کہا جائے کہ ہم تو خدا پر اعتراض نہیں کرتے صرف بیماری کا تذکرہ کرتے ہیں تو حضرت ذرا ان الفاظ کو دیکھئے جو اس تذکرہ میں استعمال کئے جاتے ہیں پھر ذرا اپنے دلوں کو ٹٹو لئے کہ ان الفاظ کو منہ سے نکالتے ہوئے واقعات حادثہ کے متعلق شکایت ہوتی ہے یا نہیں؟

چنانچہ سنئے آج کل ان وبائی امراض کے متعلق اس قسم کے کلمات استعمال کئے جاتے ہیں کہ ہائے سارا کانپور خالی ہوا جاتا ہے۔ محلے کے محلے ویران ہوتے جاتے ہیں گھروں میں قفل لگتے جاتے ہیں۔ قبر کھودنے والے نہیں ملتے سینکڑوں بچے یتیم ہوگئے ہزاروں عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ گھر گھر مردے ہی مردے ہیں مردوں کا دفن کرنے والا بھی کوئی نہیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب اعتراض کے کلمات ہیں یا نہیں۔ کیوں صاحب کیا کبھی صاحب جج کے سامنے بھی اس طرح کہہ دوگے۔ کہ اگر یہی فیصلے رہے کہ پھانسی دے دی، کسی کو قید کر دیا تو تھوڑے دنوں میں بستی ہی ختم ہوجائے گی۔ یقیناً کبھی ہمت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس میں جج پر اعتراض ہے یا کم از کم ایہام تو ضرور ہے۔

افسوس صد افسوس! جو بات ایک حاکم دنیا کے سامنے گستاخی کے خیال سے نہیں کہہ سکتے وہی بے باک ہوکر خدا کے سامنے کیونکر کہی جاتی ہے؟ آخر ان جملوں کا کیا مطلب ہے کہ اگر یہی بیماری رہی تو بہت جلد شہر خالی ہوجائے گا تمہیں خبر بھی ہے کہ یہ تم کسے سناتے ہو؟ اگر مجھے سناتے

ہوتو میں کیا کروں؟ کسی دوسرے کو سناتے ہوتو وہ بھی کیا کرسکتا ہے۔ بس یوں کہونا کہ خدا کو سناتے ہو۔ خیال تو کرو کتنی بڑی گستاخی ہے پھر گستاخی سے تو اور زیادہ قہر نازل ہونے کا اندیشہ ہے۔

ہر چہ آید بر تو از ظلمات و غم آں زبیبا کی و گستاخی ست ہم

از خدا جوئیم توفیق ادب بے ادب محروم گشت از فضل رب

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

ہر کہ گستاخی کند اندر طریق باشد اندر لجہ حیرت غریق

''جو کچھ تم پر مصیبتیں آرہی ہیں وہ گستاخی کی بناء پر ہیں۔ خدا سے ہم ادب کی توفیق چاہتے ہیں۔ بے ادب اللہ کے فضل سے محروم رہتا ہے بے ادب صرف خود ہی خراب نہیں ہوتا۔ بلکہ ساری دنیا میں آگ لگادیتا ہے۔ جو شخص طریقت میں گستاخی کرتا ہے وہ حیرانی کے دریا میں غرق ہوجاتا ہے۔''

گستاخیوں کی سزا

عجیب بات ہے کہ خدا تعالیٰ کو علم محیط ہے کہ لوگ کس قدر گستاخیاں کرتے ہیں مگر پھر بھی رحمت کم نہیں ہوتی کیا انتہا ہے اس حلم کی۔ یہ بھی تو نہیں کہ اس گستاخ کو بیمار کردیں۔ نہیں اچھا خاصا ہٹا کٹا اور تندرست رہتا ہے۔ مگر یہاں کی مہلت سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ گستاخی کی سزا سے بری ہوگیا۔ سنگین مقدموں کی مہلت زیادہ دی جاتی ہے پہلے تحقیقات کے لئے نظر بند کردیا جاتا ہے۔ اس میں ہر وقت دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ شاید سزا ہوجائے۔

یہی حالت خدا تعالیٰ کے یہاں بھی ہے دنیا میں جو واقعات ہوتے ہیں اکثر نمونہ ہیں واقعات آخرت کے لئے۔ دنیا کے واقعات وہاں کے واقعات کے نظیر ہیں مگر اسی اصل کے نہ جاننے سے اکثر دھوکا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ایک ملحد جو خدا ہستی سے انکار کرتا ہے وہ اپنے انکار کو اس خیال فاسد سے مضبوط کرتا ہے کہ اگر دنیا کا کوئی مالک اور صانع ہے تو اسی وقت بجلی گرا کے منکر کو ہلاک کیوں نہیں کردیتا۔ اگر کوئی صانع ہے تم ہم پر بجلی گرادے۔ اس کے بعد بجلی نہیں گرتی اور صحیح وسالم رہتا ہے تو یہ خیال کرتا ہے کہ صانع عالم کوئی نہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ کیونکہ یہ برتاؤ تو اس وقت ہوتا ہے جب کہ صانع عالم حکیم نہ ہوتے۔ غصہ اسے جلدی آتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ شاید پھر قابو نہ ہو۔

دیکھو ایک کانسٹیبل کو کس قدر جلد غصہ آجاتا ہے۔ مگر وائسرائے کو باجود آزار رسانی کے کبھی غصہ نہیں آتا۔ وجہ یہ ہے کہ کانسٹیبل تو اسی وقت کچھ کرسکتا ہے جبکہ مقابلہ ہے اور وائسرائے کا قابو

تسلط کی وجہ سے ہر وقت ہے اور بہت زیادہ ہے اس لئے وہ ایسی باتوں پر توجہ کرنا چھچھورا پن سمجھتے ہیں حالانکہ وائسرائے کا تسلط سارے علم پر نہیں صرف ایک ملک پر ہے اور وہاں تو سارے علم پر تسلط ہے وہ اس بد تہذیب کے کہنے سے تمام حکمتوں سے قطع نظر کر کے قواعد سلطنت نہیں بدل دیتے۔

کوئی جارج پنجم سے کہنے لگے کہ اگر آپ بادشاہ ہیں تو سارا لندن گولوں سے اڑا دیجئے یا تمام قیدیوں کو چھوڑ دیجئے وہ اس بیوقوف کے کہنے سے دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہ کریں گے وہ وہی کریں گے جو ان کی سلطنت کے قواعد ہیں یا جو ان کی حکمت و مصلحت ہے۔

اسی نمونہ کے موافق حق تعالیٰ کا بھی معاملہ ہے کہ مجرم کو مہلت دیتے ہیں۔ اور اس میں اسرار ہوتے ہیں جن کو ہر شخص جان نہیں سکتا اور وہ ایسی غامض اور باریک باتیں ہیں کہ آپ کا خیال بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ بھلا ان کے علم اور ان کی عظمت شان کے آگے آپ کی بساط ہی کیا ہے اور آپ کا علم ہی کتنا ہے وہ معبود ہیں اور آپ عبد۔ ان کا اور آپ کا مقابلہ ہی کیا۔

علم اسرار الٰہی

آپ صرف اسی کو دیکھئے کہ آپ اور آپ کا نوکر دونوں ہم جنس اور ہم نوع ہیں اور اوصاف کثیرہ میں متقارب بھی ہیں۔ اگر آپ عاقل ہیں تو وہ بھی عاقل ہے جس طرح آپ بولتے سنتے ہیں وہ بھی بولتا اور سنتا ہے۔

الغرض! آپ کے اس کے افعال و خواص تقریبا یکساں ہی ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف مال کا اور اسی فرق سے آپ کی اور اس کی حیثیت اتنی بدل گئی کہ آپ آقا ہیں۔ اور اس فرق کا یہ اثر ہے کہ وہ نوکر آپ کے خانگی اسرار سے واقف نہیں ہو سکتا۔

پھر حق تعالیٰ میں اور آپ میں تو بون بعید ہے وہاں تو کسی صحیح اعتبار سے تشارک بھی نہیں اور آپ کی وہاں وہ حیثیت بھی نہیں جو نوکر کی آپ کے یہاں ہے۔ پھر اس کے بعد کس منہ سے ان کے حکم و اسرار سے واقف ہونے کی جرأت کرتے ہیں۔ اگر آپ کا نوکر جو آپ کے خاص اوقات اور خانگی اسرار سے ناواقف ہے واقف ہونے کے لئے وہ اسرار آپ سے پوچھے یا خود کھوج لگائے۔ آپ کس قدر ناراض ہوں گے اور کتنا گستاخ سمجھیں گے؟ پھر خدا کے ساتھ تو آپ کو وہ نسبت بھی نہیں۔ آپ کون ہیں کہ خدائی اسرار پر مطلع ہونا چاہتے ہیں کوئی ان کی پارلیمنٹ ہے جس کے آپ ممبر ہیں یا ان سے آپ کی رشتہ داری ہے۔ جو آپ ان کے معاملات میں دخل اور معقولات دیتے ہیں ہم تو ادنیٰ سے غلام کی بھی ان کے سامنے حیثیت نہیں رکھتے۔

جب آب و ہوا خراب ہوتی ہے تو پانی کے قطرہ میں کتنے جراثیم پیدا ہوجاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا دعویٰ ہے کہ ایک قطرہ میں لاکھوں ہوتے ہیں اس سے اندازہ کیجئے کہ ان میں کا ایک کیڑا کتنا ذرا سا ہوگا۔ اگر وہ کیڑا آپ کے مسکن کے اسرار معلوم کرے اور اس پر رائے زنی کرنے لگے کہ اتنا بڑا امیدان اور اتنا بڑا سائبان اس کی کیا ضرورت تھی۔ صرف اک رائی کا دانہ کافی تھا اور وہ لاکھ برس عمر پائے تو کبھی انسانی تمدن اور رموز سلطنت کا احاطہ تو درکنار اس کے ایک جزو کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ آپ کو تو خدا سے وہ نسبت بھی نہیں جو ایک وبائی کیڑے کو آپ کے ساتھ ہے۔ پھر کیا آپ خدا کے اسرار جان سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ عارف شیرازی نے خوب فرمایا ہے۔

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو　　　　که کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

''شراب اور گانے کی بات کر دینا کے راز نہ ڈھونڈھ کہ دنیا کا معمہ عقل سے حل نہیں ہوتا۔''

تقاضائے محبت

صاحبو! جو آپ کا کام ہے اسے کیجئے اس قصہ میں نہ پڑیئے۔ اول تو اسرار کا علم ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہو بھی سکتا تب بھی ایسی کاوش، محبت و عظمت کے خلاف ہے۔ قلب میں اگر خدا کی عظمت و محبت ہو تو اس سوال کی نوبت ہی ہرگز نہیں آسکتی کہ امراض و بلاؤں میں مثلاً کیا حکمت ہے۔ محبت میں کبھی اس کا وسوسہ ہی نہیں آسکتا۔

دیکھو! اگر کوئی کسی پر عاشق ہو اور معشوق صاحب کبھی منہ نہ لگاتے ہوں۔ ایک روز اتفاق سے کہیں راستہ میں آمنا سامنا ہوجائے اور معشوق صاحب ان کے سر پر ایک چپت رسید کر کے چل دیں۔ اب بتاؤ یہ عاشق کیا کرے گا۔ اگر تم اس سے یہ کہو کہ میاں اس سے پوچھو تو چپت لگانے میں کیا حکمت تھی تو وہ کہے گا پوچھنے سے کیا فائدہ؟ میرے دل کو اس کی چپت سے ایسی لذت حاصل ہوئی ہے کہ وہی تمام سوالات کا جواب ہے میری ایسی قسمت کہاں کہ اس کا ہاتھ میرے بدن کو لگے۔ خدا کا شکر ہے اس نے چھیڑا تو۔ بہت دنوں میں قسمت جاگی کہ ادھر توجہ تو ہوئی۔

چنانچہ ایک عورت کا خاوند نہایت بدمزاج تھا کبھی بیوی کی طرف التفات نہیں کرتا تھا۔ ایک روز گاجریں لایا اور ایک گاجر کھا کر اس کی پینڈی اس غریب کے کھینچ ماری۔ وہ اس سے اتنی خوش ہوئی کہ ایک عورت کو اپنے میکے بھیجا کہ اماں سے سلام کہنا اور یہ کہنا کہ کھائی تھی گاجر۔ ماری تھی پینڈی کچھ کچھ سہاگ بھوڑا ہے (یعنی لوٹنے لگا ہے) خدا جانے اس کم بخت کو شوہر سے کتنی محبت

تھی کہ اس کے پینڈی مارنے سے ہی اس قدر خوشی ہوئی ...... محبت ہے عجیب چیز۔

اسی طرح ایک عورت اپنے شوہر سے بے پرواہ تھی وہ اسے پسند نہیں تھا۔ اس سے الگ، الگ رہتی تھی۔ ایک روز چور جو آئے اور کھڑ کا ہوا تو مارے ڈر کے شوہر سے لپٹ گئی۔ اسی وقت شوہر بزبان حال یہ کہتا ہے۔

ایں کی می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب (یا اللہ یہ جو میں دیکھ رہا ہوں یہ بیداری ہے یا خواب)

چور کچھ آہٹ جاگنے والوں کی پا کر بھاگنے لگے تو وہ کہتا ہے ارے بھئی تمہارا آنا تو ایسا مبارک ہے کہ سارا گھر تم پر نثار ہے۔ جو کچھ ہے تم سب لے جاؤ اور ہر روز آیا کرو۔ کسی طرح بیوی صاحب میری طرف متوجہ تو ہوں۔ دیکھئے اس نے محض بیوی کے لئے سارا گھر لٹوا دیا

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود　　　گوئے گشتن او وا اولیٰ بود

(محبوب حقیقی کا عشق لیلیٰ سے کیا کم ہو، اسکی گلیوں میں پھرنا اولیٰ اور بہتر ہے)

اللہ اکبر! لوگ محبت مجازی میں تو مضرتوں کو بھی منفعت سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں بلاؤں اور وباؤں میں منفعت نہیں سمجھتے جن کو علاقہ محبوب حقیقی سے ہوتا ہے وہ اس سے بھی یہی درخواست کرتے ہیں

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا یہ نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو جائے دوستوں کا سر تیری خنجر آزمائی کیلئے کافی ہے)

محبت اور ایمان

ایک بزرگ نے لوگوں کو دیکھا کہ بھاگ رہے ہیں پوچھا کیوں بھاگ رہے ہو؟ کسی نے کہا طاعون سے بھاگ رہے ہیں فرمایا یا طاعون خذ نی الیک۔ (اے طاعون مجھے لیلے) چنانچہ اسی میں انتقال ہو گیا۔ انہوں نے طاعون کی درخواست کی۔ صرف اس واسطے کہ وہ برائے حدیث مومن کیلئے رحمت ہے۔

بہر حال انہیں اس میں بھی لذت آتی ہے کہ فاقہ ہو یا بیماری آجائے کیونکہ یہ سب کچھ محبوب ہی کی طرف سے تو ہے۔

بجرم عشق تو ام مے کشند و غوغائے است　　　تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائے است

(تیرے عشق کے جرم میں مجھے قتل کرتے ہیں اور اس کا شور و غل ہے تو ذرا چھت پر کھڑا ہو کر دیکھ کہ کتنا اچھا تماشہ ہے)

صرف اتنی تمنا ہے کہ محبوب مجھے قتل ہوتے دیکھ لے بس پھر سب آسان ہوجائے گا جب اور کے ہاتھ سے قتل ہونے میں اس قدر خوش ہیں تو اگر ان کے ہاتھ سے قتل ہوں تو کیا کہنا۔ پھر تو یہ حال ہوگا

ناخوش تو خوش بود برجان من　　دل فدائے یار دل رنجان من

(تیرا رنجیدہ کرنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے، دل فدا ہوا ایسے یار پر جو مجھ کو رنجیدہ کرے)

میں بقسم کہتا ہوں کہ یہ نری شاعری ہی نہیں بلکہ واقعی اہل اللہ مصائب کو اسی قدر لذیذ سمجھتے ہیں کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں اے حضرات یہ مضمون آپ کی سمجھ میں نہیں آتا اور کیوں نہیں آتا۔ محض اس لئے کہ محبت نہیں پس سب شکایتوں اور وسوسوں کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت پیدا کی جائے واللہ اگر محبت ہوتی تو بدگمانی اور شکایت تو کیا ہوتی کبھی شبہ بھی نہ ہوتا

ہر کرا جامہ از عشقے چاک شد　　اوز حرص و عیب کلی پاک شد

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

''جس کے کپڑے عشق میں پھٹ گئے وہ لالچ اور ہر عیب سے پاک ہوگیا اے ہمارے عشق تو خوش رہ تو ہماری سب بیماریوں کا علاج ہے تو ہمارے غرور کی دوا ہے اور تو ہی ہمارے لئے افلاطون اور جالینوس! اس کی تحصیل کی طرف توجہ نہیں حالانکہ حق تعالیٰ نے محبت کو ایمان کا لازم گردانا ہے فرماتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (پ۲)

''اہل ایمان کو خدا تعالیٰ سے بہت شدید محبت ہوتی ہے۔''

خدا تعالیٰ کا یہ فرمان غلط نہیں۔ اگر آپ میں محبت کم ہے تو ضرور ایمان میں کمی ہے۔ اور علاوہ ایمان کی کمی کے بغیر محبت کے زندگی کا بھی تو مزہ نہیں

بے دوست زندگانی لطفے چناں ندارد　　لطفے چناں ندارد و بے دوست زندگانی

''بغیر دوست کے زندگی کا کچھ لطف ہی نہیں۔''

اہل اللہ کا مذاق

اے صاحبو! جن کی بیویاں یا جن کے خاوند مر جاتے ہیں ان کی زندگی کس قدر بے لطف ہو جاتی ہے کیونکہ انہیں محبت کا چسکہ پڑ گیا ہے اب بغیر اس کے شگفتگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ افسوس کہ آپ کو خدا تعالیٰ کی محبت کے بغیر کس طرح چین آتا ہے

اے کہ صبرت نیست از فرزند و زن ۔۔۔۔۔۔۔ صبر چوں داری ز رب ذو المنن

''لوگوں کو بیوی اور بچے کے چھوٹنے سے قرار نہیں آتا۔ مگر نہ معلوم خدا تعالیٰ سے جدا ہو کر کیسے چین آ گیا۔'' ایک عزیز کے چھوٹنے سے اس قدر پریشان ہوتے ہیں کہ اگر خدا تعالیٰ سے علاقہ نہ ہو تو کس قدر پریشانی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل دنیا کے مصائب کے وقت سخت بے چین ہو جاتے ہیں اور اللہ والے ہر حال میں خوش ہیں۔ ان کا تو مذاق یہ ہے کہ

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود (جو کچھ محبوب کی جانب سے ہو اسی میں لذت ہے)

خواہ کیسی ہی سخت بلا نازل ہو جاوے۔ مگر انہیں کچھ پرواہ نہیں ہوتی کیونکہ اللہ سے تعلق ہے۔ حزن طبعی تو ان کو بھی ہوتا ہے مگر پریشانی نہیں ہوتی کہ انہیں بیوی بچوں سے تعلق اور ہمدردی نہیں ہے اس لئے کسی کے مرنے کی پرواہ نہیں کرتے ان کی اولاد وغیرہ سے تعلق تو اتنا ہوتا ہے کہ ایک عزیز حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص کے سات لڑکے تھے اور ساتوں حافظ تھے تجارت کرتے تھے۔

رمضان شریف میں ایک قرآن سناتا تھا اور سب باپ بیٹے اس کے پیچھے سنتے تھے۔ ایک سال طاعون بہت شدت سے تھا سننے والوں میں سے ایک لڑکے نے کہا کہ ابا متلی ہوتی ہے۔ کہا بیٹا گھر میں آرام کرو۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے نے پھر تیسرے نے۔ غرض سب نے متلی کی شکایت کر کے باپ سے گھر آنے کی اجازت لی۔ اسے بھی گھر میں لائے۔ ان سب کو ایسا سخت طاعون ہوا کہ صبح تک سب ختم ہو گئے اور باپ نے نہایت شکر کے ساتھ تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ تھوڑی دیر کے بات ایک ہی گھر سے اکٹھے سات جنازے نکلے۔ مگر باپ نہایت خاموشی کے ساتھ جنازوں کے ہمراہ تھے آہ و بکا اور گریہ زاری کچھ نہ تھی۔

ایک شخص نے کہا کیسا سنگدل باپ ہے کہ اس کی آنکھ سے ایک آنسو تک نہیں نکلتا۔ اتفاق سے ان مرد خدا نے بھی یہ جملہ سن لیا اسی وقت کھنکار کے تھوکا تو کھنکار میں جما ہوا خون نکلا اور کہا رونے سے کیا فائدہ! میرا تو کلیجہ کٹ کٹ کر نکل رہا ہے۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست ۔۔۔۔۔۔۔ حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

اے وہ شخص کہ تیرے پاؤں میں کبھی کانٹا بھی نہیں چبھا اور اس تکلیف سے بھی آشنا نہیں تجھ کو شیروں کے حال کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے وہ شیر جو سروں پر مصائب کی تلواریں سہتے ہیں مگر اف تک نہیں کرتے۔ بکنے والوں کو بکنے سے کام ہے۔ انہیں کیا خبر کہ کسی کے دل پر کیا گزرتی ہے جب وہ تجہیز و تکفین

سے فارغ ہوکر گھر پہنچے تو کلیجہ پھٹ گیا اور خود بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ اللہ اکبر! کتنا بڑا واقعہ ہے۔

مگر حضرت اللہ والے سب گوارا کر لیتے ہیں۔ زبان پر اختیار تھا تو زبان سے بجز صبر و رضا کے کوئی بات نہ نکلی کلیجہ پر اختیار نہ تھا وہ طبعی غم سے پھٹ گیا تو خود بھی ختم ہو گئے۔ مگر شکایت کا لفظ زبان پر نہ لائے۔

عشق رسول مقبول

انسان ہر مصیبت کو برداشت کر سکتا ہے بشرطیکہ محبت ہو پھر کسی چیز کی بھی اس کو پرواہ نہیں ہوتی جان و مال کی آبرو! غرض محبوب کے مقابلہ میں کسی کی بھی پرواہ نہیں رہتی۔ حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں

فان ابی و والدتی وعرضی لعرض محمد منکم وقاء

یعنی میرے ماں باپ اور آبرو سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا ہیں۔

سبحان اللہ! کیا سچی محبت ہے۔ حضرات صحابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی محبت تھی کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ تمام عورتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اپنے اعزہ مجاہدین کے انتظار و اشتیاق میں مدینہ سے باہر نکل آئی تھیں کسی نے ایک عورت سے کہا کہ اس غزوہ میں تیرا بیٹا، باپ، خاوند اور بھائی سب شہید ہو گئے۔ تو وہ کہتی ہے پہلے یہ بتاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی سلامت ہیں اس نے کہا ہاں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بحمد اللہ سلامت ہیں۔ کہا جب آپ زندہ ہیں تو ہزار ماں باپ اور اولاد آپ پر قربان ہیں۔ حقیقت میں یہ تھے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

مگر آج یہ حالت ہے کہ محبت اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا جوش اٹھا تو سال بھر کے بعد کچھ غزلیں پڑھ لیتے ہیں اور مٹھائی بانٹ دیتے ہیں جس میں سراسر اپنا ہی حظ و نفس ہے۔ دین کے لئے جان دینا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام بجالانا آج کل کی محبت میں داخل ہی نہیں۔

ان لوگوں کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے مشہور ہے کہ ایک قصائی کا انتقال ہوا تو اس کی بیوی اپنی برادری کے لوگوں میں بیٹھی رو رہی تھی کہ ہائے یہ تو مر گیا اب اس کی چھریاں کون لے گا۔ ایک بولا میں لوں گا میں۔ پھر وہ رو کر کہنے لگی ہائے اس کے کپڑے کون لے گا۔ وہ بولا میں لوں گا میں۔

آخر میں اس نے یہ کہا ہائے اس کا قرض کون ادا کرے گا۔ آپ کہتے ہیں بولو بھئی کس کی باری ہے اب تک تو میں بولتا رہا۔ لینے کے لئے تو یہ اور دینے کے لئے کوئی اور۔

یہی ہماری حالت ہے کہ غزل اور نعت اور مٹھائی کے وقت تو ہم عاشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بن جاتے ہیں اور احکام کی اطاعت اور شریعت کی پابندی اور بدعت سے اجتناب کے موقع پر کہتے ہیں بولو کس کی باری ہے۔

محبت اور عمل

اس جگہ کا (یعنی کانپور کا) ذکر ہے کہ ایک عورت کو جس کی بیٹی جوان تھی اور بیوہ ہو گئی تھی میرے گھر میں نصیحت کی کہ اس کا نکاح کر دو اور معیوب مت سمجھو اور اگر یہ عیب ہوتا تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کیوں کرتے۔ اس نے صاف کہا کہ (معاذ اللہ) آپؐ ہمارے نکاح بیاہ کے پیغمبر نہیں۔ بس نماز روزہ کے پیغمبر ہیں کیا اسی کا نام محبت ہے؟ نہیں ہر گز نہیں۔

لو کان حبک صادقا لا طعته　　　ان المحب لم یحب مطیع

"اگر تیری محبت اپنے محبوب سے سچی ہوتی تو اس کی
اطاعت کرتا اس لئے عاشق معشوق کا تابعدار ہوتا ہے۔"

ہمارے وطن میں ایک شخص اشفاق احمد تھے وہ مولد شریف بہت پڑھا کرتے تھے ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ ہم اس سے زیادہ خوش نہیں جو ہماری بہت تعریف کرے ہم اس سے زیادہ خوش ہیں جو ہماری اطاعت کرتا ہے یعنی محبوب وہ ہے جو ہمارے قانون پر عمل کرتا ہے اور وہ محبوب نہیں جو صرف قصیدے پڑھتا ہے اور عمل نہیں کرتا۔

تو جناب محبت تو ایسی ہونی چاہئے کہ محبوب پر سب کچھ فدا کر دے یہ کیا کہ جہاں خیال آ گیا کہ برادری میں ہیٹی ہو گی۔ بس محبت ختم ہو گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو برادری سے زیادہ محبت ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (پ۲) کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ کیسی برادری اور کہاں کا کنبہ آپ کی شان تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

خدا نہ کرے کہ آپ کی تلوار آپ کے دشمن پر چلے اور وہ اس سے ہلاک ہو۔ ہم آپ سے محبت کرنے والے ہیں۔ آپ ہم پر خنجر آزمائی کیجئے کہ ہم کو یہ شرف حاصل ہو کہ محبوب کی تلوار سے مرے۔"

جو فرمائیں اس کی تعمیل میں لگ جائیے یہ نہ پوچھئے کہ اس میں حکمت کیا ہے۔

حکمتوں کی تحقیق

صاحبو! اگر کوئی کسی پر عاشق ہو جائے اور وہ یہ کہے کہ میں جب ملوں گی کہ تم جبہ اور قبا اتار کر فقط ایک پاجامہ پہن کر بلکہ لنگوٹی باندھ کر دس دفعہ بازار میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر کودتے ہوئے پھرو تو یہ ایسا ہی کرے گا اور ہرگز نہ پوچھے گا کہ بی تیرا اس میں کیا فائدہ ہے؟ اگر کوئی کہے بھی کہ اس میں کیا فائدہ تو کہے گا کہ میں اتنا جانتا ہوں کہ اس کے بعد ایک وہ دن آئے گا کہ محبوبہ مجھے مل جائے گی۔ اس سے زیادہ مجھ کو کسی فائدہ سے بحث نہیں۔

ہمارے وطن میں ایک بے ہودہ تھا اس سے کہا گیا کہ تم پاجامہ اتار کر فلاں جگہ سے فلاں جگہ تک ننگے چلے جاؤ تو سیر بھر مُرمُرے دیں گے وہ فوراً پاجامہ اتار کر منظر عام پر چلا گیا اور یہ بھی نہ پوچھا کہ اس میں کیا حکمت ہے جب مُرمُروں کی محبت میں کچھ نہیں پوچھا تو جنہیں خدا تعالیٰ کی محبت ہو گی انہیں تو حکمتوں کی تحقیق کا وسوسہ بھی نہ ہو گا۔

افسوس! خدا کے ساتھ قانونی برتاؤ کرتے ہیں۔ احکام الٰہی کے اندر حکمتیں تلاش کرتے ہیں کہ اس میں کیا حکمت ہے اور اس میں لم کیا ہے مجھے تو ایسی باتوں سے اور ایسے واقعات سے حیرت ہوتی ہے۔

چنانچہ ایک شخص نے دعا کی کسی کی صحت کیلئے۔ مگر اس کا وقت آ گیا تھا۔ انتقال ہو گیا۔ تو یہ کہتا ہے کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے خدا ہی نہیں (معاذ اللہ) اگر خدا ہوتا تو کیا ہماری دعا قبول نہ کرتا۔

صاحبو! محبت نہ ہونے سے یہ باتیں پیدا ہوتی ہیں اگر اس شخص کو محبت ہوتی تو اس قسم کا وسوسہ بھی دل میں نہ آتا۔ محبت والے کو دعا کے قبول نہ ہونے سے سب سے پہلے اپنی نالائقی کا تصور ہوتا ہے کہ میں کیا اور میری دعا ہی کیا۔

میرے ناپاک منہ سے نکلی ہوئی دعا قابل قبول ہی کب تھی جو قبول کی جاتی۔ اس بات کے بعد پھر شریعت کی نصوص سے دوسرے طریقے پر اس کی تسلی ہو جاتی ہے کہ دعا تو ضرور قبول ہوئی۔ مگر یہ ضرور نہیں کہ جو مانگا تھا وہی ملے بلکہ اس سے اچھی چیز مل جاوے گی۔ اور جس کو محبت نہیں وہ کبھی دعا کے قبول نہ ہونے سے خدا کے وجود ہی میں شک کرنے لگے گا۔

اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ جارج پنجم کچھ نہیں اگر ہیں تو مجھے امتحان سے مستثنیٰ کر کے یوں ہی ڈپٹی کلکٹری دلا دیں۔ مگر جب اس نے درخواست پیش کی تو امتحان لیا گیا۔ اب یہ کہتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جارج پنجم ہیں ہی نہیں ورنہ مجھے امتحان سے ضرور مستثنیٰ کر دیتے

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ استدلال بالکل بیہودہ ہے اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ ضابطہ یہی ہے کہ امتحان لیا جائے اور تمہارے لئے استثناء کو نامناسب سمجھا اس لئے رعایت نہیں کی گئی۔

حکمت مصائب

جب یہ مثال سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھئے کہ بلا میں بھی یہی حکمت ہے کہ امتحان لینا مقصود ہے کہ دیکھیں کون کیسا ہے کون کیسا ہے تمہاری دعا اسی لئے قبول نہیں ہوئی کہ ضابطہ وہی ہے اور تم اپنے کو ضابطہ سے مستثنیٰ کرنا چاہتے ہو۔ اور یہ استثناء حکمت و مصلحت کے خلاف ہے اور امتحان اس لئے لیا جاتا ہے تاکہ تمہیں خود اپنی حالت کا علم ہو جائے ورنہ خدا کو تو بغیر امتحان کے علم ہے اسی کو آیت میں فرماتے ہیں جسے میں نے ابتداء میں تلاوت کیا ہے **احسب الناس ان یترکوا** الآیہ میں اس امتحان کے علاوہ جو کہ ایک حکمت جلی ہے بلا کی ایک خفی حکمت بھی بیان کرتا ہوں۔

وہ یہ ہے کہ جب کوئی بلا آتی ہے تو اخلاق پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے جن میں نفسانی امراض کا بڑے بڑے مجاہدوں سے علاج ہونا چاہئے تھا ان کا علاج مصائب اور رنج وغم سے بہت جلدی ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک مجاہدہ ہے کیونکہ مجاہدہ دو قسم پر ہے۔

۱: اختیاری ۲: ایک اضطراری

اختیاری مجاہدہ تو یہ ہے کہ تقلیل الکلام (کم بولنا) تقلیل الاختلاط مع الانام (لوگوں سے کم ملنا جلنا) تقلیل المنام (کم سونا) تقلیل الطعام (کم کھانا) جس سے اس زمانہ کے لئے صرف اول کے دو جز کافی ہیں مگر یہ مجاہدہ بعض امراض کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ اس کے لئے مجاہدہ اضطراری کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ بدوں امداد غیبی کے قصد و اختیار سے نہی شرعی کے سبب ناممکن ہے مثلاً اگر کوئی سنکھیا کھائے اور کسی طرح اپنے کو بیمار ڈالے یا ہلاک کرے تو ناجائز ہے اس لئے وہ خدا کی طرف سے بیمار کیا جاتا ہے اس کی بیوی بچوں کو موت دیدی جاتی ہے اگر یہ خود مارے تو ناجائز ہے پس یہ رحمت ہے کہ تمہارا کام ادھر ہی کر دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ہی سے نشتر دلوایا جاتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے کوئی نہیں دیتا۔ اور اگر ڈاکٹر مشورہ دے کہ نشتر نہ دو تو بس علاج ہو چکا۔ خیر خواہ ڈاکٹر مریض کی رائے پر کبھی عمل نہیں کرتا۔

دیکھئے بچہ کو ماں باپ پچھاڑ کے چمچہ سے دوا پلاتے ہیں پھر حلق سہلاتے ہیں کہ اندر اتر جائے اور بچہ مچلتا ہے غل مچاتا ہے ہائے رے ہائے رے کرتا ہے مگر اس کے شور وغل کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ سننے والے بھی ماں باپ کو ظالم نہیں سمجھتے بلکہ خیر خواہ سمجھتے ہیں۔

افسوس! آپ کو ماں باپ پر اعتماد ہے خدا پر بھروسہ نہیں وہاں آپ اپنی عقل سے حکمت دریافت کرتے ہیں اور جب سمجھ میں نہیں آتی تو یہ حکم لگا دیتے ہیں کہ اس میں کوئی حکمت نہیں۔

عقل اور حکمت

تعجب ہے صاحبو! جس طرح اور قوائے مدرکہ ہیں اسی طرح عقل بھی تو صرف ایک قوت مدرکہ ہے اور جس طرح وہ سب محدود ہیں اسی طرح عقل بھی محدود ہے۔ مثلاً کان ایک حد تک سنتے ہیں اس کے آگے نہیں سنتے ان کے آگے نہ سننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آواز نہیں ہے۔ مثلاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ میں روز بارہ بجے توپ چلتی ہے اگر اس کی آواز یہاں سنائی نہ دے تو اس کا انکار نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کرنیل گنج میں عطر کی شیشی کھلی اور یہاں خوشبو نہیں آئی تو اس کے کھلنے کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح آنکھ ایک حد تک دیکھتی ہے اس سے آگے کام نہیں کرتی۔ مگر کیا حد سے نظر آگے کچھ ہے نہیں؟ یقیناً اس کا کوئی قائل نہیں۔

جب ہر قوت کے لئے ایک حد ہے تو اس کا کلیہ کا مقتضا یہ ہے کہ عقل کے ادراک کے لئے بھی ایک حد ہونا چاہئے۔ مگر آج کل دماغوں میں بیوقوفی یہ سما گئی ہے کہ کوئی چیز عقل سے مخفی نہ رہنا چاہئے۔ ہر چیز عقل میں آجانی چاہئے کیوں صاحب کیوں آنی چاہئے۔ کان آنکھ کی طرح وہ بھی ایک قوت مدرکہ اور دل کی آنکھ ہے جتنی اس کی قوت اور حد ہے اسی کے موافق ادراک سے عاجز رہے گی تم یہ سمجھتے ہو کہ جو تم نہ سمجھو وہ عقل کے خلاف ہے حالانکہ وہ عقل کے خلاف نہیں۔ بلکہ اس کی حد سے باہر ہے اور ہے صحیح۔

کسی مجذوب سے پوچھا گیا کہ عقل کیا ہے؟ کہا جو خدا کو پاوے پوچھا خدا کون ہے؟ کہا جو عقل میں نہ آوے۔ مطلب یہ ہے کہ عقل وہ ہے جو ہمیشہ اس کی جستجو میں لگی رہے اور اس سے کبھی غافل نہ ہو۔ گو اس کی کنہ اس کی ادراک سے۔ غرض یہ بات ماننا پڑے گی کہ عقل کے لئے بھی ایک حد ہے جس سے آگے وہ نہیں چل سکتی۔

حکمت جلی و خفی

آپ روح ہی کو نہیں سمجھ سکتے کہ کیا ہے۔ جس طرح یہ سمجھ میں نہیں آتی اسی طرح احکام الٰہی کی بعض حکمتیں بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ ہاں نظائر سے تسلی ہونا اور بات ہے۔ اسی طرح بلا میں ایک حکمت امتحان بھی ہے جو حکمت جلی ہے جس کا بیان اول ہوا ہے دو حکمتیں اور بھی ہیں۔ ایک خفی اور ایک اخفی۔

سو حکمت خفی تو یہ ہے کہ بیماری اور مرض سے انسان میں شکستگی اور عجز پیدا ہوتا ہے اور یہ علاج

ہے غرور، ناز، اینٹھ، مرُوڑ کا۔ مثلاً جب تک کوئی نہ مرے اپنی دولت وقوت کا غرور نہیں جاتا۔ اس سے شکستگی پیدا ہوتی ہے اور یہ بڑی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے یہ تو خفی حکمت تھی جس کا بیان ابھی...... ہوا ہے۔

حکمت اخفی یہ ہے کہ بلا میں مشاہدہ ہے یہ ذرا باریک بات ہے۔ یہ اہل اللہ کے لئے ہے۔ عاشق کی شان یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ محبوب کا ایک عضو بھی اس سے چھپا نہ رہے۔ عاشق کو چین نہیں آتا۔ وہ ہاتھ اور انگلیاں تو دیکھنا چاہتا ہی ہے محبوب کے دستانہ پر نظر ڈالتا ہے

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم　　　کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

سر کی چوٹی سے لے کر قدموں تک جہاں دیکھتا ہوں کرشمہ میرے دامن دل کو کھینچتا ہے کہ اصل جگہ یہ ہے۔

اس سے بڑھ کر رخسار ہے اگر محبوب ایک چھپالے اور ایک کھول دے تو بے چین ہوگا کہ کسی طرح دونوں دیکھوں۔

شان جلال و جمال

جس طرح محبوب کے دو رخسارے ہیں یہاں حق تعالیٰ کی دو شانیں ہیں ایک جلال ایک جمال۔ جمال لطف و رحمت وغیرہ ہے اور جلال وہ جسے آپ سختی وقہر سمجھتے ہیں۔ عاشق یہ چاہے گا کہ دونوں کو پہچانوں بغیر اس کے اسے صبر نہیں آتا۔ کیونکہ ایک رخ کی معرفت تھی دوسرے کی نہ تھی۔

یہی راز ہے آدم علیہ السلام کے جنت سے اخراج میں۔ یعنی جب وہ جنت میں تھے انہیں صفت محسن منعم و کریم کی بدرجہ عین الیقین معرفت تھی اور عادل منتقم عفو، تو اب، رحیم، رؤف کی معرفت بدرجہ علم الیقین تو تھی مگر بدرجہ عین الیقین نہ تھی۔ حق تعالیٰ کو ان کی معرفت کو مکمل کرنا مقصود تھا۔ اس کے لئے سامان یہ ہوا کہ ممانعت کے بعد بوسوسہ شیطان گیہوں کا دانہ کھالیا۔ گو اس کا بھی انہیں ثواب ملا۔ کیونکہ یہ ان کی اجتہادی خطا تھی۔ ارشاد ہوا جنت سے باہر ہو جاؤ اس وقت انہیں عادل منتقم کی معرفت ہوئی اس کے بعد توبہ کرنے سے توبہ قبول ہوئی تو تواب کی معرفت ہوئی پھر معاف ہوگیا تو عفو کی معرفت ہوئی پھر رحمت خاصہ متوجہ ہوئی تو رؤف رحیم کی معرفت ہوئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آدم علیہ السلام کی معرفت اور ان کا عین الیقین کے درجہ تک مکمل نہ ہوتا۔

انبیاء علیہم السلام کی لغزشوں سے ان کے معارف اور کمالات بڑھائے جاتے ہیں۔ یہی راز ہے کہ جب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بخار آیا۔ ابن مسعودؓ سے فرمایا مجھ کو بہ نسبت تم لوگوں کے دوگنا بخار ہوتا ہے اور اجر بھی دوگناہ ہوتا ہے چونکہ ان کو معرفت کامل بلکہ اکمل عطا ہوتی ہے

اسلئے ان کے لئے بیماری بھی سب سے بڑھ کر ہونی چاہئے۔ صحت بھی اوروں سے بڑھ کر بیماری بھی اوروں سے بڑھ کر۔ یہی شان ہے انبیاء وصلحاء کی اور اسی مشاہدہ کی بدولت انہیں بلا میں اس قدر مسرت ہوتی ہے کہ آپ کو انعام میں بھی نہیں ہوتی۔

حضرت رابعہ کے ہاں جب عرصہ تک فاقہ نہ ہوتا تو فرماتیں کہ اللہ میاں خفا معلوم ہوتے ہیں کیونکہ بہت دن سے فاقہ نہیں ہوا جو چھیڑ چھاڑ کی دلیل ہے الغرض! یہ حکمتیں تھیں جن میں بعض کا حاصل مجاہدہ تھا اور بعض کا حاصل مشاہدہ اور جو بالکل جلی یعنی کھلی ہوئی حکمت ہے وہ اس آیت میں مذکور ہے۔

فرماتے ہیں کہ الٓمّٓ ایک نکتہ اس میں اس وقت سمجھ میں آیا کہ اسے شروع کیا حروف مقطعات سے۔ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ ہمارے چند حروف کی حکمت تو معلوم نہیں۔ بڑا دعویٰ اور بڑے حکمت جاننے والے ہیں تو انہی کی حکمت بتا دو۔ جب حروف کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے تو ہمارے افعال کی حکمت کیا سمجھو گے یہ تعجیز کے لئے ہے آگے مقصود ارشاد فرماتے ہیں۔

دعویٰ اور دلیل

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا کیا لوگوں کا گمان ہے کہا امنا کہنے سے چھوڑ دیئے جائیں گے وھم لا یفتنون اور امتحان نہ ہوگا۔ کیونکہ امنا (ہم ایمان لائے) ایک دعوٰے ہے اور اس کی دلیل امتحان میں کامیاب ہے وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ۔ پہلے بھی ہم نے لوگوں کا امتحان لیا ہے اور اس امتحان کا ثمرہ کیا ہے۔

فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ (پ۲۰)

کہ اللہ تعالیٰ جان لیں گے کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے

لیعلمن میں ایک علمی تحقیق ہے مگر اس کی تفصیل کا وقت نہیں ہے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ دوسروں پر ظاہر کر دیں کون سچا ہے اور کون جھوٹا ورنہ انہیں تو سچے اور جھوٹے کا پہلے سے علم ہے اس امتحان کے متعلق ایک شعر یاد آیا۔

وجائزۃ دعویٰ المحبۃ فی الھویٰ ولکن لا یخفی کلام المنافق

محبت کا دعویٰ عشق میں جائز ہے لیکن منافق کی بات چھپی نہیں رہتی۔

ایک حکایت یاد آئی ہے کہ ایک نوجوان سے ایک شخص نے کہا۔ میں تم پر عاشق ہوں۔ اس نے التفات نہ کیا جب بہت مرتبہ کہا تو ایک دن اس نے کہا اگر تم عاشق ہو تو سیر بھر چونا بے بجھا

کھالو۔اب تو لگا سوچنے کہ چونا کھاؤں گا تو منہ اور آنتیں سب کٹ جائیں گی۔اس کے سوچنے پر محبوب نے ایک جوتا رسید کیا کہ بس یہی عشق ہے۔واقعی اگر عاشق ہوتا تو چونا پیش کرنے پر چوں نہ کرتا اور کھالیتا۔بس اس روز سے پھر عشق کا نام نہیں لیا۔

اختتام مثنوی میں ایک حکایت ہے کہ ایک شخص ایک عورت کے ساتھ ہولیا اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا پوچھا تم کون ہو۔کہا میں تم پر فریفتہ اور عاشق ہوں کہا مجھ میں کیا رکھا ہے پیچھے میری بہن آرہی ہے وہ مجھ سے ہزار درجہ زیادہ حسین ہے۔یہ بوالہوس اس کے دیکھنے کے پیچھے پلٹے۔جیسا کسی نے کہا ہے

وفاداری مدار از بلبلاں چشم　　　که هر دم بر گلے دیگر سرائیند

بلبل چشم لوگوں سے وفا کی امید نہ رکھ کیونکہ وہ ہر بار دوسرے پھول پر چہچہاتی ہے۔

یہ حضرت جونہی پیچھے پلٹے اس نے ایک دھول رسید کی کہ بس یہی عشق ہے

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی　　　دربیان دعوئے خود صادقی

پس چرا بر بغیر افگندی نظر　　　ایں بود دعوی عشق اے بے ہنر

تو اگر عاشق تھا غیر کی طرف کیوں رخ کیا۔غرض سچے جھوٹے مدعی امتحان کے وقت معلوم ہو جاتے ہیں۔

عند الامتحان یکرم الرجل اویھان (امتحان کے وقت انسان کی یا عزت ہوتی ہے یا ذلت)

امتحان کی حقیقت

اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امنا کے معنی **عشقنا** کے ہیں اور وہ اس طرح کہ **الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ** میں ایمان کے لئے محبت الٰہی کو لازم قرار دیا گیا ہے۔تو اب **امنا** کے معنی **عشقنا و احببنا** ہوئے۔جب تم نے امنا کہہ کر خدا کی محبت کا دعوی کیا تو اس کے لئے امتحان ضروری ہوا۔اس لئے کبھی آپ کی اولاد کو بیمار کر دیتے ہیں کبھی کسی اور عزیز کو۔

اب یہ کہنا کہ بیٹے کو بیمار کیوں کیا اس کے معنی یہ ہوئے کہ مجھے امتحان سے بری کیوں نہ کیا اور جب بری نہ ہوئے تو اب شبہ اور وسوسہ ہونے لگا۔ایک شبہ یہ ہے کہ خدا کو تو خبر ہے کہ کون کیسا ہے اور کون کیسا ہے۔امتحان لینے کی کیا ضرورت۔امتحان تو وہاں لیا جاتا ہے جہاں حالت مخفی ہوتی ہے اس کا جواب جیسا اوپر بھی مذکور ہوا ہے کہ یہ امتحان ظہور علی الممتحن کی غرض سے نہیں لیا جاتا۔بلکہ ظہور علی الناس کی غرض سے لیا جاتا ہے یعنی امتحان اس لئے لیا جاتا ہے کہ لوگ اس کی

حالت سے واقف ہو جائیں کہ سچا مسلمان ہے یا جھوٹا اور یہ اپنی حالت خود بھی جان لے اور جہل مرکب میں مبتلا نہ رہے بعض اوقات آدمی لائق سمجھا جاتا ہے اور خود بھی اپنے کو لائق سمجھتا ہے مگر امتحان کے وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کچھ بھی نہ تھا۔

یہی راز ہے خدا تعالیٰ کے امتحان کا۔ پل صراط اور میزان کی بھی یہی حکمت ہے مقصود یہ ہے کہ کوئی جھگڑا بھی نہ کر سکے اور جہل مرکب میں مبتلا نہ رہے اور حجت تمام ہو جائے۔ معتزلہ نے میزان کا اسی اشکال کی بنا پر انکار کر دیا کہ خدا کو تو معلوم ہے کتنے عمل اچھے ہیں کتنے برے۔ اور یہ نہ سمجھے کہ خدا نے اپنے علم کے لئے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ بندوں کی آگاہی کے لئے کیا تا کہ خدا پر کسی کو الزام رکھنے کا حق نہ رہے وسوسہ کی گنجائش ہی نہ رہے ورنہ اگر کسی جگہ حجت، کج بحثی، اور جہل مرکب کا استعمال نہ ہو تو بدوں امتحان کے صرف اپنے علم کے موافق عمل درآمد کرنے میں بھی کچھ محذور عقلی نہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اپنے شاگردوں کا ماہواری امتحان نہیں لیتے تھے کیونکہ استعداد ہر ایک کی مستحضر تھی جب موقع آتا بلا امتحان لئے نمبر بھر دیتے اور فرماتے تھے کہ مجھے سب معلوم ہے کہ کون کیسا ہے اور کون کیسا ہے اور یہ بھی فرما دیتے تھے کہ اگر کسی کو یہ احتمال ہو کہ مجھے کم نمبر دیئے ہیں تو لاؤ امتحان لے لوں۔ مگر کسی کو یہ کہنے کی ہمت نہ تھی کہ ہاں لے لیا جاوے۔

امتحان سے مدعی کی زبان بند کرنا مقصود ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ اس لئے امتحان لیتا ہے کہ لوگوں پر اور خود اس پر بھی یہ ظاہر ہو جاوے کہ محبت کا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا۔ اگر یہ اس امتحان میں فیل ہو گیا تو اسے یہ بھی نفع ہوگا کہ آگے پھر کوشش کرے گا اور کوشش کر کے اعلیٰ لیاقت پیدا کر کے پھر امتحان میں ضرور پاس ہو جاوے گا تو جو کچھ بلا اور مصیبت آتی واللہ سب رحمت ہے اس میں ذرا بھی حرج نہیں البتہ ایسے شخص کے لئے ضرور پریشانی ہے جس کا تعلق خدا تعالیٰ سے ضعیف ہے ورنہ سراسر رحمت ہی رحمت ہے چونکہ اس وقت بہت سی ...... پریشانیوں کا ہجوم ہے جن سے خیالات متزلزل ہو رہے ہیں اس لئے میں نے عمر بھر کے لئے علاج بتا دیا جو شخص اس علاج سے کام لے گا وہ تھوڑے ...... دنوں تک صبر کرتے کرتے پھر بجائے صبر کے شکر کرنے لگے گا۔

خلاصہ بیان

اجمالاً خلاصہ بیان کا پھر اعادہ کرتا ہوں۔ اگر سارے مضمون کو یاد نہ رکھ سکو تو اتنا جز و تو ضرور یاد رکھو کہ خدا سے محبت پیدا کر لو تو کبھی حکمت کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا اور نہ شبہ کا وسوسہ آئے گا۔ پھر

بلا کی حکمتوں کے جاننے ہی کی ضرورت نہ رہے گی۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ باوجودیکہ جلیل القدر مجتہدین میں سے ہیں حضرت حافیؒ کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ حالانکہ حضرت بشر حافیؒ علوم ظاہری میں کوئی معتد بہ درجہ نہ رکھتے تھے۔ مگر خدا کی محبت میں سرشار تھاے۔ ایک طالب علم نے امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا کہ انکو علوم میں کچھ بھی دسترس نہیں پھر آپ ان کی اس قدر تعظیم کیوں کرتے ہیں۔؟

فرمایا میں ان کی تعظیم اس لئے کرتا ہوں کہ میں کتاب کا علم رکھتا ہوں اور یہ کتاب والے کا علم رکھتے ہیں۔ طالب علم نے کہا میں ان سے کوئی مسئلہ پوچھوں؟ فرمایا ان سے مسئلہ نہ پوچھنا۔ طالب علم نے نہ مانا اور جا کے پوچھا کہ حضرت نماز میں سہو ہو جائے تو کیا کرنا چاہئے۔ فرمایا ایسے غافل قلب کو سزا دینی چاہئے جو خدا کے سامنے سہو کرے۔ پوچھا کسی کے پاس مال ہو تو زکوٰۃ کس حساب سے دے؟ فرمایا تمہاری زکوٰۃ تو یہ ہے کہ جب بقدر نصاب مال جمع ہو جائے اور سال گذر جائے تو چالیسواں حصہ مساکین کو دیدو اور ہماری زکوٰۃ یہ ہے کہ وہ سب بھی دیں اور اوپر سے نفس کو اس کی سزا دیں کہ اتنا جمع ہی کیوں کیا وہ طالب علم گھبرائے کہ ان سے سوال کرنے سے تو دل پر کچھ اور ہی اثر پڑتا ہے۔ یہ تو اپنی طرف کھینچتے ہیں پھر فقہ کون حاصل کرے گا۔

یہ اثر تھا محبت کا۔ اس لئے کہتا ہوں تم اپنے اندر محبت پیدا کرلو۔ جس کے بعد پھر پریشانی کی حکمت کے سوال ہی کی حاجت نہ رہے اگر محبت ہو جائے تو پریشانی کی صورت بھی نہ نظر آئے ہر حال میں خوش رہے۔

حضرت خبیبؓ کو کفار مکہ نے قتل کرنا چاہا۔ فرمایا اچھا اتنی مہلت دے دو کہ میں رکعتیں پڑھ لوں۔ مہلت ملی۔ اچھی طرح وضو کیا۔ اور نماز پڑھی اور جوش میں آ کر یہ شعر پڑھے

ولست ابالی حین اقتل مسلما　　　علی ای شق کان للہ مصرعی

یعنی خدا کی راہ میں کسی کروٹ بھی قتل کیا جاؤں کچھ حرج نہیں

وذلک فی ذات الالہ وان یشاء　　　یبارک وعلی اوصال شلو ممزع

حضرت سعد بن جبیرؒ کو حجاج بن یوسف نے قتل کیا۔ قبلہ کی طرف منہ کر کے فرمایا:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا

وما انا من المشرکین (پ ۷)

" میں نے اپنا منہ اس ذات پاک کی طرف کیا۔ اس کی طرف میں متوجہ ہوا جس نے

آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا۔ اور میں مشرک نہیں ہوں۔"

حجاج کو غصہ آیا۔ اس نے کہا۔ ان کا منہ قبلہ کی طرف پھیر دو۔ پھیر دیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ   جس طرف بھی منہ کرو اللہ تعالیٰ ادھر موجود ہے

اسے اور غصہ آیا اس کا منہ زمین کی طرف کر دو۔ زمین کی طرف کر دیا گیا تو فرمایا۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى

اسی مٹی سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں واپس بھیج رہے ہیں اور اسی مٹی سے دوسری مرتبہ قیامت کے بعد پھر نکال کھڑا کریں گے۔"

بہت غصے ہوا اور حکم دیا جلدی قتل کرواسے تو سارا قرآن یاد ہے۔ غرض قتل ہو رہے ہیں اور کچھ پرواہ نہیں۔ حضرت یہ کیا بات تھی؟ بات یہ تھی کہ ان کی رگ رگ میں محبت رچی ہوئی تھی۔ یہ اثر تھا کہ پریشانی پاس نہ تھی۔

دیکھ لیجئے یہ ہیں آپ کے بزرگ اور ایک آپ ہیں کہ ایک دو مہینے کا لونڈا مر گیا اور لگے ہائے وائے کرنے۔ کیا یہی محبت ہے ؎

تو بیک زخمے گر یزانی زعشق   تو بجز نامے چہ میدانی زعشق

یہ محبت نہیں کہ ذرا سا چرکہ لگا اور بھاگ نکلے۔ اب صرف یہ بات رہ گئی کہ محبت کیونکر پیدا ہو۔ اسکا مختصر سا طریقہ یہ ہے کہ ایک وقت معین کرو جس میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کیا کرو۔ تھوڑے دنوں کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ محبت پیدا ہو جائے گی اور خود بخود حکمتیں کھلنے لگیں گی۔ دوسرے کسی بزرگ کی صحبت میں بیٹھا کرو۔ اہل محبت کے تذکرے دیکھا کرو میں نے ایک کتاب روض الریاحین کا جس میں پانچ سو بزرگوں کی حکایتیں ہیں اردو میں ترجمہ کرا دیا ہے پانچ سو وہ اور پانچ سو دوسری معتبر حکایتوں کا اضافہ کر کے اسکا لقب ہزار داستان رکھا ہے۔ وہ عنقریب چھپ جائے گی۔

میرا یقین ہے کہ جو شخص ساری کتاب اچھی طرح سمجھ کر کے دیکھے گا ضرور عاشق ہو جائے گا۔ آخر ایک ہزار عشاق کے تذکرے دیکھنے سے کہاں تک اثر نہ ہوگا۔ اور بھی کتابیں اس قسم کی ہیں مثلاً احیاء العلوم، مقاصد الصالحین وغیرہ! الغرض! یہ مجموعہ اجزاء محبت پیدا کرنے کی تدبیر ہے پھر سب قصے سہل ہو جائیں گے اب دعا کرو کہ حق تعالیٰ اپنی محبت دے آمین۔ (اشرف علی۔ ۲۵ ذی قعدہ ۱۳۵۲ھ)

آداب المصاب

فضیلت صبر کے متعلق یہ وعظ یکم رمضان المبارک ۱۳۵۴ھ بروز پنجشنبہ بوقت صبح ساڑھے آٹھ بجے تھانہ بھون میں منشی اکبر علی صاحب کے مکان پر کرسی پر بیٹھ کر فرمایا جو اڑھائی گھنٹہ میں ختم ہوا۔ ۶۰ مرد تھے اور عورتیں علاوہ پردہ میں تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدً عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمۡ۔

اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡھُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ. قَالُوۡٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡھِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَرَحۡمَۃٌ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُھۡتَدُوۡنَ (البقرہ آیت نمبر ۱۵۵تا۱۵۶)

(ترجمہ: اور آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے جن کی یہ عادت ہے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم (تو مع مال واولاد حقیقۃً اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب (دنیا سے) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں ان لوگوں پر (جدا جدا) خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے ہوں گی اور عام رحمت بھی اور یہی لوگ ہیں جن کی حقیقت حال تک رسائی ہوگی)

مصائب تکوینیہ وتشریعیہ

یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے جس میں مصائب وبلیات کا تذکرہ ہے یعنی...... مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ہم تم کو مختلف مصائب وبلیات سے آزمائیں گے یعنی تمہارا امتحان لیں گے۔ یہ عنوان اس

لئے اختیار فرمایا تا کہ بندوں کو مصائب و بلیات سے توحش نہ ہو۔ بلکہ وہ اس کے لئے پہلے سے آمادہ رہیں اور ظاہر ہے کہ انسان جس چیز کے لئے پہلے سے آمادہ رہتا ہے وہ زیادہ پریشانی کا سبب نہیں بنتی۔ پھر اس کو امتحان و آزمائش قرار دینے سے ہر شخص کو اس بات کی بھی فکر ہوگی کہ اس امتحان میں کامیابی حاصل ہو ناکامی کا سامنا نہ ہو۔ اور کامیابی کا طریقہ آگے صبر بتلایا ہے۔ تو پہلے ہی سے صبر کی تیاری کرے گا اور اس کی تکمیل کی کوشش کرے گا تو یقیناً وقت پر مصیبت کا اثر بہت ہی معمولی رہ جائے گا۔

اب یہ سمجھنا چاہئے کہ جن مصائب و بلیات کا اس مقام پر ذکر ہے ان کی تفسیر مختلف ہے۔ بعض تفاسیر پر ان سے مراد تکوینی مصائب ہیں یعنی مصائب غیر اختیاریہ۔ چنانچہ خوف سے ناگہانی خوف مراد لیا ہے جیسے ڈاکو، چور، درندہ وغیرہ کا خوف اور جوع سے فاقہ جس کا سبب عسرت افلاس ہو اور نقص اموال سے ناگہانی نقصان مال جیسے تجارت میں نقصان ہو گیا یا مال چوری ہو گیا اور نقص انفس سے عزیزوں کی موت جو کسی مرض یا وبا کی وجہ سے ہو جائے اور نقص ثمرات سے باغات کا نقصان جیسے بجلی یا پالے یا آندھی سے پھل گر جائیں یا خراب ہو جائیں وغیرہ وغیرہ۔

بعض تفاسیر پر ان کا محل تکالیف تشریعیہ ہیں یعنی وہ امور اختیاریہ جن کا شریعت نے انسان کو مکلف کیا ہے۔ چنانچہ امام شافعیؒ سے جوع کی تفسیر روزہ سے اور نقص اموال و ثمرات کی تفسیر زکوٰۃ سے اور خوف اور نقص انفس کی تفسیر جہاد سے منقول ہے۔

میں نے ان آیات کو اسلئے بھی اختیار کیا ہے تا کہ مصائب تکوینیہ کے آداب کیساتھ جن کو وقت اور مقام مقتضی ہے وقتی تکالیف تشریعیہ یعنی روزہ کے آداب واحکام بھی کچھ بیان کردوں جن کو زبان بیان مقتضی ہے کیونکہ آج رمضان کی پہلی تاریخ ہے اگر یاد رہا تو ان شاء اللہ اسکو بیان کرونگا اور چونکہ کسی نے کسی تفسیر کو غلط نہیں کہا اسلئے یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں مصائب تکوینیہ بھی تشریعیہ بھی۔ اور جو ثواب مصیبت پر صبر کرنے کا اس جگہ مذکور ہے وہ دونوں پر متفرع و مرتب ہوگا اور چونکہ امت نے دونوں تفسیروں کو قبول کرلیا ہے اسلئے تلقی است بالقبول کے بعد کسی کو اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال کہنے کا موقع نہیں رہا۔

یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ شاید کوئی ذہین طالب علم یہ اشکال کرے کہ جب آیت کی تفسیر میں اختلاف ہے تو اس سے کچھ بھی ثابت نہ ہوا۔ جواب یہ ہے کہ اذا جاء الاحتمال اس مقام کے ہے جہاں دونوں شقوں کے حکم میں اجتماع نہ ہو سکے اور جہاں دونوں شقیں حکم میں جمع ہو سکتیں اور امت نے دونوں کو قبول کرلیا ہو۔ وہاں اس قول کی گنجائش نہیں ہے۔

غذائے روحانی

سبحان اللہ! حق تعالیٰ کی کس قدر رحمت ہے کہ امور اختیاریہ پر تو اجر ملتا ہی ہے مصائب غیر اختیاریہ پر بھی اجر عطا فرماتے ہیں جو مشقت انسان اپنے اختیار سے اٹھائے اس پر تو عقلاً استحقاق اجر ہوسکتا ہے مگر جو مصیبت بلا اختیار وارادہ کے وارد ہو اس پر اجر دینا رحمت ہی رحمت ہے اور اگر زیادہ غور کیا جائے تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ طاعات اختیاریہ پر اجر ملنا بھی رحمت ہی رحمت ہے کیونکہ طاعات تو غذائے روحانی ہیں جن سے ہم کو ہی نفع ہوتا اور ہمارے باطن کو غذا ملتی ہے تو ان طاعات کے بعد اجر عطا فرمانا ایسا ہی ہے جیسے کسی کو دعوت کھلا کر دانت گھسائی کے روپے بھی دیئے جائیں۔ اسی طرح مجاہدات غیر اختیاریہ کی ایسی مثال ہے، جیسے طبیب مسہل دیا کرتا ہے۔ اب اگر کوئی طبیب مسہل دیکر مریض کو دو روپے بھی دے تو یہ سراسر عنایت ہے یا نہیں؟

خالق کا ادب

پھر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے ہماری کوئی قرابت اور رشتہ داری تو ہے نہیں اور جن لوگوں نے قرابت جتلائی تھی ان کو بہت سختی کے ساتھ زجر کیا گیا ہے اور ایسا سخت خطاب کیا گیا ہے کہ دم بخود رہ گئے ہوں گے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ط قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ط بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ (پ ٦)

(اور یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) یہ پوچھیے کہ پھر تم کو تمہارے گناہوں کے عوض عذاب کیوں دیں گے بلکہ تم بھی منجملہ اور مخلوقات کے ایک معمولی آدمی ہو)

یہ تو ان کے متعلق ارشاد ہے جنہوں نے اپنے کو حق تعالیٰ کا قرابت دار بتلایا تھا اور جنہوں نے دوسرے مقبولین کو اللہ کا قرابت دار ٹھہرایا تھا ان پر تو بہت مقامات میں انکار و وعید مذکور ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ط بَلْ لَّهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ

(حق تعالیٰ موجود ہیں آسمان اور زمین کے اور جب کسی کام کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو بس اس کام کی نسبت اتنا فرما دیتے ہیں کہ ہو جا بس وہ اسی طرح ہو جاتا ہے)

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَاِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (پ ۱)

(اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے، سبحان اللہ (کیا سہل بات ہے) بلکہ خاص اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں جو کچھ بھی آسمانوں میں اور زمین میں (موجودات) ہیں اور سب اسکے محکوم بھی ہیں)

اسی طرح جا بجا مختلف طریقوں سے ابنیت کا ابطال فرمایا ہے اور گو یہ دلائل ابنیت حقیقۃ کی نفی کرتے ہیں اور یہود و نصاری ابنیت حقیقۃ کے قائل نہ تھے صرف ابنیت مجازیہ کے قائل تھے۔ مگر حق تعالیٰ نے ابنیت حقیقۃ کے ابطال سے اس بات پر ہم کو متنبہ فرمایا ہے کہ جس بات سے اللہ تعالیٰ منزہ ہیں اور اس کا ثبوت حقیقۃً اللہ تعالیٰ کے لئے محال اور خلاف شان ہے اس کے ایہام سے بھی بچنا واجب ولازم ہے کیونکہ موہم الفاظ کا استعمال کرنا خلاف ادب ہے۔

آخر یہ کیا غضب ہے کہ سب کا تو ادب ہو اور اللہ تعالیٰ کا ادب نہ ہو آخر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب ہے استاد کا ادب ہے۔ باپ کا ادب ہے۔ پیر کا بھی ادب ہے پھر خدا تعالیٰ کا ادب کیوں نہ ہو۔

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب یہ ہے:

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (پ ۱۸)

کہ آپس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اس طرح نہ لیا کرو جس طرح ایک دوسرے کا نام لیتے ہو۔ نیز ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (پ ۲۶)

(جو لوگ حجروں کے باہر سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پکارتے ہیں ان میں اکثروں کو عقل نہیں ہے)

"یعنی جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف رکھتے ہوں تو باہر کھڑے ہو کر آپ کو نہ بلاؤ بلکہ اس کا انتظار کرو کہ آپ خود باہر تشریف لائیں تو اس وقت ملو اور بات چیت کرو۔"

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (پ ۲۶)

(اور اگر یہ لوگ ذرا صبر اور انتظار کرتے یہاں تک کہ آپ خود باہر ان کے پاس آ جاتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اپنے اساتذہ کا ایسا ہی ادب کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ بعض دفعہ کسی حدیث کے لئے کسی انصاری صحابی کے گھر پر دو پہر کے وقت پہنچا اور دروازہ بند دیکھا تو وہیں بیٹھ گیا اور ان کو آواز نہیں دی۔ سارا وقت دو پہر کا دروازے پر گزار دیا۔ جب وہ خود ہی نماز

کے لئے باہر نکلے اس وقت ان سے ملے اور حدیث سنی۔ حالانکہ عبداللہ بن عباسؓ اہل بیت نبوت سے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی ہیں۔ اگر کسی کو باہر سے آواز دے لیا کرتے تو ان کو گراں نہ گزرتا۔ بلکہ وہ خوشی کے ساتھ باہر آتے مگر استاد کا ادب یہی ہے کہ اس کو دروازہ پر کھڑے ہو کر نہ پکارا جائے بلکہ اس کے باہر آنے کا انتظار کیا جائے۔ علم اسی طرح آتا ہے۔ (اور جن لوگوں نے استادوں کا ادب نہیں کیا ان کو علم نہیں آیا۔ گو کتابیں ختم ہو گئی ہوں مگر کیا کتابیں ختم کر لینے ہی کا نام علم ہے؟ ہرگز نہیں ورنہ اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو جاہل نہ قرار دیتے اور ان کے لئے

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا. ارشاد نہ فرماتے۔

(مثال ان لوگوں کی جو تورات کا علم رکھتے ہیں پھر اس پر عمل نہیں کرتے ایسے ہے جیسے گدھے کے سر پر بوجھ لادا جائے)

جب استاد کا بھی ادب لازم ہے اور اس سے زیادہ باپ کا اور اس سے بھی زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب ہے تو اب خود سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کا ادب کس درجہ کا ہونا چاہئے لیکن آج کل عام طور پر لوگ مخلوق کا تو ادب بہت کرتے ہیں مگر خالق کا ادب نہیں کرتے اور اس مرض میں بعض اہل علم بھی مبتلا ہیں۔

ادب کا مدار

حق تعالیٰ کی شان میں بعض علماء بھی ایسے الفاظ کہہ جاتے ہیں جو حضورؐ کی شان میں وہ استعمال نہیں کر سکتے۔ البتہ صیغہ واحد کا استعمال حق تعالیٰ کے لئے خلاف ادب نہیں کیونکہ اول تو یہ عرف عام ہو گیا ہے اور ادب کا مدار عرف ہی پر ہے۔ ورنہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے لطیفہ سے سب کو خاموش ہونا پڑے گا۔ جیسا ایک عالم کو آپ نے خاموش کر دیا تھا۔

آپ نے اس سے سوال کیا کہ اگر کوئی شخص فرش پر بیٹھا ہو اور قرآن کو رحل پر رکھے ہوئے پڑھ رہا ہو اور دوسرا آدمی پلنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھ جاوے یہ جائز ہے یا نہیں؟ مولوی صاحب نے کہا جائز نہیں کیونکہ اس میں قرآن کی بے ادبی ہے۔ مولانا اسمٰعیل صاحب نے فرمایا کہ اگر قرآن کے سامنے کوئی کھڑا ہو جائے تو یہ کیسا؟ کہا یہ جائز ہے مولانا نے فرمایا کہ دونوں صورتوں میں کیا فرق ہے۔ چارپائی پر بیٹھنے میں اگر بے ادبی پیروں کی ہے تو پیر تو پلنگ پر بیٹھنے والے کے بھی نیچے ہیں اور اگر بے ادبی سرین کے اونچے ہونے سے ہے تو سرین کھڑے ہونے والے کے

بھی اونچے ہیں۔ وہ مولوی صاحب حیران ہوکر خاموش ہو گئے۔ اگر فقیہہ ہوتے تو کہہ دیتے کہ ادب کا مدار عرف پر ہے اور عرف میں پہلی صورت کو بے ادبی اور دوسری کو ادب شمار کیا جاتا ہے مولانا اسمٰعیل شہید کے مزاج میں شوخی یعنی زندہ دلی بہت تھی اس لئے ان کے یہاں ایسے ایسے لطیفے اکثر ہوتے رہتے تھے جن کا جواب کوئی ان ہی جیسا دے سکتا تھا۔ ہر شخص نہ دے سکتا تھا۔

اور ہمارے ماموں امداد علی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ شوخی مزاج کی دلیل ہے نفس کے مردہ ہونے اور روح کے زندہ ہونے کی اور متانت دلیل ہے روح کے مردہ ہونے اور نفس کے زندہ ہونے کی۔ اکثر اہل اللہ شوخ مزاج یعنی زندہ دل ہوتے ہیں۔

بہر حال ادب کا مدار عرف پر ہے فقہاء نے اس کو خوب سمجھا ہے چنانچہ **لا تقل لھما اُفٍ** کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ حقیقت اس نہی کی ایذاء والدین سے منع کرنا ہے یہاں تافیف موجب ایذاء وہاں حرام ہے اور اگر کسی وقت عرف بدل جائے اور تافیف موجب ایذاء نہ ہو تو حرام نہیں اور فقہاء نے جو بعض احکام میں تغیر عرف کی وجہ سے بدلنے کا حکم فرمایا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ احکام حقائق کے متعلق ہوتے ہیں۔ اور عرف کے بدلنے سے وہ حقیقت نہیں بدلتی جس سے تعلق حکم کا تھا صرف عرف سے اس حقیقت کی صورت تحقق بدل جاتی ہے۔ سو صورت مدار حکم نہیں۔ مثلاً جس حکم کا مدار ایذاء پر تھا وہ ایذاء ہی پر مرتب ہوگا۔ بدوں ایذاء کے حکم ثابت نہ ہوگا پس اگر ایک لفظ کسی قوم کے عرف میں موجب ایذاء ہے وہاں وہ تلفظ حرام ہوگا اور دوسری قوم کے نزدیک موجب ایذاء نہیں وہاں تلفظ حرام نہ ہوگا۔

جیسے سر کا ہلانا ہمارے یہاں ایک ہیئت سے یعنی فوق و تحت کو اقرار کے لئے ہے اور ایک ہیئت سے یعنی یمین و شمال کو انکار کے لئے مگر حیدر آباد میں ہمارے یہاں کی انکاری ہیئت بہت لطیف فرق سے اقرار کے لئے بھی ہے تو وہاں اس فرق کے جاننے والے کی نظر میں اس سے اقرار ہی مفہوم ہوگا انکار مفہوم نہ ہوگا اور جو شخص وہاں کے عرف سے ناواقف ہوگا وہ بڑا پریشان ہوگا۔

چنانچہ ایک مدرس ہمارے اطراف کے وہاں پہنچ گئے۔ طلباء کے سامنے کتاب کی تقریر کر کے پوچھا سمجھ گئے انہوں نے اپنے قاعدہ کے موافق سر ہلا دیا جس کو انہوں نے انکار پر محمول کر کے دوبارہ تقریر کی اور پوچھا سمجھ گئے تو انہوں نے پھر اس طرح سر ہلا دیا۔ اب تو یہ بالکل مایوس ہو گئے اور ایک شخص سے شکایت کی کہ یہاں کے طلباء بڑے غبی ہیں۔ میں نے تین دفعہ ایک مقام کی تقریر کی اور میرے پوچھنے پر یہی کہتے رہے ہم نہیں سمجھے۔

وہ شخص عاقل تھا۔ دنوں مقامات کے عرف سے واقف تھا اس نے کہا کہ انہوں نے زبان سے کہا تھا کہ ہم نہیں سمجھے؟ کہا زبان سے تو نہیں بلکہ انکار کی ہیئت سر ہلایا تھا جب انہوں نے بتلایا کہ یہاں کا عرف دوسرا ہے یہاں اقرار کے لئے بھی اسی طرح سر ہلاتے ہیں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ ادب کا مدار عرف پر ہے اور اس کو فقہاء نے سمجھا ہے اور اس لئے جہاں حقائق نہیں بدلے صرف عرف بدلا ہے وہاں تبدل عرف سے احکام بدل جانے کا حکم فرما دیا ہے۔

مگر آج کل جہلا حقائق کو بدلنا چاہتے ہیں اور دقاحت یہ ہے کہ ایسے لوگ باوجود جاہل ہونے کے علماء کے سامنے احکام شرعیہ میں گفتگو کرتے ہیں بس وہ حال ہے کہ

گر بہ میر وسگ وزیر وموش را دیوان کنند　　　ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

بلی بادشاہ، کتاب وزیر، چوہا ہیڈ کلرک ہے اس طرح کے سلطنت کے ارکان ہی ملک کو ویران کرتے ہیں۔"

پچھلے دنوں سنا تھا کہ ایک غیر مسلم بڑا لیڈر جیل میں قرآن کا مطالعہ کر رہا ہے اور اس سے احکام کا استنباط کر رہا ہے۔ میں نے کہا واقعی یہ اجتہاد واستنباط سب سے بڑھ کر ہوگا کیونکہ امام ابوحنیفہؒ کے معتقدین تو کبھی کسی مسئلہ میں امام صاحب کی خطا کا بھی اقرار کر لیتے ہیں مگر اس لیڈر کے مسلمان معتقد بھی کبھی اس کی خطا کا انکار نہیں کرتے اس کا استنباط سب سے بڑھ کر ہوگا (جس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ جیل سے نکل کر اس نے ایک تقریر میں یہ کہا کہ میں نے قرآن کا مطالعہ بڑے غور سے کیا مگر مجھے اس میں ذبح حیوانات کا حکم کہیں نہیں ملا۔ آپ کے غور کی تو یہ حالت ہے کہ پہلے سپارہ میں **ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ** نظر نہ آیا۔ نہ معلوم بے غوری سے مطالعہ کرتے ہیں اور کس کس چیز کا انکار کر دیتے۔

یہ تقریر ادب پر چلی تھی کہ حق تعالیٰ کا ادب سب سے زیادہ ضروری ہے مگر پھر بھی صیغہ واحد کا استعمال حق تعالیٰ کی جناب میں خلاف ادب نہیں کیونکہ عرف عام ہو گیا ہے اور عرف میں اللہ تعالیٰ کے لئے صیغہ واحد غالباً اس لئے اختیار کیا گیا کہ اس میں توحید پر زیادہ دلالت ہے اور صیغہ جمع میں توحید کی صراحت نہیں۔

مگر مجھے اپنے استاد رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت سے صیغہ جمع کے استعمال کی عادت ہوگئی ہے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ ہمیشہ یونہی ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں کیونکہ صیغہ جمع میں تعظیم زیادہ ہے۔

رہا یہ کہ اس میں توحید کی رعایت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ توحید اس میں بھی محفوظ ہے کیونکہ علماء بلاغت نے لکھا ہے موحد **انبت الربیع البقل** کہے تو اسناد مجازی ہوگی۔ اسی طرح یہاں سمجھ لو۔

رہا یہ کہ قرآن میں بھی کہیں اس کی اصل موجود ہے یا نہیں۔ سو صیغہ تکلم میں تو بکثرت صیغہ جمع اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے اختیار فرمایا ہے اور خطاب کی صورت میں بھی ایک جگہ صیغہ جمع آیا ہے قال رب ارجعون (پ ۱۸) اس میں اللہ کو صیغہ جمع کے ساتھ خطاب ہے اور گو اس میں دوسرا احتمال بھی بیان کیا گیا ہے کہ جمع سے مراد تکرار فعل ہے رب ارجع رب ارجع۔ مگر تکرار فعل کے لئے صیغہ جمع کا لانا خلاف ظاہر ہے۔ اس لئے یہ احتمال بعید ہے اور اگر بعید بھی نہ ہو تو دوسرا احتمال بھی امت کے نزدیک متلقی بالقبول ہے اس لئے اس کا اعتبار و اتباع بھی جائز ہے۔

بہر حال اس کی اصل بھی موجود ہے اور اس لئے یہ بھی جائز ہے۔ مگر پھر بھی میں کسی ایک شق کو دوسری پر ترجیح نہیں دیتا کیونکہ ممکن ہے کہ اپنے استاد کی محبت کی وجہ سے اس شق کو پسند کرتا ہوں۔

رحمت بلا علت

اس جملہ معترضہ کے بعد میں پھر اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ سے ہماری کوئی قرابت نہیں اور اسی سلسلہ میں قرابت کے موہم الفاظ کے استعمال کو خلاف ادب بتلایا تھا۔ مگر باوجود قرابت نہ ہونے کے پھر بھی ان کی شفقت و رحمت ہمارے ساتھ بے انتہا ہے۔ چنانچہ کیا یہ عین شفقت و رحمت نہیں ہے کہ جو مشقت ہم اپنے اختیار سے برداشت کریں اس پر بھی اجر اور جو بلا اختیار وارد ہو جائے اس پر بھی اجر۔ اور گو باوجود قرابت نہ ہونے کے حق تعالیٰ سے ہمارا ایسا تعلق ہے جس کے مقابلہ میں نہ قرابت کوئی چیز ہے نہ ابوۃ و بنوۃ۔ اور بعض صوفیا تو اس تعلق کی تفسیر میں بہت آگے پہنچ گئے ہیں جس کا تحمل عقول عامہ کو نہیں ہو سکتا۔

مگر اتنی بات تو سب سمجھ سکتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ رحمت بلا علت ہے اس سے بڑھ کر کیا تعلق ہوگا اور اس شدت تعلق کا مقتضا بھی یہی ہے کہ وہ ہم پر خاص توجہ فرمائیں تو پھر ہر حال میں اجر دینا کیا عجیب ہے۔

سو یہ شدت تعلق اور اس کا مقتضا مسلم مگر اس کے ساتھ استغناء حق پر بھی تو نظر کی جائے جو اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے تو اس پر نظر کرنے سے پھر عقل کا فتویٰ یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو کوئی نفع نہ پہنچائیں کیونکہ جب ان کا کوئی کام ہمارے اوپر اٹکا ہوا نہیں اور وہ تمام عالم سے مستغنی ہیں تو وہ ہم پر کوئی انعام کیوں کریں؟ کیونکہ سلاطین جو کسی پر انعام کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو بھی رعیت کی احتیاج ہے۔ وزراء و افسران فوج کو خوش رکھنے کی ان کو ضرورت ہے تا کہ رعیت

باغی نہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کو کسی کے خوش رکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جس پر رحمت فرماتے ہیں بلا سبب اور بلا علت فرماتے ہیں۔ پس عقل کا فتویٰ تو یہ ہوگا کہ بلا علت کے کسی پر کیوں رحمت و شفقت کی جائے؟ بلا وجہ کسی کی کیوں حفاظت کی جائے؟

اس لئے کہا کرتا ہوں کہ عقل انسان کی خیر خواہ نہیں بلکہ دشمن ہے اگر اللہ تعالیٰ عقل کے فتوے پر ہمارے ساتھ برتاؤ کرنے لگیں تو حقیت نظر آ جائے۔ اگر اس پر شبہ کیا جائے کہ بعض اوقات تو ایسے ہوتے ہیں جن میں بندہ پر رحمت نہیں ہوتی بلکہ زحمت ہوتی ہے پھر رحمت کا دعویٰ کیسا۔

جواب یہ ہے کہ اس کا سبب بھی بے توجہی نہیں کہ معاذ اللہ حق تعالیٰ کو حفاظت عبد سے ذہول ہو گیا ہو وہاں اس کا احتمال ہی نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض دفعہ اپنے بندہ پر لطف بصورت قہر بھی فرماتے ہیں۔ آخرت بہت سے مشائخ و مرشدین بھی تو کبھی اصلاح کے لئے یا کسی اعلیٰ مقام کی طرف متوجہ کرنے کے لئے مرید پر سختی کرتے ہیں گو ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تو صورۃً بھی رحمت ہی غالب تھی ایسے شدید واقعات نہیں ہوتے تھے جیسے دوسرے مشائخ کے یہاں ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا تھا۔ اگر نشتر نہ ہو تو پلٹس تو ضرور ہوگی تاکہ زخم سے مواد نکل جائے۔ بچہ کے دل میں جب نشتر لگایا جاتا ہے تو بچہ روتا ہے مگر ماں باپ خوش ہوتے ہیں کہ اب جلدی آرام آ جائے گا۔

طفل مے لرزد زنیش احتجام مادر مشفق ازاں غم شاد کام

بچہ خون لینے کے نشتر سے کانپ رہا ہوتا اور ماں اس کے اس غم سے خوش ہو رہی ہوتی ہے۔

بشارت باواسطہ

اسی طرح مشائخ کی سختی سے ناواقف رنجیدہ ہوتا ہے مگر اہل فہم خوش ہوتے ہیں کیونکہ مشائخ اپنی تعظیم اور پرستش نہیں کراتے کہ خواہ مخواہ لوگوں پر سختی کریں اور حکومت کا سکہ بٹھلائیں بلکہ کبھی تو طالب کی کسی غلطی کی اصلاح کرتے ہیں اور تجربہ ہے کہ اکثر کامل اصلاح سختی ہی سے ہوتی ہے ہر جگہ نرمی کام نہیں دیتی جس زخم میں مواد بھرا ہوا ہو اس پر مرہم نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ پلٹس اور نشتر ہی سے کام لیا جاتا ہے اور بعض دفعہ شان محبوبیت کی وجہ سے طالب علم کا امتحان کرتے ہیں کہ اس کو طریق سے محبت ہے یا نہیں۔ اور اس محبت طریق کا معیار محبت شیخ ہے۔ جس کو شیخ سے جتنی محبت ہوگی اتنی ہی طریق سے ہوگی۔ پس خواہ اس کو شیخ سے محبت کا عنوان کہو یا طریق سے محبت کا عنوان کہو دونوں میں باہم تلازم ہے۔

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

بخت اگر مری مدد کرے اور اس کا دامن میں اپنے ہاتھوں میں لے لوں پھر اگر وہ کھینچے تو مجھے خوشی ہو اور میں کھینچوں تو یہ میرے لئے باعث شرف ہو۔"

سو مشائخ اپنے ساتھ طالب کی محبت کرنے کے بلا وجہ طالب نہیں بلکہ اس لئے طالب ہیں کہ اصل مطلوب کے حصول میں محبت شیخ کو دخل ہے تو جب استاد اور پیر اور والدین کی سختی کو شاگرد، مرید اور اولاد کے حق میں رحمت مانا جاتا ہے کیونکہ ان کا مقصود اصلاح ہے تو حق تعالیٰ کی طرف سے ایسے واقعات کو رحمت کیوں نہیں مانا جاتا۔

الغرض! حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ مشاق اختیاریہ وغیر اختیاریہ دنوں پر ثواب کی بشارت ہے اور بشارت بھی بلا واسطہ نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے بشارت دلوائی ہے گو بظاہر بشارت بلا واسطہ کو ترجیح معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر اسی وجہ سے بشارت بلا واسطہ بھی وارد ہے۔ مگر عام قاعدہ یہ ہے کہ سلطان عظیم الشان کی بشارت بلا واسطہ[1] سے ہیبت میں اضافہ ہو کر حواس گم ہو جاتے ہیں اور بشارت کا لطف حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے بشارت دلوائی ہے کہ آپ ہم جنس بھی ہیں ہم نوع بھی ہیں۔ بلکہ مثل عین کے ہیں چنانچہ اسی لئے قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی جگہ تومنهم فرمایا کسی جگہ مثلكم اور کسی جگہ من انفسكم اور ظاہر ہے کہ نفس شئ کے ایک ہی معنی ہیں اور اس کا معنی کا مصداق آپ میں یہ ہے کہ آپ مسلمانوں کو جان سے زیادہ محبوب ہیں اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (پ ٢١) اور محبّ و محبوب میں ایک گو نہ اتحاد ہوتا ہے تغائر محض نہیں ہوتا۔ یہی مراد ہے صوفیا کی عین سے لوگوں نے اس سے عین باصطلاح فلسفہ سمجھ لیا ہے اور اعتراض کرنے لگے ورنہ اس میں اعتراض کی بات کیا ہے۔ محاورات میں دوست کو کہہ دیا کرتے ہیں کہ تم غیر تھوڑا ہی ہو اور جب غیر نہ ہوا تو عین ہوگا۔ بس جو معنی عین کے یہاں ہیں وہی صوفیا کے کلام میں ہیں۔ مگر نا اہلوں کے سامنے ایسے الفاظ نہ بولنے چاہئیں جو ان کی عقول سے بالا

---

[1] قلت ویمکن ان یقال ان الله تعالیٰ حی کریم یستحی من عبده فلما ابلاه بما اقلقه واحزنهٗ وقد علم ان کل ذلک من ربه تعالیٰ شانه استحیا من مواجیهة بالبشارة لان المولی الکریم اذا امتحن عبده بما یشق علیه ویحزنه من الضرب والتعزیر استحیا من مواجهته بالا نعام بل یرسل الیه مایسرة من التشریفات علی یدا حد من خواصه وفی التبشیر بواسطة سیدنا محمد صلی الله علیه وسلم تسلیة للصابرین بان افضل الخلق واکرم الناس علی الله ینج فی هذه الدارمن المصائب والاّ لام فقد ابتلاه الله بالیتیم فی اول عمره والعلیة فی عنفو ان شبابه وفقد البنین والبنات و موت الاجته فی کهو لته ثم او ذی فی الله ما لم یؤذ احد بعد مابعثه الله الی الخلق نبیاً ورسولاً فصبر علی کل ذلک کما صبر ا ولوا العزم من الرسل فکان افضل الصابرین واکملهم فلیتغر المصابون بذکره ولیقتدوا فی احوالهم بهدیه فانما المحروم من حرم الثواب ١٢ظ۔

ہوں۔ کلموا لناس علی قدر عقولھم ۔ (لوگوں سے انکے فہم کے مطابق بات کرو)

غرض اللہ تعالیٰ نے اس بشارت میں بھی ہمارے جذبات کی رعایت فرمائی ہے۔ چونکہ بشارت بلا واسطہ سے بوجہ غایت عظمت حق تعالیٰ کے ہیبت کا غلبہ ہو جاتا ہے اور بشارت کا پورا لطف نہ آتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بواسطہ بشارت دلوائی۔ شاعر کہتا ہے ؎

سامنے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے　　　تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

درجات صبر

بشارت میں واسطہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جو مسلمانوں کو اپنی جان سے زیادہ محبوب ہیں پھر آپ کو بھی یہ نہیں فرمایا کہ اخبر یا نبی یعنی خبر دیدیجئے بلکہ بشر فرمایا اور بشارت وہ خبر ہے جس سے سننے والے کا چہرہ کھل جائے۔ چہرہ پر خوشی کے آثار نمایاں ہو جائیں پس اگر کوئی بشارت بھی نہ ہوتی تو بشر کا لفظ ہی ہمارے خوش ہونے کو کافی تھا۔ مگر اس پر بس نہیں ہے بلکہ آگے بھی دل جوئی کے بہت سے سامان جمع فرمائے گئے۔ ایک یہ کہ ان کو صابرین کا خطاب دیا اور اس معزز جماعت میں داخل کیا جس میں انبیاء علیہم السلام سب سے پیش پیش ہیں یہ صبر تو پہلا درجہ ہے۔

دوسرا درجہ صبر کے بعد یہ ہے اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ الخ جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ صابر ایسے ہیں کہ صبر کے بعد اپنے دل کو تسلی دیتے ہیں۔ پس یہ دوسرا درجہ تسلی کا ہے اور تسلی بھی کس طرح دیتے ہیں اس کا طریقہ بھی خود ہی ارشاد فرمادیا کہ:

اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ. قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

کہ جب ان کو مصیبت کا سامنا ہوتا ہے تو یوں کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ (پ۲)

اس میں لفظ اذا کا اختیار فرمانا منجانب اللہ تعالیٰ ایک مستقل تسلی ہے کیونکہ لغت عرب میں اذا تیقن کے موقع پر بولا جاتا ہے یعنی جب شرط کا وقوع متیقن ہو تو اس میں بتلا دیا گیا کہ اے مخاطبو! دنیا میں تو مصیبت کا پیش آنا یقینی ہے اس کے لئے پہلے ہی سے تیار رہو۔ اور یہ بھی بڑی رحمت ہے کہ پہلے سے انسان کو خبردار کر دیا جائے کہ تجھے ایسا واقعہ پیش آنے والا ہے علماء نے:

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا (پ۲)

(اب تو (یہ) بیوقوف لوگ ضرور کہیں گے کہ ان پر (مسلمانوں) کو ان کے سابق سمت) قبلہ سے

(کہ بیت المقدس تھا) کس (بات) نے بدل دیا) میں یہی نکتہ بیان فرمایا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دنیا میں مصیبت تو ضرور آئے گی کیونکہ انسان دنیا میں مشقت ہی کے واسطے پیدا ہوا ہے یہاں چین کہاں؟

روح اور جسد کا تعلق

چین تو عالم ارواح میں تھا جہاں نہ مرض کا اندیشہ تھا نہ موت کا خطرہ۔ اس سے بڑھ کر کیا چین ہوگا کہ اپنی بھی خبر نہ تھی۔ سکر ہی سکر تھا کسی نے خوب کہا ہے۔

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

ہمارے حاجی صاحب قدس اللہ سرہ کے رسالہ "دردنامہ غمناک" کے شروع میں بھی اس قسم کے اشعار ہیں۔

سنو یارو عجب قصہ ہمارا — بیان کرتا ہوں میں جو غم کا مارا
پڑا سوتا تھا میں خواب عدم میں — نہ دیکھا تھا کبھی ہستی کے غم میں
یکا یک عشق نے آکر جگایا — جگا کر سو بلاؤں میں پھنسایا
ہر اک کھیل خلقت نے بنایا — تماشے کو بھی تو میرے نہ آیا

مگر چونکہ عالم ارواح میں قرب کی ترقی نہیں ہوسکتی تھی اس لئے روح کو جسد کے ساتھ متعلق کیا گیا کیونکہ ترقی کا مدار مجاہدہ پر ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (پ ۲۱)

(جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے (قرب وثواب یعنی جنت) کے رستے ضرور دکھائیں گے)

اور مجاہدہ بدوں جسد کے نہیں ہوسکتا کیونکہ اعمال دو قسم کے ہیں۔

ایک وہ جو محتاج جسد ہیں جیسے نماز روزہ وغیرہ۔ دوسرے وہ جو محتاج جسد نہیں جیسے عقائد و ذکر وغیرہ پہلی قسم کے افعال تو ظاہر ہے کہ بدوں جسد کے ہو ہی نہیں سکتے اور دوسری قسم کے افعال گو بدوں جسد کے ہوسکتے ہیں مگر ان میں مجاہدہ نہیں کیونکہ جو اعمال محتاج جسد نہیں وہ غذائے روح ہیں۔ روح کسی وقت بھی علم اور تفکر سے خالی نہیں رہ سکتی۔ اور جب یہ اعمال غذائے روح ہیں تو ان میں مشقت کہاں اور جب مشقت نہیں تو مجاہدہ بھی نہیں کیونکہ مجاہدہ کا مشقت پر موقوف ہونا ظاہر ہے اور مراد اس

جسد سے جس کی نفی علم ارواح میں کی جارہی ہے۔ جسد ناسوتی ہے کہ مشقت کا محل یہی ہے۔

باقی یہ کہ وہاں جسد ملکوتی بھی تھا یا نہیں۔ یہ دوسری بحث ہے میثاق کے وقت تو ایسا جسد ہونا حدیثوں میں وارد ہے مگر وہ جسد اعمال شاقہ کا محل نہیں۔ اس لئے مجاہدہ کے لئے کافی نہیں۔ باقی اپنے وجود میں جسد و مادہ کا محتاج ہونا نہ ہونا یہ مختلف فیہ ہے۔

متکلمین تو روح کے تجرد کو محال سمجھتے ہیں مگر صوفیاء کی تحقیق اس تجرد کے بارے میں فلاسفہ کے موافق ہے وہ تجرد روح کے قائل ہیں مگر فلاسفہ کے اتباع کی وجہ سے قائل نہیں ہوئے بلکہ ان کا کشف ہے اور وہ اعتقاد قدم میں فلاسفہ کے مخالف بھی ہیں اور باوجود تجرد کے قائل ہونے کے ارواح کو ذاتاً و زماناً حادث مانتے ہیں۔ باقی متکلمین جو روح کو مادی اور اس کے تجرد کو محال کہتے ہیں ان کے پاس اس کی کوئی دلیل صحیح نہیں۔

متکلمین نے دلیل یہ بیان کی ہے کہ تجرد صفات خاصہ واجب سے ہے البتہ قدم ضرور صفات خاصہ میں سے ہے۔ اسلئے فلاسفہ کا قول ضرور باطل ہے مگر خود اس کی کوئی دلیل نہیں کہ تجرد و صفات خاصہ موہصب ہے صوفیاء کے قول کے بطلان کی کوئی دلیل نہیں اور صوفیاء پر کوئی...... اشکال باقی نہیں رہتا۔

بہر حال جو اعمال محتاج جسد نہیں وہ بوجہ غذائے روح ہونے کے سبب ترقی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے روح کو ناسوت میں لا کر مشاق میں مبتلا فرمایا۔

اگر اس پر شبہ ہو کہ جب ترقی مشقت پر موقوف ہے اور مجاہدہ و مواظبت سے اعمال شاقہ مثل غذائے روح بن[1] جاتے ہیں تو ان پر اجر اور ترقی کا ترتب نہ ہونا چاہئے۔ سو ان میں یہ ترقی اس واسطے ہے کہ وہ مشقت و مجاہدہ ہی سے تو غذا بنے ہیں گو مشقت اب نہیں رہی مگر حکماً اس مشقت کا اثر ممتد و مستمر قرار دیا گیا ہے۔ پس اس تحقیق سے اہل اللہ کے اعمال پر اشکال نہیں ہو سکتا جو ان کے لئے طبیعت ثانیہ ہو کر بمنزلہ غذا کے ہو گئے ہیں۔ البتہ اس تحقیق سے یہ استنباط صحیح ہے کہ انسان کی عبادت ملائکہ کی عبادت سے افضل ہے۔ کیونکہ وہ ثمرہ مشقت ہی کا ہے۔

غرض روحانی اعمال سے ترقی نہیں ہو سکتی تھی اور حق تعالیٰ کو ہمیں ترقی دینا منظور تھی اس لئے روح کو ایک مرکب یعنی جسد عطا کیا گیا۔ اور گو عامل اب بھی روح ہی ہے۔ مگر یہ مرکب جو ملا ہے اسکی فکر بھی اس پر سوار ہے۔ اسکو دانہ بھی دینا ہے اور اس کیلئے دنیا کے ہزار دھندے کرنا پڑتے ہیں پھر یہ مرکب بعض دفعہ شوخی بھی کرتا ہے اور کبھی تو ایسی شوخی کرتا ہے کہ انسان اس کے آگے اپنے کو بالکل بے قابو پاتا

---

[1] جیسا حدیث میں ہے جعلت قرة عيني في الصلوٰة (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں) اور بحمد اللہ اس دولت کا ایک حصہ میری قرة العین اختری مرحومہ کو حاصل تھا کہ نماز اسکی غذائے روح تھی رفع اللہ درجاتھا و تقبل حسناتھا۔

ہے۔اس لئے سنبھل کر چلنے کی بھی ضرورت ہے کہ کہیں ہلاکت کے گڑھے میں نہ ڈال دے غرض دنیا میں ہم کو بھیجنے کی حکمت ہی مشقت ہے۔

صبر اور اجر

چنانچہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے **لقد خلقنا الانسان فی کبد** (ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا) اور ایک اردو کے شاعر نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔ گو شعر تو پھیکا ہے اور اردو کے اشعار فارسی عربی کے سامنے پھیکے ہی ہوتے ہیں۔ مگر مضمون کو خوب ادا کیا ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

جب ہمارے دنیا میں آنے کی حکمت ہی یہ ہے تو مشقت اور درد وغم کا پیش آنا لازم ہے اسی کو لفظ اذا سے بتلایا گیا ہے جو تیقن کے لئے موضوع ہے اور ظاہر ہے کہ جس کا پیش آنا ناگزیر ہو اور اس کا علم بھی ہو جائے اس کے وقوع سے کچھ زیادہ پریشانی نہیں ہوتی اس لئے **اذا اصابتھم** میں لفظ اذا۔ بہت کچھ موجب تسلی ہے اور دوسری تسلی مصیبہ کی تنوین میں ہے کیونکہ تنوین تقلیل واطلاق کیلئے بھی ہوتی ہے۔

سو مطلب یہ ہوگا کہ ادنیٰ مصیبت پر بھی صبر کرنے سے اجر ملے گا قرآن میں تو یہ مضمون متحمل تھا۔ مگر ایک حدیث سے اس کی تفسیر ہوگئی اور اب محتمل نہیں رہا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ چراغ گل ہوگیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے **اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ** پڑھا حضرت عائشہؓ نے کہا یا رسول اللہ! کیا یہ بھی مصیبت ہے اور اس پر صبر کرنے سے بھی اجر ہے فرمایا ہاں! جس چیز سے مسلمان کو ناگواری پہنچے وہ مصیبت ہے یہاں تک کہ کانٹا لگ جائے یا کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اس پر صبر کرنے میں بھی اجر ہے۔

تیسری تسلی قالوا میں ہے مگر اسکو صوفیاء محققین ہی سمجھ سکتے ہیں جو اہل ذوق ہیں کیونکہ جو مضمون اس مقام پر قالوا کے بعد مذکور ہے حقیقت میں تو ازالہ حزن وغم میں مؤثر اس مضمون میں تامل وفکر ہی کرنا ہے محض قول لسانی اس کیلئے کافی نہیں معلوم ہوتا۔ مگر حضرات صوفیاء فرماتے ہیں کہ جس طرح باطن ظاہر میں مؤثر ہوتا ہے اسی طرح ظاہر بھی باطن میں مؤثر ہوتا ہے۔ اس لئے گو زیادہ مؤثر تو قول مع التفکر ہی ہے لیکن تنہا قول بھی کافی ہے بیکار نہیں اور تجربہ ومشاہدہ ان کی دلیل ہے کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قول محض سے بھی نفع ہوتا ہے۔ اسی لئے ذکر لسانی بدوں حضور کے بھی انکے نزدیک مفید ہے۔ جس کو تحقیق کے درجہ میں تو وہ اس عنوان سے بیان کیا کرتے ہیں کہ زبان وقلب دونوں ذکر کے مکلّف ہیں اگر دونوں مشغول نہ ہوں تو ایک کو تو مشغول رکھنا چاہئے اور زبان کا

مشغول رکھنا آسان ہے اسلئے ذکر لسانی کو ترک نہ کرنا چاہئے لیکن اس تحقیق کے علاوہ خود تجربہ بھی ہے کہ محض ذکر لسانی سے بھی قلب پر اثر پہنچتا ہے جب آدمی برابر زبان سے ذکر کئے جائے گا تو دل پر ضرور اثر کرے گا (نیز یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ذکر خفی جس کو ذکر قلبی کہا جاتا ہے زیادہ دیر تک نہیں رہتا۔ تھوڑی دیر تو دل ذکر اللہ میں رہتا ہے پھر نہ معلوم کہاں کہاں چلتا رہتا ہے تو اس صورت میں زبان اور دل دونوں کے ذکر سے محروم ہوئے اور ذکر لسانی میں اگر قلب غافل ہوگیا تب بھی زبان تو مشغول ذکر رہتی ہی ہے اور کسی قدر دل کو بھی ذکر اور مذکور کی طرف توجہ رہتی ہے گو حضور کامل نہ ہو تو اس میں اکثر دونوں ذکر مجتمع رہتے ہیں) غرض یہاں قول کو اسلئے اختیار کیا گیا ہے کہ وہ آسان اور کافی بھی ہے دوسرے مصیبت کا وقت قول ہی کا وقت ہوسکتا ہے۔ تامل وتفکر کا وقت نہیں کہ وہ اطمینان پر موقوف ہے۔ سو اس وقت اسکو تامل کا مکلف کرنا مصیبت زدہ پر گرانی ڈالنا ہے۔

اس کے بعد بیان ہے اس قول کا جس کو وہ مصیبت کے وقت تسلی اور تقلیل غم کے لئے اختیار کرتے ہیں وہ کیا ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ اس میں صیغہ جمع انا للہ بھی ایک گونہ تسلی بخش ہے کیونکہ اس میں دلالت ہے کہ میں تنہا میصبت میں نہیں اور لوگ بھی میرے ساتھ شریک ہیں جیسے علمائے نے آیت عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (اے ایمان والو تم پر روزے (رمضان المبارک کے) فرض کے گئے جیسا تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے) (پ۲) میں یہی نکتہ اشتراک کا بیان فرمایا ہے اسی کے قریب نکتہ ہے ایاک نعبد کے جمع لانے میں۔ اسی لیے ایہام تعظیم عابد کی پرواہ نہیں کی گئی۔ مگر اللہ بچاوے جہل سے۔ ایک جاہل ایاک نعبد کی جگہ ایک اعبد پڑھتا تھا اور کہتا تھا کہ نعبد (ہم صرف آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں یا اللہ) میں اپنی تعظیم ہے۔ اس لئے اعبد کہنا چاہئے شاید یہ جاہل یہاں بھی انی للہ پڑھنے کی رائے دیتا۔ مگر اس جاہل نے یہ نہ سوچا کہ اگر اس میں کوئی نکتہ بھی نہ ہوتا تب بھی سب سے بڑی عبدیت تو امتثال امر ہے جب اللہ تعالیٰ خود فرمائیں کہ تم اپنے کو صیغہ جمع سے تعبیر کرو تو ہم کو ایسی لفظی تواضع کی کیا ضرورت ہے

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین   خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

جب دین کا بادشاہ مجھ سے حرص کی خواہش کرے تو اسکے بعد قناعت کی چوٹی پر مٹی ڈال دوں گا۔''

امتثال امر

ایک بار میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت مولانا

چارپائی کی پائیں طرف تھے مجھے سرہانے کی طرف بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ میں نے عذر کیا کہ حضرت سرہانے بیٹھنا بے ادبی ہے۔ فرمایا جب ہم خود کہتے ہیں تو اب بے ادبی نہیں۔ چنانچہ پھر میں نے انکار نہیں کیا۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آ گئی۔ داراشکوہ اور عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ کی کہ دونوں کو تاج وتخت کی آرزو تھی۔ گو ایک کو دنیا کیلئے اور ایک کو ترقی دین کیلئے۔ کیونکہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ بزرگ تھے ان کو طمع دنیا کے لئے سلطنت کی خواہش نہ ہوگی۔ بہر حال دونوں کو بزرگوں سے دعا کرانے کا خیال دامنگیر تھا۔ اور داراشکوہ کو تو ہر طرح کے فقیروں سے بہت ہی اعتقاد تھا۔ مگر ایسا ہی جیسا آج کل کے بدعتیوں کو ہوتا ہے کہ بھنگڑوں سنگڑوں کو ہی بزرگ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ خبر ملی کہ کوئی بزرگ آئے ہوئے ہیں اور وہ واقعی بزرگ تھے۔ داراشکوہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بزرگ نے شہزادہ کی خاطر کی اور اس کے لئے اپنی مسند چھوڑ دی اور فرمایا شہزادے یہاں بیٹھو۔

داراشکوہ نے تو اضعاً عذر کیا۔ انہوں نے دوبارہ فرمایا۔ جب بھی عذر کیا کہ میری کیا مجال ہے جو بزرگوں کی جگہ قدم رکھوں فرمایا بہت اچھا۔ اور وہ اپنی مسند پر بیٹھ گئے۔ چلتے ہوئے دعا کی درخواست کی۔ مجھے گدی مل جائے فرمایا شہزادے ہم تو آپ کو گدی دے رہے تھے مگر افسوس! کہ تم نے اس کو رد کر دیا۔ اب تو دراشکوہ کو بڑا رنج ہوا کہ میں نے بڑی غلطی کی جوان کے اصرار کے بعد بھی مسند پر نہ بیٹھا۔ اب فکر یہ ہوئی کہ کسی طرح عالمگیر کو اس واقعہ کی خبر نہ ہو اور وہ ان کے پاس نہ آئے۔

مگر عالمگیر بھی حاضر خدمت ہوئے۔ بزرگ نے ان کے واسطے بھی مسند چھوڑ دی اول تو انہوں نے بھی عذر کیا۔ مگر جب انہوں نے دوبارہ کہا تو چونکہ صاحب علم تھے اس لئے الامر فوق الادب کہہ کر امتثال امر کیا اور مسند پر جا بیٹھے۔ چلتے ہوئے انہوں نے بھی تاج وتخت کے لئے دعا کی درخواست کی۔ تو بزرگ نے فرمایا کہ تخت تو آپ کو مل گیا مبارک ہو۔ یہی مسند تخت ہے باقی تاج میرے قبضہ میں نہیں ہے۔ پوچھا۔ حضرت وہ کس کے قبضہ میں ہے کہا کہ وہ آپ کے ایک ملازم کے قبضہ میں ہے۔ جو آپ کو وضو کراتا ہے اگر وہ اپنے ہاتھ سے آپ کے سر پر عمامہ یا ٹوپی رکھ دے تو تاج بھی آپ کو مل جائے گا۔

عالمگیر نے سوچا کہ یہ کیا مشکل ہے وہ تو ملازم ہے اور بزرگ و متقی آدمی عقد اجارہ کے لوازم سے انکار نہیں کر سکتا۔ جب ان کے سپرد ہی یہ کام ہے کہ وضو کرائیں اور کپڑے پہنائیں تو میرے کہنے سے وہ ضرور سر پر بھی ٹوپی یا دستار رکھ دیں گے (چنانچہ انہوں نے رکھ بھی دی جیسا آگے آتا ہے)

دوسرے خدا کو منظور ہی یہ تھا کہ عالم گیر کو تخت وتاج دونوں مل جائیں ورنہ ویسے کسی بادشاہ

کی کیا مجال جوان حضرات پر زبردستی کر سکے۔ دیکھئے ظاہر میں تو یہ شخص عالمگیر کا نوکر تھا۔ مگر باطن میں اتنا زبردست کہ عالمگیر حصول تاج میں انکی نظر عنایت کے محتاج و دست نگر تھے

مبیں حقیر گدایان عشق راکیں قوم   شہاں بے کمر و خسرواں بے کلہ اند

عشق کے فقیروں کو حقیر خیال نہ کرو۔ یہ لوگ بے کمر بادشاہ اور بے تاج کے سلطان ہیں۔"

غرض! عالمگیر اپنے مکان پر پہنچے اور تھوڑی دیر پھر اٹھے اور اسی ملازم کو آواز دی جو وضو کراتا تھا۔ وہ وضول کا پانی لے کر حاضر ہوا۔ عالمگیر نے عمامہ اتار کر وضو کرنا شروع کیا اور وضو کر کے حکم دیا کہ یہ عمامہ ہمارے سر پر رکھ دو اس نے عذر کیا کہ میری مجال جو آپ کے سر تک ہاتھ لے جاؤں کہا نہیں ہمارے سر پر رکھنا ہوگا۔ مجبور ہو کر ان کے سر پر عمامہ رکھ دیا۔ اور اس فقیر کا نام لے کر بہت کوسا کہ اس کمبخت نے میرا پردہ فاش کیا۔ اس کے بعد وہ دہلی ہی سے غائب ہو گئے۔

یہ حکایت میں نے اس پر بیان کی ہے کہ امتثال امر سب سے بڑا ادب ہے جیسا عالمگیر نے امتثال امر کیا اور اس کی برکت سے بادشاہ ہو گئے اور راز اس میں یہ ہے کہ ادب بھی تو اسی واسطے مطلوب ہے تا کہ محبوب کو یا اپنے معظم کو راحت ہو یا اس کا حق ادا ہو اور بعض وقت اس کو امتثال امر ہی میں خوشی ہوتی ہے گو بظاہر خلاف ادب ہو تو اس وقت امتثال امر ہی لازم ہے۔

القائے نسبت وسلب نشاط

دیکھئے! شادی میں ہم نائی کو اپنے سے بھی اچھا جوڑا دیتے ہیں اور وہ اس کو پہن کر دکھلاتا پھرتا ہے کیوں؟ صرف اس لئے کہ آج آپ کی اسی میں خوشی ہے کہ وہ آپ کے جوڑا سے بھی بڑھیا جوڑا پہنے اور لوگوں کو دکھلائے۔

اسی پر ایک اور حکایت یاد آ گئی کہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی عادت تھی کہ جس وقت جامع مسجد میں نماز پڑھ کر واپس ہوتے وہاں ایک بزرگ برآمدہ میں بیٹھے ملتے۔ مرزا صاحب ان کے پاس جا کر ان کی جانماز الگ پھینک دیتے، تسبیح کو ادھر ادھر کر دیتے، عمامہ سر سے اتار دیتے، ایک دھول لگا دیتے اور وہ بے چارے سب چیزوں کو سمیٹ سماٹ کر پھر بیٹھ جاتے۔ لوگوں کو یہ قصہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی کہ حضرت مرزا صاحب کی بزرگی اور ایک بزرگ کے ساتھ یہ حرکت۔ بالآخر بعض لوگوں نے جرأت کر کے اس کا سبب دریافت کیا تو مرزا صاحب نے فرمایا کہ جب ہم جوان تھے اور ہماری صورت شکل بھی اچھی تھی تو ہمارے چاہنے والے بہت تھے ان ہی میں یہ بزرگ بھی تھے اور اس زمانہ میں ہمارا ان کے ساتھ یہی معمول تھا جس سے یہ خوش ہوتے

تھے جب ہمارے داڑھی آ گئی تو سب عشاق ایک ایک کر کے رخصت ہوتے گئے کیونکہ

عشق ہائے کزپئے رنگے بود　　　عشق نبود عاقبت ننگے بود

جو عشق کہ رنگ کی خاطر ہوگا۔ وہ عشق نہیں ننگ ثابت ہوگا۔

مگر یہ شخص محبت میں ثابت قدم رہے۔ ہمارے پاس اسی طرح آتے جاتے رہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو نسبت باطنیہ سے نوازا تو ہمارے دل میں یہ آیا کہ یہ شخص وفادار ہے۔ لاؤ! ہم بھی اس کے ساتھ کچھ احسان کریں کہ جو دولت باطنیہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو عطا فرمائی اس میں سے اس کو بھی حصہ دیں۔ چنانچہ یہ ارادہ کر کے میں ایک دن ان کی طرف متوجہ ہوا تا کہ ان کے دل میں القائے نسبت کردوں تو مجھے معلوم ہوا کہ ان کا تو بڑا بلند مقام ہے۔

نقشبندیہ کے یہاں تصرفات بہت ہیں۔ القائے نسبت بھی ان ہی میں سے ایک تصرف ہے جس کی حقیقت استعداد نسبت کا القاء ہے جس سے دوسرے کے دل میں ایک قسم کا نشاط اور یکسوئی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد عمل کی ضرورت ہوتی ہے مگر عمل میں سہولت ہوجاتی ہے اور کسی وقت نسبت حقیقۃ حاصل ہوجاتی ہے۔ اور اگر اس تصرف کے بعد کسی نے عمل نہ کیا تو القاء سے خاک بھی نہ ہوگا۔ اور یہی حقیقت ہے سلب نسبت کی کہ وہ بھی دراصل نشاط عمل کا سلب ہے اور جب عمل میں نشاط نہیں رہتا تو عادۃً عمل میں کمی ہوجاتی ہے حتی کہ کبھی فرائض وواجبات میں کمی آ کر نسبت باطنیہ سلب ہوجاتی لیکن اگر کوئی شخص سلب نشاط کے بعد عمل میں کوتاہی نہ کرے تو اس سلب سے کچھ ضرر نہ ہوگا۔ اس لئے یہ تصرف اسی مقام پر جائز ہے جہاں سلب نشاط سے ترک عمل کا اندیشہ نہ ہو بلکہ کسی کو غلبہ میں حقوق واجبہ کا بھی اہتمام نہ رہا تھا۔ اس غلبہ کو سلب کرلیا گیا یہ جائز ہے اور جہاں اس کا اندیشہ ہو وہاں حرام ہے۔

غرض مرزا صاحب نے فرمایا کہ ہم اس شخص کی طرف متوجہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ یہ تو بڑے عالی مقام بزرگ ہیں اسی وقت ہم ان کا ادب کرنے لگے اور بے تکلفی برتاؤ بدل دیا جو پہلے سے معمول تھا۔ اس پر یہ کہنے لگے کہ مرزا اپنی خیر چاہتا ہے تو اسی طرح رہو جس طرح اب تک رہے تھے۔ اور اگر تم نے اپنا طرز بدلا تو یاد رکھنا سب دولت سلب کرلوں گا۔ جو پوٹلہ کی طرح بغل میں دبائے پھرتا ہے تو اب اپنی دولت کا سلب کون چاہتا ہے۔

گو اس کی حقیقت سلب نشاط ہی ہے جیسا اوپر بیان ہوا اور حقیقت نسبت سلب نہیں ہوتی۔ مگر وہ نشاط معین تو ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ

بر دل سالک ہزاراں غم بود　　　گرز باغ دل خلا لے کم بود

سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہی۔ اگر دل کے باغ سے ایک خلال کم ہو جائے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ اس کے سبب کے بعد ہر وقت صبر و مقاومت کرنا بڑی ہمت کا کام ہے اس لئے مجبوری ان بزرگ کی مرضی کے لئے سب کچھ کرتا ہوں وہ اسی میں خوش ہیں غرض امتثال امر بڑی چیز ہے۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں　　　　خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

جب سلطان دین مجھ سے طمع کی خواہش کرے تو قناعت کے سر پر خاک ڈالو۔

ضرورت اعتدال

مگر امتثال امر میں بھی بعض کو غلو ہو جاتا ہے چنانچہ اہل ظاہر نے اس غلو سے ضروری اجتہاد کو بھی ترک کر دیا۔ یہ بھی نہ چاہئے۔ افراط و تفریط تو ہر چیز میں مذموم ہے ضرورت ہر امر میں اعتدال کی ہے۔ غرض ایاک نعبد کو کسی متبع احکام نے ایاک اعبد نہیں پڑھا۔ اسی طرح انا للّٰہ (ہم اللہ ہی کے ہیں) کو انی لله (میں اللہ ہی کا فی ہوں) نہیں پڑھا۔ باقی آج کل کے مدعوان ذوق جو حقیقت میں بد ذوق ہیں۔ اگر نعبد (ہم عبادت کرتے ہیں) کو اعبد (میں عبات کرتا ہوں) اور انا للّٰہ کو انی لله کہنے لگیں تو اس کا کچھ علاج نہیں۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ تلاوت قرآن مجید میں بھی اللّٰہ الصمد (اللہ تعالیٰ بے نیاز ہیں) نہیں پڑھتا تھا اس کو چھوڑ جاتا تھا اور کم بخت کہتا کہ پناہ اس نام سے اس نے ہی بہت لوگوں کو تباہ کر ڈالا ہے اس میں بڑا جلال ہے (نعوذ بالله من هذه الهذ يانات) (ان بکواسوں سے اللہ پناہ میں رکھے)

یہ سب خرابی ہے ذوق کو نصوص پر ترجیح دینے کی۔ اسی لئے مجدد صاحب فرماتے ہیں۔

مارا نصوص در کار است فصوص در کار نیست (ہمیں نصوص کی ضرورت ہے فصوص کی ضرورت نہیں)

اس میں صاحب فصوص کی عظمت سے انکار نہیں۔ ان کی نسبت تو خود مجدد صاحب کا ارشاد ہے کہ از مقبولاں نظر می آید بلکہ نصوص کا انکار ہے یعنی ان ذوقیات کا جو اس کتاب میں مذکور ہیں (اور یہ انکار بھی اس لئے ہے کہ نصوص میں یہود کی وسبیہ کاری سے بعض مضامین خلاف نصوص ملا دیئے گئے ہیں ورنہ کتاب کا صحیح نسخہ مخالفت نصوص سے بالکل پاک ہے ذکرہ القطب الشعرانی فی الیواقیت)

غرض یہاں دنیا میں بھی پل صراط کی طرح چاروں طرف کلالیب ہیں کانٹے ہیں۔ سیدھے چلے چلو۔ ادھر ادھر کو نہ بھٹکو۔ ورنہ گمراہی کے گڑھے میں گرو گے۔

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِه۔ (اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ

راہیں تمہیں اللہ تعالیٰ سے جدا کردیں گی) اور سیدھے چلتے ہوئے بھی رب سلم رب سلم کا ورد رکھو جو حضرات انبیاء علیہم السلام کا وظیفہ ہوگا پل صراط پر (اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا پل صراط اگر خوبی سے طے ہوگیا اور یہاں اللہ تعالیٰ نے استقامت عطا فرمادی تو آخرت کا پل بھی آسانی سے طے ہوجائے گا۔ فان الدنیا مزرعة الاخرة۔ (پس دنیا آخرت کی کھیتی ہے)

ازالہ حزن وغم

میں نے یہ کہا تھا کہ انا للہ میں صیغہ جمع بھی موجب تسلی ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مبتلائے مصائب میں تنہا نہیں ہوں بلکہ اور بھی بہت ہیں اور قاعدہ ہے کہ مرگ انبوہ جشنے دارد۔ چنانچہ جب بہت آدمی جیل میں جارہے ہوں تو وہ بھی نگر سا معلوم ہونے لگتا ہے بلکہ پچھلے دنوں تو بعض لوگ تمنا کیا کرتے تھے کہ حکومت ان کو جیل میں بھیج دے کیونکہ اس جیل کے بعد قوم میں عزت ہوتی تھی تو وہ جیل جیل ہی معلوم نہ ہوتا تھا۔ دوسرے پہلے تو کوئی معمولی آدمی جیل میں جاتا تھا۔ اب بڑے بڑے آدمی جانے لگے اور بہت جانے لگے تو جیل خانہ مصیبت نہ رہا۔ اور دیکھئے روزہ رکھنا بہت دشوار ہے مگر رمضان میں آسان ہے کیونکہ سب کا ایک ہی حال ہوتا ہے۔

ممکن ہے کوئی مصیبت زدہ اس طریق تسلی کی نسبت شبہ کرے اور یہ کہے کہ گو مبتلائے مصیبت دوسرے بھی ہیں۔ مگر میرے اوپر سب سے زیادہ مصیبت ہے۔ مگر یہ تو تفتیش کے بعد ہی معلوم ہوسکتا ہے۔ تفتیش کرو تو یقیناً بعضے تم سے بھی زیادہ مصیبت میں گرفتار ملیں گے۔

اب یہاں ایک یہ بات قابل غور ہے کہ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں) کی تعلیم سے مقصود تو اہل مصائب کی تسلی اور ازالہ حزن وغم ہے لیکن بظاہر اس مقصود اور اس کے طریق میں ربط نہیں معلوم ہوتا۔ یعنی مصیبت کے بیان میں دفع مصیبت کا طریقہ تو بتلایا نہیں بس صرف یہ بتلادیا کہ وہ یوں کہتے ہیں تو اس کہنے کو مقصود سے کیا تعلق ہے اور اللہ تعالیٰ کی تعلیم بے ربط نہیں ہوسکتی۔ یہ اور بات ہے کہ کسی جگہ آپ کی سمجھ میں ربط نہ آئے۔

اور گو تکلف سے تو ربط گھڑنا نہ چاہئے لیکن بے تکلف سمجھ میں آجائے اور نصوص سے موید ہو تو کچھ حرج نہیں بلکہ مستحسن ہے کیونکہ تعلیم الٰہی میں بے ربطی نہیں ہوسکتی۔ سو اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ (پس جب ان پر مصیبت آتی ہے) اور قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ (تو وہ کہتے ہیں ہم سب اللہ کے لئے ہیں) میں گو بظاہر ربط نہیں معلوم ہوتا۔ مگر غور کیا جائے تو اس قول ہی میں دفع مصیبت کا طریقہ بتلایا گیا ہے کیونکہ تمام تر تشویش کا مدار اس پر ہے کہ آدمی اپنے کو اپنا سمجھتا ہے دوسرے کا نہیں سمجھتا۔

راحت تفویض

جو شخص اپنے کو دوسرے کا سمجھتا ہے وہ بڑی راحت میں رہتا ہے چنانچہ ابن عطاءؒ نے بغداد کے ایک غلام کا قصہ لکھا ہے کہ زمانہ قحط میں تمام لوگ پریشان تھے۔ مگر وہ خوش پھرتا ہے کسی نے اس سے کہا کہ تجھے قحط سے تشویش نہیں۔ کہنے لگا مجھے کیا غم۔ میں تو فلاں رئیس کا غلام ہوں۔ جس کے کئی گاؤں ہیں اور وہ میرے کھانے پینے پہننے کا ذمہ دار ہے۔

تو دیکھئے تفویض میں کس قدر راحت ہے۔ اسی طرح عورتیں اپنے آپ کو اپنا نہیں سمجھتیں بلکہ مردوں کا سمجھتی ہیں۔ تو مردوں کی نسبت سے ان کو فکر و تشویش کم ہے۔ غرض تفویض راحت کی بنیاد ہے۔ اس میں خاصیت ہے راحت بخشی کی۔

پس انا للہ میں اسی کی تعلیم ہے کہ ہم سب اللہ کے ہیں اور جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ بھی اللہ کا ہے پھر ہم کو کسی چیز کے جانے یا نہ رہنے کا کیا غم؟ جس کی چیز تھی وہی اس کا محافظ ہے اور وہی لینے والا ہے۔

اب شرط و جزا میں ربط کامل ہو گیا ور یہی ربط اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ میں بھی ہے کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں یعنی اور جو وہاں پہنچ جائے گا اس کو ہر طرح کا چین ہے تو اس میں تعلیم ہے کہ اپنے نفس کو یہ کہہ کر تسلی دو کہ دنیا چند روزہ ہے ایک دن اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ کر ہی راحت نصیب ہو گی اور قاعدہ طبعیہ ہے کہ انسان اپنے نفس سے جو وعدہ کر لیتا ہے اس سے نفس کو راحت ملتی ہے جیسے مزدور اپنے نفس سے وعدہ کر لیتا ہے کہ شام تک محنت کریگا تو چار آنے یا پانچ آنے ملیں گے۔ اس وعدہ سے نفس کو دن بھر کی محنت آسان ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) میں بھی نفس سے ایک وعدہ ہے۔

مگر یہاں یہ تفصیل مذکور نہیں کہ رجوع الی الرب کے بعد کیا ہوگا کیونکہ قرآن میں ہر طبقہ کے جذبات کی رعایت ہے، عشق کی بھی اور مزدوروں کی بھی۔ عشاق کی تسلی کے لئے تو اتنا ہی بس ہے کہ ہم بھی ایک دن اللہ کے پاس پہنچیں گے اور وہ سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ ان کے لقاء سے تمام کلفتیں ختم ہو جائیں گی۔

راحت دنیا و آخرت

دوسرا انداق ہم جیسے مزدور کا ہے کہ وہ مزدوری ملنے سے خوش ہوتا ہے ان کے لئے دوسرے مقامات پر تفصیل کر دی گئی ہے کہ مرنے کے بعد جنت ملے گی جس میں ہر قسم کی نعمتیں اور راحتیں

ہیں۔ رہا یہ سوال کہ مرنے کے بعد ہم کو راحت ہی ہوگی اس کا کیا بھروسہ؟ ممکن ہے کہ جنت کے بجائے دوزخ میں بھیج دیا جائے تو اس سے تو دنیا ہی اچھی تھی۔

اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے امید رکھنا چاہئے کہ ان شاء اللہ ہم کو جنت ہی ملے گی۔ اور ان کا وعدہ ہے انا عند ظن عبدی بی۔ جب یہ امید قائم کرو گے تو ان شاء اللہ تم کو جنت ہی ملے گی۔ دوسرے فرض کرلو کہ دوزخ ہی میں جانا ہوا تب بھی مسلمان کو موت سے نہ ڈرنا چاہئے کیونکہ مسلم کی ایک حدیث ہے جس کو میں بیان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تاکہ کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ میں لوگوں کو بے فکر کرنا چاہتا ہوں۔ مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نہیں چھپایا تو میں کیوں چھپاؤں اور کوئی شبہ کرے تو کیا کرے۔ میرا مقصود عصاۃ کو جری کرنا نہیں ہے بلکہ ناامیدوں کو امیدوار بنانا ہے۔

تو مسلم شریف میں ایک حدیث ہے جس میں عصاۃ مسلمین کے متعلق ارشاد ہے اما تھم اللہ فی النار اماتۃ یعنی جن گنہگار مسلمانوں کو جہنم میں داخل کیا جائیگا انکو ایک قسم کی موت دے دی جائیگی جس سے جسم پر تو عذاب کا اثر ہوگا مگر روح کو شدید احساس نہ ہوگا۔ اور بعض اہل کشف کا کشف یہ ہے کہ گنہگار مسلمانوں پر دوزخ میں گہری نیند مسلط کی جائیگی جس میں وہ خواب ایسا دیکھتے رہیں گے گویا جنت میں ہیں وہاں کی نعمتوں سے متمتع ہو رہے ہیں تو روح اس خواب راحت میں مشغول ہوگی اور جسم عذاب میں ہوگا۔

اگر اس کشف کو حدیث کی تفسیر کہا جائے تو کچھ بعید نہیں۔ پس عشاق کے نزدیک تو یہاں کی راحت سے وہاں کی مصیبت بھی بہر حال اچھی ہے کیونکہ وہاں کی مصیبت کا خطرہ ہے۔ نیز محبوب کے پاس پہنچ کر راحت ہو یا مصیبت۔ مگر اس حدیث کے بعد تو عشاق و غیر عشاق سب یہی کہیں گے کہ دنیا سے بہر حال آخرت اچھی ہے کیونکہ وہاں کی جنت تو راحت ہے ہی دوزخ میں بھی مسلمان کے لئے راحت ہی ہے۔

پس اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ میں ایک وجہ تسلی تو یہ ہوئی کہ موت سے مصائب دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا اور آخرت کی راحت شروع ہو جائے گی۔ دوسری وجہ یہ کہ انا صیغہ جمع میں وہ میت بھی داخل ہے جس کی موت پر نفس کو تسلی دی جارہی ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ ہم سب وہیں جانے والے ہیں۔ جہاں وہ گیا ہے وہاں پہنچ کر اس سے ملنا ہو جائے گا اور ایسا ملنا ہوگا کہ پھر کبھی جدائی نہ ہوگی۔ ان مضامین کے سوچنے سے ان شاء اللہ نفس کو تسلی ہو جائے گی۔

مصیبت کے آداب

میں یہ نہیں کہتا کہ غم نہ رہے گا بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ تھوڑا بہت غم رہنا چاہئے اور اگر

موقعہ ملا تو اسی جلسہ میں اس کی مصلحت بھی ان شاء اللہ بتلا دوں گا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ان مضامین کے استحضار سے غم ہلکا ہو جائے گا تو مصیبت کے یہ آداب ہیں جو اس آیت میں بتلائے گئے ہیں۔ ادب کا لفظ بہت عام ہے احکام کو بھی آداب کہتے ہیں تو مصیبت کا ادب یہ ہے کہ زبان سے تو اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں) کی کثرت کرے اور دل سے ان باتوں کو سوچے اور ان کے ذریعے سے اپنے نفس کو تسلی دے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہمارے حال پر کس قدر رحمت وشفقت ہے کہ ان کو ہمارا زیادہ غم گوارا نہیں گویا فرماتے ہیں کہ گو ہم نے حکمت کی وجہ سے تم کو رنج دیا ہے مگر تمہارا زیادہ رنجیدہ ہونا، پریشان ہونا ہم کو گوارا نہیں۔ اس لئے مصیبت کے موقع پر تم اس طرح اپنے آپ کو تسلی دیا کرو اور دل بہلایا کرو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندہ کے غم کے ناگوار ہونے کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

ما ترددت فی شئ ترددی فی قبض نفس عبدی ارید لقاء ہ وھو یکرہ الموت ولن یلقانی حتی یموت (اتحاف السادۃ المتقین ۵:۲۹۵)۔ او کما قال

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے کسی کام میں ایسا تردد نہیں ہوتا جیسا اپنے بندے کی جان قبض کرنے میں تردد ہوتا ہے (اس کی تفسیر ہم نہیں کر سکتے بلکہ اس کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتے ہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کے ساتھ کس قدر تعلق ہے کہ موت سے جو اس کو تکلیف ہوتی ہے وہ بھی ان کو گوارا نہیں حالانکہ موت ضروری اور لابدی ہے)

جس طرح مصیبت زدہ کو خود تسلی کا مضمون سکھلایا گیا ہے اسی طرح دوسروں کو بھی حکم ہے کہ مصیبت زدہ کو تسلی دیں چنانچہ تسلی دینے کی فضیلت حدیث میں بہت آئی ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی شفقت و رحمت کی دلیل ہے کہ خود بھی اپنے بندے کو تسلی دیتے ہیں اور کوئی دوسرا تسلی دے تو اس کو ثواب عطا فرماتے ہیں حدیث میں ہے:

من عزی ثکلی کسی بدا فی الجنۃ (سنن الترمذی: ۱۰۷۶، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۷۳۸) او کما قال

جو ایسی عورت کو تسلی دے جس کا بچہ مر گیا ہو اس کو جنت میں (بڑھیا) چادر یا لباس پہنایا جائیگا۔

اور من عزی مصابا فلہ مثل اجرہ (سنن الترمذی: ۱۰۷۳، سنن ابن ماجہ: ۱۶۰۲) او کما قال

جس نے کسی مصیبت زدہ کی تسلی کی اسکو مصیبت زدہ کے برابر ثواب ملے گا۔

یہ تو قول کلی کے طور پر بیان تھا مقصود آیت کا۔

آداب مصیبت کی تفریعات

اب اس کی دوچار تفریعات بیان کرتا ہوں۔

۱: ایک یہ کہ اس آیت میں تسلی کا جو طریقہ بتلایا گیا ہے اس کی حقیقت مراقبہ ہے پس اس مضمون کو زیادہ سوچنا اور ذہن میں حاضر رکھنا چاہئے خصوصاً جس وقت رنج وغم کا غلبہ ہو اور اگر کسی وقت مراقبہ دشوار ہو تو زبان ہی سے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ کی کثرت رکھے۔

۲: دوسرے یہ کہ امراض کی فضیلت کو یاد کرے۔ حدیثوں میں مختلف امراض کی مختلف فضیلتیں وارد ہیں۔ بخار کی فضیلت میں آیا ہے کہ وہ مسلمان کو گناہوں سے پاک کر دیتا ہے۔ اسی طرح خاص خاص امراض کے متعلق جدا جدا فضائل ہیں ان کو یاد کر کے میت کے متعلق امید کی جائے کہ ان شاء اللہ اس کو یہ فضائل حاصل ہوئے ہیں[1]۔

۳: اسی طرح مصیبت کے اجر کو یاد کر کے اپنے آپ کو تسلی دی جائے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمیں یہ ثواب دینا مقصود تھا اس لئے رنج وغم دیا۔ حدیثوں میں ہر ہر مصیبت پر ثواب کا وعدہ ہے حتیٰ کہ کانٹا لگ جائے یا جیب میں رکھ کر کوئی چیز بھول جائے تو اس ادنیٰ سی تکلیف پر بھی ثواب کا وعدہ[2] ہے۔

بچوں کے مرنے پر شفاعت کا وعدہ ہے کہ بچے اپنے والدین کے لئے حشر میں شفاعت کریں گے اور بچہ وہاں بھی بچہ ہی ہے اور وہاں بھی ضد کرے گا اور اس کی ضد پسند کی جائے گی۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ اگر ہوا حمل بھی اللہ تعالیٰ سے ضد باندھے گا جب اسکے ماں باپ دوزخ میں داخل کئے جائیں گے ارشاد ہوگا **ایها السقط المرا غم ربه ادخل ابویک الجنة** (المصنف لابن أبي شيبة: ۳:۳۵۴) اے ضدی بچے اپنے رب سے ضد کرنے والے لے

---

[1] روی ابن ابی شیبة فی الصنف عن ابی هریرة عن النبی صلی الله علیه وسل انه عاد مریضا من وعک کان به فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم البشران الله تعالیٰ یقول هی ناری اسلطها علی عبدی المومن فی الدنیا لیکون حظه من النار فی الأخرة وعنه مرفوعاً ذکرت الحمی عند رسول الله صلی الله علیه وسلم فسبها رجل فقال له لا تسبها فانها تنفی الذنوب کما تنفی النار خبث الحدید وعن ابی هریرة مو قوفا قال ما وجع یصیبنی احب الی من الحمی انها تد خل فی کل مفصل من ابن ادم وان الله لیعطی کل مفصل قسطا من الاجر(صفحه ۷۰و ۷۱ قلت وللموقوف فی مثله حکم الرفع وسند الاخیر صحیح والا ولین ما بین صحیح وحسن والله تعالیٰ اعلم. [2] عن ابی سعید و ابی هریرة مر فوعاً ما یصیب المومن من وصب ولا نصب ولا سقم ولا حزن حتی الهم یهمه الا کفر الله عنه من خطایاه رواه ابن ابی شیبة بسند حسن صحیح ص ۷۰ لا اقول حسن صحیح الا اذا ترددت فی کون الا سنادو حسناً او صحیحاً ۱۲ ظ.

اپنے ماں باپ کو بھی جنت میں لے جا۔ فیجرهما بسرره حتیٰ ید خلهما الجنة۔

شبان موسیٰؑ

بچوں کی ضد جو کہ بظاہر گستاخی ہے پسند کئے جانے پر مجھے ایک حکمی مجذوب کا قصہ یاد آ گیا۔ یعنی شبان موسیٰ علیہ السلام کا یہ قصہ نہ معلوم مولانا نے کہاں سے لکھا ہے۔ مگر قواعد کے خلاف نہیں اس لئے اس کا ذکر بے جا نہیں۔ اس نے بھی اللہ تعالیٰ کی شان میں ایسی ہی باتیں کی تھی۔ جیسے بچے کرتے ہیں کیونکہ بچے اور مجذوب ایک ہی حکم میں ہیں۔ دونوں مرفوع القلم ہیں۔

اس پر یہ اشکال ہوگا کہ پھر وہ کیسے مقبول ہوا کیونکہ جذب مانع اثم تو ہے مگر سبب قبول نہیں۔ جواب یہ ہے کہ وہ اپنے اخلاص[1] کی وجہ سے مقبول ہوا جس کی تائید ابوداؤد کی ایک حدیث سے ہوتی ہے کہ ایک شخص نے ایک مقدمہ میں واللہ الذی لا الہ الا ھو کہہ کر جھوٹی قسم کھائی تو حضورؐ نے فرمایا کہ تیری قسم تو جھوٹی ہے مگر خدا کا نام تو نے ایسے اخلاص سے لیا ہے کہ اس نے گناہ سے بھی تجھ کو بچا دیا اور مقبول بنا دیا او کما قال۔

اس سے معلوم ہوا کہ اخلاص فی الطاعۃ گناہ کے ساتھ بھی جمع اور نافع ہوسکتا ہے تو جہل کی باتوں کے ساتھ بدرجہ اولیٰ جمع ہوسکتا ہے جو شبان موسیٰؑ سے صادر ہوئیں۔

اس پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ جب اس کی باتیں جہل سے ناشی تھیں تو موسیٰ علیہ السلام کو امر بالمعروف سے کیوں منع کیا گیا۔ جیسا مثنوی میں مذکور ہے۔ جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو امر بالمعروف[2] سے منع نہیں کیا گیا بلکہ زیادہ لتاڑنے سے منع کیا گیا تھا کہ انہوں نے اسے کافر ہی بنا دیا تھا جس سے وہ سہم ہی گیا تھا۔

مطلب ممانعت الہیہ کا یہ تھا کہ جیسا اسکا جہل اور تکلم بالجہل امر بالمعروف کو مقتضی تھا۔ اسی طرح اس کی دوسری حالت یعنی محبت و اخلاص دوسرے معاملہ یعنی رعایت کی مقتضی تھی۔ پس امر بالمعروف میں نرمی کی کیا ضرورت تھی۔

---

[1] یعنی الا خلاص المتقدم علی الجذب فان الا خلاص یستدعی الاختیار وھونیا فی الجذب نعم ان الجذب لا یقطع الاخلاص المتقدم کما لا یقطع الایمان مالم یو جدا لمنافی ۱۲ظ۔

[2] ولا یخفیٰ انه لا یومر بالمعروف الا العاقل فلا یصح مامر من کون هذا الرجل ملوباقدر فع عنه القلم فلیتامل ۱۲ ظ ولواريد بالمجذوب الحکمی لا یرد علیه شئ ۱۲ . اشرف. وظنی انه لم یکن مجذو بابل کان محبا مخلصا لله جاهلا عن مسائل الذات والصفات فتکلم فی شانه بما یقتضی تجسمه وعقیدة التجسم لم ینج منها کثیر من اهل العلم واعقل فکیف براع جاهل بلدوی. ۱۲ظ۔

حب وبغض

اس پر مجھے ایک قصہ یاد آ گیا اور میرا جی چاہتا ہے کہ سب احباب کے کانوں تک یہ واقعہ پہنچ جائے تا کہ افراط وتفریط میں مبتلا نہ ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ شیخ محی الدین کو ایک عالم سے اس لئے بغض تھا کہ ان عالم کو ان کے شیخ ابو مدین سے بغض تھا جس کی وجہ کچھ روایات تھیں۔ شیخ محی الدین فرماتے ہیں کہ ایک رات میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ مجھ سے اس کی وجہ دریافت فرماتے ہیں کہ تم فلاں عالم سے کیوں بغض رکھتے ہو۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو میرے شیخ سے بغض ہے حضورؐ نے فرمایا لیکن اس کو میرے ساتھ تو محبت ہے۔ بس تم نے اس کے ساتھ اس لئے تو بغض کیا کہ اس کو ابومدین سے بغض ہے مگر اس لئے محبت نہ کی کہ اس کو میرے ساتھ محبت ہے۔

اس واقعہ میں بتلا دیا گیا کہ کسی کے ساتھ حب وبغض کے لئے محض اتنا کافی نہیں کہ اس کو ہمارے معتقد فیہ کے ساتھ محبت یا بغض ہے بلکہ دوسرے پہلوؤں پر بھی نظر کرنا چاہئے۔ اگر کسی کو ہمارے محبوب یا ہمارے معتقد فیہ سے محبت ہے تو طبعاً ہم کو اس کے ساتھ محبت ہونا لازمی ہے۔

مگر اس محبت کا اثر یہ ہونا چاہئے کہ دوسرے نظر سے غائب ہو جائیں۔ مثلاً اگر وہ اس حالت محبت میں حقوق اللہ یا حقوق الرسول میں کوتاہی کرتا ہو تو اس پہلو کا حق ادا کرنے کے لئے اس سے کچھ بغض بھی کرنا چاہئے جب تک وہ اپنی اصلاح نہ کرلے اسی طرح اگر کسی کو ہمارے استاد یا شیخ سے بغض ہو تو اس کے ساتھ طبعی بغض کسی قدر ضرور ہوگا۔ مگر اس کے ساتھ دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر نہ کرنا چاہئے۔ یعنی اگر اسکے اندر دوسری خوبیاں اور بھلائیاں بھی ہوں تو ان کا حق بھی ادا کرنا چاہئے۔

آگے حکایت کا تتمہ ہے کہ شیخ محی الدین کی ان عالم سے اور ان عالم کی ابومدین سے صفائی ہوگئی۔ یہ مجھ کو اس پر یاد آ گیا کہ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کو قصہ شبان میں امر بالمعروف کی ممانعت نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ اس کی محبت واخلاص کے پہلو بھی رعایت کا امر ہوا تھا کہ اس رعایت کے ساتھ امر بالمعروف ہونا چاہئے تھا۔ اور شبان موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اس پر چلا تھا کہ قیامت کے دن بچے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی ضد کریں گے۔ جیسا دنیا میں اپنے والدین کے ساتھ ضد کیا کرتے ہیں اور ان کی ضد پسند کی جائے گی جیسا شبان کی باتیں پسند کی گئیں۔ حالانکہ درحقیقت وہ باتیں شان خداوندی کے خلاف تھیں مگر اس کے اخلاص ومحبت کی وجہ سے ان کو پسند کیا گیا۔

ثواب مصیبت اور تسلی نفس

اب میں پھر اصل مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ مصیبت کا ثواب یاد کر کے اپنے نفس کو تسلی دینا چاہئے۔ سو اولاد کے مرنے پر صبر کرنے سے بڑا ثواب ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک اور حدیث میں ہے کہ جس عورت کے تین بچے مر گئے ہوں وہ جنت میں داخل ہوگی صحابیہ نے سوال کیا یا رسول اللہ جس کے دو مرے ہوں فرمایا وہ بھی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ دو کے بعد ابی بن کعب نے کہا میرا ایک ہی بچہ مرا ہے فرمایا ایک بھی۔

ایک ایسی ہی حدیث ہے کہ حضرت عائشہؓ نے سوال کیا یا رسول اللہ اگر کسی کا ایک بھی بچہ نہ مرا ہو۔ فرمایا آپ ؐ نے، اس کے لئے میں ہوں۔

اور ایک ایسی ہی حدیث میں ہے۔ **فلیتعز بی فانهم لن یصابوا بمثلی او کما قال** یعنی وہ مجھے یاد کر کے تسلی کر لیا کرے کیونکہ میری امت کو میری فرقت کے برابر کوئی مصیبت نہ ہوگی۔ (سبحان اللہ! حضورؐ کو اپنی امت کے ساتھ کس قدر محبت تھی جبھی تو آپ کو یقین تھا کہ میری امت کو بھی میرے ساتھ بہت محبت ہوگی اور میری وفات کے برابر ان کے لئے کوئی مصیبت نہ ہوگی۔)

ایک روایت میں بچوں میں **لم یبلغوا الحنث** کی بھی قید آئی ہے یعنی جس کے بچے نابالغ مر گئے ہوں اس کے واسطے جنت ہے۔ اس بلوغ کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ یہاں حقیقی بلوغ مراد ہے یعنی جو خاص علامات ظاہر ہونے کے بعد ہو۔ اور فقہا نے جو پندرہ برس کی عمر پر بلوغ کا حکم کیا ہے اور وہ بھی علی الاختلاف، یہ بلوغ فی احکام الدنیا کے لئے ایک معیار ہے حقیقی بلوغ کا معیار نہیں۔ پس جس طرح شہید کی دو قسمیں ہیں۔ ایک شہید آخرت یعنی شہید فی الاحکام الآخرویہ۔ دوسرے شہید فی الاحکام الدنیویہ۔

اسی طرح بلوغ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک بلوغ حقیقی یعنی بلوغ فی الاحکام الآخرویہ۔ وہ تو خاص علامات کے ظہور پر ہوگا۔ دوسرے بلوغ فی الاحکام الدنیویہ یہ پندرہ برس کی عمر سے ہو جاتا ہے۔ اب اگر کوئی بچہ عمر کے لحاظ سے پندرہ برس کا ہو گیا ہو مگر اس میں علامت بلوغ نہ پائی گئی ہوں۔ جیسی حالت وعظ کی موضوع مرحومہ کی تھی میرے خیال میں عند اللہ وہ نابالغ ہے۔ اور **لم یبلغوا الحنث**[1] کا مصداق ہے اور یہ سب اجر و فضیلت اس سے متعلق ہوگی اور چونکہ قطعی دلیل اس خیال

---

[1] برخورداری اختری مرحومہ کی عمر تو پندرہ برس پندرہ دن کی ہوئی مگر جثہ سے دس برس سے زیادہ معلوم نہ ہوتی تھی۔ اور کوئی علامت بلوغ کی اس میں موجود نہ تھا۔ اس لئے حضرت کے خیال میں احکام آخرت میں وہ نابالغ ہی تھی۔ ۱۲ ظ۔

کی نفی پر نہیں ہے اسلئے انا عند ظن عبدی بی کی بنا پر یہ گمان قائم کرنے کی گنجائش ہے خصوص جب کہ بعض فقہاء نے بدوں ظہور علامات پندرہ برس کی عمر میں احکام دنیویہ میں بھی نابالغ قرار دیا ہے تو احکام آخرت میں تو اور بھی وسعت ہے ان کے باب میں اگر کوئی اس قول عدم۔ بلوغ کو لے کر انا عند ظن عبدی بی کی توقع رکھے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اسی کے موافق معاملہ فرمانے کی امید ہے۔

ہمارے حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ایصال ثواب کے بارہ میں بھی جس کی تقسیم و عدم تقسیم کے باب میں کوئی نص قطعی نہیں اور اسی وجہ سے اس میں اختلاف ہوا ہے۔ یہی فرمایا تھا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ سے امید یہی ہے کہ جب ہم چند آدمیوں کو ایک عمل کا ثواب پہنچاتے ہیں تو سب کو برابر ہی پہنچتا ہے تقسیم ہو کر نہیں پہنچتا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں کچھ کمی تھوڑا ہی ہے۔

مراقبۂ راحت

غرض! یہ صورتیں ہیں تسلی حاصل کرنے کی۔ ان سے کام لینا چاہئے۔ کیونکہ انسان دنیا میں اپنی راحت ہی کے لئے سب کچھ کرتا ہے۔

بعض دفعہ حصول راحت کے لئے مصائب کو بھی برداشت کرتا ہے۔ دوا میں، اپریشن میں، سفر میں، نوکری میں تکلیف ضرور ہوتی مگر اسی لئے سب کو کیا جاتا ہے کہ بعد میں آرام ملے گا۔

سفر میں گھر سے دور رہتے ہوئے دل کو یہی تسلی دیتے ہیں چند روز کے بعد وطن واپس پہنچ کر آرام سے کھائیں پئیں گے۔ اور اصلی وطن تو ہمارا دوسرا ہے.......

یعنی آخرت اور وہ اب بھی موجود ہے۔ اس طرح سے کہ آخرت کے دو حصے ہیں۔

ایک تو زمان آخرت۔ ایک مکان آخرت۔ سو زمان آخرت تو بعد قیامت کے شروع ہوگا۔ مگر مکان آخرت تو اب موجود ہے وہ کہاں ہے؟ وہ چھت کے اوپر ہے۔ یہ آسمان ہماری چھت ہے وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا اور جنت ساتویں آسمان کے اوپر ہے۔ پس ہماری چھت پر جنت موجود ہے جو ان شاء اللہ ہمارا اصلی گھر ہے۔ سو اس مراقبہ میں کوئی تکلف بھی نہیں کہ ہماری چھت کے اوپر جنت ہے اور اس وقت موجود ہے چند روز کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ ہم وہاں پہنچیں گے۔ اور بڑی راحت و فرحت کے ساتھ وہاں رہیں گے اس سے بڑی تسلی ہوگی۔

یہ صورت تسلی کی اہل سنت ہی کے عقیدہ پر ہو سکتی ہے جو وجود جنت و نار فی الحال کے قائل ہیں۔ معتزلہ کو مبارک ہو کہ انہوں نے وجود جنت کی نفع کر دی۔ باوجودیکہ ان کے پاس نفی کی کوئی دلیل نہیں

بجز اس کے کہ پہلے سے پیدا ہونا..... فضول اور بے ضرورت ہے۔ مگر ان عقلاء نے یہ سمجھا کہ فضول وعبث کے اگر یہ معنی ہیں کہ ہم کو اس میں حکمت نہ معلوم ہو تو نہ معلوم کتنی چیزوں کو فضول کہنا پڑے گا۔ حالانکہ ان کا وجود مشاہد ہے مگر ہم کو ان کی حکمت کا علم نہیں۔ اور اگر یہ معنی ہیں کہ واقع میں فائدہ وحکمت سے خالی ہو تو تمہارے نہ جاننے سے یہ کیوں کر لازم آ گیا کہ واقع میں بھی اس میں حکمت نہیں۔ اور ایک حکمت تو ابھی میری تقریر سے معلوم ہو گئی۔ کہ جنت کے وجود سے اس کا مراقبہ سہل اور مفید تر ہو گیا اور اس سے اہل ایمان کو بڑی تسلی ہوتی ہے۔ اور معدوم کا مراقبہ نہ سہل ہے نہ اس قدر مفید۔ اور تسلی بہت بڑی چیز ہے، جس کا شریعت نے خاص اہتمام کیا ہے۔ جیسا میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔

بس اب ان لوگوں کا انکار جنت ویسا ہی ہوا جیسا کہ کسی شخص نے روپیہ قرض لے کر مکان بنایا تھا۔ قرض خواہ نے رقم کا تقاضا کیا تو آپ نے غصہ میں آ کر اس گھر ہی کو ڈھا دیا کہ جاؤ ہم نے تمہارے روپیہ کا گھر ڈھا دیا۔ اب لے لو قرضہ کس سے لو گے۔ بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ گھر ڈھا کر تو نے کس کا نقصان کیا؟ قرض خواہ کا قرضہ تو اب بھی بدستور رہا تیرا ہی نقصان ہوا۔

اسی طرح معتزلہ انکار وجود جنت سے اپنا ہی نقصان کرتے ہیں ہمارا کچھ نقصان نہیں کرتے نہ ہمیں ان کے ساتھ بحث کی ضرورت بلکہ ہم تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ ایسی جنت آپ ہی کو مبارک ہو جو اس وقت معدوم ہے۔

ہماری جنت تو اسی وقت موجود ہے اور ہم مرتے ہی ان شاء اللہ اس کو دیکھ لیں گے۔ اس کی ہوا کھائیں گے۔ خوشبو سونگھیں گے، پھل بھی کھائیں گے، پانی بھی پئیں گے (اور اگر شہادت کا درجہ نصیب ہو گیا تو جنت کی سیر بھی مرنے کے بعد ہی شروع کر دیں) گے۔

بہر حال جنت اب بھی موجود ہے مگر وہاں تک پہنچنے کا رستہ آپ کو معلوم نہیں۔ مریخ تک تو ممکن ہے آپ پہنچ جائیں۔ مگر جنت تک بدون اذن الٰہی کے کون پہنچ سکتا ہے؟

غرض آپ کا وطن اور گھر وہی جنت ہے وہاں ہر قسم کا سامان راحت موجود ہے اور عنقریب آپ وہاں پہنچنے والے ہیں۔ ؎ شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود

اور حقیقت تو یہ ہے کہ جو مر جاتا ہے وہ دنیا کے بہت سے جھگڑوں سے چھوٹ جاتا ہے گو طبعاً اس کے مرنے والے کی مفارقت پر رنج ہو مگر عقلاً تو یہ سوچ کر تسلی دے لینا چاہئے کہ وہ خوش قسمت اپنے اصلی گھر میں اور چین و آرام کی زندگی میں پہنچ گیا اور دنیا کی مصائب سے چھوٹ

گیا۔ کیونکہ یہاں راحت تھوڑا ہی ہے۔ راحت تو مر کر ہی نصیب ہوگی۔

نفی الحدیث اللھم لا عیش الا عیش الاخرۃ (الصحیح للبخاری:۱:۱۷۱)

ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص روتا ہوا آیا اور کہنے لگا حضرت میری بیوی مر رہی ہے حضرت نے فرمایا عجیب بات ہے کہ ایک شخص تو قید سے چھوٹ رہا ہے اور یہ روتا ہے کہ تو قید سے کیوں چھوٹ رہا ہے۔

سبحان اللہ! عارفین کی ہر بات میں معرفت کی شان ہوتی ہے کہنے لگا حضرت! وہ میری روٹی پکاتی تھی فرمایا کہ ہاں بھائی! جب تم ماں کے پیٹ سے نکلے تھے اس وقت بھی وہ روٹیاں پکاتی ہوئی تمہارے ساتھ آئی تھی۔

ان باتوں پر تو حضرت کو تکدر نہیں ہوا۔ بلکہ ہر بات کا ہنس کر جواب دیتے رہے اس کے بعد اس نے ایک اور بات کہی جو ظاہر بینیوں کے نزدیک دین کی بات تھی مگر حضرت بگڑ گئے۔ کہنے لگا حضرت ایک شخص نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھ کو مدینہ اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اب وہ اس وعدہ سے پھر گیا ہے۔ دعا فرما دیجئے وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائے بظاہر اس بات سے حب رسول کا ظہور ہوتا تھا۔ مگر حضرت نے برہم ہو کر فرمایا کہ ہمارے سامنے شرک کی باتیں نہ کرو غیر اللہ پر اتنی نظر!

یہاں تک میں نے اس آیت کے متعلق جس کی شروع میں تلاوت کی گئی تھی۔ اختصار کے ساتھ جتنا بیان کیا ہے اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مضمون عقلی طور پر بھی اسباب تسلی سے ہے پس اس سے کام لینا چاہئے۔ ان شاء اللہ یہ مراقبہ مفید ہوگا۔

اسباب تسلی

دو باتیں اس وقت اور ذہن میں ہیں جن کا آیت سے تو تعلق نہیں مگر میرے نزدیک وہ بھی اسباب تسلی سے ہیں۔ اس لئے ان کو بھی فی الجملہ مناسبت ہے اور ممکن ہے کہ بہت سے اہل علم بھی ان کو اسباب تسلی سے نہ سمجھتے ہوں گے۔ اسلئے ان کے بیان کی بھی ضرورت ہے۔

۱......یہ کہ اسباب تسلی سے ایک امر یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی کچھ تذکرہ میت کا کر لیا جائے اس سے بھی تسلی ہوتی ہے (اور جب وہ یاد آئے یا اس کا تذکرہ کیا جائے تو انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بھی پڑھ لیا جائے تو ہمیشہ وہی ثواب ملے گا جو پہلی مرتبہ صبر کرنے سے ملا تھا۔ کما ورد)

۲......یہ کہ کچھ آنسوں بھی بہا لئے جائیں اس سے بھی تسلی ہوتی ہے صبر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میت کے تذکرہ سے زبان کو روک لیا جائے اور آنسو بھی نہ بہائے جائیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صاحبزادے ابراہیم علیہ وعلی ابیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات پر آنسو بھی

بہائے ہیں اور زبان سے بھی انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون (المصنف لابن أبي شيبة :۳:۲۹۳) فرمایا ہے کہ اے ابراہیم !تمہاری مفارقت سے ہم کو رنج ہے۔

اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کی مفارقت پر رنج کا اظہار فرمایا ہے۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ . مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا

اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (پ ۱۳)

کہ میں اپنے رنج وغم کا اظہار اللہ ہی سے کرتا ہوں دوسروں سے نہیں کرتا۔

بہر حال جب ہمارے حضورؐ نے گریہ فرمایا اور اس کو رحمت فرمایا ہے اور آپ کا قول وفعل تشریع ہے تو آنسو بہانے اور میت کا کچھ تذکرہ کرنے میں سنت سے تجاوز نہیں ہے۔

انبیاء اور غلبہ حال

ممکن ہے کوئی یہ احتمال نکالے کہ حضورؐ کا فعل غلبہ حال پر محمول ہے کیونکہ محققین نے فرمایا ہے کہ کاملین پر بھی غلبہ حال ہوسکتا ہے حتیٰ کہ ملائکہ پر بھی بعض دفعہ غلبہ حال ہوتا ہے چنانچہ ترمذی کی ایک حدیث میں حضرت جبریلؑ کا یہ ارشاد وارد ہے۔

لو رایتنی یا رسول الله وانا ادس الطین فی فی فرعون لئلا یتشهد فتدرکه الرحمة. او کما قال

حالانکہ وہ جانتے تھے کہ بعد معائنہ عذاب کے ایمان مقبول نہیں ہوسکتا پھر بھی ڈوبتے ہوئے فرعون کے منہ میں کیچڑ ٹھونستے تھے تاکہ کلمہ نہ پڑھ لے اور رحمت کا مستحق نہ ہو جائے آخر یہ کیا تھا وہی غلبہ حال یعنی غلبہ بغض فی اللہ!

اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام پر بھی غلبہ حال ہوسکتا ہے بس اتنا فرق ہے کہ انبیاء پر غلبہ حال گاہ ہوتا ہے دوسروں پر زیادہ ہوتا ہے واقعہ بدر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا

اللهم ان تهلک هذه العصابة لم تعبد بعد اليوم (الصحيح لمسلم: ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، مسند أحمد ۱ : ۳۲)

اے اللہ! اگر یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو آج کے بعد زمین میں آپکی بندگی نہ کی جائیگی۔

غلبہ حال ہی تھا (جس کو سن کر حضرت صدیقؓ نے عرض کیا تھا کہ یارسول اللہ بس بس آپ نے اللہ تعالیٰ سے خوب عرض ومعروض کرلی ہے۔ وہ ضرور آپ کی مدد کردے گا۔ پس اس کلیہ کا تو انکار نہیں کیا جا

سکتا کہ آپ پر غلبہ حال ہوسکتا ہے۔ اسلئے ممکن ہے کوئی صاحب اس واقعہ جز ئیہ یعنی وفات ابراہیم وعلیہ وعلی ابیہ الصلوٰۃ والسلام) آپ کے گریہ کو غلبہ حال پر محمول [1] کرے مگر اول تو دل اس کو قبول نہیں کرتا۔

آنسوں بہانا

دوسرے یہ کہ بعد تسلیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر غلبہ حال بھی بارادۂ حق ہوتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر جو حال بھی وارد فرماویں۔ وہ قابل تاسی ہے کیونکہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (پ ۲۱) میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں بڑھائی کہ جو غلبہ حال سے ہو وہ اسوہ نہیں بلکہ حضورؐ کی ذات کو مطلق اسوہ فرمایا ہے۔

پس آپ کا ہر فعل وقول وحال ہمارے واسطے اسوۂ حسنہ ہے بجز اس کے جس کا آپ کی ذات کے لئے مخصوص ہونا حق تعالیٰ کے یا آپ کے ارشاد سے معلوم ہو گیا ہے پس رونا مطلقاً خلاف سنت نہیں بلکہ وہ رونا خلاف سنت ہے جس میں نوحہ ہو یعنی بیان اور بین ہو۔ باقی آنسو بہا لینا رو لینا اچھا ہے اس سے دل کا غبار نکل کر تسلی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تجربہ ہے۔

ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے کسی کی موت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ یا رسول اللہ عورتیں رو رہی ہیں۔ فرمایا منع کر دو۔ مگر حضورؐ نے خود منع نہیں فرمایا۔ حالانکہ آپ کو اطلاع تھی بلکہ اس شخص نے دو تین بار آ کر اطلاع دی کہ میں نے منع کیا مگر وہ نہیں رکتیں۔ تو آخر میں آپؐ نے صرف اتنا فرمایا کہ ان کے منہ پر خاک ڈالو یعنی جانے دو۔ آپؐ نے خود اسی واسطے نہیں منع فرمایا کہ اس حکمت پر نظر تھی کہ اس سے [1] تسلی ہو جاتی ہے۔

---

[1] بل یرده الذوق السلیم لا سیما وقد ورد عند ابن ابی شیبة بسندٍ حسنٍ عن جابرٍ قال اخذالنبی صلی الله علیه وسلم بید عبدالرحمن بن عوف فخرج به الی النخل فاتی بابرٰهیم وهو یجود بنفسه فوضع فی حجره فقال یا بنی لا املک لک من الله شیئاً وذرفت عینة فقال له عبد الرحمن تبکی یا رسول الله! اولم تنه عن البکاء؟ قال انما نهیت عن النوح عن صوتین احمقین فاجرین صوت عند نغمة لهو ولعبٍ ومزامیر شیطان وصوت عند مصیبة خمشق وجوه وشق جیوب ورنة شیطان وانما هذه رحمة ومن لا یرحم لا یرحم (ففیه دلیل ظاهرعلی ان بکاء ه صلی الله علیه وسلم لم یکن لغلبة الحال بل لا ظهار الرحمة لقولهٖ ومن لا یرحم لا یرحم ثم قال یا ابرٰهیم لا لا انه امرحق ووعد صدقٍ وسبیل ما تیةٍ وان اخرنا لتلحق اولا نا لحزنا علیک حزنا اشد من هذاوانابک لمحزونون تبکی العین ویحزن القلب ولا نقول یسخط الرب ا ه ص۱۶۸ ۔

آنسوں نہ بہانے کا اثر

اور تجربہ کیا گیا ہے کہ بالکل آنسو نہ بہانے اور دل کو گھونٹ لینے سے بعد میں صحت کو نقصان پہنچتا ہے اور صحت کی حفاظت بھی مطلوب ہے اور تجربہ سے رونے کو اس میں بڑا دخل ہے تو اس سے ضرور کام لیا جاوے۔[1]

حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ نے ایک خط[2] میں نواسہ کے انتقال پر مجھے خود لکھا تھا۔ شدت ضبط سے قلب و دماغ دونوں ماؤف ہوگئے جب شدت ضبط سے حضرت کا یہ حال ہوا جو علم و معرفت وقوت میں ہم سے بدرجہا زیادہ تھے تو ہم جیسوں کا تو کہاں ٹھکانا رہے گا۔

اسی لئے میری یہ رائے ہے کہ جب واقعہ غم بالکل تازہ ہو تو غیر محقق کا وعظ نہ کہلایا جائے کیونکہ واعظ صاحب تو صبر وضبط کی ہی تعلیم دیں گے اور لوگوں کا دل گھونٹ دیں گے۔ ان کے نزدیک تو صبر اسی کا نام ہے کہ آنسوں نہ نکلیں۔ آواز بھی نہ نکلے۔ بلکہ ہر وقت انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھتا رہے یا تسبیح چلتی رہے۔

مگر صبر کی یہ تعلیم ویسی ہی ہے جیسی واعظوں کے یہاں توکل کی تعلیم اور اکل حلال کی تعلیم غلو کے ساتھ دی جاتی ہے۔ حالانکہ ایسا توکل و اکل حلال مطلوب نہیں بلکہ مہروب عنہ ہے توکل کی تعلیم میں تو یہ کہیں گے کہ صبح کو جب کھانا کھالیا تو شام کی فکر ہونا خلاف توکل ہے۔ شام کو کھالیا تو صبح کی فکر ہونا خلاف توکل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رزق کا وعدہ فرمالیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا وعدہ کسی کا نہیں ہوسکتا۔ تو جو لوگ رزق کی فکر میں رہتے ہیں گویا ان کو اللہ کے وعدہ پر بھروسا اور

---

[1] واخرج ابن ابی شیبة بسند حسن صحیح عن عائشة ام المومنین قالت لما حضر رسول الله علیه وسلم وابوبکر و عمر یعنی سعد بن معاذ فو الذی نفسی بیده انی لا عرف بکاء عمر من بکاء ابی بکر وانی لفی حجرتی الحدیث وبسند حسن عن ابی عثمان (هوا المنهدی) قال اتیت عمر بنعی النعمان بن مقرن فوضع یده علیٰ راسه وجعل یبکی وبسند صحیح عن ابن عمر انه کان فی السوق فنحی الیه حجر (هواً ابن عدی من اصحاب علی کرم الله وجهه) فاطلق صوته وقام وغلبه النجیب وبسند حسن صحیح عن ابی مسعود و ثابت بن زید وقرظة بن کعب قالوا رخص لنا فی البکاء علیٰ المیت فی غیر نوح وبسند صحیح عن ابی هریرة قال مر النبی صلی الله علیه وسلم بجنازة یبکی علیها وانا معه و عمر بن الخطاب فانتهر عمر اللاتی یبکین مع الجنازة فقال النبی صلی الله علیه وسلم دعهن یا ابن الخطاب فان النفس مصابة والعین دامعة والعهد قریب ص۱۲۹)

[2] قلت وقد وفقنی الله للعمل بذلک قبل هذا الوعظ بسنین عدیدة حین توفی ولد الرئیس حسین علی خان المرحوم الذین کان قد متبناه فمات بحطمة البابورو رأیتة صابر اضابطا باشد ضبط لم تدمع عینا بدمعة وسألنی الوعظ لنفسه ولا هل بیته فذکرت فی اثناء الوعظ امورا غلیه لا جلها البکاء والنحیب وکذا علی اهل بیته وانتفعوا بذلک ور آوافی انفسهم خفة من الغم والحزن الذی کان قبل ذلک مستولیا علیهم والله الموفق والمعین.

یقین نہیں۔اور یہ مثال بھی دیں گے کہ اگر کوئی دوست دعوت کر دے تو فوراً بے فکر ہو کر چولہا ٹھنڈا کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی دعوت پر بے فکری نہیں ہوتی۔

رزق حلال

رزق حلال کے متعلق ایسی ایسی حکایتیں بیان کی جاتی ہیں کہ ایک بزرگ رزق حلال کی تلاش میں پھرتے تھے تحقیق سے معلوم ہوا کہ ایک شخص کے یہاں رزق حلال تھا۔مگر آج نہیں رہا کیونکہ میرے بیل ایک کھیت میں گزر گئے تھے۔اس کے کھیت کی مٹی ان کے پیروں میں لگ گئی اور وہ مٹی میرے کھیت میں مل گئی تو میرا کھیت سارا مشتبہ ہو گیا۔

سو ایسا تقویٰ خشک تقویٰ ہے ایسے متوکل اور ایسے طالب حلال کو فقہاء نے قابل تعزیر قرار دیا ہے کیونکہ یہ تقویٰ نہیں بلکہ تقوے کا ہیضہ ہے جو در حقیقت شریعت پر اعتراض ہے کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ توکل اور اکل حلال محال ہے اس لئے کہ ایسا توکل اور ایسا اکل حلال کس کی وسعت میں ہے؟اور یہ خلاف ہے لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا کے۔اس لئے ایسے متقیوں کو اور ایسے واعظوں کو جو غلط تقویٰ کی تعلیم وعظوں میں بیان کریں۔فقہاء لائق تعزیر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس جزئی کی تصریح ہے کہ اگر کوئی ایک دانہ گندم کو لقطہ سمجھ کر مالک کو تلاش کرتا پھرے اس کو تعزیر دی جائے بس امت میں فقہاء اور صوفیاء دو ہی جماعتیں حکماء امت ہیں مگر باوجود اس کے ان میں جو کبھی جنگ ہوتی ہے تو وہ نقصان علم یا نقصان تصوف کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اب اس اعتراض کا جواب دینا چاہتا ہوں جو ان واعظوں نے عام مسلمانوں پر کیا ہے کہ دوست کی دعوت سے تو چولہا ٹھنڈا کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر چولہا ٹھنڈا نہیں کرتے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اہتمام رزق بدرجہ ضرورت ہرگز توکل علی اللہ کے خلاف نہیں رہا۔یہ کہ باوجود الٰہیہ کے تشویش کیوں ہے؟سو بات یہ ہے کہ اسباب تشویش مختلف ہیں کبھی تو اسلئے تشویش ہوتی کہ وعدہ کرنے والے پر اعتماد نہیں۔سو مسلمان کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے بعد اس سبب سے تو تشویش ہرگز نہیں ہو سکتی یہ تشویش صرف کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور ایک سبب تشویش کا یہ ہے کہ وعدہ مبہم اور غیر معلوم الوقت اور غیر معلوم السبب ہو۔سو ایسی تشویش اللہ تعالیٰ کے وعدہ میں ہو سکتی ہے اور مسلمانوں کے رزق کے معاملہ میں جو تشویش ہے وہ اسی سبب سے ہے اللہ تعالیٰ نے رزق کا تو وعدہ فرمایا ہے مگر اس کا وقت اور سبب معین نہیں فرمایا کہ روزانہ دونوں وقت ملا کرے گا یا

تین دن کے بعد یا ایک ہفتہ کے بعد۔ اور تجارت سے ملے گا یا زراعت سے یا نوکری سے۔

سو ایسا مبہم وعدہ تو اگر کوئی دوست بھی کرے تب بھی تشویش ضرور باقی رہے گا۔ مثلاً دوست یوں کہہ جائے کہ اس مہینہ میں آپ کی دعوت ہے اور وقت اور دن نہ بتلائے تو ہرگز آپ شام کو چولہا ٹھنڈا نہ کریں گے۔ پس ایسی ایسی باتوں سے مسلمانوں کی ہمتیں نہ توڑو اور غلط سلط حکایات سے رزق حلال کو دشوار نہ کرو۔ بلکہ اس باب میں میری رائے تو یہ ہے کہ اگر معاملات میں کسی وقت اپنے مذہب میں تنگی ہو اور دوسرے ائمہ مجتہدین کے اقوال میں گنجائش ہو تو عوام میں تنگی میں نہ ڈالا جائے۔ بلکہ دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دے دیا جائے۔ میں حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ سے اس رائے کی صریح تائید حاصل کر چکا ہوں۔

اسی طرح صبر کو دشوار نہ کرو۔ اہل مصیبت کا دل نہ گھونٹوں۔ ان کو مت کے تذکرہ کی اور آنسو بہا لینے اور کسی قدر رو لینے کی اجازت دو کہ اس سے تسلی ہو جاتی ہے۔

حزن اور مجاہدہ

تیسری بات یہ ہے کہ یہ سوچے کہ حزن کو قطع راہ باطن میں بڑا دخل ہے۔ حزن سے تصفیہ باطن بہت جلد اور زیادہ ہوتا ہے اور اس باب میں صوفیاء کا قول حجت ہے کہ طریق باطن کے امام وہی ہیں۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ حزن سے اتنی جلدی یہ راستہ طے ہوتا ہے کہ مجاہدات سے برسوں میں بھی طے نہیں ہو سکتا۔ اور مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ — جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ
ہر کجا پستی ست آب آنجا رود — ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے دوا آنجا رود — ہر جا رنجے شفا آنجا رود

صرف عقل وفہم کو تیز کرنا کچھ نہیں۔ فضل خداوندی شکستہ دلوں پر ہوتا ہے۔ جہاں پستی ہو پانی وہیں جاتا ہے۔ جہاں مشکل ہو جواب وہیں دیا جاتا ہے۔ جہاں درد ہوگا دوا وہیں کی جائیگی۔ جہاں رنج ہوگا شفا وہیں جائیگی۔

اس قول کی تائید قرآن شریف سے بھی ہوتی ہے۔ واقعہ احد میں بعض حضرات صحابہ سے ایک اجتہادی غلطی ہو گئی تھی۔ اس پر چند آیات نازل ہوئیں ان میں سے ایک آیت یہ بھی ہے:

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَاتَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّامبِغَمٍّ لِّكَیْلَاتَحْزَنُوْاعَلٰی مَافَاتَكُمْ وَلَامَآاَصَابَكُمْ الآیۃ (پ ۴)

اس میں مشہور تفسیر یہی ہے کہ لا زائدہ ہے ار مطلب یہ ہے کہ فَاَثَابَکُمْ غَمًّام بِغَمٍّ کہ تم کو غم پرغم اسلئے دیا تا کہ تم کو رنج ہو اور رنج کیوں دیا اسکی وجہ تھوڑی دور آگے مذکور ہے وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰہُ مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ وَلِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِکُمْ. (پ۴)

جس کا حاصل وہی تسفیہ و تجلیہ باطن ہے اور تصفیہ و تجلیہ باطن سے مقصود رفع درجات ہے اور یہی اصل مقصود ہے۔ حق تعالیٰ نے اسی کے اسباب قصداً صحابہ پر وارد کئے اور اسی طرح مسلمانوں پر ہر زمانہ میں رفع درجات کے اسباب وارد کئے جاتے ہیں اور یہ بہت بڑی دولت ہے جس کی قدر کرنا چاہئے۔

پس اہل مصیبت کو چاہئے کہ ان منافع کو سوچ کر تسلی حاصل کریں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہئے کہ جب خدا تعالیٰ کی توفیق سے مصیبت کی وجہ سے ان کے اندر شکستگی اور تواضع پیدا ہوگئی ہو۔ اور باطن کا تصفیہ ہو چکا ہو تو اب اس کی حفاظت کریں۔ غفلت سے اس دولت کو برباد نہ کریں کہ یہ دولت بڑے بڑے مجاہدات اختیاریہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

محبت اور رحمت

چوتھی بات تسلی کی یہ ہے کہ مصیبت سے انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

اذا احب اللہ عبداً ابتلاہ ولیسمع تضرعہ (إتحاف السادۃ المتقین ۵:۳۸، کنز العمال: ۳۰۷۹۳) رواہ البیھقی عن ابن مسعود وھو حسن لغیرہ وروی البیھقی والضیاء عن انس بلفظ اذا احب اللہ قوما ابتلاھم وھو حدیث صحیح کذا فی العزیزی. (صفحہ نمبر ۷۹ ج ۱)

یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت فرماتے ہیں کہ تو اس کو کسی بلا میں مبتلا کر دیتے ہیں کسی نے اسی باب میں کہا ہے۔

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست ۔۔۔ کس را رسد نہ چون و چرا در قضائے ما

ہم دشمن کو پالتے ہیں اور دوست کو قتل کرتے ہیں۔ کوئی ہمارے فیصلے میں چون و چرا کر سکتا ہے۔؟

اسی لئے محبین نے تو مصیبت کی تمنا کی ہے۔ ہم کو خود تو تمنا نہ کرنا چاہئے کہ ہم اس درجہ کے نہیں۔ مگر جب یہ مراقبہ پختہ ہو جاتا ہے تو تمنا خود ہی پیدا ہو جاتی ہے۔

حضرت رابعہ بصریہ بعض دفعہ فرمایا کرتی تھیں۔ کہ شاید اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہیں کیونکہ بہت دنوں سے مجھے بیمار نہیں کیا۔ اور جن کو یہاں مصائب کی تمنا نہیں ہے وہ قیامت کے دن

جب دیکھیں گے کہ اہل مصیبت کو بڑے بڑے درجات دیئے جا رہے ہیں اس وقت تمنا کریں گے کہ کاش! ہماری کھالیں دنیا میں قینچیوں سے کاٹی جاتیں۔

نیز حدیث میں آیا ہے کہ سب سے زیادہ بلا حضرات انبیاء علیہم السلام پر آتی ہے پھر ان پر جو ان کے بعد افضل ہوں۔

(اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالا مثل اخرجه ابن ابی شیبة فی المصنف ص ۲ ۷ بسند حسن) (کنز العمال: ۶۷۸۲، إتحاف السادة المتقین: ۸: ۵۶۰)

غرض یہ فوائد ہیں مصائب ہیں۔ اور یہ سب اسباب تسلی میں سے ہیں ان کو سوچنا اور مستحضر رکھنا چاہئے۔ اور دو باتیں جو میں نے بعد میں اپنی طرف سے بتلائی ہیں۔ ان پر بھی عمل کرنا چاہئے ان شاء اللہ تعالیٰ تسلی ہو جائے گی۔

بس اب میں بیان ختم کرتا ہوں کیونکہ مضمون کی آمد بھی اب نہیں رہی اور بیان بھی کافی ہو گیا ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه سیدنا ومولنا محمد وعلیٰ اله واصحابه اجمعین. واٰخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین.

والحمد للہ الذین بنعمته وعزته وجلاله تتم الصلحت.

تنبیہ: بعد وعظ کے حضرت نے فرمایا کہ اسکا نام آداب المصاب رکھ دیا جائے مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ نے عرض کیا کہ اس نام میں تسلیۃ الاحباب کا لفظ بھی آ جائے تو اچھا ہے۔ فرمایا تو اس کا نام ''آداب المصاب تسلیۃ الاحباب'' رکھ دیا جائے۔ پھر مکان وعظ سے باہر تشریف لا کر فرمایا کہ میں نے اس بیان کا ثواب اختری مرحومہ کو بخش دیا ہے

پھر جامع وعظ سے فرمایا کہ تم بھی اس وعظ کو صاف کر کے اس کا ثواب مرحومہ کو بخش دینا۔ چنانچہ احقر نے یہ وعظ حسبتاً للہ ہی لکھا اور حسبتاً للہ ہی اس کو صاف کیا اور اس کا ثواب مرحومہ کو بخش دیا ہے۔ اور ناظرین و منتفعین وعظ سے درخواست ہے کہ وہ بھی مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت و رفع درجات فرمائیں۔ اور یہ مسودہ وعظ مجلس خیر تھانہ بھون پر اس لئے وقف کرتا ہوں کہ اگر کوئی اس کو طبع کرنا چاہے تو اس کو اس کی نقل دے دی جایا کرے۔ مصارف نقل حسب قاعدہ مجلس خیر لے گی۔ اس مسودہ کا کچھ معاوضہ نہ لے گی اور اگر کسی وقت یہ احقر یا میرے متعلقین میں

سے کوئی اس کا طبع کرنا چاہے تو اس کی درخواست کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔ **ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم**۔ کتبہٗ بقلم ظفر احمد عفا اللہ عنہ، ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۵۴ھ

الحاق: اس الحاق کے دو حصے ہیں ایک تتمہ سے ملقب ہے دوسرا ضمیمہ سے۔ حصہ دوم وعظ سے پہلے ذہن میں تھا۔ مگر وعظ کے وقت یاد نہ آیا۔ اور حصہ اول وعظ کے بعد ذہن میں آیا۔ ان دونوں حصوں کو وعظ کے ساتھ ملحق کیا جاتا ہے مگر حصہ اول چونکہ بمنزلہ جزو وعظ کے ہے۔ اسلئے اس کو ترتیب میں مقدم کیا جاتا ہے اور اسی لئے اس کا لقب تتمہ ہے۔ اور دوسرے حصہ میں صبر کی ایک جزئی کے متعلق بیان ہے اور اسی لئے اس کا لقب ضمیمہ ہے۔ اب دونوں کو مختصر عبارت میں پیش کرتا ہوں۔ عبارت مختصر اس لئے ہے کہ تحریر کا وقت وعظ کا وقت نہیں۔ جس کا خلاصہ بسط ہوتا ہے مضمون کا۔ البتہ اگر کوئی صاحب اس مضمون کو بطور وعظ کے بیان فرمادیں۔ وہ مبسوط کر سکتے ہیں۔

تتمہ

غم اور شغل

ایک ادب مصیبت کا کہ وہ بھی اسباب تسلی میں سے ہے یہ ہے (اور میں اکثر متعلقین کو اس کی تعلیم کیا کرتا ہوں کہ ایسے غم کے واقعہ میں بیکار نہ رہے۔ بلکہ کسی نہ کسی کام میں مشغول رہے تا کہ اس کی طرف توجہ ہونے سے واقعہ غم کی طرف توجہ کم ہو جائے۔ افضل تو یہ ہے کہ وہ شغل طاعت ہو۔ مثلاً ذکر ہو۔ تلاوت ہو، نوافل ہوں، مطالعہ کتب ہو شغل تصنیف ہو، صحبت اختیار ہو، اگر اس کی ہمت نہ ہو تو شغل مباح بھی کافی ہے۔ جیسے سیر وسیاحت، دیندار دوستوں کی ملاقات ومکالمت، بیوی بچوں سے ہنسنا بولنا۔

تسلی کی اس تدبیر کا ماخذ بھی کلام الٰہی ہے قال اللہ تعالیٰ (فی سورۃ البقرۃ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (پ ۲)

اے ایمان والو (طبیعتوں میں غم ہلکا کرنے کے بارے میں) صبر اور نماز سے سہارا (اور مدد) حاصل کرو۔ بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ (اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ۔)

فائدہ: وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبادت ہے جب صبر میں یہ وعدہ ہے کہ تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجہ اولی یہ بشارت ہوگی اور صبر کو تخفیف حزن میں دخل اور اثر ہونا تو ظاہر ومشاہد ہے۔ رہا یہ کہ نماز کو اس میں کیا دخل ہے۔

سو اول تو جیسے بعض ادویہ فاعل بالخاصہ ہوتی ہیں اور تجربہ سے اس خاصیت کا حکم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر بعض اعمال بھی فاعل بالخاصہ ہوں تو اس میں تعجب کیا ہے۔ چنانچہ نماز جو حضور قلب کے ساتھ ہو جس کے بدوں نماز مثل دوائے کہنہ کے ہے۔ اس میں جس کا جی چاہے اس

خاصیت کا تجربہ کر کے دیکھ لے کہ مشاہدہ کے بعد سوال ہی کی گنجائش نہ رہے گی۔

اگر مثل ادویہ فاعلہ بالکیفیت کے نماز میں اس اثر کی لم اور علت ہی کی تحقیق کرنے کا شوق ہو تو اس کی توجیہ بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ مدار تخفیف حزن کا قلب کو دوسری شے کی طرف متوجہ کر دینے پر ہے۔ اس سے جی بہل جاتا ہے۔

پس جب نماز میں حضور قلب کے ساتھ مشغول ہوگی۔ اس سے عبادت و معبود کی طرف یکسوئی اور توجہ ہوگی اور اس عمل کے تکرار سے وہ واقعہ غم انگیز متخیلہ سے غائب اور اس کا اثر ضعیف ہونا شروع ہوگا اھ...... (بیان القرآن) وقال اللہ تعالیٰ (فی سورۃ ق)

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الغروب. ومن الليل فسبحه وادبار السجود. (پ ۲۶)

سوان کی باتوں پر صبر کیجئے (یعنی رنج نہ کیجئے) اور (چونکہ بدون اس کے کہ کسی طرف دل کو مشغول کیا جائے وہ غم کی بات دل سے نہیں نکلتی اور بار بار یاد آ کر دل کو محزون کرتی ہے اس لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہیئے (اس میں بھی نماز داخل ہے) آفتاب نکلنے سے پہلے (مثلاً صبح کی نماز) اور اس کے چھپنے سے پہلے (مثلاً ظہر و عصر) اور رات میں بھی اس کی تسبیح (و تحمید) کیجئے (اس میں مغرب اور عشا آ گئی) اور (فرض) نمازوں کے بعد بھی (اس میں نوافل و اوراد آ گئے حاصل یہ ہوا کہ ذکر اللہ میں اور اس کی فکر میں لگے رہیئے۔ تاکہ ان کے اقوال کفریہ کی طرف توجہ نہ ہو) اھ۔

مسائل السلوک میں ہے کہ اس آیت میں صاف اشارہ ہے کہ شدائد میں تسلیہ کا قوی درجہ توجہ الی اللہ ہے (برحاشیہ مکمل بیان القرآن صفحہ ۵۶ ج ۱۱)

توجہ الی الطاعت کا مؤثر ہونا تو آیت اور تفسیر میں نصاً مذکور ہے۔ باقی دوسرے اشغال مباحہ کے نافع ہونے کی تقریر یہ ہے کہ اطاعت اس اثر تسلیہ میں علاوہ مؤثر بالخاصہ ہونے کے مؤثر بالکیفیہ بھی ہے جس کی تقریر آیت اولیٰ کی تفسیر میں گزر چکی ہے اس قول میں کہ اس کی توجیہ بھی سمجھ میں آسکتی ہے۔ الخ

اور یہ علت مشترک ہے کہ طاعات و مباحات میں۔ پس حکم بھی مشترک ہے۔ اور تجربہ و مشاہدہ کے بعد تو اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

ضمیمہ

وعظ کا گو اصل اور زیادہ مقصود صبر کی ایک خاص جزئی یعنی صبر علیٰ موت المحبوب کے متعلق

بیان کرنا تھا۔ مگر صبر کی اور بھی جزئیات ہیں جن میں ایک خاص جزئی اس وقت کے مناسب قابل ذکر ہے اور وہ صوم ہے۔ جس کا زمانہ کل کے روز (یعنی آج کی شب) سے شروع ہو گیا ہے۔ اس کے متعلق بھی کچھ ضروری بیان مقتضائے وقت ہے۔ زیادہ گنجائش نہ ہونے کے سبب بیان القرآن سے صرف تین آیتوں کے ترجمہ وتفسیر کی نقل پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حکم سوم صوم

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (پ ۲)

اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ اس توقع پر کہ تم (روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ) متقی بن جاؤ (کیونکہ روزہ رکھنے سے عادت پڑے گی۔ نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی۔ اور اسی عادت کی پختگی بنیاد ہے تقویٰ کی سو) تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو (اور ان تھوڑے دنوں سے مراد رمضان ہے جیسا اگلی آیت میں آتا ہے) پھر اس میں بھی اتنی آسانی ہے کہ) جو شخص تم میں (ایسا) بیمار ہو (جس کو روزہ رکھنا مشکل ہو یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور بجائے ایام رمضان کے) دوسرے ایام کا (اتنا ہی) شمار (کر کے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب ہے) اور (دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہو گئی یہ ہے کہ) (جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں (اور پھر بھی روزہ رکھنے کو دل نہ چاہے تو) ان کے ذمہ (صرف روزے کا) فدیہ (یعنی بدلہ) ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا (کھلا دینا یا دیدینا) ہے اور جو شخص خوشی سے (زیادہ) خیر (خیرات) کرے (کہ زیادہ فدیہ دیدے) تو یہ اس شخص کے لئے اور بھی بہتر ہے اور (گو ہم نے آسانی کے لئے ان حالتوں میں روزہ رکھنا (اس حال میں بھی) زیادہ بہتر ہے۔ اگر تم (کچھ روزے کی فضیلت کی) خبر رکھتے ہو۔

فائدہ: پہلی امتوں میں سے نصاریٰ پر روزہ فرض ہونے کا بیان ایک حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ نصاریٰ پر ماہ رمضان کا روزہ فرض ہوا تھا۔ ان کا کوئی بادشاہ بیمار ہوا تو اس کی قوم نے نذر مانی کہ اگر بادشاہ کو شفا ہو جائے تو ہم دس روزے اور اضافہ کر دیں گے پھر اور کوئی بادشاہ بیمار ہوا تو اس کی صحت پر سات کا اضافہ ہوا۔ پھر تیسرا بادشاہ بیمار ہوا۔ سو اس نے تجویز کیا کہ پچاس میں تین ہی کی کسر رہ گئی ہے لاؤ تین اور بڑھا لیں۔ اور ایام ربیع میں سب رکھ لیا کریں۔ (ذکر فی روح المعانی بروایة ابن حنظلة والنحاس والطبرانی عن معقل بن حنظلة مرفوعاً)

اور لعلکم تتقون میں روزہ کی ایک حکمت کا بیان ہے جس کی تقریر اثنا ترجمہ میں کر دی گئی۔ لیکن حکمت کا اسی میں انحصار نہیں ہو گیا۔ خدا جانے اور کیا کیا ہزاروں حکمتیں ہوں گی۔ پس کسی کو یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ جب مقصود روزہ کا معلوم ہو گیا تو یہ مقصود دوسرے طریق سے حاصل کر لیں تو روزہ کی یا قید رمضان کی کیا ضرورت ہے۔

وجہ گنجائش نہ ہونے کی یہ ہے کہ ممکن ہے کہ روزہ میں کچھ خاص حکمتیں اور ثمرات ایسے ہوں کہ وہ بدوں ان خاص قیود مقررہ شرعیہ کے حاصل نہ ہو سکیں۔ خوب سمجھ لو۔ اور اس مقام پر چند مسائل ہیں۔

چند مسائل

ا: جس بیماری میں روزہ رکھنا نہایت شاق ہو اس میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔

۲: سفر شرعی حنفیہ کے نزدیک یہ ہے کہ اپنی جائے قیام سے تین منزل کے قصد سے سفر کرے تو رستہ میں تو یہ مسافر ہو گیا۔ اب منزل مقصود پر پہنچ کر اگر پندرہ روزہ یا زیادہ قیام کا ارادہ کر لیا تو مسافر نہ رہا۔ اور اگر پندرہ روزے سے کم کے قیام کا ارادہ کیا تو پھر بھی مسافر ہے۔

غرض! جو شخص شرعی مسافر ہو اس کو جائز ہے کہ باوجود روزہ رکھ سکنے کے روزہ نہ رکھے لیکن ایسی حالت میں زیادہ افضل یہی ہے کہ رکھے۔

۳: یہ مریض اور مسافر جن کا ذکر کیا گیا اگر اس روز کے روزہ کی نیت نہ کر چکے تھے تو روزہ نہ رکھنا درست ہے اور اگر نیت کر چکے ہوں تو بلا تکلیف شدید روزہ توڑنا جائز نہیں۔

۴: یہ مریض اور مسافر جتنے دن روزہ نہ رکھیں ان دنوں کا شمار یاد رکھیں۔ اور جب مرض اور سفر ختم ہو جاوے بعد رمضان گزر جانے کے اتنے دنوں کا روزہ بہ نیت قضا رکھیں۔ اور یہ قضا کے روزے خواہ ایک دم سے رکھیں اور خواہ ایک ایک دو دو کر کے رکھیں اور بعد ختم ہونے مرض اور سفر کے اگر کچھ رمضان بھی باقی ہے تو بقیہ رمضان کا روزہ ادا کر کے اس کے گزرنے کے بعد یہ قضا روزے رکھ سکتے ہیں۔

۵: شروع اسلام میں جب لوگوں کو بتدریج روزہ کا خوگر کرنا۔۔۔ منظور تھا یہ حکم ہو گیا تھا کہ باوجود استطاعت روزے کے فدیہ کی اجازت تھی اب یہ حکم منسوخ ہے البتہ جو شخص بہت بوڑھا ہو یا ایسا بیمار ہو کہ اب صحت کی توقع نہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ حکم اب بھی ہے کہ فی روزہ یا تو ایک مسکین کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیں یا خشک جنس دینا چاہیں تو فی روزہ اسی روپے کے سیر سے پونے دو سیر دیا کریں۔ اگر اتنے گیہوں دو مسکین کو دیں گے درست نہیں یا ایک مسکین کو ایک تاریخ

میں دو دن کا فدیہ دیں گے تب بھی درست نہیں۔ اور اگر فدیہ دینے کے بعد اس شخص میں طاقت آ گئی یا وہ مرض جاتا رہا تو ان روزوں کو پھر قضا کرنا ہوگا۔ اور اگر کسی کو فدیہ دینے کی بھی وسعت نہ ہو تو بجائے فدیہ کے وہ صرف استغفار کرے اور نیت رکھے کہ جب ہو سکے گا ادا کروں گا۔

حکم چہارم

تمتع بمفطرات در شب صیام۔ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُم الی قوله حتیٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ

تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیبیوں سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا (اور پہلے جو اس سے ممانعت تھی وہ موقوف کی گئی) کیونکہ (بوجہ قرب و اتصال کے) وہ تمہارے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے ہیں) اور تم ان کے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہو۔ خدا تعالیٰ کو اسکی خبر تھی کہ تم (حکم الٰہی میں) خیانت (کر) کے گناہ میں اپنے کو مبتلا کر رہے تھے (مگر) خیر (جب تم معذرت سے پیش آئے) تو اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا۔ سو (اجازت ہو گئی) تو اب ان سے ملو ملاؤ اور جو (قانون اجازت) تمہارے لئے تجویز کر دیا ہے (بے تکلف) اس کا سامان کرو اور (جس طرح شب صیام میں بی بی سے ہم بستری کی اجازت ہے اسی طرح یہ بھی اجازت ہے کہ) کھاؤ (بھی) اور پیو (بھی)۔ اس وقت تک کہ تم کو سفید خط (کہ وہ نور ہے) صبح (صادق) کا (جب کہ وہ بالکل شروع ہی شروع میں طلوع ہوتی ہے) متمیز ہو جائے سیاہ خط سے (کہ عبارت ہے تاریکی کی اس حد فاصل سے جو کہ خط نور صبح سے ملا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مراد متمیز ہونے سے یہ کہ صبح صادق طلوع ہو جائے) پھر (صبح صادق سے) رات (آنے) تک روزہ کو پورا کر لیا کرو۔

فائدہ: شروع اسلام میں یہ حکم تھا کہ رات کو ایک دفعہ نیند آ جانے سے آنکھ کھلنے کے بعد کھانا پینا، بی بی کے پاس جانا حرام ہو جاتا تھا۔ یعنی صحابہ سے غلبہ میں اس حکم کے امتثال میں کوتاہی ہو گئی پھر نادم ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اطلاع کی۔ ان کی ندامت اور توبہ پر حق تعالیٰ نے رحمت فرمائی اور اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ اور احقر نے جو خط تاریکی اور خط نور کے ملنے کو محسوس ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ وجہ اس تعبیر کی یہ ہے کہ واقع میں وہ دو خط نہیں بلکہ ایک ہی خط ہے جو سطح نور و سطح ظلمت دونوں کا منتہا اور دونوں کے درمیان میں مشترک اور فاصل ہے جیسا اہل ریاضی جانتے ہیں۔

حکم پنجم اعتکاف

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ اوران بیبیوں (کے بدن) سے اپنا بدن بھی (شہوت کے ساتھ) مت ملنے دو جس زمانہ میں تم لوگ اعتکاف والے ہو (جو کہ مسجدوں میں ہوا کرتا ہے)۔

فائدہ: مسئلہ: حالت اعتکاف میں بی بی کے ساتھ صحبت اوراسی طرح بوس وکنار سب حرام ہے۔ پھر اگر بوس وکنار میں انزال بھی ہو گیا تو وہ اعتکاف جاتا رہے گا اور بجائے اس کے دوسرا قضا کرنا ہوگا۔ اور (اگر بلا شہوت اس نے اس کو یا اس۔ نے اس کو ہاتھ لگادیا یا بدن دبادیا تو درست ہے۔

مسئلہ۲: اعتکاف صرف ایسی مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں پانچوں وقت جماعت سے نماز کا انتظام ہو۔

مسئلہ۳: جو اعتکاف رمضان میں نہ ہو اس میں روزہ بھی شرط ہے۔

مسئلہ۴: اعتکاف والے کو مسجد سے کسی وقت باہر نکلنا درست نہیں۔ البتہ جو کام بہت ہی لاچاری کے ہیں جیسے پیشاب، پائخانہ یا کوئی کھانا لانے والا نہ ہو تو گھر سے کھانا لے آنا یا جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کیلئے جانا بس ایسی ضرورت کیلئے باہر جانا درست ہے لیکن گھر میں یا رستہ میں ٹھہرنا درست نہیں۔

مسئلہ۵: اگر عورت اعتکاف کرنا چاہے تو جو جگہ اس کی نماز پڑھنے کی مقرر ہے اسی جگہ اعتکاف بھی درست ہے۔ اھ

(اشرف علی)

دو أالضيق

ناگواری کے علاج کے متعلق یہ وعظ ایک صدمات کی ماری بیوہ کی فرمائش پر کانپور میں حاجی محمد سعید صاحب کے متعلق پر ۱۲ محرم ۳۴ھ بروز یکشنبہ بیٹھ کر فرمایا جو تین گھنٹے ۴۵ منٹ میں ختم ہوا۔ ۲۰۰ زن و مرد تھے۔ مولوی عبد الحلیم صاحب لکھنوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمْ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.
وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (پ ۱۴)
(سورۃ الحجر آیت نمبر ۹۷ تا نمبر ۹۹)

(ترجمہ: یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں اس سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تنگ دل ہوتے ہیں پس اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید کرتے رہیے اور نماز پڑھنے والوں میں رہیے اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہیے یہاں تک کہ موت آ جائے)

انسان کا طبعی تقاضا

یہ ایک مختصر سی آیت ہے سورۂ حجر کے اخیر کی۔ اس میں حق تعالیٰ نے ایک حالت ناگوار کا علاج بتلایا ہے کہ جس کی ضرورت کم وبیش سب ہی کو واقع ہوتی ہے اسی واسطے اس وقت اس کو اختیار کیا گیا ہے۔ جی ہمیشہ یہ چاہا کرتا ہے کہ ضروری مضمون جس کا وقوع بکثرت ہو بیان کیا جایا

کرے۔ چنانچہ ان حالات میں سے ایک خاص حالت ہے جو سب حالتوں سے کسی قدر زیادہ پیش آتی ہے۔اس کا چونکہ اس آیت میں علاج بتلایا گیا ہے اس لئے اس آیت کو اختیار کیا گیا۔ تا کہ لوگ اپنے اس مرض کی دوا معلوم کر کے اسکا ازالہ کرلیں اور اپنی حالتوں کو درست بنالیں اور وہ حالت ضیق یعنی تنگی کی حالت ہے اور اس کا پیش آنا سب پر ظاہر ہے۔جس کا سبب خلاف طبیعت امور کا پیش آنا ہے یعنی جو خواہش یا جو مذاق جس کا ہے۔ ہر واقعہ اس کے موافق نہیں ہوتا کثرت سے واقعات خلاف طبیعت پیش آتے ہیں اور ہر شخص کو ایسے امور پیش آتے ہیں کیونکہ انسان بہت سے تقاضوں میں گھرا ہوا ہے کہ ان سے باہر نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ انسان کا طبعی تقاضا ہے کہ میں خوش رہوں۔ ہمیشہ تندرست رہوں مگر اس میں اس کو کامیابی نہیں ہوتی۔غم میں بھی مبتلا ہوتا ہے مرض میں بھی لاحق ہوتا ہے مرض میں بھی لاحق ہوتا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ سب مجھ سے موافقت کریں۔ مگر بہت سے مخالفت بھی کرتے ہیں۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ کثرت سے مال ہو۔ مگر بعض اوقات بقدر حاجت بھی نہیں ہوتا۔ اور جن کے پاس ہوتا بھی ہے تو ہوس آگے ہوتی ہے کہ اور ہو۔

بہر حال گو خاص حالت یا خاص سبب سب مشترک نہ ہو یہ امر سب میں مشترک ہے کہ خلاف مزاج امور پیش آتے ہیں۔ مثلاً انسان کب یہ چاہتا ہے کہ عزیز گم ہو جاویں مگر کم ہو جاتے ہیں۔ ایسے امور کی حق تعالیٰ نے ایک مختصر فہرست ارشاد فرمائی ہے فرماتے ہیں:

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ الآية (پ ۲)

ترجمہ یہ ہے کہ ہم ضرور امتحان کریں گے خوف سے مثلاً حاکم مخالف کا اندیشہ، دشمن کا دباؤ وغیرہ وغیرہ اور بھوک سے فقر وفاقہ سے جو نادار ہیں۔ ان کے تو بھوک لگا ہی کرتی ہے۔ فاقہ کی نوبت آتی ہی ہے۔

مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو بھوک کا اثر نہ ہو۔ جو بڑے بڑے مالدار صاحب ریاست ہیں انکو بھی یہ نعمت میسر ہو جاتی ہے۔ مثلاً سفر میں ہوں اور کھانا ختم ہو جاوے اور ملے نہیں اور کسی خشک مزاج کو یہ شبہ نہ ہو کہ آج کل تو سفر میں کھانے کی تکلیف ہو ہی نہیں سکتی۔ ہر مقام پر مکان سے زیادہ اسباب راحت موجود ہیں کیونکہ یہاں وہ حالت سفر کی مراد ہے کہ جس میں کھانا میسر نہ آئے عام اس سے کہ ریل کا سفر ہو یا جنگل۔ اور حضرت ریل تو کیا خدائے کارساز کی وہ قدرت ہے کہ امراء نے گھر بیٹھے بھوک سے بیتاب ہو کر جان بحق تسلیم کی ہے۔

دولت کی خاصیت

کسی متمول کی حکایت ہے کہ ایک شخص نے اخبار سے نقل کی تھی کہ اس کے تہ خانہ میں جو کہ اندر ہی اندر دور دراز تک چلا گیا تھا۔ سونے کے ستون پڑے تھے ہر ہفتہ کو وہاں کے معائنہ کو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ حسب معمول گیا اور گھوڑا قریب ہی باندھ کر اندر گیا کسی وجہ سے گھوڑا بدکا اور تڑ پھڑا کر بھاگ گیا جب خزانچی آیا اور گھوڑے کو نہ پایا تو یہ سمجھ کر کہ امیر صاحب واپس تشریف لے گئے ہوں گے قفل ڈال دیا۔ حالانکہ وہ وہاں سے بہت آگے گئے تھا۔ واپس ہونا چاہا تو قفل بند دروازہ باہر کا بڑی دور جہاں آواز بھی نہ جا سکتی تھی۔ اس وقت وہ حسرت کی نظروں سے سونے کے ستونوں کو دیکھتا تھا کہ کچھ کام نہیں آتے کئی روز بھوکے رہ کر ختم ہو گئے۔ نیز ہمیشہ ہر کوئی ریل ہی میں تھوڑا سفر کرتا ہے۔

تو مثلاً سفر میں کھانا ختم ہو جائے اور نہ ملے؟

گلستاں کی حکایت مشہور ہے کہ ایک شخص جنگل میں چلا جاتا تھا کسی ایسے مقام پر اس کا توشہ ختم ہو گیا کہ جہاں سے آبادی بہت دور تھی بے چارہ ادھر ادھر پھرا کہیں کوئی چیز کھانے کو نہیں ملی۔ آخر میں آکر پڑ رہا اور زمین پر جو روپے اس کے پاس تھے رکھ کر یہ مضمون انگلی سے لکھا

در بیاباں غریب سوختہ راہ — شلغم پختہ بہ زنقرۂ خام

جنگل میں دل جلے مسافر کو پکے ہوئے شلغم خالص چاندی سے زیادہ بہتر ہے۔''

تو روپیہ پیسہ تو کھانے کے بھی کام نہیں آتا۔ اس کی عجیب خاصیت ہے کہ جب تک جدا نہ ہو کبھی کام نہ آوے۔ دوستی کا مقتضی یہ تھا کہ اجتماع ہو مگر یہ ساتھ رہ کر کبھی کام نہیں آتا یعنی جب اس کو پاس سے جدا کر دو۔

بہر حال ایسی چیز دوستی کے قابل نہیں کہ آپ کی دشمن اور آپ اس کے مشتاق۔ دوست وہ ہے جس کی شان یہ ہے۔ ؎ ما با و محتاج بودیم او بما مشتاق بود

بہر حال روپیہ چاہے کتنا ہی ہو مگر جب وقت پر کھانا بھی نہ میسر ہو تو بھوک تو سب کو ہی چکھنا پڑے گی۔

ونقص من الاموال اور مال کے نقصان سے مثلاً تجارت کی تھی اس میں نقصان ہوا۔ برف تھی گل گئی یا چور لے گئے۔ بہر حال نقص عام ہے۔

والانفس بیمار ہو گیا۔ والثمرت پھلوں کا گھٹنا۔ یا تو یہ کہ باغ میں پھل ہی نہ آیا۔ مگر کسی وجہ سے ہلاک ہو گیا یا اولاد نہ ہوئی یا ہوئی اور مر گئی۔

بہر حال یہ مختصر فہرست ارشاد فرمائی ہے ان واقعات کی جو ناگوار ہیں۔

مشابہت ومناسبت

گو ناگواری کا پیش آنا بھی رحمت ہے حق تعالیٰ کی کہ اگر ناگواریاں نہ پیش آئیں تو اجر وصبر نہ میسر ہوتا کیونکہ اگر ناگواری نہ پیش آتی تو صبر کی ماہیت جو حبس النفس علیٰ ما تکرھہ ہے کہاں سے متحقق ہوتی اور جب یہ متحقق نہ ہوتی ہم بہت بڑے ثواب سے محروم رہتے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اولیاء کو بوجہ مشاہدہ اس رحمت کے، ناگوار طبعی ہوتا ہے ناگوار عقلی نہیں ہوتا۔ ہاں صدمہ ہوتا ہے۔ مگر یہ منافی رضا کے نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحب زادے ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ایک صحابیؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ آپ روتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہ رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے۔

ایک اور حکایت یاد آئی۔ ایک بزرگ کے بیٹے کا انتقال ہوا تو وہ ہنس پڑے اور ایک ایسے بزرگ فرض کئے جائیں کہ وہ اس حالت میں رونے لگیں دونوں کی بڑی فضیلت ہے مگر یہ کہا جائے گا کہ رونے والے میں کمال اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھا۔ تو بزرگوں کی حالت میں اس قسم کا تفاوت ہوتا ہے۔

کسی شخص نے اپنے پیر سے کہا کہ بزرگوں کی حالت کیسے مختلف ہوتی ہے پیر نے کہا کہ فلاں مسجد میں تین بزرگ بیٹھے ہیں وہاں جا کر ان کے ایک ایک طمانچہ مار کر دیکھ لو۔ چنانچہ سائل مسجد میں گئے۔ ہر ایک کے ایک ایک طمانچہ مارا ایک نے تو اٹھ کر اتنے زور سے اس کو طمانچہ مار لیا اور چپکے جا بیٹھے ایک نے خیال بھی نہ کیا۔ اور ایک نے الٹا اس کے ہاتھ کو دبانا شروع کیا کہ تیرے چوٹ لگی ہوگی۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں سے صاحب زادے کے انتقال پر آنسو جاری ہو گئے تھے اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ حضور کو رضا حاصل نہ تھی۔ اور یہ حدیث صحیح ہے راوی اس کے سب ثقہ ہیں۔ تو اس میں کسی طرح کا کلام نہیں ہوسکتا۔ اور بظاہر نظر ناواقف کو یہ حالت گھٹی ہوئی معلوم ہو سکتی ہے۔ مگر وجہ صرف یہ ہے کہ فن سے واقفیت نہیں۔ پس اس فن کے جاننے کی ضرورت ہے۔ نہ جاننے کی وجہ سے جو سنا اور جو چاہا سمجھ لیا۔ اور اسی سے غلطی ہوتی ہے۔ مگر اس فن کے حاصل کرنے کی طرف اصلاً توجہ نہیں۔ طلبہ سے تعجب ہے کہ صرف ونحو میں تمام تمام عمریں صرف کر دیتے ہیں مگر اس فن کے لئے تھوڑے دن بھی صرف کرنا ضائع سمجھتے ہیں۔ حالانکہ درسیات سے بھی یہی مقصود ہے فرماتے ہیں۔

سیپارۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست ۔۔۔ در کنز و ہدایہ نتواں یافت خدارا

''کنز اور ہدایہ میں خدا نہیں پایا جا سکتا۔ دل کے سیپارے میں دیکھو کہ اس سے اچھی اور کوئی کتاب نہیں۔'' اور

چند چند از حکمت یونانیاں　　　　حکمت ایمانیاں راہم نجواں

''یونانیاں کی حکمت کب تک دیکھتے رہو گے۔ ایمان والوں کی حکمت بھی پڑھو۔''

صرف شد عمرت بہ بحث نحو و صرف　　　　از کتابِ عشق خواں ہم یک دو حرف

''تیری عمر صرف ونحو کی بحث میں صرف ہوگئی۔ کتاب عشق کے دو چار حرف بھی پڑھ دیکھ۔''

تو اخلاق کے حقائق ہی نہیں معلوم۔ خیر! اگر تفصیل نہیں معلوم ہے تو اتنا تو معلوم ہے کہ حضورؐ سب سے افضل ہیں۔ اور ہر حالت آپ کی افضل تھی تو جس کی حالت حضورؐ کے مشابہ ہوگی وہ ضرور افضل ہوگا کیونکہ اس نے دامن اقتداء کو مضبوط پکڑ لیا۔ مگر مساوات نہ سمجھئے گا۔ تو وہ حالت مشابہ ہوگی نہ کہ مساوی۔

پس اہل کمال کے فیوض و احوال حضورؐ کے فیوض سے صرف مشابہت و مناسبت رکھتے ہیں اور مساوی کہنا جہل اور گمراہی ہے۔ سو جن کو مشابہت کامل ہے ان کا ادراک کامل ہے۔ وہ ہر واقعہ سے پورے متاثر ہوتے ہیں۔

چنانچہ جب حضرت ابراہیم کے انتقال کا وقت ہوا تو آپ کے آنسو ٹپک پڑے۔ یہ اثر تھا شفقت پدری کا۔ کیونکہ یہاں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اولاد مر گئی اور ایک یہ کہ اس امر کو خدا نے واقع کیا۔ تو یہاں دو حق ہوئے ایک اولاد کا اور ایک خدا تعالیٰ کا۔

پس کمال یہ ہے کہ دونوں کے حقوق ادا کیے۔ بیٹے کی محبت کی وجہ سے تو آنسو ٹپک پڑے اور متاثر ہوئے مگر نہ اس قدر کہ جزع و فزع کی نوبت پہنچتی جس سے خدا کا حق فوت ہوتا۔ تو حق کی رضا کو بھی ساتھ لئے رہے اور بیٹے کی محبت کا حق بھی ادا کیا۔ تو دونوں کو جمع کر دکھایا۔

جیسا خدا تعالیٰ نے ایک مخلوق ملائکہ کی پیدا کی ہے جن کی خلقت میں دو چیزوں کو جمع کیا ہے یعنی انکا نصف بدن برف کا ہے اور نصف آگ کا اور انکی یہ تسبیح ہے۔

سبحان الذین جمع بین الثلج و النار

تو یہ شان یہاں بھی موجود ہے کہ غم کی آگ، رضا کی ٹھنڈک نہ وہ غالب نہ یہ زائل! تو پورے حقوق ادا کرنا بڑا کمال ہے۔ غیر کاملین پورے حقوق ادا نہیں کرتے۔

جذبات کی حکمت

دوسرے صبر کی فضیلت بھی تو جب ہی حاصل ہوسکتی ہے کہ جب دل کو لگ جاوے۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جذبات پیدا کئے ہیں سب میں حکمت رکھی ہے مثلاً غضب میں یہ حکمت ہے کہ عفو کی فضیلت ہمیں حاصل ہو فرماتے ہیں

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (پ ۴)

(اور وہ غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں)

تو عفو بھی بہت بڑی فضیلت ہے۔ اگر غضب نہ ہوتا اس سے محروم رہتے۔ پس نہ یہ فضیلت ہے کہ بالکل ہی غصہ نہ آوے اور نہ یہ فضیلت ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں میں خفا ہو جائیں تحمل وعفو جانتے ہی نہ ہوں فضیلت تو یہ ہے کہ اذا ما غضبوا هم يغفرون (پ ۲۵) (اور جب غضبناک ہوتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں)۔ مگر یہ واضح رہے کہ عفو اور تحمل کے مواقع ہیں ہر محل وموقع میں نہ غضب مناسب ہے اور نہ عفو ہی بلکہ جو محل عفو کا ہے وہاں عفو کرنا چاہئے اور جو موقع غضب کا ہے وہاں غضب نافع ہے۔ اس زمانہ کے صوفیاء اس میں تمیز نہیں کرتے۔ ایک ملکہ کو نہ بالکل ہی فنا کردیں اور نہ اس کو امام مطلق ہی بنادیں۔

اگر کسی کے پاس سنکھیا ہو تدبیر سے وہ بھی کارآمد ہے ساری خرابی یہ ہے کہ فن ناقصوں کے ہاتھ آ گیا۔ جیسا ایک بڑھیا کے مکان میں شاہی باز آ گرا تھا اس نے دیکھا کہ اس کی چونچ ٹیڑھی ہے۔ یہ کھاتا کیسے ہوگا۔ اس کے پنجے مڑے ہیں یہ چلتا کیسے ہوگا۔

غرض اس بڑھیا کو اس باز کی حالت پر بہت رحم آیا اور قینچی لے کر باز کے پنجے اور چونچ بازو وغیرہ کاٹ ڈالے اور اس کو مضغہ گوشت بنادیا۔

اس زمانہ کے رسمی پیر و مرید بھی اس بڑھیا سے کم نہیں کہ تمام عالم کو تہس نہس اور برباد کرتے پھرتے ہیں۔ بڑا اولیاء اللہ وہ مرید شمار ہوتا ہے کہ جس کو اپنے بیوی بچوں کی خبر اور پرواہ نہ ہو۔ مگر فی الحقیقت یہ شخص بڑا مخالف ہے خدا کا۔ حضور تو یہ کریں کہ خطبہ چھوڑ کر حسنؓ کو گود میں اٹھالیں اور یہ منہ بھی نہیں دیکھتے۔ بلکہ دیکھنا گناہ سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یا تو مسئلہ سے بے خبری ہے یا اس کی حالت ناقص خیال کرتے ہیں ایک جہل ہے ایک کفر۔

بہر حال غضب بھی ضروری ہے اپنے موقع پر اور بخل بھی ضروری ہے مثلاً ایک شخص اس لئے

رقم مانگے کہ بھنگ پیوں گا۔ ناچ کراؤں گا۔ یہاں بخل کی ضرورت ہے۔ پس بخل بھی جب بے موقع ہوگا تب تو مذموم ہوگا اور نہ محمود خوب سمجھ لیجئے مولانا فرماتے ہیں۔

شہوت دنیا مثال گلخن است　　　　که ازو حمام تقوی روشن است

دنیا کی خواہش بھٹی کی طرح ہے جس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے۔

یہ جو خواہشیں ہیں ایندھن ہیں کہ ان سے تقویٰ کا حمام روشن ہے اگر شہوت کا تقاضا نہ ہو تو تقویٰ کیا۔ مولانا نے اس شہوت کو بھی کمال بتلایا ہے کہ جس کی قوت شہویہ جس قدر بڑھی ہو اور وہ رکے بس وہ کامل ہے کہ

شہوت دنیا مثلا گلخن است　　　　که ازو حمام تقوی روشن است

(دنیا کی خواہش بھٹی کی طرح ہے جس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے)

دین اور عقل

اس سے وہ مسئلہ بھی حل ہوگیا کہ کوئی چیز بیکار نہیں۔ لیجئے جس کو قمت کہتے ہیں کہ وہ سبب رحمت کا ہوا۔ اسی طرح صبر کی فضیلت ناگواری ہی کی وجہ سے میسر آتی ہے۔ پس موت پر طبعی ناگواری ہونا تو حق اولاد کا ہے اور روحانی ناگواری نہ ہونا رضائے حق کا حق ہے تو حضورؐ نے دونوں حق ادا کئے۔ غالب کا غالب، مغلوب کا مغلوب، یہی عدل ہے۔ تو اولیاء میں بھی کاملین وہی ہیں جو حضورؐ کا وصف لئے ہوئے ہوں۔

اس سے یہ بھی سمجھ لیجئے کہ حضورؐ نے نہ کبھی کپڑے پھاڑے نہ جنگل میں بھاگے حضورؐ کے یہاں امور خانہ داری کا بھی پورا پورا انتظام اور سلطنت کا بھی اور انتظام بھی وہ جس کی نظیر نہیں ہو سکتی۔ امور خانہ داری کا وہ انتظام کہ آج ہر شخص اسی کا خوشہ چین ہے۔ غرض کہ حضورؐ کے یہاں ہر ایک امر کا انتظام تھا۔ آپ نے بول و براز تک کے لئے قانون بتلائے ہیں۔

آج کل پیروں کا بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ فلاں شاہ نے ایک ضرب لگائی اور ہو کہا بس گر پڑے۔ لو صاحب! بس یہ پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ مگر حقیقت میں اگر اس کا نام بزرگی ہے تو کوئی نبی بزرگ ہی نہیں ہوا۔ کیونکہ انبیاء مغلوب الحال نہیں ہوتے تھے۔ ان کو وہ وجد نہیں آتا تھا کہ جس میں کپڑے پھاڑ ڈالیں۔ دنیاوی امور میں وہ بالکل عوام کے مشابہ ہوتے تھے۔ پس یہ امور لوازم بزرگی سے نہیں۔ ہاں اگر تصنع سے نہ ہوں، تو بزرگی کے منافع بھی نہیں۔

چنانچہ بزرگ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک ابن الحال اور ایک ابوالحال.....ابوالحال تو اپنے حال پر غالب رہتے ہیں۔ اور ابن الحال مغلوب ہوتے ہیں خلقت سے بھاگتے ہیں کہ کپڑے پھاڑتے ہیں۔ ہاں خلاف شریعت قصداً نہیں کرتے اور ان دونوں قسموں میں زیادہ کامل ابوالحال ہوتے ہیں مگر آج کل لوگ غالب الحال بزرگوں کو ہی نہیں سمجھتے جیسا کہ انبیاء کو ان کے زمانہ کے لوگ سمجھتے تھے چنانچہ کفار عرب کہا کرتے تھے۔

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ. لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا اَوْ يُلْقٰى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْتَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا(پ ۱۸)

"یہ کیسے اللہ کے اور پیارے رسول ہیں کہ کھانا بھی کھاتے ہیں۔ بازار میں چلتے پھرتے ہیں۔ ان پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا کہ ان کی ضروریات منصبی میں مدد کرتا یا ان کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں دیا گیا یا باغ ان کو کیوں نہ دے دیا گیا جس سے کھاتے پیتے۔ یہ تو ہم سے بھی زیادہ محتاج ہیں۔

آج کل بھی جو بزرگ ایسی شان رکھتے ہیں ان کو بزرگ نہیں سمجھتے۔ بلکہ اب تو ایسے شخص کو زیادہ بزرگ سمجھتے ہیں جس کو عقل تک بھی نہ ہو۔ حالانکہ دین میں عقل زیادہ کارآمد و نافع ہے کیونکہ اس کا فعل ہے انجام اندیشی۔ مگر صرف عاجل کی نہیں بلکہ آجل کے لوگ۔ انجام کے معنی یہ بھی نہیں سمجھتے۔

انجام اندیشی

انجام اندیشی یہ نہیں کہ ایک ہفتہ کا نرخ دیکھ کر کلکتہ سے مال منگالیں بلکہ انجام اندیشی یہ ہے کہ احقر نے ایک بار سہارنپور میں سے گنے لئے۔ اسٹیشن پر جا کر بابو سے کہا کہ انہیں وزن کر کے محصول لے لو۔ اس نے کہا لے جاؤ ہم گارڈ سے کہہ دیں گے۔ میں نے کہا وہ گارڈ کہاں تک جاوے گا کہا غازی آباد تک۔ میں نے کہا اس کے آگے کیا ہوگا کہنے لگا وہ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا۔ میں نے کہا وہ کہاں تک جاوے گا اس نے کہا کانپور تک۔ میں نے کہا اس کے آگے کیا ہوگا اس نے کہا بس کانپور تو جانا ہی ہے۔ میں نے کہا نہیں بلکہ اس کے آگے پھر ایک جگہ جانا ہے (اللہ کے یہاں) وہاں کون سا گارڈ ہوگا؟ تو وہ ہندو بابو سناٹے میں آ گیا اور اس پر بہت ہی اثر ہوا۔ بس پھر کسی نے کچھ نہیں کہا ایک روپیہ وزن کرا کے دے دیا۔ اب ان شاء اللہ وہاں سے بے فکری ہے ہم نے جو حکم تھا کر دیا۔

غرض یہ ہے انجام اندیشی اور وہ انجام جس کو آپ سمجھے ہوئے ہیں وہ نہیں ہے۔ لوگوں نے انجام میں تعلیل کر لی ہے کہ م کو بدل لیان سے یعنی انجان۔ غرض عقل کا کام ہے انجام اندیشی اور اس کی ضرورت خصوصیت کے ساتھ دین میں جس قدر ہے ظاہر ہے۔

پس کم عقل زیادہ بزرگ ہوگا یا عاقل۔ انبیاء کو ہی دیکھ لو کہ ان کو وہ عقل عطا ہوئی ہے کہ نہ کسی دنیادار کو نہ کسی دیندار کو ویسی عقل ملی۔ پس جن کے احوال زیادہ مشابہ ہوں گے۔ انبیاء علیہم السلام کے خصوص حضورؐ کے وہی زیادہ بزرگ ہوں گے البتہ بعض بزرگ بھولے بھی ہوتے ہیں۔ مگر بھولا ہونا لوازم بزرگی سے نہیں گو منافی بھی نہیں مگر نفع زیادہ بھولے سے نہیں ہوتا ہاں چاہے بھولا خود مقبول ہو کیونکہ۔

پیا جس کو چاہے وہی سہاگن ہوئے

بعضے اس مذاق کے بھی ہوئے ہیں کہ نفع سے بحث نہیں چنانچہ احمد جام فرماتے ہیں۔

احمد تو عاشقی بمشیخت تراچہ کار　　　دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

اے احمد جام! تم عاشق ہو۔ تمہیں شیخ بننے سے کام ہی کیا ہے دیوانے بن جاؤ سلسلہ چلا... چلا... نہ چلا... نہ چلا۔

مگر انبیاء نے سلسلہ بڑھانے کی کوشش فرمائی۔ بہر حال واقع میں خواہ یہ حالت بھی کامل ہو مگر انفع وہی ہوگا جو عاقل کامل ہوگا۔ پس انبیاء عاقل تھے اور میں اسی کو ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ انبیاء بھولے نہیں تھے۔ سب تعلقات کے حقوق پورے ادا فرماتے تھے۔ اولاد کا بھی، حق تعالیٰ کا بھی، یہی شان مومن کامل کی ہوتی ہے کہ اسکو ناگواری ہوتی ہے مگر وہ ناگواری سے مغلوب نہیں ہوتا۔

خلاصہ مقام یہ تھا کہ ناگواری ہر شخص کو پیش آتی ہے اور بیچ میں مضمون بڑھ گیا مگر ہیں سب مفید باتیں۔ مقصود یہ ہے کہ سب کو ناگواری پیش آتی ہے اور اس پر صبر کرنے سے ثواب عظیم ملتا ہے تو ناگواری بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے۔ دیکھئے لوگ کہتے ہیں کہ لا تقنطوا من رحمة الله سے رحمت ثابت ہوتی ہے۔

شریعت اور رحمت

مجھ کو تو ہر آیت میں رحمت ہر حکم میں رحمت نظر آتی ہے۔ اگر شریعت کے ہر ایک برتاؤ کو غور سے دیکھیں تو ہر ایک میں رحمت پائی جاوے گی۔ اور یہ میری من گھڑت نہیں بلکہ سلف کے اقوال اسکے مؤید ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ سب سے بڑی آیت رحمت کی آیت مدانیت ہے کہ آپس میں کالین دین لکھ لیا کرو۔ وجہ دلالت یہ کہ حق تعالیٰ کو جب ہمارا دنیا کا نقصان گوارا نہیں تو اخروی نقصان کو کب گوارا فرمائیں گے لکھنا مشروع فرمایا۔ تاکہ چار پیسہ کی بھی بھول نہ ہو کہ نقصان اٹھانا پڑے ایک لمبی آیت رکوع کا رکوع اسی قانون میں نازل فرمایا تو ہمارا چار پیسہ کا نقصان بھی گوارا نہیں یہ کتنی بڑی رحمت اور محبت ہے۔

جیسے اس باپ کو کتنی محبت ہوگی کہ بیٹے کو ٹھیکرے جمع کرنے سے نہیں روکتا کہ روئے گا۔ حالانکہ ٹھیکرے رونے کے قابل نہیں۔ ۲واللہ دنیاوی متاع تو ٹھیکروں سے بھی کمتر ہے بلکہ مچھر کے بازو کے برابر بھی اس کی قدر اللہ کے نزدیک نہیں۔ اگر اتنی بھی قدر ہوتی تو کسی کامل سے بڑھ کر کوئی دوسرا مالدار نہ ہوتا اور نافرمان کو ایک گھونٹ بھی پانی کا نہ ملتا کہ محبوب چیز مبغوض کو نہیں دی جاتی۔

اس سے ثابت ہوا کہ مال دنیا حق تعالیٰ کو فی نفسہٖ مبغوض ہے اگر معین دین ہونے کے سبب عارضی محبت ہو جیسے محبوبیت سنکھیا کی کہ کسی دوا کا جز ہے لہذا قابل خریداری ہے۔ جب یہ بات ہے تو جب معین دین ہوگا۔ ورنہ مبغوض ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ اپنے محبوبوں کو کم (یعنی حسب ضرورت) دیتے ہیں اور یہ عین رحمت ہے کہ خدا ضرورت کے موافق دے کہ عصمت بحالہ رہے اور انہماک فی الدنیا نہ ہو کیونکہ اگر ان کو زیادہ مال و متاع ملے تو آخر ان کے بھی پیچھے حرص کا جال بچھا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں کو زیادہ دیتا ہی نہیں تا کہ انہماک فی الدنیا نہ ہو اور جس کا مرتبہ عنداللہ جس قدر بڑھا ہوا ہے اور جو زیادہ محبوب ہے اس کو اسی قدر دنیا سے کم حصہ ملتا ہے چنانچہ اسی سبب سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے کم دنیا دی گئی۔

انبیاء اور معجزے

کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ حضرت سلیمانؑ کو ساری دنیا کا مالک اور اتنا بڑا بادشاہ بنایا تھا کہ آج تک کسی کو ان کا نظیر نہیں بنایا کیونکہ وہ ان اموال سے متمول اور ان کے مالک نہ تھے بلکہ ان کے خازن محض تھے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ یہ آپ کا معجزہ تھا کیونکہ معجزہ ہر نبی کو اس زمانے کے موافق عطا ہوتا ہے یعنی جس زمانہ میں جس بات کا زور ہوتا ہے اسی قبیل کا معجزہ اسی قوم کے نبی کو دیا جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں سحر کا بڑا زور تھا تو حضرت موسیٰؑ کو وہ وہ معجزے عطا کئے گئے کہ جس سے اہل سحر متحیر و عاجز ہو گئے اور ناچار آپ کو رسول برحق ماننا پڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب کا بڑا زور تھا اس لئے حضرت عیسیٰؑ کو دم سے مردہ زندہ کر دینے کا معجزہ عنایت ہوا لاعلاج برص والے کو دم کے دم اچھا کر دیتے۔

زمانہ بھر کا مسلم ہے کہ مادرزاد نابینا بینا کسی دوا سے بھی نہ ہو سکتا۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کو بھی بحکم خداوندی بینا کر دیتے تھے۔

چونکہ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں حکومت اور سلطنت کا زور تھا کہ ہر بادشاہ اپنی طاقت وخدا داد قوت پر مغرور تھا اپنے اس زور وقوت پر مغرور ہو بیٹھے تھے خدائی اور آسمانی احکام بالکل نسیاً منسیا ہو چکے تھے۔ اس زمانہ میں جب سلیمانؑ کو نبی برحق بنا کر بھیجا گیا تو ان کو ایسا زبردست بادشاہ بنایا گیا کہ جس کو دیکھ کر وہ لوگ اپنی طاقت وزور سب بھول گئے اور سر تسلیم خم کرتے ہی بن پڑا۔

باقی یہ بات کہ ہر نبی کو وہی معجزہ کیوں دیا جاتا ہے جس میں اسکی قوم کو غلو ہو۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ جس امر کا جس زمانہ میں غلبہ ہوتا ہے اس کی معرفت ان لوگوں کو زیادہ ہوتی ہے اور جس قدر معرفت زیادہ ہوتی ہے اس کی حد مقدوریت زیادہ معلوم ہوتی ہے جب معجزہ اس حد سے آگے ہوگا اس کے اعجاز کو بھی وہ لوگ خوب سمجھیں گے اور جو مصلحت ہے معجزہ کی وہ خوب ظاہر ہوگی۔ پس حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسی قوت کی سلطنت دی گئی تا کہ بمقابلہ دوسرے سلاطین کے یہ بات ظاہر ہو جاوے کہ سلاطین کتنے ہی بڑھ جائیں ساری دنیا غرب سے شرق تک کے مالک ہوجائیں کتنے ہی ریلوے انجن موٹر کار وغیرہ نکالیں مگر جن اور طیور پر کہاں سے حاکم بنیں گے۔ ان کی زبانیں کیسے معلوم کریں گے۔ ہوا کو کیونکر ایسا تابع بنائیں گے کہ صرف زبان ہلانے سے وہ کام کرنے لگے۔

اور حضرت سلیمانؑ کو ان چیزوں پر حاکم بنایا۔ سب کو ان کے قبضہ میں دیا

پس اس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ معجزہ ہے............

حاصل یہ کہ سلطنت ان کو اس غرض سے دی گئی تھی جو مذکور ہوئی پس وہ خازن محض تھے اس ملک سے متمول نہ ہو گئے تھے چنانچہ لکھتے ہیں۔

زاں سلیمانؑ خویش را مسکین بخواند (اسی طرح خود حضرت سلیمان علیہ السلام کو مسکین سمجھو)

قرآن بھی اس تقریر کا موید ہے چنانچہ ایک مقام پر فرمایا کہ داؤد کو ہم نے سلطنت دی اور سلطنت بھی چھوٹی نہیں بلکہ ملک عظیم عطا فرمایا چنانچہ ارشاد ہے وشددنا ملکہ (پ ۲۳) اور باوجود اس کے دوسری جگہ ان کے ہی قصہ میں فرمایا کہ ہم نے ان کو زرہ بنانے کا حکم دیا۔ اگر کہئیے کہ زرہ بنانا۔ ایک صنعت تھی جن کو انہوں نے سیکھ لیا تھا۔ باقی کھاتے پیتے سلطنت سے تھے تو یہ بھی نہ تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وکان یاکل من عمل یدیہ کہ اپنی دستکاری سے اپنے حوائج پوری کرتے تھے۔

صاحبو! یہ ان کی سلطنت تھی کہ صاحب سلطنت ہو کر ان کی غذا جو کی روٹی ہوتی تھی اور یہ شان سوائے کاملین اور انبیاء کے دوسرے کی نہیں ہوسکتی کہ سلطنت بھی کریں اور جو کی روٹی بھی کھائیں۔ اس لئے ان کی سلطنت سے اپنے لئے ترقی کی ہوس کا سہارا مت ڈھونڈنا۔

امور دنیا اور اعتدال

اس سے ایک غلطی اور رفع ہوئی کہ اب جو لوگوں نے بزرگی کے معنی کا حاصل زہد خشک نکالا ہے کہ.... مررہو، بیوی بچے سب چھوڑو۔ گھر سے منہ موڑو۔ یہ کوئی بزرگی نہیں۔ زرہ بنا کر اس سے گزارا کرنے سے تو اس کی ممانعت نکلتی ہے۔ ہاں ترقی دنیا و جشن نہیں نکلتا کیونکہ اعمل سابغات کے ساتھ ہی واعملوا صالحا بھی ارشاد فرمایا ہے مگر آپ نے خوب عمل کیا اعملوا صالحا کو اڑا ہی دیا جس طرح کسی بسیار خور نے کلوا واشربوا پر عمل کیا تھا۔ دعا بھی قرآن میں منتخب کی تو صرف رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ۔ (پ ۷) غرض یہ کہ مطلب کی سب باتیں لے لیں۔

بہرحال خدا نے دنیا کے کام سے ممانعت نہیں فرمائی۔ ہاں اس میں اعتدال کا حکم ہے کہ منہمک اور مشغول نہ ہو۔ اسی استعمال معتدل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سائل کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ان اللہ جمیل و یحب الجمال (الصحیح لمسلم کتاب الایمان:۱۴۷)

سائل نے پوچھا تھا کہ احب ان یکون نعلی حسنا وثوبی حسناً ایکون ھذا من الکبر۔ حاصل جواب یہ مطلب نہیں کہ خدا تو دے عمدہ اور پاکیزہ کھانا کپڑا اور تم وہی سڑی ہوئی پوشاک اور بھسا ہوا کھانا کھاؤ یہ بے نفسی نہیں بدتمیزی ہے۔ ہاں حد اعتدال سے آگے قدم نہ رکھو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتدال دیکھئے کہ فرماتے ہیں ان اللہ یحب الناظفة اور ایک جگہ فرماتے ہیں البذاذة من الایمان یعنی ...... سادگی رکھو نہ میلا پن اور نہ تکلف یعنی نہ کرو بغیر صابن میاں کا منہ ہی نہ دھلے بغیر آئینہ عمامہ ہی نہ باندھا جائے کہ کہیں ٹیڑھا نہ ہو جائے۔ کہ یہ تکلف ہے۔ جس سے بعض وقت اوروں کو بھی سخت تکلیف ہوتی ہے۔

چنانچہ فقہاء نے بدبودار کپڑے پہن کر یا بدبودار شے مثل پیاز لہسن کے کھا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا ہے کہ ایسے لوگ جماعت میں نہ شریک ہوں۔ کتنا بڑا حرمان ہے کہ فضیلت جماعت سے بھی محروم رہے۔

صاحبو! علماء نے حقیقت کو سمجھا ہے جمعہ کو نہانا۔ بدن صاف کرنا۔ کپڑے بدلنا ضروری قرار دیا لیکن یہ نہیں فرمایا کہ استری ہی کے کپڑے ہوں۔ صابن بھی ضرور ہوا گر دھوبی کے یہاں کے بھی نہ دھلے ہوں تو اپنے ہاتھ سے دھو کر صاف کر لئے جاویں پس حضورؐ نے اعتدال کی تعلیم فرمائی ہے۔

تو خدا نے انبیاء کو مال کا خازن بنایا ہے مالک نہیں بنایا اور اسی کا یہ اثر ہے جو فرمایا گیا ہے کہ نحن معاشر الانبیاء لا نرث ولانورث (البدایة والنہایة ۲:۱۵۴) یعنی ہم انبیاء کی

جماعت نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں نہ ہماری وراثت کسی کو ملتی ہے کیونکہ وراثت تو جب ملے کہ ہم پہلے مالک ہوں ہمارے پاس جو ہے وہ وقف ہے اور فقراء ومساکین کا حق ہے بس! حضورؐ کا یہ تمول تھا کہ آپؐ کے خاتمہ کے ساتھ ہی مال کا بھی ختم ہو گیا۔

موت اور مال

اس میں یہ بھی حکمت ہے کہ یہ ملک اموال دنیا کی ناقص ہے چنانچہ اس کا اثر مرض موت کے وقت ظاہر ہوتا ہے کہ ثلث سے زیادہ کی وصیت نہیں کرسکتا۔ پس عدم ملک کا اثر اسی وقت سے ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے مگر حالت صحت تک ہمارے ضعف کے سبب ہماری تسلی کی اصل سے عدول کیا گیا۔ چونکہ انبیاء میں یہ عارض نہیں۔ اسی لئے علی الاطلاق ان کے لئے اس اصل کو تجویز کیا گیا۔

نیز اس میں یہ بھی حکمت ہے کہ انبیاء کے ساتھ محبت فرض ہے اور محبت بغیر ایمان ہے نہیں۔ تو اگر میراث ملا کرتی تو شاید لوگوں کو میراث اور مال کی محبت میں انبیاء کی موت کی تمنا ہوتی جو خلاف محبت ہے اس لئے اس کی جڑ ہی کاٹ دی۔

اسی طرح لازمیں بھی یہی حکمت ہے کہ شاید کوئی عزیز واقارب معاملات تقسیم میں ان سے الجھتا۔ اس لئے یہ حکم قرار پایا کہ انبیاء نہ وارث ہوں کسی کے نہ ان کا کوئی وارث ہو اور جو کچھ چھوڑا جائے وہ صدقہ ہے چنانچہ ارشاد ہے ماترکنا فھو صدقة

غرض خدا تعالیٰ نے اس سے اپنے دوستوں کو بچایا ہے۔ تو باوجودیکہ دنیا ایسی مبغوض ہے مگر پھر بھی جب ہمارا چار پیسے کا نقصان بھی گوارا نہیں کیا کہ لکھ لیا کرو تو کیا رحمت ہے۔ اور لیجئے یہ کس قدر رحمت ہے کہ اگر کوئی مالک نصاب مقروض ہو تو حکم ہے کہ قرضہ پہلے ادا کرو۔ بندوں کا حق بندوں کو دو۔ ہم اپنا حق یعنی زکوٰۃ ساقط کرتے ہیں۔ انہیں دو ہمیں نہیں چاہئے۔

اللہ اکبر! اس قدر رحمت کہ بندوں کے سامنے اپنا حق معاف فرمادیا مگر ہر موقع کو اس پر قیاس نہ کیجئے کہ ہر جگہ حق اللہ کو حذف کر دیا جاوے کیونکہ جس موقع پر حق عبد مقدم ہے تو اس حیثیت سے نہیں کہ وہ حق مستقل ہے بلکہ اس حیثیت سے وہاں حق اللہ اس طرح ادا ہوتا ہے کہ اس حکم کو مانو۔ پس خواص اس حق عبد کو حق اللہ سمجھ کر بجالائے اور اس کے ضمن میں مخلوق کا حق بھی ادا کیا۔ پس ان کو تمام حقوق العباد میں اصل مطمح نظر حقوق اللہ ہی ہیں اور یہی شان ہوتی ہے عارفین کی کہ ان کی نظر میں مخلوق مراۃ جمال حق ہوتا ہے۔

واصل وشاغل کا فرق

اس کی مثال آئینہ کی سی ہے جو محبوب کے سامنے رکھا ہے کہ وہاں ایک دو عاشق بھی کھڑے ہیں اور ایک مشتری بھی ہے۔ یہ سب اس آئینہ کو دیکھ رہے ہیں مگر نظر میں دونوں کی وتفاوت ہے مشتری آئینہ کو من حیث ہو۔ مقصود دیکھ رہا ہے اور عاشق من حیث انه مراة للمقصود دیکھ رہا ہے۔ لوگ ان حضرات کی حالت سن کر تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ادھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شاغل۔ مگر مثال مذکور سے خوب سمجھ لو کہ ان کو مخلوق کی طرف نظر کرنا مانع نہیں ہوتا مشغولیت بحق سے۔

اس کی دوسری ایسی مثال ہے کہ کسی جماعت نے بادام بہت سے جمع کئے اور وہ روغن کے عاشق ہیں تو محلہ میں مشین ڈھونڈتے پھریں گے مگر مشین کے طالب نہیں ہیں۔ اسی طرح عارفین روغن معرفت کے عاشق ہیں اور مخلوق مشین ہے پس وہ اس مصنوع سے صانع کا روغن نکالتے ہیں اس مصنوع میں صانع کے مشاہدہ کی مثال میں ایک حکایت یاد آئی ہے کہ ایران کے شہزادہ نے ایک مصرع کہا کہ ؎ درابلق کسے کم دیدہ موجود (چتکبرا موتی کسی نے کم دیکھا ہوگا)

دوسرا مصرع نہ موزوں ہوسکا۔ شعراء سے کہا مگر چونکہ مضمون مہمل تھا کسی شاعر سے بھی موزوں نہ ہوا۔ دہلی بادشاہ کو لکھا کہ اس کا دوسرا مصرع موزوں کرا کے بھیج دیجئے۔ دہلی کے شعراء بھی نہ کر سکے۔ مگر زیب النساء ایک دن سرمہ لگا رہی تھی اتفاقاً آنسو ٹپک پڑے۔ تو دوسرا مصرع آنکھ دیکھ کر موزوں کر دیا کہ

درابلق کسے کم دیدہ موجود　　　　مگر اشک بتان سرمہ آلود

چتکبرا موتی کسی نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ صرف سرمہ لگانے والے محبوب کے آنسو ایسے ہوسکتے ہیں۔

اور بھیج دیا۔ وہاں سے خط آیا کہ شاعر کو یہاں بھیج دو اس کے جواب میں زیب النساء نے لکھا

درسخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل　　　　ہر کہ دیدن میل دارد درسخن بیند مرا

میں شعر وسخن میں اس طرح مخفی ہوں جیسے بوئے گل برگ گل میں جو مجھے دیکھنا چاہے وہ شعر وسخن ہی میں دیکھے۔

مخفی زیب النساء کا تخلص ہے۔ تو کیا آپ یہ تجویز کر سکتے ہیں مخفی کو تو سخن میں دیکھو اور ظاہر دیکھ نہ سکو اور خدا کو ظاہر دیکھ لو۔ کسی میں طاقت ہے بس سوا اس کے کچھ نہیں۔

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

(جو مجھے دیکھنا چاہے میرے کلام میں مجھے دیکھ لے)

فرماتے ہیں

چیست قرآن اے کلام حق شناس　　　　رونمائے رب ناس آمد بہ ناس

پس قرآن کو دیکھ لو کہ یہ اسی کا دیکھنا ہے اسی طرح مخلوق دیکھ لو مگر دیکھنا اپنے نفس کا نہیں۔ غرض وہ لوگ بواسطہ مخلوق کے خالق کی معرفت حاصل کرتے ہیں کہ مخلوق کے واسطے سے حق تک پہنچتے ہیں وہ یہ سمجھ کر سب کے حقوق ادا کرتے ہیں سوانکے دیکھنے پر اپنے دیکھنے کو قیاس مت کرو۔ آپکی حالت اور ہے اور انکی حالت اور ہے۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر　　　　گرچہ ماند در نوشتن شیر وشیر

پاک لوگوں کو اپنے اوپر قیاس مت کرو۔ اگرچہ لکھنے میں شیر اور شیر (دودھ) ایک جیسے ہیں۔ یہ رفع تھا شبہ متعلق تقدیم حق عبد علیٰ حق اللہ کا اور اصل مضمون رحمت حق کا تھا جس سے حق عبد کو حق اللہ پر مقدم کر دیا۔ اور اس سے پہلے مضمون رحمت حق کا کہ ہمارے حقوق کی آیت مداینت[1] میں کس طرح حفاظت فرمائی اور اس سے پہلے یہ تھا کہ ہر آیت میں رحمت کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس سے پہلے یہ تھا کہ ناگواری سب کو پیش آتی ہے اور یہی عماد مضمون تھا۔

الاہم فالاہم

خلاصہ یہ کہ ناگواریاں سب کو پیش آتی ہیں اور چونکہ اس آیت میں اس کا علاج مذکور ہے جو کہ ضروری تھا اس لئے اس وقت بیان کے لئے اس کو اختیار کیا کہ اس کی حقیقت بتلا دوں کیونکہ اب عادت ہے کہ جو ضیق پیش آتا ہے تو لوگ بجائے اس کے کہ اس کا علاج کریں اس کا شغل کر لیتے ہیں اور علاج کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور شاید بعضے اس کو علاج ہی سمجھتے ہوں۔ حالانکہ ضروری اور مفید اس کا حقیقی علاج کرنا ہے نہ کہ اس کو وظیفہ بنایا۔ مثلاً کوئی مدقوق ہے تو اس کو چاہیئے کہ حکیم کے پاس جا کر نسخہ لکھوائے نہ کہ کہتا پھرے۔

انا مدقوق انا مدقوق۔ اگر انا مدقوق کی تسبیح پر کفایت کریگا تو بیس (۲۰) دن کے بعد درجہ ثالثہ میں پہنچ کر سمجھ میں آوے گا کہ نسخہ استعمال کرتا تو کچھ نفع بھی ہوتا۔

اسی طرح ہم پر جو مصیبتیں آتی ہیں تو ان کے ازالہ کی تو فکر کرتے نہیں بس ان کا وظیفہ بنا لیتے ہیں اور فضول بکتے پھرتے ہیں۔ سو اس سے کیا فائدہ۔ میں کہا کرتا ہوں جتنے جملے ہیں دو

---

[1] یعنی آیت یا ایھا الذین امنوا اذا تداینتم بدین الخ (پ ۳)

قسم کے ہیں۔ خبریہ انشائیہ تو خبریہ تو اکثر فضول ہوتے ہیں اور انشائیہ اکثر مفید۔ مثلاً یہ کہ میرا لڑکا بیمار ہے یہ خبر یہ ہے اگر اس کے ساتھ انشائیہ نہ ہو مثلاً یہ کہ نسخہ لکھ دیجئے تو یہ محض فضول ہوگا۔

پس جب منہ کھولا کرو تو پہلے سوچ لیا کرو کہ ہم کو کیا کہنا چاہتے ہیں مثلاً اگر کہیں کہ طاعون ہوا تو اب کہتے پھریں گے کہ طاعون ہو رہا ہے مگر اس کے ازالہ کی فکر نہ کریں گے۔

ایک بزرگ سے ایک شخص نے کہا کہ فلاں جگہ طاعون ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ یہ کیوں کہتے ہو۔ اس سے مقصود کیا ہے وہ بھی تو کہو۔ سو وہ مقصود جملہ انشائیہ ہوگا۔ تو جملہ خبریہ اکثر غیر مفید ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک پہچان ہے لغو کلام کی اور لغو کلام سے بچنے کا حکم ظاہر ہے۔

اور مثال لیجئے فرماتے ہیں **قل هو الله احد**۔ اس میں توحید سکھلائی جس سے مقصود یہ ہے کہ **فاعتقلوہ** بزرگوں کے پاس آج کل لوگ جاتے ہیں اس طرح کی فضول باتوں میں اپنا اور ان کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ کہیں اخباروں کا ذکر ہے کہ زمیندار میں بڑی ہمدردی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تمہیں کیا۔ اپنا جو کام ہے وہ تو کرتے نہیں۔ ادھر ادھر کی فضول اور لغو باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں حالانکہ اہم امور کی طرف توجہ تو ہونی چاہئے کہ **الا هم فالاهم**۔ مگر لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ خود ان کے بدن پر تو سانپ اور بچھو لگے ہیں مگر دوسرے کے بدن کی مکھی کو گاتے پھرتے ہیں یہ لوگ احمق نہیں تو کیا ہیں۔ افسوس ہے کہ میں اسی واسطے کہا کرتا ہوں کہ

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم   از ما بجز حکایت مہر و فا مپرس

میں نے سکندر اور دارا کا قصہ نہیں پڑھا۔ ہم سے تم مہر وفا کے سوا کوئی بات نہ پوچھو۔

اسلام کی خوبی

فائدہ کیا ان لغو کلاموں سے۔ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ من حسن اسلام المرء ترک مالا یعنیہ کہ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے گو وہ معصیت نہ ہوں کیونکہ یہ مفضی الی المعصیت ہو جاتی ہیں۔ مگر ان کو اس کا شبہ بھی نہیں۔ غرض خوبی اسلام کی یہ ہے کہ لغو کلام سے بچو۔

ایک بزرگ دیوبند میں تھے جن کی نگاہ اور آواز بھی بلا ضرورت نہ اٹھتی تھی اور نہ نکلتی تھی تو وہ ہر فضول سے بچتے خواہ وہ کلام ہو یا نظر۔ حضورؐ نے اوپر کی حدیث میں ہر لغویات سے ممانعت فرما دی ہے۔ عام ہے کہ نظر ہو یا کلام ہو سب کو ممنوع فرمایا ہے اور نظر بھی بڑی بری بلا ہے۔ بعض نظر کی نسبت بزرگوں نے فرمایا ہے **النظر سهم من سهام ابليس**۔ (مستدرک حاکم ۴: ۳۱۴، الدر المنثور ۵: ۴۱) حقیقت

میں نظر ایک ایسا تیر ہے جو نظر ہی نہیں آتا کہ کہاں اور کیسے لگا اور دل شکار ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے

درون سینہ من زخم بے نشان زدہ بحیرتم کہ عجب تیر بے گماں زدہ

''میرے سینے میں تو نے بے نشان تیر مارا۔ میں حیران ہوں کہ عجیب بے گماں تیر مارا۔''

تو ایسا کرے ہی کیوں کہ زدہ کہنا پڑے۔ بس نظر ہی ذرا نیچے رکھے اسی نظر کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ (پ۲۴) اور ان پر دزدیدہ نظر تو کیا منفی ہوتی۔ اس کی تو یہ شان ہے کہ آگے فرماتے ہیں وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ کہ وہ دلوں کی باتیں بھی جانتا ہے اور اس میں باری تعالیٰ کو غیرت بھی آتی ہے کہ ہمارے غیر کو نظر محبت سے کوئی کیوں دیکھے الا باذن۔ واقعی اس دل میں گنجائش غیر کی ہونا نہ چاہئے جیسے معبودیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ایسا ہی مقصودیت میں بھی نہ ہونا چاہئے اور توحید حقیقی یہی ہے۔

تو وہ بزرگ اتنا بچتے کہ نگاہ فضول نہ اٹھاتے اور کلام تو بہت بڑی چیز ہے غرض اسکو بھی چھوڑنا چاہئے۔

ناول اور اخبار بینی

اگر کوئی خیر خواہ اس کو منع کرے کہ ناول بینی تو خیر مگر اس میں اخبار بینی بھی داخل ہے۔ اکثر مضامین ان کے خلاف شرع ہوتے ہیں۔ ایک شخص نے اسی طرح کا مضمون ایک اخبار سے نقل کیا تھا کہ اس میں کسی نے لکھا تھا کہ نماز کو اسلام سے نکال ڈالا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ یہ مانع ترقی ہے۔ اس لئے جو کوئی سنتا ہے کہ اسلام لاکر پانچ وقت نماز ادا کرنا پڑے گی تو وہ متوحش ہو کر اسلام سے ہٹ جاتا ہے۔

علیٰ ہذا ناول کی صریح اور مضر جھوٹ ہوتا ہے اور جھوٹ جیسے بولنا منع ہے ایسا ہی لکھنا اور سننا بھی تو منع ہے۔

میں نے ایک دفعہ چند سطریں اخبار بینی کے متعلق لکھ دی تھیں اخباروں میں مجھ پر بڑی لتاڑ پڑی۔ ایڈیٹروں نے ہر طرف سے غل مچانا اور چیخنا چلانا شروع کیا کہ اخبار بینی کو حرام کہتے ہیں حالانکہ میں نے اسی تحریر میں حلال وحرام اقسام کی تفصیل کر دی تھی۔ میں نے کہا کہ اس سے میری ایک دلیل اور بڑھی کہ اخباروں میں ایسی تہمتیں ہیں۔

ایک صاحب اخبار میں لکھتے ہیں کہ جب سے یہ طاعون ملاعون ہندوستان میں پھیلا ہے۔ یہ ملاعون کونسا لغت ہے۔ اس کی بالکل یہ مثال ہے جیسے کسی دہقانی گنوار نے کہا تھا کہ جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ۔ اس نے کہا تیلی رے تیلی تیرے سر پر کولھو۔ اس نے کہا واہ وزن تو ملا ہی نہیں۔ جاٹ نے کہا کہ بلا سے نہ ملے۔ بوجھ میں تو مرے گا۔

یہ تو اس جاٹ سے بھی گیا کہ یہ مہمل لغت لکھ دیا۔ پھر طاعون کو ملعون کہنا کیا یہ گناہ نہیں۔ یہ کیفیت ہے اخباروں کی۔ مگر آج کل تو عالم وہی ہے جو اخباروں میں مضمون لکھے تو اس طرح کے مضامین اخباروں میں شائع ہوتے ہیں کہ طاعون کو ملعون کہہ دیا۔ حالانکہ حدیث میں اس کو رحمت فرمایا ہے اور اس میں جو مرے اس کو شہید فرمایا ہے تو خدا کی رحمت کو ملعون کہنا کتنی بڑی گستاخی ہے۔

طاعون اور شہادت

اگر کوئی کہے کہ صاحب رحمت کیسے ہے تو دو طرح پر معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ شہادت ہے یہ تو آخرت میں مشاہد ہوگی۔ اور دنیا میں یہ مشاہدہ ہے کہ طاعون کے مرنے والے اور دوسرے مرض میں مرنے والے کو دیکھ لو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ زیادہ آثار خاتمہ بالخیر کے کس پر ہوتے ہیں۔ طاعون میں مرنا اکثر ایسا دیکھا گیا ہے جیسا اولیاء کی وفات ہوتی ہے۔

چنانچہ ایک اٹھارہ سال کا بچہ مولانا فتح محمد صاحب کی خدمت میں پڑھتا تھا۔ دفعۃً بخار چڑھا اور تیز ہو گیا۔ لوگوں نے اسی خیال سے کہ شکستہ دل نہ ہو اس سے کہا کہ تم کچھ خیال نہ کرنا۔ اچھے ہو جاؤ گے۔ اس نے پیشانی پر بل ڈال کے کہا یوں مت کہو اب تو خدا سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔

ایک لڑکا اسد اللہ اس کا ہم سبق تھا۔ اس کا ایک دن پیشتر دوسری بستی میں انتقال ہو چکا تھا۔ لوگوں سے پوچھا وہ کیسا ہے؟ سب نے کہہ دیا اچھا ہے اس نے عین وفات کے وقت کہا تم بڑے جھوٹے ہو اس کا تو انتقال ہو گیا۔ وہ میرے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ ایک یہ کرامت اس کی دنیا میں ہی ظاہر ہوئی کہ عالم آخرت منکشف ہو گیا اور کشف بھی صحیح۔ تو اس کی وفات اولیاء اللہ کی سی وفات ہونے میں کیا شبہ ہے۔

اسی طرح جتنے طاعونیوں کو دیکھا سب کا خاتمہ اچھا ہوا۔ اس کو یہ ملعون لکھیں تو بتلایئے کہ جب اخباروں کی یہ حالت ہو تو کیوں۔ اس سے نہ روکا جائے مگر جو اس سے روکے اس کی کم بختی۔ اس کی ممانعت میں قرآن کی آیت موجود ہے۔

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ

(اور اگر یہ لوگ اس کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اور جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے اوپر حوالہ رکھتے تو اس کی وہ منافقین کی حالت بیان ہو رہی ہے کہ منافقین کی عجیب حالت ہے کہ اگر کوئی خبر ان کو پہنچتی ہے اس کو بہت جلد ادھر ادھر شائع کر دیتے ہیں چاہے وہ خبریں پھیلانے کے قابل نہ ہوں۔ بتلایئے اخباروں کی یہی حالت ہے یا کہ نہیں۔ پس جب اس کی ممانعت قرآن مجید سے بھی

ثابت ہو۔تو ہم کیوں نہ روکیں۔مگر یہ ان کے لئے ہے جو قرآن کے ماننے والے ہیں۔اور جو اس کو نہیں مانتے تو اول میں ان سے خدا کی توحید اور رسول کی رسالت منواؤں گا۔جب وہ اس کو تسلیم کرلے گا اس وقت قرآن میں بھی اس کو ضرور ماننا پڑے گا۔پھر قرآن سے اس پر احتجاج ہوگا۔

اسکی ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک جماعت باغی ہو جاوے تو اول اس سے بادشاہ کا بادشاہ ہونا تسلیم کرایا جائے گا۔پھر اس کے بعد وہ اگر کسی حکم میں چون و چرا کرے گا تو اس سے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جب تم نے بادشاہ کی بادشاہی تسلیم کرلی تو اب سنو کہ بادشاہ کا ہر حکم واجب الاطاعت ہوتا ہے اور یہ حکم بادشاہ کا ہے۔پس اسکو بھی مانو۔

اسی طرح جو قرآن کا منکر ہوگا۔اس سے اول توحید اور رسالت کا ہم اقرار کرالیں گے۔اس کے بعد بھی اگر وہ انکار کرے کہ قرآن کلام خدا نہیں تو اس کو ہم دلیل اعجاز سے ثابت کردیں گے۔پھر احتجاج کریں گے۔غرض یوں ہی قصے ہو رہے ہیں۔یہ ہے ہماری حالت۔یہ تو عام خبریں تھیں اور اگر کسی نے اپنی حالت پر نظر کی۔تو وہ بھی بے قاعدہ ہے کہ کہتے پھرتے ہیں کہ انا مدقوق مگر علاج نہیں کرتے۔

طبیب کامل

خلاصہ یہ ہے کہ اگر ناگواری پیش آئے تو بجائے اس کو گاتے پھرنے کے اس کا علاج کرو اور علاج بھی ارزاں کچھ گراں نہیں ہے اللہ میاں کا نسخہ حکیم محمود خاں کے نسخہ سے بھی گراں نہیں ہے طبیب کامل وہ کہلاتا ہے جو گھاس میں عللاج کردے۔چنانچہ خدائے تعالیٰ کے معالجہ میں ہلدی پھٹکری بھی نہیں لگتی بلکہ بہت ہی آسان ہے چنانچہ ارشاد ہے

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ (پ ۱۴)

کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کا دل اقوال سے تنگ ہوتا ہے۔

آگے علاج بتاتے ہیں کہ فسبح بحمد ربک یعنی تسبیح کیجئے حمد رب کے ساتھ۔اللہ کا نام لیجئے۔ نفل پڑھئے یا ذکر کیجئے سب کو عام ہے وکن من الساجدین۔بالخصوص سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جیئے اور یہ جو ہم نے بتلایا۔یہ تو دوا تھی۔چنانچہ فاء تفریعیہ اس کا قرینہ ہے۔

اب آگے فرماتے ہیں کہ اس کے ساتھ ایک غذا ہے کہ اگر پریشانی اور تنگ دلی بھی نہ ہو تب بھی اس کو کرتے رہو یعنی وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ پس یہ غذا ہے کہ موت آنے تک عبادت کرتے رہو غرض اس آیت سے علاج و غذا دونوں باتیں معلوم ہوئیں۔باری تعالیٰ نے یہاں تین صیغے اختیار کئے ہیں اور سب کا حاصل قریب قریب ایک ہے

عباراتنا شتی وحسنک واحد   وکل الی ذلک الجمال یشیر

بس عبارتیں مختلف ہیں اور حاصل سب کا ایک ہے یعنی مشغولی بحق۔

خلاصہ یہ کہ اگر آپ پر تنگی آوے اور آپکا دل تنگ ہو تو مشغول بحق ہو جیئے یہ اسکا علاج ہے۔

اختلاف خاصیت

اول تو خدا تعالیٰ نے یہ علاج بتلایا ہے تو اب اس کے لم کی تحقیق کی ضرورت نہیں دوسرے ہر چیز میں لم ہونا ضروری بھی نہیں۔ بہت سی چیزیں مؤثر بالکیفیت ہوتی ہیں مثلاً مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے تو کیوں۔ اس کی خاصیت یہی ہے وہاں لم کوئی نہیں پوچھتا۔ اور اگر شریعت میں اس کو بتلایا جائے تو کہتے ہیں علت بتلاؤ۔ وہاں کیوں نہیں علت پوچھی جاتی۔

ایک شخص نے مجھ سے پوچھا۔ نماز پانچ وقت کی کیوں فرض ہوئی۔ اس میں کیا مصلحت ہے۔ میں نے کہا تمہارے ناک آگے کیوں ہے پیچھے کیوں نہیں اس میں کیا حکمت ہے انہوں نے کہا اگر پیچھے ہوتی تو بدنما معلوم ہوتی میں نے کہا جب سب کی پیچھے ہوتی ہے تو کیوں بدنما معلوم ہوتی۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ افسوس ہے کہ اگر محمد ابن زکریا کچھ کہہ دے تو مان لیا جائے۔ اور اگر محمد بن عبداللہ کچھ کہیں تو اس کی تصدیق نہ کی جائے۔ غرض! جب میں نے ثابت کر دیا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے پھر ہمیں ضرورت نہیں کہ ہر ایک حکم کی علت بتائیں۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ اس میں خاصہ یہی ہے جو خدا تعالیٰ کے ارشاد سے معلوم ہو جاتا ہے۔ بلکہ جو ادویہ مؤثر بالکیفیت کہلاتی ہیں تو وہ بھی مؤثر بالخاصیت ہی ہیں۔

مثلاً برودت کا علاج اجزاء حارہ سے کرتے ہیں۔ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ علاج بالکیفیت ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ حرارت نہیں کیونکہ اول تو علاج بالمثل بھی ہوتا ہے تو وہاں علت کہاں گئی اور شفاء وہاں بھی ہوتی ہے معلوم ہوا کہ حرارت علت نہیں۔

دوسرے یہ کہ فالج زدہ کے لئے جو ادویہ گرم تجویز ہوں ان کا مزاج جس درجہ میں ہوتا ہے دوسری بہت سی ادویہ جو اسی درجہ میں گرم ہیں وہ دوائیں اگر دی جائیں تو وہ کیوں نہیں مفید ہوتیں۔ اس کی وجہ پوچھو تو اختلاف خاصیت بتلایا جاتا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ وہ ادویہ مفید بھی مؤثر بالخاصہ ہوتی ہیں کیفیت کا نام بدنام کیا جاتا ہے۔ اور اگر تاثیر کیفیت کو مان بھی لیا جائے تو صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اس کو بھی دخل سہی مگر اس میں محصور تو نہیں۔

بس اگر اسی طرح ہم شرائع میں دعویٰ کریں کہ اس کی خاصیت یہی ہے تو کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا اور اس پر اکتفا کیوں نہیں کیا جاتا کہ قرآن میں ہے اور اس سے یہ نہ سمجھنا کہ علماء کو لم اور علل کچھ معلوم نہیں۔

ہمیں سب کچھ معلوم ہے مگر اہل زمانہ کی رعایت ہے کہ بتلایا نہیں جاتا اور صرف اس پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ قرآن میں ہے کیونکہ لم بتلانے سے اتنا نفع نہیں جس قدر مضرت ہے کہ رائے کا دروازہ کھلتا ہے۔ سو ہمارے پاس سب کچھ ہے مگر بوجہ مذکور بتلانا مصلحت نہیں

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

مصلحت وقت نہیں کہ راز کو پردہ سے باہر نکالا جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں ایسی کوئی خبر نہیں جو نہ پہنچی ہو۔

مشغولیت کا اثر

مگر خیر ہم تبرعاً وجہ بھی بتلاتے ہیں۔ سو وجہ اس کی یہ ہے کہ مشغولی بحق سے واقعات بھولتے ہیں اور یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ واقعات اتنے مؤثر نہیں ہوتے جتنا کہ مشغولی بواقعات۔

مثلاً دو شخص فرض کیجئے کہ ان دونوں کے بیٹے مر گئے اب ایک نے تو بیٹھ کر وظیفہ رٹنا شروع کیا کہ ہائے بیٹے ہائے بیٹے اور ایک نے اتنا خیال نہ کیا۔ چند دنوں کے بعد دیکھے گئے تو ایک سرخ وسپید اور ایک کالا زرد حالانکہ واقعہ ایک تھا۔ معلوم ہوا کہ واقعہ مؤثر مشغولی سے ہوتا ہے اور بدوں مشغولی کے طبعاً تو حزن ہوتا ہے مگر پریشان کرنے والا نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہوا زیادہ پریشانی مشغول سے ہوتی ہے۔

بس اس علاج میں اس مشغولی کو دور کیا ہے۔ اس طرح کہ مشغولی بحق ہو جاؤ کیونکہ النفس لا تتوجه الی شیئین فی ان واحد۔ اور اس کو سائنس والوں نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ تو عقلاً اور نقلاً یہ بات ثابت ہے کہ جب ہم مشغول بحق ہوں تو اس جانب سے توجہ گھٹے گی۔ پس حزن کم ہو جاوے گا۔ تو عقلی طور پر ثابت ہو گیا کہ دوسری طرف مشغولی علاج ہے ضیق کا۔ آگے یوں سمجھو کہ جس طرف مشغول کیا گیا ہے، جتنا محبوبیت میں قوی ہوگا اسی قدر اثر قوی ہوگا۔

محبت کی وجوہ

اب یہ بات تحقیق کے قابل رہی کہ حق تعالیٰ زیادہ محبوب ہیں یا مخلوق۔ تو دیکھ لیجئے کہ کسی سے جو محبت ہوتی ہے اس کی وجہ یا کمال یا جمال یا نوال ہے تو معلوم ہوا کہ محض ذات سے محبت

نہیں کسی صفت کی وجہ سے ہوتی ہے۔

تو اب دیکھو کہ یہ صفتیں بالذات کس کی ہیں جس میں یہ اوصاف بدرجہ اکمل ہوں گے وہ زیادہ محبوب ہوگا۔ اب یہ رہ گیا کہ یہ اوصاف کس میں زیادہ ہیں تو اس میں مسلمانوں کو تو شبہ نہیں کہ سب سے زیادہ اور کمال کے ساتھ یہ اوصاف خدا ہی میں پائے جاتے ہیں۔ اگر ظاہراً دوسرے میں ہیں بھی تو خدا میں بالذات ہیں۔ اور غیر خدا میں بالعرض۔

چنانچہ مخلوق میں بالعرض ہونا ہم آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ ہر شے زوال پذیر ہے جو کل ساری دنیا پر حاکم تھے وہ آج تمام عالم کے محتاج ہیں جو کل حسن میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ ایک زمانہ ان پر وہ بھی آتا ہے کہ ان سے بدصورت دوسرا نہیں ہوتا۔

الحاصل! مخلوق کا اتصاف ان اوصاف کے ساتھ بالعرض ہے جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اور خدا میں تمام اوصاف بالذات علی درجۃ الکمال ہیں اور بالعرض جو وصف ہوتا ہے وہ محتاج بالذات کا ہوتا ہے پس جب خدا میں یہ اوصاف بالذات ہیں تو ان کی محبوبیت قوی ہوگی۔ پس اگر محبوب جمال کی وجہ سے بنایا جاتا ہے تو خدا سے بڑھ کر کون جمیل ہے اور اگر کمال یا نوال کی وجہ سے ہے تو خدا سے بڑھ کر کون صاحب کمال اور ذی نوال ہے۔ بہر حال خدا سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں مگر لوگوں کو خبر نہیں اس لئے دوسری طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص دیوار پر دھوپ دیکھ کر عاشق ہو جائے تو واقع میں تو آفتاب کا عاشق ہے لیکن اسکو خبر نہیں کہ نور آفتاب کا ہے۔ اگر خبر ہو جائے تو دیوار کی طرف التفات بھی نہ کرے اسی کو فرماتے ہیں۔

عشق بامردہ نباشد پائدار　　　عشق را با حی و باقیوم دار

"کسی مردہ سے عشق پائیدار نہیں ہوسکتا ہمیشہ زندہ پائندہ سے عشق رکھ۔"

اور مخلوق کے ساتھ جو عشق ہوتا ہے انجام اس کا یہ ہوتا ہے۔

عشق ہائے کزپئے رنگے بود　　　عشق نبود عاقبت ننگے بود

جو عشق کسی رنگ کی خاطر ہوگا وہ ہمیشہ باعث ننگ ہوگا۔

عاشقی بامردگاں پائندہ نیست　　　زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست

مردوں کے ساتھ عشق پائندہ نہیں ہوسکتا کیونکہ مرنے والے مر کر واپس نہیں آتے۔"

غرق عشقے شوکہ غرق ست اندریں　　　عشقہائے اولین و آخریں

تو ایسا عشق اختیار کر جس عشق میں قدیم وجدید سب عشق گم ہوں۔"

آگے فرماتے ہیں کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ وہاں تک ہماری رسائی کہاں تو فرماتے ہیں کہ

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست　　　برکریماں کار ہا دشوار نیست

"یہ نہ سمجھو کہ اس بادشاہ کے ہاں باریابی نہ ہوگی۔ کریموں پر ایسے کام دشوار نہیں۔"

یعنی تم کو ہراس وناامیدی نہ ہونی چاہئے بہت آسان ہے۔

یعلم اللہ دوقدم راہست دیگر بیش نیست　　　یک قدم برنفس خودنہ دیگرے برکوئے دوست (جامع)

خدا جانتا ہے دو قدموں کی راہ نہیں۔ ایک قدم نفس پر رکھو اور دوسرا کوئے دوست میں۔

اور حاصل جواب یہ ہے کہ ہمارے کئے سے کچھ نہ ہوگا مگر وہ تو کریم ہیں وہ خود تم کو کھینچ لیں

گے اور وصول دونوں طرح ممکن ہے۔

بخت اگر مدد کند امنش آورم بکف　　　گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

اگر بخت نے مدد کی اور اس کا دامن میں پکڑ سکا تو اگر وہ کھینچے گا خوشی ہوگی اور میں کھینچوں گا تو

میرے لئے باعث شرف ہوگا۔

البتہ طلب ادھر سے ہونا ضرور ہے پھر کام وہی بنادیں گے اس کی ایسی مثال ہے کہ بچہ چل

نہیں سکتا اور باپ کی طرف دوڑتا ہے آخر دوایک قدم چل کر گر پڑتا ہے اور پھر دوڑ کر اس کو اس کا

باپ گود میں اٹھالیتا ہے تو یہ جو مسافت قطع ہوئی لڑکے کے چلنے سے نہیں۔ مگر اس نے کوشش تو کی

گو گر پڑا۔ تو یہ مسافت درمیانی جس کی حالت یہ ہے۔

نگرود قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدن ہا کہ　　　می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدن ہا

عشق کی راہ دوڑنے سے نہیں ختم ہوگی کیونکہ عشق کی راہ انگور کی بیل کی طرح کاٹنے سے بڑھتی ہے۔"

یہ ان ہی کے قطع کرانے سے قطع ہوگی اس لئے کہتے ہیں۔

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست　　　بر کریماں کارہا دشوار نیست

غرض! محبوب حقیقی حضرت جل وعلا ہی ہیں۔ مگر جن کو اطلاع نہیں وہ دیوار پر عاشق ہیں اور

جب دھوپ گئی تو ہائے کیا ہوا۔ جان نکل گئی۔

وہ چلا جاں بھی چلی دونوں برابر کھسکے　　　اسکو روکوں کہ اسے، پاؤں پڑوں کس کس کے

اور جن کی سمجھ میں کہ جمال حقیقی اور کچھ ہے۔ یہ تو محض پرتو اور عکس ہے اور مستعار ہے کسی اصل سے وہ یہ پڑھیں گے۔

حسن خوشی از روئے خوباں آشکارہ کردۂ　　پس بہ چشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ

اپنے حسن کو تو نے محبوبوں کے چہرے سے آشکارا کیا اور عاشقوں کی آنکھ سے اپنے آپ کو دیکھا۔

پرتو حسنت نہ گنجد در زمین و اسماں　　در حریم سینہ حرانم کو چوں جا کردۂ

تیرے حسن کی جھلک آسمان وزمین میں سما نہیں سکتی۔ میں حیران ہوں کہ تو حریم سینہ میں کس طرح جاگزیں ہو گیا۔

تصور شیخ

ان لوگوں کو کسی چیز سے پریشانی نہیں ہوتی اور حزن طبعی اور بات ہے۔ اسی مقام پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پہنچے تو فرمایا ان اللہ حی لا یموت۔ تو حقیقت میں محبوب حقیقی حق جل وعلا کے سوا کوئی نہیں۔ پس اس میں جو جتنا مشغول ہو گیا۔ اتنا ہی زیادہ اس کی تنگی دور ہو گی۔

بس خدا کی مشغولی دافع ہے تمام بلیات وصدمات ومصائب کے لئے اور یہاں سے مسئلہ تصور شیخ کا بھی حل ہو گیا کہ تصور شیخ کی ہر ایک کو اجازت نہیں کیونکہ بعضے اس کو مثل مقصود بالذات کے قرار دیکر تصور کرتے ہیں۔ حقیقت اس کی صرف اتنی ہے کہ ذاکر مبتدی کو جو کہ مذکور کا استحضار نہیں کر سکتا۔ جب وساوس ستانے لگیں تو شیخ کا تصور کر لے کہ اس طرف متوجہ ہو جانے سے دوسرے تصورات دفع ہو جاویں گے۔ مگر یہ تصور جو ہو تو اسطرح نہ کہا یہاں موجود ہے بلکہ اس طرح کہ فلاں جگہ میں شیخ کو ملا تھا کیونکہ یہ تصور کرنا کہ یہاں موجود ہے ایک گونہ بے ادبی ہے کہ گویا شیخ اس کے پاس آکر حاضر ہو۔ دوسرے جو اس سے مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہو گا۔ کیونکہ یہ خلاف واقع ہے اور خلاف واقع پر دھیان نہیں جمتا اور بے دھیان جمے وساوس دفع نہ ہوں گے پھر اس میں عقیدہ حاضر وناظرہ کا بھی ہو گا اور اس میں احتمال شرک کا ہے۔

غرض! اس طرح سے تصور کرے چونکہ شیخ بہ نسبت اوروں کے زیادہ محبوب ہوتا ہے اسلئے حضرات صوفیاء دفع وساوس کے لئے اس کو تجویز فرماتے ہیں۔ پھر جب خطرات دفع ہو جاویں تو اس تصور کو ترک کر دینا چاہئے خلاصہ یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے تصور کر لے کیونکہ مشغولی بشیخ عارضی ہے اصل مقصود تو حق تعالیٰ کی مشغولی ہے۔

یہاں بعضے قلوب میں یہ وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شیخ کی طرف جتنا ہمارا دل کھنچتا ہے خدا کی طرف نہیں کھنچتا تو اس میں مجھ کو گناہ ہوتا ہوگا تو سمجھ لو کہ یہ محبت طبعیہ ہے اور خدا کے ساتھ محبت عقلیہ زیادہ ہونی چاہئے سووہ حاصل ہے۔ چنانچہ اس شخص سے اگر کوئی اس کا بڑا محبوب یہ کہے کہ اگر خدا سے تعلق رکھو تو ہم سے نہیں رکھ سکتے اور اگر ہم سے رکھنا چاہو تو خدا کو چھوڑ دو اسی وقت یہ شخص یہی جواب دے گا کہ ہمیں تم سے تعلق رکھنا منظور نہیں۔

روز ہا گر رفت گورو باک نیست　　　تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

دن چلے گئے تو کیا غم البتہ تم نہ جاؤ کہ تمہارے سوا اور کوئی پاک نہیں۔"

اطمینان قلب

پس وہ شبہ دفع ہو گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب تنگی ہو فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ یعنی خدا کے ساتھ مشغول ہو۔ اس مشغولی بحق سے تنگی جاتی رہے گی۔ اب یہاں سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ حق تعالیٰ کی یاد سے جمعیت دل ہوتی ہے اور یہاں جمیعت سے وہ مراد نہیں ہے جو ایک دوسری آیت میں مذکور ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (پ ۱۳) یہاں پر اس کی تفسیر سیاق وسباق سے اور معلوم ہوتی ہے کہ اطمینان سے وہ اطمینان مراد نہیں جو ضیق کا مقابل ہے یہاں پر دوسرا اطمینان مراد ہے کہ جس کا ایمان نام ہے چنانچہ قرنیہ سیاق بالموحدہ یہ ہے کہ فرماتے ہیں

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ط قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (پ ۱۳)

(اور یہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی معجزہ ان کے رب کی طرف سے کیوں نہیں نازل کیا گیا، آپ کہہ دیجئے کہ واقعی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں گمراہ کر دیتے ہیں اور جو شخص ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اسکو ہدایت دیتے ہیں) آگے فرماتے ہیں بطور اناب کے بدل کے

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ط اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

(جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے انکے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے)

جب یہ من اناب کا بدل ہے تو اس کے ساتھ متحد ہے اور من اناب بوجہ تقابل خیال کے بمعنی مہتدی و مومن ہے۔ پس یہ اطمینان متحد ہوا ایمان کیساتھ۔ اور سیق بالتحسیۃ یہ ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ (پ ۱۳)

(جولوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے خوش حالی اور نیک انجامی ہے)

اور اصل معنی اطمینان کے سکون کے ہیں اور سکون دو طرح کا ہوتا ہے ایک سکون عقلی دوسرا سکون طبعی۔ پس یہاں اطمینان سکون عقلی کے معنی میں ہے پس مقابل ضیق کا نہیں کیونکہ ضیق امر طبعی ہے۔ پس یہ تو اطمینان کفر کے مقابل ہے بس طبعی نہیں۔ اور قرآن میں دونوں کا استعمال موجود ہیں چنانچہ فرماتے ہیں وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ م بِالْاِيْمَانِ (پ۱۴) (اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہے) یہاں سکون عقلی ہے اور ایک جگہ طبعی ہے ابراہیمؑ کے قصے دعائے احیائے موتی ہیں۔

بعضے اس کی تفسیر نہ جاننے سے غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ ایک کورٹ انسپکٹر یہ آیت دیکھ کر کہ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ط قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (پ۳) (ارشاد فرمایا کیا تم ایمان نہیں لاتے انہوں نے عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لاتا لیکن اس غرض سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو سکون ہو جائے) کہنے لگے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو احیاء میں اطمینان نہ تھا شک تھا۔ ان کے اس شبہ کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ اس آیت میں اطمینان کو مقابل شک کے سمجھے یعنی اطمینان عقلی سمجھ گئے۔ سو یہاں بمعنی اطمینان طبعی مستعمل ہے اور شک کی نفی تو اولم تومن کے جواب میں ان کے بلیٰ کہنے سے ہوگئی۔

حاصل اس بے اطمینانی طبعی کا یہ ہے کہ ان کو یہ تو یقین تھا کہ احیاء ہوگا مگر اس کی کیفیت میں جو کہ کئی احتمال تھے اور کسی کیفیت کا مشاہدہ نہ ہوا تھا اس لیے اس کی تعیین میں تردد تھا۔ اس کو عدم اطمینان فرمایا کیونکہ یہ اطمینان مشاہدہ ہی سے ہوتا ہے کہ طبعاً سکون ہو جاوے یہ کیفیت واقع ہوئی۔ میں نے ان کو یہی جواب دیا۔ بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ واقعی ترجمہ سے قرآن سمجھنا بہت دشوار ہے۔

یہ اثر پیدا ہوتا ہے محققین کے پاس رہنے سے ورنہ کتنا بڑا شبہ تھا ابراہیم علیہ السلام کو تو اطمینان نہ تھا تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (دلوں کو اطمینان ہوتا ہے) سے اور وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ م بِالْاِيْمَانِ (اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ادنیٰ مومن کو اطمینان حاصل ہے تو اس کو اتنا بڑا درجہ ملا کہ جو حضرت ابراہیمؑ کو بھی حاصل نہ تھا۔

اطمینان کے درجات

تو اس تحقیق سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اطمینان کے دو درجہ ہیں پس ان الذین امنوا میں اطمینان عقلی مراد ہے وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ میں اطمینان طبعی۔ اور ضیق کا علاج یہی اطمینان

طبعی ہے جو مشغولی بحق سے پریشانی کے رفع کرنے میں مؤثر ہے گواور بہت امور میں تردد کو رفع نہ کرے مثلاً احیاء موتی کی کیفیت میں۔

اب ایک اور قوی شبہ باقی رہ گیا وہ یہ کہ فرماتے ہیں اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ (پ ۳۰) تو کیا شرح صدر کے بعد بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنگی معلوم ہوئی سو سمجھ لو کہ یہ جو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ (کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل تنگ ہوتا ہے)

سو ضیق کی دو قسمیں ہیں ایک تو یہ کہ جیسے عوام کو ہوتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اور یہ کہ نہایت ضعیف ہو سو یہ ہوا۔ مگر یہ شرح صدر کے منافی نہیں۔

دیکھو آپ کو زکام ہو گیا اور وہ بھی معمولی۔ تو آپ بھی مریض ہیں اور ایک مدقوقہ ہے وہ بھی مریض ہے۔ مگر آپ کی بیماری عادت صحت کے منافی نہیں کیونکہ صحت غالب ہے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ضیق بھی خفیف ہوتا تھا جو شرح صدر کے منافی نہیں۔

اب ایک بات اور عجیب قابل تحقیق باقی رہی۔ وہ یہ کہ اطمینان جب حاصل ہوگا تو آیا ضیق زائل ہو جائے گا یا مغلوب ہو جاوے گا۔ تو یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ ضیق زائل نہیں ہوتا۔ بلکہ مغلوب ہو جاتا ہے جس طرح انسان کے اندر سب اخلاط موجود ہیں تو جب صفرا بڑھ جاتا ہے مسہل کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر مسہل صفرا کو بالکل نہیں نکال دیتا۔ اور اگر بالکل صفراویت نہ رہے تو خیریت نہیں۔

حق تعالیٰ نے جب طبیعت عطا فرمائی ہے تو اس کے خواص لازمہ بھی عطا فرمائے ہیں ورنہ انتفا لازم سے انتفا ملزوم ہو جاتا ہے غرض زائل نہیں ہوتا ہے۔ ہاں مغلوب ہو جاتا ہے اور اس تحقیق سے ایک بڑا تردد سالکین کا دفع ہوا وہ یہ کہ بعض اوقات بعد مجاہدہ کے بھی بعضے امور طبعیہ سے مذمومہ کا اثر اپنے اندر پاتے ہیں اور اس مجاہدہ کے بیکار ہونے کا گمان کر کے مایوس ہو جاتے ہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر اخلاق ذمیمہ مغلوب ہو جائیں کہ ان کے اقتضاء پر عمل کرنے کو آسانی ترک کر سکیں یہ کافی ہے۔ زوال کی توقع نہ رکھیں۔ ورنہ پھر ثواب اور فضیلت ہی کیا ہے۔ یہ امور ذوقیہ تھے جو درمیان میں عرض کر دیئے گئے۔

خلاصہ اور اصل مسئلہ یہی ہے کہ ضیق کا مشغولی بحق سے علاج کیا گیا ہے آپ خود بھی دیکھ لیجئے کہ مشغولی حق سے پہلا واقعہ بھول جائیں گے یا نہیں۔ اور میں یہ بتلا چکا ہوں کہ واقعات و محزون پریشان نہیں بناتے بلکہ مشغولی بواقعات پریشان کرتی ہے۔ اور مشغولی بحق سے وہ مشغولی و توجہ نہیں رہتی۔ اس لئے پریشانی نہ رہے گی۔

جذب سلوک اور استغراق

مگر شاید کوئی کہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ مشغولی بحق کے بعد بھی واقعہ کی طرف توجہ رہتی ہے۔ سو جواب یہ ہے کہ میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ واقعہ بالکل ہی یاد نہ رہے گا۔ بلکہ اسکی طرف جو توجہ ہے وہ ضعیف اور مغلوب ہو جاویگی اور اثر مطلوب کے لئے یہ بھی کافی ہے اور کمال بھی انسان کا اسی میں ظاہر ہوگا کہ موجود ذہن میں وہ بھی ہے پھر توجہ بحق کو اس پر غالب کر دیا۔

مثلاً دو پہلوان کشتی کرنے کے لئے نکلے آپ بیچ میں آ گئے۔ آپ نے ایک کو تو الٹے پاؤں بھگا دیا۔ دوسرا رہ گیا تو کچھ کمال نہیں۔ کمال قوت تو جب تھا کہ دونوں لپٹے رہیں اور آپ بیدار ہیں کہ جب ذرا ایک نے دوسرے کو گرانا چاہا آپ نے اس کو مغلوب کر دیا۔

اسی طرح یہاں دو پہلوان ہیں مشغولی بحق۔ مشغولی بواقعہ۔ ان میں سے ایک پہلوان بھاگ گیا تو پھر آپ کا کیا کمال ہوا۔ کمال تو یہ ہے کہ دونوں مستعد ہیں مگر جہاں ذرا اس نے اپنا اثر کرنا چاہا۔ آپ نے فوراً اس کو مغلوب کر لیا۔ متقین مبصرین کی یہی شان ہوتی ہے کہ جہاں ذرا شیطان نے اپنا اثر کرنا چاہا **فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ** (پ۹) کہ فوراً ان کی آنکھ کھل جاتی ہے اہل کمال کی یہی حالت ہوتی ہے۔

اسی سے ایک اور مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ کتنی ہی توجہ الی اللہ بڑھ جائے مگر پھر بھی میلان الی النساء اور حب جاہ و مال ضرور رہتا ہے اور یہ تو انتہا تک ساتھ رہتا ہے۔ تو توجہ الی اللہ سے توجہ الی الغیر کہاں زائل ہوئی۔ تو یہ سمجھ کی غلطی ہے ہمارے ناقصین کی۔

وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پورے ولی وہ ہیں جو پاخانہ بھی نہیں کرتے، نہ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ ان کو کسی قسم کی خواہش ہوتی ہے تو یہ ولی کیا ہوئے جماد محض ہوئے۔ نہیں! کاملین میں سب کچھ ہوتا ہے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

انما انا بشر اغضب کما یغضبون (بے شک میں انسان ہوں مجھے بھی غصہ آتا ہے جیسے ان کو غصہ آتا ہے) (مسند احمد ۲:۲۴۳)

وہ کھاتے بھی ہیں پیتے بھی ہیں جورو بھی رکھتے ہیں لیکن یہ سب جذبات ان میں مغلوب ہوتے ہیں کہ ان کو رضائے حق سے نہیں نکلنے دیتے مگر جو ناواقف ہیں ان کو دھوکا ہو جاتا ہے اور وہ اسی خبط میں رہتا ہے کہ ایسے بزرگ سے مرید ہو کہ صاحب تصرف بھی ہو اور اگر کسی کو شیخ صاحب

تصرف مل گیا اور اس کی تعلیم سے قدرے محویت کی حالت ہوگئی تو بس وہ بزعم خود نبی سے بڑھ گیا۔

اسی غلطی کے سبب لوگ جذب کو سلوک پر ترجیح دیتے ہیں۔ استغراق کو بڑی چیز سمجھتے ہیں کہ جب تک ہم بے عقل و مدہوش نہ ہوئے تو کمال ہی کیا۔

صاحبو! اللہ تعالیٰ کا نام تو ہوش بڑھانے کے واسطے لیا جاتا ہے نہ کھونے کے لئے۔ ہاں اس کے دو طریقے ہیں کہ کبھی گھٹ کر بڑھ جاتا ہے، کبھی بغیر گھٹے اور یہ فرق مزاج کے اختلاف سے ہوتا ہے۔

مثلاً ماء اللحم سے قوت بڑھتی ہے مگر ایک شخص کو تو ابتداء ہی سے دے دیا جاتا ہے، جس میں مادہ فاسد نہ تھا۔ اور ایک کو مسہل کے بعد دیا جاتا ہے، جس میں مادہ فاسد ہو۔ مگر مقصود سب کو قوت پہنچانا ہے۔ اسی طرح جن کو ضرورت بے ہوش کر کے ہوش میں لانے کی ہوتی ہے انکو اول بے ہوش کیا جاتا ہے۔ پھر ہوش دیا جاتا ہے اور بعض کو اول ہی سے ہوش بڑھانا شروع ہو جاتا ہے، بہر حال استغراق خود مقصود نہیں۔

استغراق اور قرب

خواجہ عبید اللہ احرار فرماتے ہیں کہ استغراق میں قرب نہیں بڑھتا کیونکہ اس میں عمل نہیں ہوتا جو مدار قرب ہے تو حقیقت میں جو ذی استعداد کامل ہیں ان پر نفسانی کیفیات طاری نہیں ہوتیں۔ ہاں روحانی کیفیات کہ جن کا اثر روح پر ہوتا ہے کاملین پر وہ کیفیات طاری ہوتی ہیں جن کا عوام کو پتہ بھی نہیں اور ان دونوں میں وہ فرق ہے۔ جیسے گڑ اور فیرینی کی شیرینی میں کہ چمار کسی کی بیگار میں گئے۔ اس نے فیرینی کھلائی۔ تو چماروں نے ناک مار کر کھا تو لی۔ مگر چودھری کہتا ہے کہ تھوک سا کیا ہے اس کو مٹھائی مدرک نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس نے کبھی فیرینی کی بو بھی نہ سونگھی تھی۔ اس کے نزدیک تو مٹھائی گڑ ہے۔

تو واقعی جو سالکین متمنی کیفیات ہیں وہ دیہاتی گڑ خوار ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ کام میں لگو۔ کیفیات کی ہوس چھوڑو۔ پھر دیکھئے کہ ایک دن وہ کیفیات نظر آئیں گی کہ **مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطرت علی قلب احد۔** (مسند احمد ۳:۴۳۸) (نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی کے دل پر اس کا خطرہ ہوا) مگر تفصیلی تنبہ ان پر شیخ کے متنبہ کرنے سے ہوگا۔ البتہ اجمالی تنبہ اس پر اس طرح سے ہو سکتا ہے کہ ابتداء ذکر کے وقت جو کیفیت تھی اس کو نہ بھولنا پھر دو برس کے بعد دیکھنا کہ اب کیا حالت ہے خود تفاوت معلوم ہوگا۔ تم چاہتے ہو آج ہی سب کچھ ہو جائے۔

ایک بچہ کو دیکھئے کہ جتنا آج اتنا ہی کل۔ دو ایک دن میں کوئی قابل امتیاز تفاوت نہیں ہو جاتا۔ مگر اسی بچہ کو دس برس کے بعد دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہاں اس کو نشو و نما ہوا ہے۔ غرض کیفیات روحانیہ تو ضرور ہوتی ہیں۔

کیفیات نفسانیہ

مگر کیفیات نفسانیہ ضرور نہیں۔ کسی کو ہوتی ہیں کسی کو نہیں چنانچہ بعضوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب غلبہ ذکر ہوتا ہے تو بھوک پیاس تک نہیں لگتی۔ نیند نہیں آتی۔ یہ سمجھا کہ یہ ثمرہ ذکر کا ہوا کہ سب چیز کی شہوت جاتی رہی۔ خوش ہوا۔ اس کے بعد جب کیفیت جوش کی گھٹی اور ان امور طبعیہ نے عود کیا تو مغموم ہے۔ تو یہ ناواقفی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جوش وخروش دائم نہیں رہتا۔

حدیث میں ہے کہ ہر جوش میں ضعف ہوتا ہے۔ ان جوشوں کے فرو ہونے کے بعد۔ پھر روحانی کیفیت بڑھتی ہے وہ البتہ دائم ہوتی ہے۔

خود قوی تر میشود خمر کہن　　　　خلاصہ اُں خمرے کہ شد من لدن

پرانی شراب زیادہ طاقت ور ہوتی ہے خصوصاً شراب جولدنی ہو۔

ان کیفیات نفسانیہ کا غلبہ عروج تھا اور ان کیفیات روحانیہ کا غلبہ نزول ہے غرض! ان کیفیات نفسانیہ کے سکون کے بعد بعض آثار طبعیہ کا عود موجب اشتباہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ مقصود ازالہ طبعیات کا نہیں ہے عدم غلبہ کافی ہے بالکل لوگ پاگل ہو جاتے ہیں۔

اسی کو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ زائل نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ امور طبعیہ مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اور آیت میں جو علاج ہے اس کا یہی حاصل ہے کہ گو تنگی رہے مگر مشغولی بحق سے وہ موذی نہ رہے۔ خود مشغولی بحق سے بھی اور اس استحضار سے بھی کہ یہ بھی من الحق ہے۔

اس کو مثال سے سمجھئے آپ کے بدن میں ایک دشمن نے چٹکی لی تو جھلا گئے اور محبوب نے چٹکی لی تو آپ اپنے سے زیادہ خوش نصیب کسی کو نہ سمجھیں گے اور لیجئے ایک شخص نے آپ کو زور سے دبو چا تو تکلیف کس قدر ہوگی اور فرض کیجئے کہ آپ کا محبوب اس طرح دبوچے۔ تو بھی اس کا اثر بدن پر تو ضرور ہوگا۔ مگر دل پر مسرت کے آثار نمایاں ہوں گے۔ بس ایک وہ تنگی ہے ایک یہ تنگی ہے مگر دونوں میں فرق زمین آسمان کا ہے اسی طرح مشغولی بحق کی حالت میں بھی گو واقعات سے تنگی ہوتی ہے۔ مگر یہ ایسی تنگی ہے جس سے دل مسرور ہے مثلاً اسی حالت میں جب کہ محبوب نے آپ کو بھینچ رکھا ہے اور کوئی رقیب کھڑا ہوا اور وہ محبوب آپ سے کہے کہ اگر تکلیف ہوتی ہو تو تجھ کو چھوڑ کر اس کو لپٹ جاؤں تو آپ یہی جواب دیں گے

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

''تمہاری تلوار سے ہلاک ہونا دشمن کے نصیب میں نہ ہو۔ تیری خنجر آزمائی کے لئے دوستوں کے سر موجود ہیں۔'' کبھی قیامت تک بھی اس پر راضی نہ ہو گے۔

مکررات قرآن

اس طرح مشغولی بحق کی حالت میں بھی تنگی ہومگر قلب وروح پرنہیں صرف طبیعت وجسم پر ہوتی ہے اور وہاں راستہ ہی نہیں ملتا کہ قلب تک پہنچے۔ وہ حالت ہوتی ہے کہ

عذل العواذل حول قلب التائہ　　　　وھوی الاحبۃ منہ فی سودائیہ

یعنی محبت تو قلب کے اندر ہوتی ہے اور ملامت باہر۔ تو بس اس قسم کی تنگی رہے گی۔ یہ حاصل ہے علاج کا۔ اوراس علاج کو حق تعالیٰ نے بہت جگہ بیان فرمایا ہے ایک جگہ فرمایا۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ (پ ۲۷)

(اور آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے رب کی اس تجویز پر صبر سے بیٹھے رہے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں اور اٹھتے وقت (مجلس سے یا سونے سے) اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیا کیجئے اور رات میں بھی اسکی تسبیح کیا کیجئے اور ستاروں سے پیچھے)

اور ایک جگہ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ (پ ۲۶)

(پس آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیجئے سورج نکلنے سے پہلے اور سورج غروب ہونے سے پہلے)

کیونکہ یہ علاج بہت نافع تھا اس لئے متعدد جگہ بتلادیا تا کہ غافل بھی اس سے غافل نہ رہے مگر افسوس اس کی قدر نہ کی اور وہ احمق جن کو تصنیف کا سلیقہ نہیں اس تکرار پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ قرآن مجید میں تکرار ہے۔ صاحبو! مکررات قرآن میں عین شفقت ہے۔

دیکھو ایک تو حاکم کا اعلان ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اعلان کردیا کہ گھر کے سامنے کوڑا نہ ڈالے اور ایک باپ کا کہنا ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ کہا نہ مانا پھر تنبیہ کرتا ہے پھر نہ ماننے پر پھر کہتا ہے۔ تو ان دونوں کے کہنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باپ کا بار بار کہنا شفقت سے ہے اور اعلان حاکم میں شفقت نہیں۔ تو قرآن مجید میں مکررات بوجہ شفقت خداوندی کے ہیں اور کیوں نہ ہو جب کہ اس کو ہم پر والدین سے زیادہ شفقت ہے۔ مگر افسوس! تم نے اس شفقت کی یہ قدر کی اور پھر اپنی خبر نہیں۔ صاحبو! اگر تکرار موجب نقص ہے تو تم اپنے اعتراض کو پچاسوں مرتبہ کیوں دہراتے ہو؟

خیر یہ تو لطیفہ ہے۔ غرض یہ ہے کہ تکرار محض شفقت کی وجہ سے ہے تو اس علاج کو شفقت سے حق تعالیٰ نے کئی جگہ بتلایا ہے۔ میرا مقصود مستورات کے مجمع میں اس قسم کا بیان نہ تھا۔ مگر اتفاق سے دقیق ہوگیا۔

تنگی کا علاج

خیر! میں اب عورتوں کے متعلق کچھ بیان کرتا ہوں کہ اگر کچھ تنگی ہوا کرے تو اس کا علاج خدا کی یاد سمجھ لو اور اس کو دستور العمل بنالو کہ مثلاً جب چوری ہو جائے طاعون آ جائے جو بھی شکایت ہو اس کا علاج یہ مت کرو کہ گاتے پھرو۔ بلکہ خدا کی یاد سے علاج کرو اور یہ نہ سمجھنا کہ خدا کی یاد کرنے والی وہی ہے جو ذاکر کہلاتا ہو نہیں بلکہ جس طرح ہو سکے ہر طاعت اس میں داخل ہے اور یہ بھی نہ کرو کہ زبان سے صرف سبحان اللہ سبحان اللہ رٹتے رہو اور دل پر اس کا اثر نہ ہو۔ ایسی تسبیح کا معتد بہ اثر نہیں ہوتا

بر زبان تسبیح درد دل گاؤ خر   ایں چنیں تسبیح کے دارو اثر

(زبان پر تسبیح اور دل میں گاؤ خر کا خیال، ایسی تسبیح کب اثر رکھتی ہے)

بلکہ زبان سے قلب سے ہاتھ پاؤں سے، سب سے ذکر کرو۔ چنانچہ زبان کا تو ذکر یہ ہے کہ بکثرت تسبیح و تہلیل پڑھو اور قلب کا ذکر یہ ہے کہ اس کی نعمتیں یاد کرو۔ اس سے یعنی تذکرہ نعم سے انفع اور کوئی طریقہ نہیں ہے موٹی بات ہے کہ نعمتیں مقدار میں مصیبتوں سے بڑھی ہوئی ہیں۔ دیکھو کہ اگر مرض بھیجا ہے تو اس کی دوا بھی فرمائی ہے

درد از یارست و درماں نیز ہم   دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم

یعنی درد بھیجا تو درماں بھی بھیجا۔ فرض کرو اگر مرض ہوتا اور علاج نہ ہوتا دوا نہ ہوتی۔ طبیب نہ ہوتا۔ تیماردار نہ ہوتے تو کچھ دشواری ہوتی یا نہیں ہمیں اپنے خدا سے محبت ہے تو ایسی حالت میں کچھ بھی نہ ہوتا۔ پھر بھی ہمیں ہراساں نہ ہونا چاہئے۔ تھا کیونکہ

درد از یارست و درماں نیز ہم   دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم

''درد دوست کی طرف سے ہے اور دوا بھی۔ دل اسی پر فدا ہے اور جان بھی''

ہر چہ می گویند آں بہتر ز حسن   یار ما ایں دارو وآں نیز ہم

''جو کچھ حسن کے متعلق لوگ کہا کرتے ہیں۔ ہمارا دوست یہ اور وہ سب رکھتا ہے۔''

قوت قلب

پھر علاج کرنے والے بھی وہ کہ جو آپ کے مزاج شناسا تیماردار، ایسے جو دل سے یہ چاہیں کہ میں بیمار ہو جاؤں۔ اور یہ اچھا ہو جاوے۔ تو ایسے معالج و خیر خواہ خدا نے پیدا کئے کہ اگر ہزار روپے بھی تنخواہ دی جائے تو

یہ ہمدردی ممکن نہیں جو کہیں اس کے بجالانے کو تیار، ہر طرح حاضر کہ جن سے ہر وقت قوت دل بڑھتی رہے کہ یہ خود بھی علاج ہے۔ چنانچہ بالاتفاق تمام طبیب کہتے ہیں کہ قوت قلب سے مرض دفع ہو جاتا ہے۔

چنانچہ والد صاحب نے مجھے الہ آباد سے کانپور لکھا کہ میں سخت بیمار ہوں تم چلے آؤ۔ میں گیا تو دفعتاً آنکھیں کھول دیں اور پندرہ منٹ میں مجھ کو اپنے ساتھ بازار لے گئے کہ امرود یہاں کے بڑے نفیس ہوتے ہیں اور فرمایا کہ تمہیں دیکھ کر اچھا ہو گیا۔

حدیث میں تاکید ہے کہ جب بیمار کے پاس جاؤ تو نفسوالہ فی اجلہ یعنی اس کو تسلی دو کہ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے یا ابھی تمہارا وقت نہیں آیا ہے حضورؐ ایک مریض کی عیادت کو تشریف لے گئے تو فرمایا لاباً س طہور ان شاء اللہ اس احمق نے کہا بل حمی تفر راجی خوف کیوں نہیں۔ بڈھے آدمی کو بخار چڑھا ہی نہیں ضرور اچھا نہ ہوں گا۔ آپؐ نے فرمایا اچھا ایسا ہی ہوگا۔ بالآخر وہ مر گیا۔ فال بد ایک قسم کی ناامید ہے رحمت حق سے سو کبھی اس کا اثر برا ظاہر ہوتا ہے۔

ہمارے وطن میں ایک لڑکی ہے۔ بچپن میں جب اس سے کوئی کہتا کہ تیرا بیاہ کب ہوگا تو وہ کہتی کہ بس اب کیا ہوگا۔ آخر اس کے بیاہ کی ایسی مشکل پڑی کہ اللہ اللہ کر کے بڑی مدت میں ہوا (اس وعظ کے آٹھ مہینہ بعد) مزن فالد بدکا ورد حال بد۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی کے لئے اسی لئے حکم فرمایا کہ طبیعت میں قوت بڑھے۔

آداب عیادت

ایک اور بات مریض کی طبیعت کی رعایت سے فرمائی کہ

من عاد منكم المريض فليخفف الجلوس. (مسند أحمد: ۳:۱۱۸)

(یا اور کوئی لفظ ہوں) یعنی مریض کے پاس تھوڑا بیٹھو۔ کیونکہ طبعی بات ہے کہ بے تکلفی ہر ایک سے نہیں ہوتی۔ تو اگر کوئی آکر پاس بیٹھا تھا اب مثلاً اس کی طرف پاؤں نہیں پھیلاتا۔ پشت نہیں کرتا۔ ادب کی وجہ سے اور اس سے اس پر بوجھ پڑتا ہے۔ اور تکلیف ہوتی ہے۔

فقہاء نے خوب لکھا ہے کہ بعض لوگ بعض دنوں میں عیادت کو منحوس سمجھتے ہیں تو اس دن میں ان کی عیادت نہ کرو کیونکہ ایک تو اس وقت اس کو اذیت ہوگی۔ دوسرے اگر اس کو کوئی ضرر پہنچ گیا تو اور زیادہ عقیدہ خراب ہوگا۔ اور یہ وقت اس کے جہل کے علاج کا وقت نہیں۔ یہ مرض کے علاج کا وقت ہے۔ پھر دوسرے وقت سمجھا دینا۔ مگر عیادت کے جلسہ میں۔ غرض عیادت میں خلل

کیوں ڈالتے ہو۔ تو ہمارے فقہاءؒ نے عجیب وغریب حقائق سمجھے ہیں۔ واقعی فقیہ بننا ہر ایک کا کام نہیں۔ کثرت روایت سے فقیہ نہیں ہوتا۔ فقہ اس کا نام ہے حافظ نے خوب کہا ہے ؎

نہ ہر کہ چہرہ برا فروخت دلبری داند ۔۔۔ نہ ہر کہ آئینہ دارو سکندری داند

ہزنکتہ باریک تر زمو اینجاست ۔۔۔ نہ ہر کہ سر بترا شد قلندری داند

''ہر چہرے کا چمکانے والا محبوب نہیں ہوسکتا۔ ہر آئینہ رکھنے ولا سکندر نہیں بن سکتا۔ ہر سر منڈا قلندر نہیں ہوسکتا۔ قلندری کے لئے بال سے بھی زیادہ باریک رموز کا جاننا لازم ہے۔''

حیات آخرت

صاحبو! یہ انہی حضرات کا کام تھا کہ بخاری اور ترمذی سے مسائل استنباط کریں۔ غرض نعمتوں کے یاد کرنے سے بھی تنگی خاص طور پر دور ہوتی ہے۔ اور قلب کی یہ بھی یاد ہے کہ وطن اصل کو یاد کرو کہ وطن اصلی کی یاد سے بھی تنگی دور ہوگی اور ہمارا وطن اصلی آخرت ہے تو مصیبت کے وقت آخرت کی باتوں کو یاد کرنا چاہئے وہاں کے ثواب وعذاب پر غور کرنا چاہئے فرماتے ہیں۔

وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ط وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ط وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ م لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (پ ۲۱)

یعنی اصل حیات دار آخرت کی ہے اور حیات دنیا عارضی ہے۔ افسوس! اس کو حیات نہ سمجھا کہ بلکہ اس کا نام موت رکھا۔ البتہ جو لوگ حقیقت سمجھ گئے وہ یہ کہتے ہیں۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ۔۔۔ راحت جاں طلبم و زپے جانا بروم

نذر کردم کہ گرایں غم بسر آید روزے ۔۔۔ تادر میکدہ شاداں وغزلخواں بروم

جس دن میں اس ویران جگہ سے جاؤں گا خوش ہوں گا۔ جاناں کے پیچھے جا کر راحت جان پاؤں گا۔ میں نے منت مانی ہے کہ اگر یہ غم عشق کبھی ختم ہوگیا تو میکدہ کے دروازے تک خوش خوش غزل خوانی کرتا جاؤں گا''۔

خوشا وقتے و خرم روز گارے ۔۔۔ کہ یارے برخوردا ز وصل یارے

وہ وقت بڑا اچھا ہوتا ہے جب ایک دوست دوسرے دوست سے ملاقات کرے۔''

بس! وہ موت سے خوش ہیں اس کی تمنا کررہے ہیں ان کی یہ حالت ہوتی ہے۔ پھر یہ سوچو

کہ یہاں کیا ہے۔ یہاں عیش کا کون سا سامان ہے جو وہاں نہیں اور یہاں جو سامان ہے اس سب کا منغص کرنے والا خوف انقطاع ہے۔ گھٹا کی رات اور حسرت بڑھا کی

بخلاف عیش آخرت کے کہ اگر معصیت نہ کی تب تو لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ۔ (پ ا) (اور نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے) وہاں ہر سامان عیش موجود ہے۔

فِيۡهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخۡلٌ وَّرُمَّانٌ (پ ۲۷)

(ان دونوں باغوں میں میوے اور کھجوریں اور انار ہوں گے)

اور فِيۡهِنَّ خَيۡرٰتٌ حِسَانٌ (ان میں خوب سیرت خوب صورت عورتیں ہوں گی یعنی حوریں) اور حُوۡرٌ مَّقۡصُوۡرٰتٌ فِي الۡخِيَامِ اور لَمۡ يَطۡمِثۡهُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَهُمۡ وَلَا جَآنٌّ (وہ عورتیں گوری رنگت کی ہوں گی اور خیموں میں محفوظ ہوں گی اور ان لوگوں سے پہلے نہ ان پر کسی آدمی نے تصرف کیا ہوگا اور نہ جن نے) اور مُتَّكِـِٕيۡنَ عَلٰى رَفۡرَفٍ (پ ۲۷) شاید کسی کو یہ شبہ ہوتا کہ اور تو سب چیزیں ہوں گی مگر گہنا پہننا نہ ملے گا۔ اور بعضوں کا تو یہاں بھی پہننے کو جی چاہتا ہے۔

ایک مولوی صاحب بڑھے گوٹے پٹھے کے کپڑے پہننے کی تمنا کیا کرتے تھے۔ پنکھے میں گوٹا ٹکوایا کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ نابینا سے بینا ہوئے تھے سو اللہ تعالیٰ نے زیور پہننے کی بھی خبر دے دی کہ يُحَلَّوۡنَ فِيۡهَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَهَبٍ وَّلُؤۡلُؤًا۔ (پ ۱۷) کہ خوب پہنو۔ اب کیا چاہتے ہو۔ حضورؐ نے فرمایا کہ وہاں موتیوں کے مکان و باغ ہیں کہ جن میں نہریں جاری ہیں اور وہاں کی نعمتوں کا کیا بیان ہوسکتا ہے ان کی نسبت اتنا سمجھ لینا چاہئے کہ **اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطرہ علی قلب بشرٍ** (مسند أحمد ۲: ۴۳۸) اور جو کچھ نام ونشان آئے ہیں وہ صرف مشابہت پر مبنی ہیں ورنہ

چہ نسبت خاک را با عالم پاک (خاک کو آسمان سے کیا نسبت)

اور وہاں ایک عجیب لطف ہوگا کہ بہت سے میووں کی صورت یکساں ہوگی اور مزہ مختلف۔ چنانچہ ارشاد ہے وَاُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا (پ ا) کہ جنت کے میوہ جات صرف رنگ و اسم میں متشابہ و مشترک مگر چکھنے کے بعد ممتاز۔ اس میں ایک خاص لطف ہوتا ہے کہ سمجھے تھے کچھ نکلا کچھ۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک حکایت بیان فرمائی کہ دو شخص کسی امیر سے ملنے گئے۔ ناشتہ کا وقت تھا۔ اس نے باورچی سے کہا ناشتہ لاؤ۔ ایک پر تکلف دستر خواں بچھا اور

نہایت پتلی چپاتیاں آئیں، قورمہ آیا۔ ایک پیالہ میں اور ایک چھوٹی طشتری میں میٹھے چاول وہ اس مقدار قلیل کو دیکھ کر جل گئے۔ اور جلدی جلدی جو کچھ سامنے تھا سب صفاچٹ کر گئے جب کھا چکے تو باورچی نے کہا یہ پیالہ اور طشتری بھی کھا لیجئے۔ وہ یہ سمجھے کہ تمسخر کرتا ہے۔ ناخوش ہوئے۔ اس نے معافی چاہ کر پھر کہا۔ توڑا تو نمکین بالائی اور میٹھی بالائی۔

تو صاحبو! جب دنیا میں ایسے لطائف وغرائب ہیں تو وہاں کے لطائف کس سے بیان ہو سکتے ہیں۔ وہاں اسی قسم کے انار ہوں گے جن کو توڑتے ہی اس میں حور سی نمودار ہو گی اور نکل آئے گی۔

جب میں کانپور میں تھا تو ایک شخص سائز عبداللطیف صاحب کے پاس حاضر ہوا تھا۔ مدرسہ میں آ کر کہنے لگا کہ میں ایسا عمل جانتا ہوں کہ ابھی دیوار شق ہو جاوے اور اس میں سے ایک عورت نکلے جو غزل اس سے کہیں وہی گاوے گی۔ ہم نے اس کو عجیب سمجھا تھا وہاں رات دن ایسا ہوا کرے گا۔

غرض! ساری چیزیں عیش وعشرت کی وہاں موجود ہیں۔ خدا جزائے خیر دے اہل سنت کو۔ کہ کتاب وسنت سے ثابت کر دیا کہ لگا ہوا باغ یہ نہیں کہ لگے گا۔ اس سے جو تسلی ہو سکتی ہے وہ بھی رافع ضیق ہے۔ اسی طرح کے حور وقصور اور میوے وہاں تیار ہوں گے۔ بعض روایات میں تصریح ہے فرماتے ہیں۔ **الجنة قيعان و غراسها العمل الصالح.(لم أجد الحديث فی "موسوعة أطراف الحديث")**

اب ایک نعمت اور باقی رہ گئی کہ سب کچھ ہو گا۔ اور اس کے ساتھ سب سے بڑھ کر خلود ہو گا کہ تم لیتے لیتے تھک جاؤ گے۔ مگر ان کی نعمتیں ختم ہی نہ ہوں گی۔ سو تمہارا وطن اصلی یہ ہے اور وہ دن بہت دور بھی نہیں کہ جب قیامت آوے گی تب ملے گا نہیں بلکہ مرتے ہی مل جاوے گا۔

مراقبہ موت

مگر شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ مرنے کا تصور تو منغص ہے تو اس کا تصور یوں کیا کرو کہ ایک کمرہ ہے۔ ہم اس کی چھت کے نیچے ہیں اور جنت اس کی چھت پر ہے اور وہ کمرہ آسمان ہے بس یہاں سے وہاں چلے جائیں گے۔ مرنا کیسا رہا۔ یہ خیال کہ بڑی دور ہے وہاں تک رسائی کیسے ہو گی۔ تو اس سے بے فکر رہو۔ سرکاری اور قدرتی ریل گاڑی تم کو دم کے دم میں پہنچا دے گی۔

اب ایک خیال اور ہو گا کہ دنیا میں تو ایسے ہیں جیسا کہ پاخانہ میں اور پھر اس میں آلودہ بھی ہو رہے ہیں۔ تو یہاں سے نکل کر فوراً کیسے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ تو سنو! کہ وہاں نہر الحیوۃ وحمام ہے۔ جھٹ غسل دے کر حکم ہو گا کہ لے جاؤ باغ میں۔ مگر خدا کے واسطے کہیں باغ والے کا انکار نہ کر دینا

اور نہ باغ کی خبر دینے والے کا۔ تو حق تعالیٰ کی یہ نعمتیں ہیں۔ ان کے سوچنے کے بعد کوئی مصیبت نہیں رہتی۔ اور یہ طریقے ہیں حب دنیا گھٹانے کے اس سے دنیا کی بے وقعتی ذہن نشین ہوتی ہے اور آنکھیں کھل جاتی ہیں اور جن کی آنکھیں کھل گئیں وہ یہاں کے مال وجاہ کو بے وقعت سمجھ کر یہ کہتے ہیں۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی　　بے زرو گنج بصد حشمت قاروں باشی

اے دل اگر شراب عشق پیے تو بغیر خزانے کے تجھے قاروں کا مرتبہ حاصل ہو جائے۔

درره منزل لیلےٰ کہ خطرہا ست بجاں　　شرط اول قدم انست کہ مجنوں باشی

لیلےٰ تک پہنچنے میں جان کیلئے بہت خطرے ہیں اور پہلے قدم اٹھانے کی شرط یہ ہے کہ تو مجنوں ہو جائے۔

آز مودم عقل دور اندیش را　　بعد ازیں دیوانہ کر دم خویش را

میں نے اپنی دوراندیش عقل کو آزمالیا اور پھر دیوانہ بنا۔ !اور فرماتے ہیں۔

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم　　مست آں ساقی و آں پیانہ ایم

ہم قلاش ہیں یا دیوانے، اپنے ساقی اور پیانے کے مست ہیں۔

محبت کا اثر

حضرت اہل محبت سے یہ بعید نہ سمجھو۔ دیکھئے دنیا میں جب کسی سے محبت ہوتی ہے تو اس کی طلب میں کتنی ہی ذلت اٹھانی پڑے سب گوارا ہوتی ہے بلکہ جب دیکھتے ہیں کہ اسی کے تصرف سے ہے تو پھر احتمال بھی ناگواری کا نہیں ہوتا۔ اسی کی نسبت کہتے ہیں۔

از خدا داں خلاف دشمن دوست　　کہ دل ہر دو در تصرف اوست

دوست دشمن کی بات خدا کی طرف سے ہے کیونکہ دونوں دل اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

بس یہ تو سب مشینیں ہیں جو کہ کسی کے چلانے سے چلتی ہیں اور بدوں اس کی اعانت کے بیکار محض ہیں لیکن جس نے اصل چلانے والے کو نہیں دیکھا وہ سمجھ رہا ہے کہ انہیں سے آٹا پستا ہے مگر اہل معرفت سمجھتے ہیں کہ ان کی رفتار عارضی ہے اصلی نہیں ہے۔ یہ اپنی رفتار میں غیر کے محتاج ہیں۔

دو دہاں داریم گویا ہمچونے　　یک دہاں پنہاں ست درلب ہائے وی

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما　　ہائے ہوی درفگندہ درسما

ماچو چنگیم و تو زخمہ مے زنی　　زاری ازمانے تو زاری میکنی

''بانسری کی طرح ہمارے دومنہ ہیں ایک منہ بجانے والے کے لبوں میں ہے اور دوسرے منہ سے آواز نکل رہی ہے جس نے زمین وآسمان میں ہل چل مچادی۔ ہم تو چنگ کی طرح ہیں مضراب لگانے والے تم ہو۔ یہ رونا ہمارا رونا نہیں تمہارا رونا ہے۔'' اور فرماتے ہیں

ما ہمہ شیراں ولے شیر علم   حملہ شاں زا باد باشد و مبدم

حملہ شاں پیدا وُناپیدا است باد   آنچہ ناپیدا است ہرگز کم مباد

''ہم تو پرچم کے شیر ہیں جو ہوا ہو تو حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان کا حملہ ظاہر ہوتا ہے اور ہوا پوشیدہ۔ اور جو پوشیدہ ہے (خدا کرے) وہی کم نہ ہو۔ اور فرماتے ہیں

عشق من پیدا و معشوقم نہاں   یار بیروں فتنہ او درجہاں

میرا عشق ظاہر ہے اور معشوق مخفی۔ دوست کے حسن نے جو فتنے اٹھائے وہ تو موجود ہیں۔ مگر دوست مخفی ہے۔ غرض سب کچھ ادھر ہی سے ہے مصیبت ادھر سے دکھ ادھر سے۔ مگر یاد رکھو کہ محبت پیدا کرلو۔ بس سب مصیبتیں آسان ہیں۔

از محبت تلخہا شیریں بود (محبت سے تلخیاں میٹھی ہوجاتی ہیں)

ورنہ پھر مصائب کفر کا پھاٹک ہے اور اس محبت پر میں خوشخبری دیتا ہوں کہ جن کو محبت ہے اپنے اللہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں ویحبھم ویحبونہ مولانا فرماتے ہیں

آب کم جو تشنگی آور بدست   تا بجوشد آبت از بالاؤ پست

تشنگاں گر آب جویند از جہاں   آب ہم جوید بعالم تشنگاں

پانی نہ ڈھونڈ پیاس پیدا کر۔ تاکہ پانی ہر طرف سے تمہارے پاس آئے پیاسے پانی کو ڈھونڈتے ہیں تو پانی بھی پیاسوں کی تلاش کرتا ہے۔

تو جب ہم اللہ کو اپنا محبوب بنالیں گے تو اللہ ہمیں اپنا محبوب بنالے گا تو محبت ادھر سے بھی ہوگی۔ مگر فرق یہ ہے محبوب کا عشق خفی ہوتا ہے اور عاشق کا عشق ظاہر کہ عاشق تمام عالم میں غل مچادیتا ہے۔

علامت قبول طاعت

باقی یہ بات کہ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اللہ کو بھی ہم سے محبت ہے تو اس کی علامت یہ ہے کہ قلب میں باری تعالیٰ ایک تعلق اپنے ساتھ پیدا کردیتے ہیں جس سے ذکر وطاعت آسان ہوجاتا ہے۔ بس یہی علامت ہے کہ ہم بھی مقبول ومحبوب ہیں۔

حضرت حاجی صاحب نے قبول عبادت کی یہ علامت بتلائی ہے کہ جب پھر اسی کے کرنے کی توفیق ہو تو سمجھ لو کہ پہلی عبادت مقبول ہو گئی ورنہ دروازہ پر پھٹکنے ہی کیوں دیتے۔ مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کوئی عابد تھا ایک بار مایوس ہو کر کہ وہاں سے کچھ پتہ ہی نہیں ملتا۔ سو رہا۔ فرشتہ آیا اور کہا

گفت آں اللہ تو لبیک ماست — ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

فرشتے نے بتلایا کہ یہ سوز و درد ہمارے قاصد ہیں۔

تو یہ درد شوق ہمارا قاصد ہے اور یہ علامت ہے کہ خدا کو محبت ہے یہ ہے علاج مصائب کا۔ صاحبو! بڑے بڑے عقلا یوں سمجھتے ہیں کہ رونے سے نفع ہوگا مگر جو ہم بتلاتے ہیں اسی سے نفع ہوگا اور تسلی اسی سے ہوگی یعنی مشغولی و توجہ بحق یہ ہے تسلی کا سرمایہ۔ بات تو مختصر تھی مگر تمہیدوں میں لمبی ہو گئی۔ مگر یہ طول سب جھالر اور چین تھے۔ اگر یہ نہ ہو تو کپڑا تو ہو یعنی اصل مقصود۔

توکل و رضا

وہ یہ کہ جب مصیبت آوے خواہ عام جیسے طاعون یا خاص جیسے۔ مقدمہ۔ پس اگر تم نے یہ طریقہ مشغولی و تعلق بحق اختیار کیا جو میں نے بیان کیا تو وہ مثال بہلول کی مخاطب بزرگ کی صادق آوے گی۔ کہ بہلول نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کیسا مزاج ہے کہا کہ ایسے شخص کے مزاج کا کیا پوچھنا کہ تمام مخلوق اس کی خواہش کے موافق چلتی ہو۔ کوئی کام اس کے ارادے کے خلاف نہ ہوتا ہو۔ بہلول نے شرح پوچھی۔ فرمایا کہ میں نے اپنے ارادہ کو اس کے تابع کر دیا ہے جس کے بدوں حکم ایک ذرہ نہیں ہل سکتا تو جب اپنی خواہش کو اس کے تابع کر دیا۔ تو جو واقعہ اس کے ارادہ کے موافق ہوگا۔ میرے ارادہ کے بھی موافق ہوگا پھر غم کہاں۔

یہ توکل و رضا وہ ہے کہ جو کچھ ہوگا یہی سمجھو گے کہ بہت مناسب بہت بہتر پس لامحالہ وہ حالت ہو جاوے گی جو ان بزرگ کی سنی اور واقعی اگر غور کرو تو بلاؤں میں بھی نعمتیں ہیں جب رضا و طاعت اختیار کرو گے ان مصائب کے اسرار بھی منکشف ہو جاویں گے جس سے اور تسلی ہوگی۔ اسی انکشاف کو مولانا فرماتے ہیں۔

بینی اندر خود علوم انبیاء — بے کتاب و بے معید و ادستا

اپنے اندر تم انبیاء کے علوم پاؤ گے بغیر کتاب اور بغیر استاد کے سب کچھ سمجھ آنے لگے گا۔

منجملہ اسرار بلا کے ایک وہ ہے جو تفسیر مظہری میں ایک حدیث سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں کہ بعضے میرے بندے ایسے ہیں کہ اگر انکو تندرست و متمول رکھوں تو وہ کفر کرنے لگیں۔ چنانچہ اس حدیث کے آخر میں فرماتے ہیں۔ وذالک بانی اعلم بعبادی۔ بعض کی نسبت ارشاد ہے وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ جیسا حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو توڑا تھا۔ بظاہر کوئی مصلحت نہ تھی۔ چنانچہ حضرت موسٰیؑ نے اعتراض کیا۔ مگر اس میں کتنی بڑی مصلحت نکلی۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حکمت و مصلحت سے بھرا ہوتا ہے۔ **فعل الحکیم لا یخلوا عن الحکمة**۔ (دانا کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا) چنانچہ ایک مصلحت یہ ہے کہ اہل مصیبت کو وہ وہ درجے ملیں گے کہ اغنیاء یہ تمنا کریں گے کہ کاش! ہمارا بدن..... قینچیوں سے کاٹا جاتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم خود بلا مانگو۔ تم تو عافیت ہی مانگو۔ اگر وہ مراتب اور عافیت دونوں دے دیں۔ تو ان کے یہاں کس چیز کی کمی ہے۔ حضورؐ بیماری سے بچنے کی بھی دعا مانگتے تھے اور عافیت کی بھی۔ تم بھی ہر مراد مانگو۔

صورت شکر

مگر ساتھ ہی یہ نیت کرو کہ اگر حاصل ہوگئی تو شکر کی توفیق عطا ہو اور اگر حاصل نہ ہو تو شکایت نہ ہوگی۔

پس ایسا شخص ہمیشہ ہر حال میں تسلی کے ساتھ رہتا ہے۔ حضرت ایسا شخص جھونپڑوں میں محلوں کے خواب دیکھتا ہے گو ظاہر میں وہ خستہ حال ہو مگر حقیقت میں وہ بادشاہ ہوتا ہے۔

فرماتے ہیں ایسا شخص تمام لوگوں کی نظروں میں محبوب ہو جاتا ہے اور اگر ظاہر میں اس کے پاس ساز و سامان نہیں ہوتا۔ مگر حقیقت میں ان کی یہ حالت ہوتی ہے

گدائے میکدہ ام لیکن وقت مستی بیں   کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

''ہوں تو میں میکدہ کا فقیر مگر مستی کے وقت آسمان پر ناز کرتا ہوں اور ستاروں پر حکم چلاتا ہوں۔''

اور کہتے ہیں

مبیں حقیر گدایاں عشق راکیں قوم   شہان بے کم و خسراں بے کلہ اند

''عشق کے گداؤں کو حقیر نہ جان کہ یہ قوم بے کمر اور بے تاج کے بادشاہ ہیں۔''

پس حاصل علاج کا یہ ہوا کہ نافرمانیاں بالکل چھوڑ دو۔ دعائیں مانگو۔ ہر نتیجہ پر راضی رہو۔ یہ ہے وہ نسخہ جس کو حق تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے۔ اس کے استعمال سے یہ گو ضروری نہیں کہ تنگی زائل ہو جائے۔ مگر مغلوب ضرور ہو جائے گی جس سے وہ کالعدم ہی ہو جاوے گی۔

دیکھو! کوزہ کی مصری میں جو تنکا ہوتا ہے وہ بھی مصری کے بھاؤ بکتا ہے تو اگر کچھ ضیق رہا بھی تو اس

میں بھی لطف ہوگا۔ چنانچہ عارف کو تکلیف میں بھی ایک لطف ملتا ہے۔ اب چونکہ بعضے ایسے لوگ تھے کہ تنگی کے وقت تو عبادت کرتے ہیں لیکن جب تنگی دور ہو جاتی ہے تو چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے آگے فرماتے ہیں کہ ایسا نہ ہونا چاہئے بلکہ واعبد ربک حتی یاتیک الیقین۔ کہ موت آنے تک عبادت کرو پھر چھوڑ دو۔ لیکن خود عقل کا مقتضا تو یہ ہے کہ جب یقین آ جائے تو زیادہ کرنا چاہئے۔ موٹی بات ہے کہ اگر کسی کے سامنے پلاؤ کی رکابی آئے اور اسے یقین نہ آئے کہ پلاؤ اس وقت رک رک کر کم کھائے گا۔

لیکن جب یقین آ جائے تو اور دل کھول کر زیادہ کھائے گا۔ مگر یہاں عجیب بات ہے کہ جب یقین آ جائے تو بہت ظاہر ہے کیونکہ محاورہ عربی میں یقین آنے کے معنی میں تیقن آتا ہے۔ اتیان یقین نہیں آتا۔ تو اگر یہ مراد ہوتی تو یوں فرماتے حتیٰ تیقن۔

غرض یہ معنی بالکل مہمل ہیں اور یہاں یقین کے معنی موت ہے۔ تو معنی یہ ہوئے حتی یاتیک الموت اور موت کو یقین اس لئے کہا کہ وہ یقینی ہے۔

سبحان اللہ! اس آیت میں میں نے دوا،غذا دونوں کو جمع کر دیا جیسا کہ میں نے مفصل بیان کیا۔ مگر اس علاج سے علی سبیل الکمال منتفع ہونے کے لئے بزرگوں کی صحبت کی سخت ضرورت ہے مولانا فرماتے ہیں۔

گر تو سنگ و خارہَ و سنگ مرمر شوی چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی ''اگر چہ تم جب کسی صاحب دل کے پاس جاؤ گے تو موتی بن جاؤ گے۔''

اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ مکمل نسخہ کو برتنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین یا رب العلمین۔

الاجر النبیل

تصحیح عقیدہ اور ازالہ غم کے متعلق یہ وعظ ۲۳ شعبان ۱۳۴۶ھ بوقت صبح ساڑے آٹھ بجے اپنے مکان پر حافظ جلیل احمد علی گڑھی کے بچہ کے انتقال کے سلسلہ میں بطور تعزیت کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا جو چار گھنٹے پانچ منٹ میں ختم ہوا۔ مستورات کے علاوہ ۵۰ کے قریب مرد بھی موجود تھے مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمْ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ط وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (پ ۱۰)

(ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمینوں کی اللہ ہی کے لئے ہے زندہ کرنا اور مارنا انکے اختیار میں ہے اور تمہارے لئے اللہ کے سوا اور کوئی حامی اور مددگار نہیں ہے)

تصحیح عقائد

یہ ایک آیت ہے سورۃ توبہ کی جس کا حاصل یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا مالک الملک ہونا ظاہر فرمایا ہے۔

اس وقت کے بیان سے مقصود غرض یہ ہے کہ ہمارے بعض احباب کو بعض واقعات حزن پیش آئے ہیں جس کا اثر ان کے قلب پر معمول سے زیادہ ہوا۔ کچھ تو شدت واقعہ کی وجہ سے کچھ ضعف قلب کی وجہ سے اور وہ اس وقت اسی غرض سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ تا کہ دین کی باتیں سن کر کچھ دل کو تقویت ہو۔

ان کے آنے کے ساتھ ہی میرے قلب میں یہ بات آئی تھی کہ اس کا سب سے بڑا علاج تصحیح عقائد و تبلیغ احکام ہے اور تصحیح عقائد مراد یہ ہے کہ عقائد صحیحہ کی یاددہانی کی جائے کیونکہ بحمد اللہ سامعین اور صاحب واقعہ سب کے عقائد صحیح ہیں۔ مگر واقعات حزن میں ان کی طرف التفات نہیں ہوتا اور نہ ان کو بالقصد ذہن میں حاضر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ لوگ اس سے بے خبر ہیں۔ کہ ان عقائد کو ازالہ غم میں دخل ہے۔

اس وقت میں اسی پر تنبیہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور تصحیح عقائد و تبلیغ احکام ہی سے اس حزن کے غم کا علاج کرنا چاہتا ہوں۔ اس مسئلہ کو اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر بیان فرمایا ہے۔

وَمَنْ يُّؤْمِنْ م بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ (پ ۲۸)

کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت کر دیتے ہیں۔

یہ تو ترجمہ ہے مگر اصطلاحی لفظوں میں اس کا حاصل یہی ہے کہ تصحیح عقائد سے ہدایت ہو جاتی ہے کیونکہ ایمان کے یہی معنی ہیں۔ اب رہا یہ کہ اس سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ تصحیح عقائد سے غم زائل ہو جاتا ہے کیونکہ ازالہ غم کا کوئی ذکر نہیں صرف ہدایت کا ذکر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ بے شک صرف ہدایت کا ذکر ہے مگر ہدایت کے لئے مفعول کی ضرورت ہے جو اس جملہ میں مذکور نہیں۔ تو سیاق و سباق میں تامل کر کے مفعول مقدر کرنا چاہئے سو اس سے پہلے ارشاد ہے: مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (پ ۲۸)

"کہ کوئی مصیبت بدون اذن خداوندی کے نہیں پہنچتی۔"

اس کے بعد ہے وَمَنْ يُّؤْمِنْ م بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ (پ ۲۸)

کہ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اس کے دل کو ہدایت ہو جاتی ہے۔

یعنی اس مضمون سابق کی کہ وہ مسئلہ قدر ہے اس کو ہدایت ہو جاتی ہے اس طرح سے اس کو مسئلہ تقدیر پر جزم و اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہو کہ اس کو ازالہ غم کی ہدایت ہو جاتی ہے کیونکہ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (کوئی مصیبت بغیر حکم خداوندی کے نہیں پہنچتی) کا مضمون ہی ایسا ہے جس کے استحضار سے مصیبت و غم زائل ہو جاتا ہے تو مضمون مذکور اور ازالہ غم کی ہدایت گویا دونوں مترادف ہیں اور اس کی بڑی دلیل مشاہدہ ہے جو لوگ اس مضمون پر جازم و مطمئن ہیں۔ ان کی حالت کو دیکھ لیا جائے کہ وہ مصائب و حوادث میں کیسے مستقل و صابر و شاکر رہتے ہیں۔ غرض تصحیح عقیدہ کو ازالہ غم میں بڑا دخل ہے۔

محل مصائب

مگر ازالہ سے مراد تسہیل وتخفیف ہے اور یہی مطلوب ہے زوال کلی مراد نہیں۔ کیونکہ طبعی غم کا زوال مقصود نہیں بلکہ اس کی خفت مطلوب ہے۔ ہاں اس خفت کے لئے لازم یا مثل لازم کے زوال ہے اور مثل لازم اس لئے کہا کہ بعض ضعیف طبائع کو عمر بھی خفیف سا غم یا کلفت رہتی ہے مگر اس کا ازالہ خود مطلوب ہی نہیں کیونکہ اس سے زیادہ اذیت نہیں ہوتی اور تھوڑی بہت کلفت تو کھانے میں بھی ہوتی ہے چنانچہ ظاہر ہے۔ خصوص آرام طلب لوگوں کو تو منہ میں لقمہ لے جانا ہی گراں ہے۔

چنانچہ واجد علی شاہ کے زمانہ کے احدیوں کو چھاتی پر رکھا ہوا بیر بھی منہ میں ڈالنا دشوار تھا۔ وہ اس کام کے لئے راستہ میں چلتے ہوئے سواروں کو پکارتے تھے کہ ذرا یہ بیر سینہ پر سے اٹھا کر ہمارے منہ میں ڈال دو۔ مگر کیا ان احمقوں کی رائے کو کوئی معتبر کہے گا اور کھانے پینے کو مصیبت یا دشوار کہے گا ہرگز نہیں چنانچہ قرآن میں بھی جوع کو تو مصائب میں شمار کیا گیا ہے۔ اکل کو مصیبت نہیں کہا گیا۔

یہ تقریر تو اس تقدیر پر تھی کہ یھد قلبہ کے لئے مفعول مقدر کیا جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ مقطوع عن المفعول ہو اور معنی یہ ہوں۔

من یؤمن ، باللہ یحصل لہ الھدایۃ ای الوصول الی المطلوب

کہ جس شخص کے عقائد صحیح ہوں اس کے دل کو ہدایت ہو جاتی ہے یعنی وہ ان مصائب و حوادث کے حکم و اسرار سے باخبر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو مصیبت مصیبت نہیں رہتی کیونکہ کوئی مصیبت اپنی ذات سے مصیبت نہیں بلکہ محل کے اعتبار سے مصیبت ہے۔ ممکن ہے کہ جو چیز ایک محل میں مصیبت ہو دوسرے محل میں مصیبت نہ ہو۔

چنانچہ قطع جلد تندرست کے لئے مصیبت ہے مگر مریض محتاج اپریشن کے لئے صحت ہے فاقہ تندرست کو مصیبت ہے اور مریض بدہضمی کے لئے راحت وصحت ہے وعلیٰ ہذا۔

اسی طرح یہ حوادث النفس واموال واولاد غیر عارف کے لئے مصائب ہیں مگر عارف کے لئے جو حکم تکوینیہ کو سمجھتا ہے مصائب نہیں۔ بہرحال تصحیح عقائد واعمال کو تخفیف وازالہء غم میں بڑا دخل ہے۔ اس لئے میرا ارادہ ہوا کہ اسی کو بیان کروں اور اس کے بعد بھی اگر کچھ غم رہے تو یہ نہ کہا جائے کہ علاج سے شفا کو تخلف ہوا۔ ہرگز نہیں۔ غم میں خفت ضرور ہوگی اور یہی مطلوب ہے زوال نہیں۔

محل غم

یہاں سے میں تصوف کا بھی ایک مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اخلاق رذیلہ کا جو مجاہدہ سے علاج کیا جاتا ہے اس سے بھی تخفیف ہی مقصود ہے یعنی انسان کا ایسا تقاضا نہیں رہتا جو مفضی الی المعصیت ہو جائے زوال مقصود نہیں کہ مطلب داعیہ واثر ہی نہ رہے۔ پس مجاہدہ کے بعد اگر رذیلہ کا اثر خفیف باقی رہے تو اس سے بددل نہ ہوں اور اس کو مجاہدہ کی ناکامی نہ سمجھیں کیونکہ تمام رذائل طبعی ہیں اور ان میں فی نفسہ مذموم کوئی نہیں بلکہ بوجہ افضاء الی المعصیت کے مذموم لغیرہ ہو جاتے ہیں۔

اور اگر کسی میں خلق رذیل موجود ہو مگر اس سے معصیت صادر نہ ہو تو وہ خلق رذیل ہی نہیں۔ نہ اس کے بقاء سے غم ہونا چاہئے۔ یہ بات تصوف کے متعلق درمیان میں یاد آ گئی تھی اس لئے اس کو حل کر دیا گیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ خفیف غم کا عمر بھر باقی رہنا بھی مضائقہ نہیں کیونکہ غم مطلقاً مضر نہیں ہے اگر غم فی نفسہ مذموم یا مضر ہوتا تو حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے غم تجویز نہ ہوتا۔ حالانکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے لئے غم تجویز ہوا۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے لئے غم تجویز ہوا۔ پس غم کوئی فی نفسہ مضر کوئی نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ افضاً الیٰ الخلال الدین کی وجہ سے مضر ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غم سے دنیا کا ضرر بہت ہوتا ہے۔ جیسے ضعف یا مرض وغیرہ تو میں اسی لئے ازالہ غم کا طریقہ بتلانا چاہتا ہوں۔ اور میں اسی آیت سے یہ بھی ثابت کروں گا کہ غم فی نفسہ مضر نہیں۔ ہاں اس کا التزام ضروری ہے کہ انسان خود اپنے لئے غم کو تجویز نہ کرے۔

صاحبو! عقائد اسلامیہ میں سے ہر عقیدہ کو ازالہ غم میں بڑا دخل ہے اور اس کی لم اور وجہ بیان کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ بلکہ اسلام کا بالخاصہ یہی اثر ہے کہ اس سے سکون واطمینان حاصل ہوتا ہے۔

برکات اسلام

اطباء جانتے ہیں کہ بعض اشیاء مفید بالکیفیت ہیں اور ان کے افادہ کی لم بیان ہو سکتی ہے اور بعض مفید بالخاصہ ہیں جن کے افادہ کی لم بیان نہیں ہو سکتی۔ مثلاً مقناطیس وقوت کہ بائیسہ میں جو فوائد ہیں وہ سب بالخاصہ ہیں۔ آج تک کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے اور زلزلہ آنے سے کچھ پہلے مقناطیس کی یہ قوت کیوں زائل ہو جاتی ہے۔ آخر اس کی کیا لم ہے۔ نیز اس کی کیا وجہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے گدگدی کیوں نہیں اٹھتی دوسرے ہی کے ہاتھ سے

اٹھتی ہے۔ عربی میں گدگدی کو دغدغہ کہتے ہیں شاید اسی کو بگاڑ کر گدگدی بنایا گیا ہو۔ غرض ثابت ہوا کہ بعض اشیاء موثر بالخاصہ ہیں۔ اس لئے ان کے لم کی وجہ بیان نہیں ہو سکتی۔

میرا خیال تو یہ ہے کہ ہر دوا موثر بالخاصہ ہی ہے۔ کیفیت کا نام ہی نام ہے کیونکہ مثلاً بنفشہ کے مزاج کی کیفیت جو ہے یعنی جس درجہ میں اس کی حرارت و یبوست ہے۔ اسی درجہ کی حار و یابس دوائیں بہت ہیں۔ مگر وہ زکام میں گل بنفشہ کی طرح نفع نہیں کرتیں۔ اور ہم جیسے طالب علموں کو طب میں مہارت نہیں۔ تو خدا تعالیٰ نے عقل تو دی ہے۔ اس لئے وہ طب کے بعض مسائل میں عقلی گفتگو کر سکتے ہیں۔ اور خیر! طب کے متعلق کوئی میرا قول مانے یا نہ مانے لیکن عقائد اعمال شرعیہ کے متعلق تو میں یہی کہوں گا کہ سب مفید بالخاصہ ہیں۔ اور میں اس پر قسم کھا سکتا ہوں اور کیوں نہ قسم کھاؤں۔ اول تو مجھے اس کا مشاہدہ ہے اور مشاہدہ بھی نہ ہو تو حق تعالیٰ کا ارشاد کافی ہے۔

اَلا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (جان لو کہ دلوں کو اطمینان اللہ کے ذکر سے ہوتا ہے) (پ ۱۳) وَمَنْ يُّؤْمِنْ م بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ۔ (پ ۲۸) (اور جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو (صبر و رضا کی راہ دکھاتا ہے)

میں نے ایک اخبار میں ابھی ایک حکایت دیکھی ہے کہ امریکہ میں یا اور کہیں ایک بہت بڑا انگریز مسلمان ہوا ہے جو بڑے درجہ کا اور بڑا مالدار آدمی ہے۔ وہ سینما کمپنی میں افسر تھا جس میں بائیسکوپ اور فوٹو گراف کو ملا کر تماشا کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنے اسلام کا قصہ یہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ ہم کو یہ خیال ہوا کہ مسلمان کی اذان کا تماشا کیا جائے اور اذان کی آواز کو بند کر کے مؤذن کا فوٹو لیا جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے ہم نے ایک عربی مؤذن کو بلایا اور ہم آلات لے کر بیٹھے۔ اس نے آذان دینا شروع کی۔ بس یا تو ہم نے تماشے کے لئے موذن کو بلایا تھا یا خود ہی تماشہ بن گئے۔ یعنی کلمات اذان سے دل پر ایک چوٹ لگی اور میری حالت ہی بدل گئی۔ جب موذن اذان دے چکا تو میں نے اس کو اپنے خاص کمرے میں بلایا اور تنہائی میں اسلام کی تعلیم کو پوچھنا شروع کیا اور اس طرح اسلام قبول کر لیا۔

دیکھئے! حالانکہ اس شخص نے اذان کے کلمات کو سمجھا بھی نہ ہوگا کیونکہ اذان تو انگریزی میں نہیں ہوتی۔ جیسے ایک سرحدی نے کہا تھا کہ اذان پشتو میں ہوتی ہے۔ وہ بے چارہ ہندوستان آیا تھا اردو نہ سمجھتا تھا اور پشتو کوئی نہ بولتا تھا۔ اس لئے بڑا پریشان ہوا۔ ایک مدت کے بعد تنگ ہو کر کہنے لگے کہ یہاں کوئی پشتو نہیں جانتا۔ البتہ صرف دو چیزیں پشتو میں ہوتی ہیں۔ ایک تو اذان

پشتو میں ہوتی ہے دوسرے کتے پشتو میں بھونکتے ہیں (کیونکہ سرحد اور ہندوستان کی اذان یکساں تھی۔اور دونوں جگہ کے کتے بھی ایک ہی طرح بھونکتے ہیں۔)

تو کوئی ایسا عقلمند ہوتو اس کے نزدیک اذان انگریزی اور پشتو میں ہوسکتی ہے۔ ورنہ اذان تو سب جگہ عربی میں ہوتی ہے اور عربی کو انگریزی کیا سمجھتے خاص کر تماشا کمپنی کا ملازم اور اگر سمجھا بھی ہوتو اذان ایک مختصر کلام ہے جو محض اعلان نماز کے لئے اسلام میں مقرر کیا گیا ہے نہ اس میں دلائل و براہین نہ کوئی طویل مسئلہ ہے۔

ہاں! اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے ساتھ اسلام کے اصل الاصول توحید و رسالت کا اعلان ہے مگر اسی کا دیکھئے کیسا اثر ہوا۔ پھر جو مؤذن سینما کمپنی میں اجرت پر اذان دینے آیا ہوگا۔ اس کی معلومات کا حال بھی معلوم ہے ظاہر ہے کہ اس کے معلومات کیا ہوں گے۔ پھر اس اذان میں اخلاص بھی نہ تھا۔ چند پیسوں کے لئے بے محل اذان تھی۔ مگر ایک کافر کو ہدایت کرنے کے لئے اسلام کا اس شان کا ادنیٰ مؤذن بھی کافی ہے۔ بشرطیکہ مخاطب کی طبیعت میں سلامتی اور انصاف ہو۔ اور اس سے اندازہ کیجئے کہ زیادہ اور خالص علوم اسلامیہ کی تو کیا شان ہوگی۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　　صاف گر باشد ندانم چوں کند

جب مٹی ملی ہوئی شراب کا ایک گھونٹ دیوانہ بنادیتا ہے تو اگر صاف ہوجائے تو نہ جانے کیا کرے۔

سو وہ نومسلم انگریز لکھتا ہے کہ مجھے اس مؤذن سے تعلیمات اسلام کا جو کچھ بھی علم حاصل ہوا۔ اسی سے مجھے اسلام کی طرف میلان شروع ہوا اور بالآخر میں نے اسلام قبول کرلیا۔

اب اسلام کے بعد اس کا کیا حال ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ بس اسلام کی اور برکات کو تو بیان کرنا طویل ہے۔ ایک ظاہر اور کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ جو سکون و راحت میرے قلب کو اسلام کے بعد حاصل ہوا ہے یہ کبھی حاصل نہ تھا۔ مجھے سکون و راحت کی خواب میں بھی زیارت نہ ہوئی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد اب میری یہ حالت ہے کہ تمام دن اکیلا کمرہ میں پڑا رہتا ہوں۔ اور اسلام کی حلاوت کے مزے لیتا ہوں۔ بس میں ہوں اور خدا کی یاد ہے۔ نہ کسی سے ملنے کی خواہش رہی، نہ سیر و تفریح کی نہ مال کی محبت رہی نہ مکانات و جائیداد کی۔ ہائے! جو شخص عمر بھر لہو لعب میں مشغول رہا۔ اب دفعتاً اس کی وہ حالت ہوگئی۔

خلوت گزیدہ را بتماشا چہ حاجت ست　　　چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجت

گوشہ میں بیٹھنے والے کو سیر کی کیا ضرورت ہے۔ جب کہ دوست کی گلی میسر ہے۔ جنگل جانے کی کیا ضرورت ہے۔

صاحبو! دل صاف ہو جائے تو اسی کے اندر ایسی بہار نظر آتی ہے کہ کسی باغ اور تفریح گاہ کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

اے برادر عقل یک دم باخود آر　　　دمبدم در تو خزاں ست و بہار

''اے بھائی! تھوڑی دیر عقل سے کام لے۔ ہر وقت تجھ میں بہار و خزاں موجود ہے۔''

اور ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

ستم است گر بدست کشد کہ بسیر سرسمن درآ　　　تو زغنچہ کم ندمیدۂ درد دل کشا بچمن درآ

معشوق کا ظلم اگر تجھے باغ کی سیر پر مجبور کرے تو تو کہہ کہ تو غنچہ سے کم نہیں ہے۔ دل کا دروازہ کھول اور باغ میں آجا۔''

اور جس کو یہ دولت حاصل ہو اس کو کسی تکلیف اور مصیبت کی پرواہ نہیں رہتی۔ بلکہ وہ ہر حال میں خوش رہتا ہے کیونکہ اس کو ایک بڑی دولت حاصل ہے جس کے یہ خواص ہیں۔

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ　　　جنت ست آں گر چہ باشد قعر چاہ

ہر کجا دلبر بود خرم نشین　　　فوق گردوں ست سے قعر زمین

با تو دوزخ جنت ست اے جاں فزا　　　بے تو جنت دوزخ سے اے دلربا

جس جگہ خوبصورت معشوق ہوتا ہے وہ جگہ باغ ہو جاتی ہے چاہے گہرا کنواں کیوں نہ ہو۔ جس جگہ معشوق ہو خوش بیٹھ جا۔ نہ آسمان کی بلندی کا خیال کر۔ نہ زمین کی گہرائی کا۔ تیرے ساتھ تکلیف بھی راحت ہے۔ اے دوست اور تیرے بغیر جنت بھی دوزخ ہے اے دوست غرض! اسلام سے دولت حاصل ہوتی ہے کہ بندہ کو خدا مل جاتا ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

اتصال بے تکیف بے قیاس　　　ہست رب الناس راباجان ناس

لوگوں کی جان کیساتھ اللہ تعالیٰ کا شامل ہونا بغیر و ملیافت کے (جسکا اندازہ نہیں ہوسکتا) بےانتہا ہے۔

اثر اسلام

اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں جاہل صوفیا کی طرح یوں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دل میں سما جائے گا اور نعوذ باللہ! وہ انسان کے دل میں اتر جائے گا۔ اور جہلاء صوفیہ نے اس دعویٰ پر آیت وَفِیْ

اَنۡفُسِكُمۡ ط اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ (پ۲۶) سے استدلال کیا ہے جس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ خدا تمہارے اندر ہے پھر کیا دیکھتے نہیں ہو مگر یہ استدلال وترجمہ غلط محض ہے کیونکہ وفی انفسکم معطوف ہے وفی الارض پر جو آیت سابقہ میں ہے وَفِي الۡاَرۡضِ اٰيٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِيۡنَ۔ اور یہ معنی ہوئے کہ زمین میں اہل یقین کے واسطے نشانیاں ہیں اور تمہاری ذات میں بھی نشانیاں ہیں پھر کیا دیکھتے نہیں ہو۔

غرض میرا وہ مطلب نہیں جو ان جاہلوں کا ہے بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے بندہ کو خاص تعلق ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ کو بندہ سے خاص تعلق قرب ورضا کا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت اور حالت ہم بیان نہیں کر سکتے۔ اور قرب کا ثبوت نصوص میں موجود ہے۔

وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِ (پ۲۶)

(اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ)

وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡكُمۡ وَلٰكِنۡ لَّا تُبۡصِرُوۡنَ. (پ۲۷)

(اور ہم اس وقت (اس مرنیوالے) شخص کے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم سمجھتے نہیں)

(اور یہ محض قرب علمی نہیں ہے کیونکہ وہ قرب مبصر نہیں جس کی مخاطب سے نفی کی گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ کوئی دوسرا قرب ہے جو ابصار کے متعلق ہو سکتا ہے)

غرض محققین عارفین کو جو اثر اسلام کا مشاہدہ ہوتا ہے وہ اثر اس نو مسلم کو ابھی سے حاصل ہو گیا۔ اور یوں دیکھا گیا ہے کہ نو مسلموں کو اسلام کا اثر زیادہ مشاہد ہوتا ہے۔

گو نعمت ہمارے اوپر زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پشت ہا پشت سے ہم کو مسلمان کیا ہے۔ کیونکہ اسلام سے زیادہ مناسبت ہم کو ہی ہے۔ نو مسلم کو مناسبت دیر میں حاصل ہوگی۔ مگر اس کے اثر کا مشاہدہ نو مسلم کو ہم سے زیادہ ہوگا۔

بھائی کے یہاں ایک کارندہ تھے حاجی عبدالرحیم! جن کا اب انتقال ہو گیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم جب شروع شروع اسلام لائے ہوئے تھے کہ ابھی تک اس کا اظہار بھی کسی پر نہ کیا تھا۔ اور اس وقت چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس وقت کی نماز میں جو لطف آتا تھا وہ لطف پھر نہیں آیا۔

بات یہ ہے کہ اس وقت دولت نئی نئی ملی تھی اس لئے زیادہ لطف تھا (جیسے ذاکرین کو ابتدائے سلوک وابتدائے ذکر میں بہت ذوق وشوق ولذت وکیفیت حاصل ہوتی ہے۔ بعد میں یہ بات نہیں رہتی کہ ذکر سے مناسبت بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح نکاح میں اول اول بڑی لذت آتی ہے جو بعد

میں نہیں آتی۔ مگر مناسبت بعد ہی میں بڑھتی ہے اور ابتداً[1] میں گونہ اجنبیت ہوتی ہے۔

پس وہ انگریز لکھتا ہے کہ حقانیت اسلام کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس سے اطمینان کامل وسکون وراحت دل حاصل ہوتی ہے۔ اسلام کے برابر کسی چیز میں دل کی راحت اور سکون وچین نہیں۔

میرا مقصود تو اس حکایت ہی سے حاصل ہو گیا کیونکہ مجھے اس وقت یہی بیان کرنا تھا کہ ازالہ غم کا طریقہ یہ ہے کہ اسلام کو کامل کرلو۔ اس طرح کہ عقائد شرعیہ کو مستحضر رکھو اور احکام شرعیہ کی پابندی کر کے دیکھو۔ ان شاء اللہ راحت سے رہو گے۔ لیکن باوجود مقصود حاصل ہو جانے کے اس وقت میں ذرا تفصیل سے اس مضمون کو بیان کرنا چاہتا ہوں جس کی وجہ اور غرض اوپر معلوم ہو چکی ہے۔ پہلے میں آیت کا ترجمہ کردوں پھر مقصود کی تقریر کروں گا۔

کیفیت ایمان

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے سلطنت آسمان وزمین کی، وہی زندہ کرتے ہیں وہی مارتے ہیں اور تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔ یہ تو ترجمہ ہوا۔ رہا یہ کہ اس کو ماقبل سے ربط وتعلق کیا ہے۔ سو بظاہر اس کا ربط ماقبل سے غامض ہے کیونکہ اس کے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک واقعہ مذکور ہے۔

مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ط اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (پ ۱۱)

کہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لئے استغفار کرنا صرف ایک وعدہ کی بنا پر تھا جو اس سے کرلیا تھا۔ پھر جب یہ معلوم ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے (اور کفر ہی پر خاتمہ ہوا ہے) تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے بیزاری ظاہر کی اور اس سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو مشرکین کے لئے استغفار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

ان حضرات انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کو رحمت وشفقت اس قدر تھی کہ اپنے ستانے والوں سے بھی شفقت کا برتاؤ کرنا چاہتے تھے کہ ان کے لئے استغفار کرنے کو تیار ہو گئے تھے اور اس کا منشا یہ تھا کہ اس وقت صرف رحمت پر نظر تھی اور اللہ تعالیٰ کی سب حکمتوں پر اس قدر نظر نہ تھی جتنی بعد نزول آیات واحکام کے ہوئی اور اس میں کچھ نقص نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے اور خود رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لذت نفسانی کا مدار ہی اجنبیت پر ہے۔ ۱۲ جامع۔

علیہ وسلم کے علوم بھی تدریجاً بڑھتے تھے اور قبل وحی ان کے علوم کی وہ شان نہ تھی جو بعد وحی کے ہوئی۔ چنانچہ خود نص میں ہے وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ (پ۵) اور ایک مقام پر ارشاد ہے وقل رب زدنی علماً اور ایک جگہ تو ایسا ارشاد ہے کہ اس کو تو ہم لوگ زبان سے کبھی نہ کہہ سکتے تھے۔

مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ (پ۲۵)

کہ آپ کو وحی سے پہلے کچھ خبر نہ تھی کہ کتاب کیسی ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ نعوذ باللہ قبل از وحی حضور صلی اللہ علیہ وسلم خلوعن الایمان لازم آتا ہے ہرگز نہیں۔ کیونکہ آیت میں صرف علم وخبر کی نفی کی گئی ہے وجود ایمان کی نفی نہیں کی گئی۔ اور عدم علم مستلزم عدم وجود کو نہیں ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کے پاس ایک چیز ہو مگر اس کی اس کو خبر نہ ہو کہ میرے پاس یہ چیز ہے۔ جیسے ایک شخص کو جس نے جواہرات کبھی نہیں دیکھے تھے ہیرا یا قوت کہیں سے مل جائے تو یہ بات صادق ہے کہ اسکے پاس ہیرا یاقوت ہے مگر اس کو خبر نہیں۔

اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام میں وہ کیفیت نبوت سے پہلے بھی موجود ہوتی ہے جس کو ایمان کہا جاتا ہے مگر نبوت سے پہلے خبر نہیں ہوتی کہ اس کیفیت کا نام ایمان ہے۔ بعد نبوت کے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیفیت تو بہت بڑی نعمت ہے۔ اسی کا نام ایمان ہے۔ غرض نبوت و وحی سے پہلے رسول اللہ صلی علیہ وسلم کو بعض امور کا علم نہ ہونا۔ پھر وحی سے علم حاصل ہونا نقص نہیں۔ بلکہ عین کمال ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر کیا کمال ہوگا کہ آپ کے علوم بلا واسطہ حق تعالٰی کی وحی سے ماخوذ ہیں۔ عقل وقیاس یا تعلیم بشر پر ان کی بنیاد نہیں۔ مگر جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ الہ بنانا چاہتے ہیں وہ اس بات کے ماننے کو تیار نہ ہوں گے لیکن میں ان سے کہتا ہوں کہ تم اگر حضور کو الہ بناؤ گے تو الہ ناقص بناؤ گے۔ اور ہم آپ کو انسان کہتے ہیں۔ مگر انسان کامل کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر تو ہیں۔ مگر ایسے جیسے ایک بزرگ نے کہا ہے۔

بشر لا کالبشر بل ھو کالیاقوت بین الحجر

یعنی آپ بشر تو ہیں مگر اور آدمیوں کی طرح نہیں بلکہ ایسے ہیں جیسے پتھروں میں یاقوت۔ پتھر تو ہے مگر ایسا پتھر جس کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ پتھر ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انسانوں کے ساتھ نوع یا جنس میں تو اشتراک ہے مگر صنف ایسی ممتاز ہے کہ کسی کو دھوکا ہوسکتا ہے کہ آپ بشر نہیں کچھ اور ہیں اسی لئے بعض مغلوب العشق ایسی باتیں کہہ گئے

ہیں جو شان بشریت سے ارفع ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے

بمقامیکہ نشان کف پائے تو بود سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

''جس مقام پر آپ کے پائے مبارک کا نشان ہو۔ برسوں صاحب نظر لوگوں کا سجدہ ہوگا۔''

بے نظیر و بے مثال انسان

مگر ایک بات سمجھ لینا چاہئے کہ سجدہ علی القدم اور سجدہ للقدم میں فرق ہے یعنی کسی جگہ پر اس لئے نماز پڑھنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں نماز پڑھی ہے یہ سجدہ علی القدم ہے یہ حرام نہیں بلکہ اتباع سنت ہے اور سجدہ للقدم یہ ہے کہ آپ کا قدم یہاں پڑا ہے اس لئے اس جگہ کو سجدہ کرو۔ یہ حرام ہے مگر یہ شاعر غلبہ عشق میں کہہ رہا ہے اس لئے تکفیر نہ کی جائے (نیز چونکہ اس کے کلام میں سجدہ علی القدم ہونے کا بھی احتمال ہے گو بعید سہی اسلئے تکفیر سے احتیاط لازم ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسروں کی مثل ہونا نصوص میں مصرح ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہی ہے ایکم مثلی۔ مگر قرآن میں بھی اس مضمون کو دوسرے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (پ ۲۲)

کہ اے ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے متعلق ارشاد ہے اور ظاہر ہے کہ ازواج مطہرات کی یہ شان محض اس وجہ سے ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مثل کوئی بشر نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی شان امتیازی سے بعض لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے اور وہ حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔

اور آیت یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویو تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو) پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ آیت عَسٰی رَبُّہٗٓ اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُّبْدِلَہٗٓ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْکُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ (الآیۃ) (اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تم عورتوں کو طلاق دے دیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بی بیاں دے دے گا جو اسلام والیاں، ایمان والیاں، فرنبرداری کرنے والیاں، توبہ کرنے والیاں، عبادت کرنے والیاں، روزہ رکھنے والیاں کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں)

اس کے معارض ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کی مثل بلکہ ان سے بہتر دوسری عورتیں ہو سکتی ہیں۔ جبھی تو یہ ارشاد فرمایا گیا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو طلاق

دیدیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو تمہارے بدلہ میں تم سے بہتر عورتیں دیدیں گے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ ازواج مطہرات کی فضیلت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں رہنے ہی کی وجہ سے ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دے دیتے اور دوسری بیبیوں سے نکاح کر لیتے تو آپ کے نکاح کی وجہ سے اب وہ ان سے افضل ہو جاتیں۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا بے نظیر و بے مثال ہونا حدیث و قرآن دونوں سے ثابت ہے۔ مگر اس میں اتنا غلو نہ کرو کہ حضور کو الٰہ کہو بلکہ عبد کامل کہو۔

حدود عشق

یہاں سے میں اس مسئلہ پر بھی تنبیہ کرتا ہوں کہ عشق کی تمنا نہ کرو وہاں محبت کی تمنا کرو۔ کیونکہ عشق میں حدود کی رعایت فوت ہو جاتی ہے۔ عاشق کی زبان بے قابو ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں غلو کیا ہے۔ وہ اہل عشق ہی تھے۔

عاشق کی زبان کے بے قابو ہو جانے پر ایک حکایت یاد آئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ایک پرندہ نے مادہ سے کہا کہ اگر تو میرا جوڑا بن جائے تو میں تمہیں سلطنت سلیمان دے دوں گا۔ حضرت سلیمانؑ نے سن لیا اور وہ منطق الطیر کے عالم تھے۔ اس لئے مطلب بھی سمجھ لیا۔ فوراً بلایا اور فرمایا او گستاخ! یہ کیا بدتمیزی تھی؟ اس نے کہا حضور میں عاشق ہوں اور عاشق کی زبان بے قابو ہو جاتی ہے وہ عشق میں جو چاہے بکتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس جواب پر ہنس پڑے اور اس کو چھوڑ دیا۔

اسی طرح امید ہے کہ عشاق کو رب سلیمان بھی چھوڑ دے گا۔ اس لئے تم ان کو برا نہ کہو۔ ہاں! ان کی تقلید بھی نہ کرو۔ نہ ان کی حالت کی تمنا کرو۔ یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم میں وحی سے ترقی ہوئی اس لئے بعض اوقات صرف ایک پہلو پر نظر ہوئی جو داعی ہو گیا استغفار للمشرکین کی طرف اور وحی نازل ہونے سے دوسرے پہلو کی خبر ہوئی۔

قدر نعمت

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کو تدریجاً کیوں کامل کیا۔ ایک دم سے کامل کیوں نہ کر دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر ہیں کہ سب علوم ایک دم سے عطا فرماویں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی استعداد بھی کامل تھی۔ پھر تاخیر کیوں ہوئی؟

اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی حکمت ہوگی جو ہم کو معلوم نہیں دوسرا جواب اپنے ایک واقعہ کو بیان کر کے دوں گا۔ ایک دفعہ مجھے طریقے کے متعلق کچھ پریشانی پیش آئی اور اس وقت یہ خیال ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو اس پر بھی قادر ہیں کہ ہم کو اسی وقت وصال عطا فرما دیں۔ ایک مقدمہ اثبات قدرت ہوا۔ اور ان کو ہماری طلب کا حال بھی معلوم ہے خواہ ناقص ہو یا کامل مگر طلب تو ہمارے اندر ہے ہی۔

یہ دوسرا تیسرا مقدمہ ہوا۔ اثبات طلب۔ پھر وصال میں تاخیر کیوں ہے۔ اس خیال کے بعد میں نے مثنوی بطور فال کے کھولی (میرا یہ عقیدہ نہیں کہ مولانا آ کر ورق کھول جاتے ہیں۔ بلکہ محض برکت و تسلی کے لئے اس سے فال لینے لگا۔ اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ کوئی تسلی بخش جواب ظاہر فرما دیں) تو سر ورق ہی پر یہ اشعار نکلے جن میں بعینہ میرا سوال بھی مذکور تھا اور اس کا جواب بھی مسطور تھا فرماتے ہیں۔

چارہ می جوید پئے من وردِ تو　　　　می شنودم دوش آہ سرد تو

تیرا درد مجھ سے علاج طلب کرتا ہے۔ تیری سرد آہ کل میں سنتا تھا۔"

یہ گویا حق تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہے کہ ہم تمہاری آہ سرد سن رہے ہیں اور مجھے تمہارے درد و طلب کی بھی خبر ہے۔ اس میں اپنے علم کو اور ہماری طلب کو تسلیم کر کے دو مقدموں کو مان لیا گیا کہ یہ مقدمات صحیح ہیں۔

می توانم من کہ بے ایں انتظار　　　　رہ نمایم وادہم رہ گذار

"میں ایسا کر سکتا ہوں کہ بغیر اس انتظار کے راستہ بتاؤں اور گزرنے والا راستہ کھول دوں"

اس میں تیسرے مقدمہ کو تسلیم کر لیا گیا کہ یہ بھی صحیح ہے کہ میں اس پر قادر ہوں کہ بدوں تاخیر کے اسی وقت تم کو وصال سے سرفراز کر دوں۔

تا ازیں طوفان دوراں وارہی　　　　برسر گنج و صالم پانہی

تا کہ زمانے کے اس طوفان سے تو چھوٹ جائے اور میری ملاقات کے خزانہ پر تو قدم رکھے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ سب مقدمات تو صحیح ہیں لیکن ایک مقدمہ اور بھی اس کے ساتھ ملاؤ۔ جو تمہاری نظر سے مخفی رہ گیا ہے وہ کیا

لیک شیرینی و لذات مقر　　　　ہست براندازۂ رنج سفر

آنگہ از فرزند و خویشاں برخوری　　　　کز غریبی رنج و زحمت ہابری

"لیکن آرام اور خوشی آدمی کو سفر کی تکلیف کے اندازہ سے معلوم ہوتی ہے اس وقت اولاد اور اقارب اچھے معلوم ہوتے ہیں جب کہ مسافرت میں رنج و تکلیف اٹھاتے ہو۔"

اس مقدمہ کا حاصل اثبات حکمت ہے یعنی حکمت کا مقتضا یہی ہے کہ مقصود جلدی عطا نہ کیا جائے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ مستقر پر پہنچنے کی قدر زیادہ اس کو ہوتی ہے جس کو سفر میں تکلیف زیادہ ہوتی ہو۔ اسی کو گھر پہنچنے کی لذت کا زیادہ احساس ہوتا ہے اور جس کو سفر میں کلفت ہی نہ ہوئی ہو۔ اس کو گھر اور باہر دونوں یکساں ہوں گے تو وہ وصول المستقر کی قدر نہ کرے گا کیونکہ

ہر کہ اوارزاں خرد ارزاں دہد گو ہرے طفلے بقرض ناں دہد

جو شخص اس سے ستا خریدنا چاہے وہ ستا دیدیتا ہے اولاد جیسی نایاب چیز ایک روٹی کے بدلے دیدیتا ہے۔

ہم نے سنا ہے کہ بعض عورتیں اولاد سے گھبرا کر کہتی ہیں کہ اے اللہ! کیا سارے بچے میرے ہی واسطے پھوٹ پڑے۔ اے اللہ! بس اب بند کر دے اور جس کے اولاد نہیں ہوئی وہ کہتی ہے کہ چاہے چوہے کا بچہ ہی ہو جائے یا ہو کر فوراً ہی مر جائے مگر میرا نام ہو جائے۔ کہ ہاں اس کے بھی اولاد ہوئی تھی۔ جس کے اولاد نہ ہوتی ہو اس کو تمنا کے بعد بچہ مل جائے تو اس کی بڑی قدر کرتی ہے چاہے کیسا ہی برا ہو۔

کانپور میں ایک عورت کا بچہ ایسا کالا تھا جیسے حبشی۔ مگر اس سے اس قدر محبت تھی کہ کھلاتے ہوئے یوں کہتی تھی کہ ماشاء اللہ ایسا ہے جیسا چیونٹا اس کی سیاہی ایسی محبوب تھی کہ اس کو نظر لگ جانے کے ڈر سے ماشاء اللہ! کہا کرتی تھی۔ ایک شاعر اپنے محبوب کی تعریف میں جس کے بدن پر پھٹا ہوا کرتا تھا کہتا ہے

لا تعجبوا من بلی غلالته قد زرا از راره علی القمر

اسی طرح ایک شاعر کے معشوق کے چہرہ پر چیچک کے سیاہ سیاہ داغ تھے لوگوں نے ملامت کی کہ اس سے محبت کیسی؟ تو وہ اس کی تعریف میں لکھتا ہے

شربت قندست دردے تخم ریحاں ریختہ کھانڈ کا شربت ہے جس میں تخم ریحان چھڑکا ہوا ہے۔

ظہور حکمت

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ قدر اسی نعمت کی ہوتی ہے جو مشقت سے ملے تو حکمت اسی میں ہے کہ سب علوم و حکم ایک دم سے عطا نہ ہوں۔ بلکہ تدریجاً عطا کئے جائیں۔ یہ جواب تھا میرے سوال کا جو مثنوی سے نکلا۔ اور گو یہ جواب پہلے جواب کے قریب ہی ہے مگر اتنا فرق ہے کہ پہلے جواب میں کسی حکمت کا علی التعیین ذکر نہ تھا۔ اس میں حکمت معینہ کا ذکر بھی ہے۔ اب چاہے یہی حکمت ہو یا اور حکمتیں ہوں حکمت کا مقتضا یہی ہے کہ علوم میں شیئاً فشیئاً تزاید ہوا کرے۔

بہر حال صحابہ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اول رحمت پر تھی حکمت پر نظر نہ تھی اس لئے آپ

نے اور صحابہ نے مشرکین کے لئے استغفار کیا جب اس سے ممانعت نازل ہوئی تو حکمت پر نظر ہوئی۔ اور تزاید علوم تدریجاً میں ایک اور حکمت میری سمجھ میں ابھی آئی ہے۔ وہ یہ کہ اگر آپ کے علوم تدریجاً متزائد نہ ہوتے بلکہ شروع ہی سے رحمت وحکمت دونوں پر نظر ہوتی تو آپ کی شفقت ورحمت کا اس درجہ ظہور نہ ہوتا جیسا کہ اب ہوا کیونکہ اس حالت میں آپ کفار کے ساتھ رحمت وشفقت اس درجہ نہ فرماتے کہ ان کی بدحالی پر رنج وافسوس کرتے۔ حالانکہ اس میں بھی حکمت تھی کہ آپ کی اس شفقت ورحمت بے انتہا کا ظہور ہو۔ کیونکہ اس سے بہت سے کفار پر تو یہ اثر ہوا کہ ہم کو آپ سے بہت امیدیں ہوگئیں کہ

دوستاں را کجا کنی محروم　　　تو کہ بادشمناں نظر داری

''دوستوں کو تو کیوں محروم کرے گا جب کہ تو دشمنوں پر مہربانی فرماتا ہے۔''

ان حکمتوں کا ظہور جبھی تو ہوا کہ آپ کے علوم میں تزاید تدریجی ہوا اور نہ واقعات شفقت ورحمت کا اس شان سے ظہور نہ ہوتا۔ اسی لئے ملا دوپیازہ نے اپنے آل نامہ میں کہا ہے الرسول خیر خواہ دشمناں۔ واقعی سچ کہا۔ رسول کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ دشمنوں سے بھی خیر خواہی کرتے ہیں اور یہی راز ہے زلات انبیاء کا کہ اس میں بھی حکمتیں ہوتی ہیں جن میں بڑی حکمت یہی ہے کہ ان سے تزاید علوم تدریجاً ہوتا ہے۔ سو حضرات انبیاء علیہم السلام کے لیے زلات موجب تنزل نہیں ہوتیں۔ بلکہ ترقی کا سبب ہوتی ہیں۔

ہمارے حاجی صاحب فرماتے تھے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زلت میں ترقی معرفت تھی کیونکہ اب تک آپ نے بعض صفات جمال ہی کا مشاہدہ کیا تھا۔ صفت جلال کا جیسے منتقم اور بعض صفات جمال کا جیسے تواب کا مشاہدہ اس زلت کے بعد ہی ہوا اور یہی ترقی ہے کہ جن صفات الٰہیہ کا مشاہدہ پہلے نہ تھا اب ہوگیا۔ غرض حکمتوں کا احاطہ کون کرسکتا ہے بطور نمونہ کے اس وقت چند باتیں بتلادی ہیں۔

مشابہت ملت ابراہیمیہ

اب یہاں ایک اور سوال ہوتا ہے وہ یہ کہ یہ تو مسلم کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم میں تزاید تدریجی ہوا اور ابتداء میں آپ کی نظر رحمت پر تھی۔ لیکن رحمت کا ظہور اس صورت سے کیوں ہوا کہ اقرباء مشرکین کے لئے آپ نے دعا فرمائی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال بے جا ہے کیونکہ جس صورت سے بھی ظہور ہوتا ہے۔ اس میں یہی سوال ہوسکتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ ایسی صورت سے ظہور ہونا چاہئے تھا۔ جس میں ممانعت نہ ہوتی کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ اس صورت ہی میں کیا حرج ہوا۔ یہ فعل بعد ممانعت ہی کے تو ممنوع ہوا۔ اس سے پہلے تو مباح تھا۔ پھر فعل مباح میں کیا حرج ہوا۔

پس یہ سوال گو بے جا ہے۔ مگر میں تبرعاً اس کی حکمت بھی بتلائے دیتا ہوں وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اس لئے درود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے کما صلیت علی ابراہیم وعلیٰ اٰل ابراھیم جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء سابقین میں درجہ صلوٰۃ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے لئے عطا ہوا ہے ورنہ سلام تو سب انبیاء پر ہوا ہے۔

سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ (حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام پر سلام ہو) (پ۲۳) سَلٰمٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ ٥ (حضرت نوح علیہ السلام پر سلام ہو عالم والوں) (پ۲۳) سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ (پ۲۳) (ال یاسین پر سلام ہو)

اور اسی مشابہت شانین کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ملت ابراہیمیہ سے بہت مشابہت ہے۔ اسی لئے اتباع ملت ابراہیم کا آپ کو امر ہوا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مشرک باپ کے لئے استغفار کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی اس سنت کا اتباع فرمایا۔

رہا یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھر تو تبریٰ فرمادی تھی۔۔ جواب اس کا یہ ہے کہ آپ کو اس تبریٰ کی اطلاع وقت استغفار کے نہ تھی۔ اس اطلاع کے بعد پھر آپ نے استغفار نہیں فرمایا۔ اور قبل اس اطلاع کے آپ نے بعض اقربا مشرکین کے لئے اقتداء بابراہیم علیہ السلام استغفار فرمایا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے درمیان میں اس شبہ کو دفعہ دخل کے طور پر رفع فرمایا:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (پ۱۱)

کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لئے استغفار فرمانا بوجہ وعدہ کے تھا کہ وہ باپ سے وعدہ کر چکے تھے دوسرے وہ رقیق القلب بہت تھے اس کے بعد ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًام بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ (پ۱۱)

کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت نہیں کہ کسی قوم کو ہدایت کے بعد گمراہ کردے جب تک کہ ان کے لئے ما یتقون کو بیان نہ کردے۔ اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ حنفیہ کے یہاں تو توحید بدوں ارسال رسول کے بھی واجب ہے اور اس کے ترک سے ضلال وعذاب کا وقوع ہوگا۔

جواب یہ ہے کہ یہاں پر یبین فرمایا ہے یوحی تو نہیں فرمایا اور بیان ارسال رسول پر موقوف نہیں عقل سے بھی نہیں ہوسکتا۔ پھر اس کے متعلق بعض فروع ہیں مثلاً یہ کہ کسی شخص کی عقل کامل نہ

ہو اور وہ مجنون و معتوہ بھی نہیں لیکن اس کی عقل تنہا بدوں رسول کے توحید کے پہچاننے کو کافی نہیں اس کو عذاب ہوگا یا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔

بعض اس طرف گئے ہیں کہ ایسے شخص کو عذاب نہ ہوگا۔ گو وہ عاقل ہے مگر قلت عقل کی وجہ سے معذور ہے اور بعض نے کہا ہے کہ عذاب ہوگا۔ اور یہ مسئلہ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (پ ۱۵) کے معارض نہیں کیونکہ اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ اس میں عذاب دنیا مراد ہے اور گفتگو عذاب آخرت میں ہے مگر یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ نفی عذاب دنیا بدرجہ اولی مستلزم ہے نفی عذاب آخرت کو کیونکہ عذاب دنیا اہون ہے جب بدوں بعث رسل کے عذاب دنیا نہیں ہوتا تو عذاب آخرت اولیٰ نہ ہوگا اور جواب ثانی یہ ہے کہ یہاں رسول عام[1] ہے عقل کو بھی اور پیغمبر کو بھی۔ یہ اس مسئلہ کے چند فروع ہیں ان کے علاوہ اور بھی فروع ہیں مگر میں نے اجمالاً اشارہ کر دیا ہے۔

غلو فی التقویٰ

اب قابل غور یہ امر ہے کہ اس آیت کو پہلی آیت سے کیا ربط ہے۔ بظاہر کچھ ربط نہیں معلوم ہوتا۔ اور میں نے دیر تک غور کیا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو اپنی تفسیر دیکھی اس میں عجیب ربط بیان کیا ہے۔ تفسیر لکھنے کے وقت اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی امداد فرمائی تھی کہ عجیب و غریب علوم قلب پر فائز ہوئے تھے۔ تو وہاں یہ ربط لکھا ہے کہ اوپر کی آیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر ایک خطرہ وارد ہو سکتا تھا کہ شاید استغفار سابق کی وجہ سے ہم سے معصیت کا صدور ہو گیا ہو ہر چند کہ اس سے پہلے استغفار للمشرک منہی عنہ نہ تھا۔ مگر بعد نزول نہی کے یہ وسوسہ ہو سکتا ہے کہ شاید وہ پہلے ہی سے قبیح لغیرہ ہوا اور صدور قبیح سے خطرہ لازم ہے مگر اس کو ہم اور آپ نہیں سمجھ سکتے کیونکہ ہم پر خوف و خشیت کا غلبہ نہیں ہے جن پر خشیت کا غلبہ ہے ان کی یہ حالت ہے کہ ہمارے ایک دوست صادق الیقین صاحب مرحوم کہتے تھے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ مجھ سے یوں نہ فرمائیں کہ تو اتنا زیادہ متقی کیوں تھا۔ اور لوگ تو قلت تقویٰ سے ڈرتے ہیں ان کو زیادت تقویٰ سے خطرہ تھا۔ اس کو ہم لوگ نہیں سمجھ سکتے۔

مگر بات فی نفسہ صحیح ہے کیونکہ شریعت میں ہر شے کی حد ہے تقویٰ کی بھی ایک حد ہے اطاعت کی بھی ایک حد ہے۔

---

[1] قلت واکمل الاحوال ما کان علیه النبی صلی الله علیه وسلم و کذلک الا نبیاء کانت لهم ازواج وذریة ودعا ابراهیم وزکریا علیهما السلام ان یولد لهما واستجیبا وعیسیٰ علیه السلام یولد له بعد النزول وفی الحدیث تزوجو الودود الولود فانی ابا هی بکم الا مم فینبغی ان یراعی جانب ذالک فی الکلام ۱۲ظ۔

حدود خاطر و مدارت

خاطر و مدارت کی بھی ایک حد ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے اپنے مہمان سے پوچھا کہ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے کہا نہیں۔ اس نے پھر پوچھا کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے کہا نہیں۔ اس نے بار بار اسی بات کی رٹ لگائی کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے مہمان نے کہا کہ اب تک تو کوئی تکلیف نہ تھی مگر اب ہے واقعی کسی سے ایک ہی بات دس دفعہ کہی جائے تو وہ گھبرا جائیگا۔

جیسا کہ غدر کے قبل ہمارے قصبہ میں ایک مجلس بڑارہ کے نام سے قصبہ کے لڑکوں اور شہدوں نے قائم کی تھی جس کا ایک مقصود یہ بھی تھا کہ بستی میں جو واقعات و معاملات کا فیصلہ بھی ہوا کرتا تھا اس مجلس کے بعض عہدیداروں کو میں نے بھی دیکھا ہے کوئی لفٹنٹ گورنر تھا، کوئی کلکٹر تھا، کوئی ڈپٹی کلکٹر، کوئی جج۔ کوئی صدر اعلیٰ۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں قصبہ کے اندر باہر سے کوئی میاں جی آگئے جو فارسی اچھی جانتے تھے۔ بستی کے میاں جی کو ان سے خطرہ پیدا ہوا کہ شاید میری جگہ ان کو نہ مل جائے۔ اس لئے اس نے اس مجلس میں باضابطہ درخواست دی کہ بستی میں ایک نیا میاں جی آگیا ہے جس کی وجہ سے مجھے اپنی روزی کا خطرہ ہے۔ اس لئے مناسب انتظام کیا جائے۔

چنانچہ یہ مسئلہ کمیٹی میں پیش ہوا اور فیصلہ کر دیا گیا کہ اس نو وارد کو شہر سے نکال دیا جائے۔ اور ایک لڑکے کو متعین کیا گیا کہ اس کام کو تم انجام دو۔ چنانچہ اس نے اپنی والدہ سے کہا کہ آج صبح کو سویرے کھانا پکا دینا۔ میں ایک کام کو جاؤں گا۔

پھر صبح ہی کھانا ساتھ لے کر اس مسجد میں جا پہنچا جہاں وہ میاں جی نماز پڑھتے تھے جب وہ مسجد سے باہر آنے لگے ان کو سلام کیا۔ انہوں پھر جواب دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر سلام کیا۔ انہوں نے پھر جواب دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر سلام کیا پھر جواب دیدیا۔ اس کے بعد پھر سلام کیا تو میاں جی جھلا گئے کہ یہ کیا لغو حرکت ہے۔ اب یہ دل میں خوش ہوئے کہ ہاں بس اب کام مار لیا۔ اس نے کہا۔ حضور! میں سلام ہی تو کر رہا ہوں گالیاں تو نہیں دیتا۔ پھر آپ جھلاتے کیوں ہیں۔ میرے سلام کا جواب دیجئے۔ انہوں نے پھر جواب دیا اور اس نے پھر سلام کیا۔ آخر میاں جی گھبرا کر اپنے جائے قیام میں جانے لگے۔ اس نے ہاتھ پکڑ لیا کہ جاتے کہاں ہو۔ میرے سلام کا جواب دو۔

حافظ صاحب بولے۔ میاں مجھے اپنے کھانے پینے کا بندوبست بھی کرنا ہے کہا اس سے بے فکر رہئے۔ میرے پاس کھانا بہت ہے دونوں کھالیں گے بس آپ یہیں تشریف رکھیں اور میرے

سلام کا جواب دیتے رہیں۔ دونوں نیک کام میں مشغول رہیں گے۔ غرض سلام ہی سے ان کو پریشان کر دیا۔ اب ان کو سوا اس کے کچھ نہ سوجھا کہ اپنا بستر سمیٹ کر قصبہ سے چل دیئے۔

تو دیکھئے سلام اچھی چیز ہے اور راحت و خوشی کی چیز ہے مگر جب حد سے بڑھ جائے تو عذاب وکلفت کا سبب ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایک شخص نے ہمزاد کو تابع کیا تھا اس نے اول ہی حاضری میں پوچھا کہ بتلاؤ کیا کام ہے۔ اس نے ایک کام بتلا دیا۔ اس کو پورا کر کے پھر آموجود ہوا کہ کیا کام ہے۔ اس نے دوسرا کام بتلا دیا۔ اس کو ختم کر کے پھر پوچھا بتلاؤ کیا کام ہے۔ اگر یہ سویا ہوتا تو جگا کر پوچھا بتلاؤ کیا کام ہے۔ یہ بڑا پریشان ہوا کہ کیا بلا پیچھے لگی۔ مگر تھا ہشیار آدمی! اس نے اپنے مکان کے صحن میں ایک بلی گاڑ دی۔ جب کوئی کام نہ ہوتا اور وہ پوچھتا کہ بتلاؤ کیا کام ہے تو کہہ دیتا اس بانس پر چڑھو اور اترو۔ یہ کام کرتے رہو جب تک کہ ہم دوسرا کام بتلائیں۔

تو اطاعت کی بھی ایک حد ہے۔ جب اس سے تجاوز ہو جائے تو وہ اطاعت باقی نہیں رہتی۔ اسی کو مولوی صادق الیقین صاحب سمجھے۔ صوفیاء اور فقہاء نے بھی اس کو سمجھا ہے۔ اسی لئے فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص گیہوں کے ایک دانہ کی تعریف وتشہیر کرے۔ اس کو تعزیر کی جائے (یعنی سزا دی جائے) اس کا منشاء یہی ہے کہ یہ شخص ورع وتقویٰ میں غلو کرتا ہے اور غلو فی التقویٰ اس لئے منہی عنہ ہے کہ یہ شخص دین میں اضافہ کرتا ہے کہ تقویٰ کے لئے ان امور کی بھی ضرورت ہے جن کی میں رعایت کرتا ہوں۔ حالانکہ شریعت نے ان کی رعایت نہیں کی اور دین میں اضافہ کرنا بدعت ہے اور بدعت سخت جرم ہے۔

کیوں کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص تعزیزات ہند میں ایک قانون کا اضافہ کر دے۔ گو وہ قانون سلطنت کی اغراض کے لئے مفید ہی ہو۔ مثلاً کوئی یہ قانون بڑھا دے کہ روزانہ کلکٹر کو سلام کرنا ضروری ہے ورنہ دس روپے جرمانہ ہوگا۔ تو یہ قانون کوئی باغیانہ نہیں۔ بلکہ اس کا منشا تعظیم حکام ہے جو ظاہر میں مستحسن ہے۔ مگر کوئی تعزیرات ہند میں اس قانون کا اضافہ کر کے تو دیکھئے فوراً جرم قائم ہو کر سزا ہو جائے گی۔ اور اس کا راز یہ ہے کہ یہ شخص اپنے کو امور سلطنت میں دخیل سمجھتا ہے کہ میں بھی جماعت قانون ساز کا ایک فرد ہوں۔

احداث فی الدین

اسی طرح جو شخص احداث فی الدین کرتا ہے وہ در پردہ مدعی نبوت کا ہے کہ مجھے بھی شریعت میں اضافہ کرنے کا اختیار ہے۔ نیز در پردہ شریعت پر نقص کا الزام لگاتا ہے کہ ابھی شریعت مکمل نہیں۔ بلکہ

میرے اضافہ کی ضرورت ہے اور اس کا سخت جرم ہونا ظاہر ہے۔ اب لوگ اس راز کو تو سمجھتے نہیں خواہ مخواہ علماء سے جھگڑتے ہیں کہ فاتحہ اور مولود میں کیا خرابی ہے یہ تو اچھا کام ہے پھر اس سے کیوں منع کرتے ہیں اس کا حقیقی جواب یہی ہے کہ جن قیود کے ساتھ تم ان افعال میں ثواب کے قائل ہو شریعت نے ان قیود پر ثواب نہیں بیان کیا۔ مگر عوام اس کو کیا سمجھیں۔ اس لئے میں ان لوگوں سے الزامی گفتگو کیا کرتا ہوں۔

چنانچہ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ گاؤں میں جمعہ کیوں نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ پہلے آپ یہ بتلائیں کہ بمبئی میں حج کیوں نہیں ہوتا۔ بس خاموش ہو گئے۔

اسی طرح ایک گاؤں والے نے مجھ سے پوچھا کہ فاتحہ دینا کیسا ہے۔ میں نے کہا میاں تم نے کبھی لکڑیاں بھی اللہ واسطے دی ہیں کہا جی ہاں! میں نے کہا تم نے کپڑا بھی کبھی دیا ہے کہا ہاں! میں نے کہا پھر اس پر بھی فاتحہ پڑھی تھی کہا نہیں۔ میں نے کہا پھر کھانے ہی پر فاتحہ کیوں پڑھتے ہو۔ تو وہ گاؤں والا کہنے لگا کہ جی ہاں! بس یہ تو فضول سی بات ہے۔ میں نے کہا ہاں خود سمجھ لو۔ اگر ثواب ہی پہنچانا ہے تو فاتحہ الگ پڑھ دو۔ کھانا الگ دے دو۔ دونوں میں جوڑ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ گاؤں والے سمجھنے کے بعد حجتیں نہیں نکالتے کیونکہ ان کی طبائع میں سلامتی ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک صاحب نے فاتحہ کے متعلق مجھ سے سوال کیا تو میں نے کہا کہ آپ پوری دیگ پر فاتحہ کیوں نہیں پڑھتے۔ پلاؤ کی دیگ میں صرف ایک طباقی میں کھانا رکھ کر اسی پر کیوں پڑھتے ہو۔ کیا اللہ تعالیٰ کو نمونہ دکھلاتے ہو۔

اور ایک شخص کو میں نے یہ جواب دیا کہ بتلاؤ ثواب پہنچتا ہے پکانے کا یا کھلانے کا۔ کہا ثواب تو کھلانے کا ہوتا ہے۔ میں نے کہا پھر کھلانے کے بعد فاتحہ پڑھ دینا اور ثواب پہنچا دینا۔

یہ چند نمونے میں نے بتلا دیئے ہیں کہ اہل بدعت کو الزامی جواب اس طرح دینے چاہئیں۔ کیونکہ وہ حقیقت کو سمجھنا نہیں چاہتے یا سمجھ نہیں سکتے۔ ہاں اگر کوئی فہیم ہو تو اس کو حقیقت بھی بتلا دی جائے۔

ایک بات اور سمجھ لینا چاہئے وہ یہ کہ احداث فی الدین'' اور شے ہے اور احداث للدین اور شے ہے۔ یعنی ایک تو یہ صورت ہے کہ نئی بات کو دین میں داخل کیا جائے۔ یہ تو بدعت محرمہ ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ نئی بات دین کی حفاظت وغیرہ کے لئے ایجاد کی جائے۔ جیسے ہر زمانہ میں اسلحہ جات نئے نئے ایجاد ہوتے رہتے ہیں۔ کیونکہ پرانا اسلحہ آج کل کارآمد نہیں۔ یا دین کی حفاظت کے لئے مدارس وغیرہ قائم کئے جاتے ہیں۔ یہ بدعت نہیں کیونکہ ان کو دین میں داخل کر

کے جزو دین نہیں بنایا گیا۔ بخلاف مولود و فاتحہ وغیرہ کے کہ ان کو دین میں داخل کیا جاتا۔ اور دین کا جزو سمجھا جاتا ہے یہ سب بدعات ہیں خوب سمجھ لو۔

استغفار للمشرکین

بہرحال جب یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا کہ شدید الخوف کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید فعل حسن بھی قابل گرفت ہو جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہی عن الاستغفار کا حکم سن کر یہ وسوسہ ہوتا کہ شاید یہ ہمارا استغفار نزول نص سے پہلے بھی قبیح ہو اور ہم سے معصیت کا صدور ہوا ہو۔ قبیح لنفسہٖ ہونے کا تو احتمال نہ تھا کیونکہ آپ سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس کا صدور ہو چکا ہے۔ ہاں قبیح لغیرہٖ ہونے کا احتمال ہو سکتا تھا اس لیے حق تعالیٰ نے درمیان میں اس شبہ کو رفع فرما دیا۔ خواہ یہ شبہ واقع ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ کیونکہ قرآن ان شبہات کو بھی رفع کر دیتا ہے جن کا وقوع محتمل و مظنون ہے اور اس قسم کا شبہ تحویل قبلہ اور تحریم خمر کے وقت واقع بھی ہو چکا ہے جس وقت تحویل قبلہ کا حکم وارد ہوا تو بعض صحابہ کو احتمال ہوا کہ شاید ہماری وہ نمازیں ناقص ہوئیں جو بیت المقدس کا استقبال کر کے پڑھی گئیں اس پر آیت وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ (پ۲) نازل ہوئی اور تحریم خمر کے وقت صحابہ کو شبہ ہوا کہ ہمارے جو بھائی اس سے پہلے شراب پیتے ہوئے مر گئے ہیں شاید ان کی حالت ناقص رہی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (پ۷)

تو کچھ بعید نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا صحابہ کو استغفار للمشرکین کے متعلق بھی یہ خلجان ہوتا کہ شاید ہمارا استغفار قبل النہی قبیح لغیرہٖ ہو گیا ہو کسی عارض کی وجہ سے اور منجملہ عوارض کی تعدی عن الحدود بھی ہے۔ کیونکہ ہر شے کیلئے ایک حد ہے۔ افعال مباح کیلئے بھی ایک حد ہے اعمال مستحبہ کی بھی ایک حد ہے۔

حدود غنا

یہاں سے ایک اور اشکال مرتفع ہوا۔ وہ یہ کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ عید کے دن دو نابالغ لڑکیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گا رہی تھیں۔ حدیث میں اس کے ساتھ ہی یہ

بھی آتا ہے ولیستا بمغنیین کہ وہ گانے والیاں نہ تھیں یعنی انکو باقاعدہ گانا نہیں آتا تھا۔ یوں ہی بے قاعدہ محض خوشی کے طور پر گا رہی تھیں۔ پس اس سے مطلق غنا کے جواب پر استدلال نہیں ہوسکتا۔

غرض حدیث میں آتا ہے کہ وہ لڑکیاں گا رہی تھیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ آئے جب بھی وہ گاتی رہیں پھر حضرت عمرؓ آئے تو ان کو دیکھ کر وہ خاموش ہوگئیں اور گانا بند کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر تبسم فرمایا اور فرمایا اے عمرؓ! شیطان تم سے بھاگتا ہے خدا کی قسم! اگر تم ایک راستہ کو چلو گے تو شیطان اس راستہ کا چلنا چھوڑ دے گا۔

اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ غنا حرام تھا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہ منع فرمایا اور جائز تھا آپؐ نے ان کے قطع غنا پر یہ کیوں فرمایا شیطان عمرؓ سے بھاگتا ہے۔

اس کا بھی جواب اسی قاعدہ سے نکلتا ہے کہ ہر شے کی حد ہے۔ مباح کی بھی ایک حد ہے اور یہ غنا حد مباح کے اندر تھا۔ مگر اس وقت مباح کی حد ختم ہو چکی تھی کہ حضرت عمرؓ اتفاقاً تشریف لے آئے اور ان کے دیکھتے ہی گانے والیاں خاموش ہوگئیں۔ اگر وہ خاموش نہ ہوتیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما دیتے۔ مگر حضورؐ کو تعجب و تبسم اس پر ہوا کہ حضرت عمرؓ کی صورت دیکھتے ہیں بدوں ان کے کچھ کہے گانے والیاں خود ہی چپ ہوگئیں۔

اس پر حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو بشارت دی کہ شیطان تم سے بھاگتا ہے (اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ غنا اس وقت بھی حد مباح پر تھا۔ مگر یہ ایسا مباح ہے جس کو شیطان اپنی کامیابی کا وسیلہ بنایا کرتا ہے کما فی الحدیث والشعر من مزامیر ابلیس اور حضرت عمرؓ کا رعب ایسا تھا کہ ان کے سامنے ایسا مباح واقع نہ ہوسکتا تھا جس میں شیطان کا کچھ بھی حصہ ہو ویجوز مثل هذا المباح بحضرة الرسول صلی الله عليه وسلم لكونه شارعاً لحدود المباح والحرام ونحوهما۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (پ ۱۱)

بے شک اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمینوں کی۔

اس کا ربط ماقبل سے یہ ہے کہ اس جگہ یہ سوال ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو استغفار للمشرکین سے کیوں منع فرمایا بلکہ یوں ہوتا کہ وہ استغفار کرتے رہتے۔ پھر اللہ تعالیٰ چاہے اس کو قبول کرتے یا نہ کرتے اور مشرکین کو بخشتے یا نہ بخشتے۔ اس سوال کا جواب اِنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ میں دیا گیا ہے اور جواب حاکمانہ ہے کہ ہماری سلطنت آسمانوں اور زمینوں میں ہے اس لئے ہم کو حق ہے کہ تم کو استغفار سے روک دیں۔

حاکمانہ کلام

قرآن میں زیادہ تر حاکمانہ ہی جواب دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ شیطان سے جب انکار سجدہ کی وجہ پوچھی گئی اور اس نے جواب دیا۔ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ۔ (آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے پیدا کیا) (پ ۸) تو اس کی اس دلیل کا حاکمانہ ہی جواب دیا گیا۔ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ وَّاِنَّ عَلَیْکَ اللَّعْنَةَ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ۔ (پ ۱۴) (تو یہاں سے نکل جا بے شک تو مردود ہے اور تجھ پر قیامت کے دن تک لعنت)

اسی طرح مقبولین کو بھی حاکمانہ جواب دیا گیا۔ یعنی فرشتوں جب کہ انہوں نے آدم علیہ السلام کی خلافت پر سوال کیا تو فرمایا انی اعلم ما لا تعلمون (پ ۱) کہ تم نہیں جانتے میں جانتا ہوں۔ اور یہی تو قرآن کی خاص بات ہے جس سے اس کا کلام الٰہی اور شاہانہ کلام ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ اگر ہر سوال کا حکیمانہ جواب دیا جاتا تو شاہانہ کلام نہ معلوم ہوتا۔ بلکہ فلسفی کا کلام معلوم ہوتا۔ اس لئے حکیمانہ جواب کم دیئے گئے ہیں۔ اور اگر دیئے بھی ہیں تو حاکمانہ جواب کیساتھ دیئے ہیں۔

مگر افسوس! طلباء مصنفین کی کتابیں پڑھنے کے بعد قرآن کو پڑھتے ہیں اور اس میں بھی وہی طرز ڈھونڈتے ہیں۔ اس لئے ان کو قرآن کا پورا لطف نہیں آتا ورنہ عجیب پر لطف کلام ہے۔ پس اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (بے شک اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمینوں کی) (پ ۱۱) میں اس شبہ کا حاکمانہ جواب دیا گیا ہے۔

حکیمانہ جواب

حکیمانہ جواب تبرعاً میں بیان کرتا ہوں گو ہمارے ذمہ تو نہیں وہ یہ کہ کفار سے بغض و دعاوت رکھنے کی بھی ضرورت ہے کیونکہ محبت الہیہ کا حق یہ ہے کہ اعداء اللہ سے عداوت و بغض رکھا جائے دوسرے اسلام کی اشاعت بھی زیادہ تر بغض فی اللہ ہی سے ہوئی ہے اگر مشرکین کے لئے استغفار جائز ہوتا تو اس بغض میں کمی ہو جاتی۔ کفار پر جوش و غضب نہ رہتا اس حکیمانہ جواب کی طرف اس آیت میں بھی اشارہ ہے چنانچہ عنقریب معلوم ہوگا اس کے بعد ارشاد ہے۔

وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (پ ۱۱)

(اور اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی حامی اور مددگار نہیں)

میرے خیال میں اس کا ربط

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًام بَعْدَ اِذْ هَدٰهُمْ (پ ۱۱)

(اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا کہ کسی قوم کو ہدایت کے پیچھے گمراہ کردے)

سے بھی ہے اور اس اعتبار سے یہ جملہ آیت سابقہ کے مضمون کی دلیل ہے۔ کہ تم کو قبل نہی کے استغفار کرنے سے گناہ اس لئے نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی دوست و مددگار نہیں ہے۔ اور یہ بات محبت وولایت کے خلاف ہے کہ نہی سے پہلے کسی فعل کے ارتکاب پر عذاب کیا جائے یا گناہ کی فرد جرم قائم کی جاوے۔ نیز اس میں ان لوگوں کو بھی تنبیہ ہے جو کسی کے گھمنڈ پر مناہی کا ارتکاب کرے کہ ہم فلاں کی شفاعت یا استغفار سے بچ جائیں گے۔

جواب کا حاصل یہ ہوا کہ خدا کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں۔ دوست نہیں اس لئے کسی دوسرے کے بھروسہ اور گھمنڈ پر گناہوں کا ارتکاب نہ کرنا چاہئے مگر اس سے شفاعت کی نفی لازم نہیں آتی۔ کیونکہ شفاعت تو خدا تعالیٰ کے اذن سے ہوگی۔ **من ذالذی یشفع عنده الا باذنه**۔ (پ۳) تو اجازت اسی شخص کے متعلق ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ خود بخشا چاہیں گے اور جس کی ولایت ونصرت وہ نہ چاہیں گے اس لئے اذن شفاعت ہی کیوں دیں گے۔

نیز اس آیت میں اس شبہ کا حکیمانہ جواب بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کو اور مسلمانوں کو استغفار للمشرکین سے کیوں منع فرمایا بلکہ ان کو استغفار کرنے دیتے اور خود استغفار کو قبول کرتے یا نہ کرتے۔

اس کا حکیمانہ جواب اس طرح دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی دوست و مددگار نہیں۔ پس تم بھی دوستی اسی سے کرو جو خدا کا دوست ہو۔ اور جو خدا کا دشمن ہو اس سے دشمنی کرو۔ پس کفار سے دوستی نہ کرو اور استغفار بھی اسی کی فرد ہے۔ اس لئے کفار کے واسطے استغفار ہرگز نہ کرو کیونکہ واعداء اللہ ہیں تم بھی ان سے عداوت ظاہر کرو۔

غرض! یہاں تین مضمون تھے یعنی نہی عن الاستغفار بحیثیت حاکمیت و نہی عن الاستغفار بحیثیت حکمت وعدم تاثیم قبل النہی۔ تینوں پر اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے۔

تفسیر آیت کریمہ

اب میں مقصود کو شروع کرتا ہوں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے یہ ثابت ہوا کہ احکام تشریعیہ کے مقرر کرنے کا حق تعالیٰ کو پورا اختیار ہے کیونکہ وہ صاحب سلطنت ہیں اور

اسی سے دوسرا مقدمہ یہ مفہوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو احکام تکوینیہ کے مقرر کرنے کا بھی پورا اختیار ہے کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہر قسم کے احکام کو عام ہے تشریعیہ کو بھی اور تکوینیہ کو بھی۔ مگر شاید کوئی عموم کو تسلیم نہ کرے کیونکہ عموم وخصوص کا سمجھنا مجتہد ہی کا کام ہے۔

مگر اس آیت میں ایک جملہ ایسا موجود ہے جس سے آیت کا عموم واضح ہو گیا اور وہ یحی ویمیت ہے کیونکہ احیاء واماتت تو احکام تکوینیہ ہی سے ہیں۔

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمینوں کی۔ وہی زندہ کرتا ہے وہ ہی مارتا ہے۔ تو یحی ویمیت میں ان تصرفات کا ذکر ہے جو سلطنت کی وجہ سے عالم میں نافذ کئے جاتے ہیں اور یہ تصرف احکام تکوینیہ سے ہے۔ اس لئے آیت دونوں قسم کے احکام کو عام ہوگئی۔ سباق میں احکام تشریعیہ کا ذکر تھا اور سیاق میں تکوینیہ کا ذکر ہو گیا تو ہر طرف سے جکڑ بند کر دیا گیا۔ اب خصوص کا احتمال نہیں رہا۔ یہ تو آیت کی تفسیر تھی۔

ابھی میں نے مقصود کو شروع نہیں کیا۔ تمہید بہت لمبی ہو گئی مگر مقصود مختصر ہوگا کیونکہ تمہید تو عموماً لمبی ہی ہوتی ہے۔ دیکھئے کھیت میں گیہوں ڈالنا، ہل جوتنا، پانی دینا، کاٹنا، یہ کتنا لمبا کام ہے۔ اور اس کے بعد آٹا پیسنا، گوندھنا، آگ جلانا، روٹی پکانا یہ بھی تمہید ہی ہے۔ اور لقمہ بنا کر کھا لینا کتنا مختصر کام ہے اور یہ مختصر محض لفظوں ہی میں نہیں کہ میں نے تلفظ میں اس کو مختصر کر دیا ہو جیسے یہاں ایک شاعر تھے جن کے اشعار میں ایک مصرع لمبا اور ایک چھوٹا ہوتا تھا۔ کسی نے ان پر اعتراض کیا تو آپ نے دعویٰ کیا کہ مولانا جامیؒ کے کلام میں بھی تو ایسا ہی واقع ہے پوچھا کہاں تو آپ نے یہ شعر پڑھا۔

الٰہی غنچہ امید بکشا   اے اللہ میری امید پوری فرما دے

اس مصرع کو تو خوب کھینچ کر تان کر پڑھا پھر جلدی سے کہہ دیا۔

گلے از روضہ جاوید بنما   ایک پھول آخرت کے باغ سے مجھے دکھا۔

تو جیسے اس شخص نے تلفظ میں دوسرے مصرع کو مختصر کر دیا تھا۔ میں کھانے کو اس طرح مختصر نہیں کہتا۔ بلکہ وہ واقع میں مختصر ہی ہے سب سے زیادہ دیر کھانے میں انگریز کرتے ہیں۔ کہ بہت آہستہ آہستہ کھاتے ہیں اور دنیا بھر کی باتیں اسی وقت کرتے ہیں مگر پھر بھی بہت سے بہت ایک دو گھنٹہ میں کھانے سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ سو یہ بھی تمہید کے سامنے تو مختصر ہی ہے اور دیکھئے انگریز وقت کی قدر کے بھی مدعی ہیں مگر کھانے میں اتنا وقت صرف کرتے ہیں کہ جس کی حد نہیں۔ بعض

لوگ اس میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ انسان کے لئے تفریح اور جی بہلانے کے لئے بھی تو کچھ وقت چاہئے انہوں نے اس کے لئے کھانے کا وقت رکھا ہے تاکہ ایک وقت میں دو کام ہو جائیں۔

چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار کتنا اچھا ہو کہ ایک وقت میں دو کام پورے ہو جائیں۔

مگر اس میں خرابی یہ ہے کہ جی بہلانے میں بعض دفعہ ہنسی بھی آجاتی ہے اور کھانے کے وقت ہنسی آنے سے بعض دفعہ گلے میں پھندا لگ جاتا ہے۔

ہمارے فقہاء نے اس راز کو سمجھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کھانا کھاتے ہوئے کسی کو سلام کرنا مکروہ ہے کیونکہ فطری بات یہ ہے کہ سلام کو سن کر سننے والے کے دل پر جواب کا تقاضا ہوتا ہے (کیونکہ جواب سلام فرض ہے) اور ممکن ہے کہ اس وقت لقمہ گلے کے بیچ میں ہی ہو تو تقاضائے جواب سے پھندا لگ جانے کا خطرہ ہے۔

یہ علت میری سمجھ میں بہت دنوں کے بعد آئی پہلے میں بھی سوچتا تھا کہ فقہاء نے اس وقت سلام کیوں مکروہ کہا۔ عرصہ کے بعد یہ علت سمجھ میں آئی اور اس وقت فقہاء کی قدر ہوئی کہ واقعی یہ حضرات امت کے لئے رحمت ہیں غرض کھانے کے وقت میں تقاضے کا کام نہ کیا جائے۔

علاج غموم وافکار

اب میں مقصود عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تمام غموم وافکار کا علاج بتلایا ہے کیونکہ فرماتے ہیں ان اللہ لہ ملک السموت والارض کہ اللہ تعالیٰ کے لئے سلطنت ہے تمام آسمانوں اور کی زمینوں کی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ہر طرح تصرف کا حق ہے تم کو کسی تجویز کا کوئی حق نہیں۔ تو اس آیت میں ہم کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم کو تشریعیات وتکوینیات کے متعلق کوئی تجویز اپنی طرف سے نہ کرنا چاہئے۔

جیسے شیخ چلی کا واقعہ ہے کہ وہ دو پیسہ کی مزدوری پر ایک شخص کا تیل کا گھڑا لے کر چلا اور راستہ میں سوچنا شروع کیا کہ ان دو پیسوں کے دو انڈے لوں گا۔ ان کو کسی مرغی کے نیچے رکھوں گا۔ ان میں سے ایک مرغی نکلے گی اور ایک مرغا۔ پھر دونوں کے بہت سے بچے ہوں گے۔ ان سب کو بیچ کر بکریاں لوں گا۔ پھر ان کے بہت سے بچے ہوں گے کہ جنگل بھر جائے گا۔ ان سب کو بیچ کر گائے بھینس خریدوں گا۔ ان کے بہت سے بچے ہوں گے ان سب کو بیچ کر اونٹوں کی پھر ہاتھی کی تجارت کروں گا۔ پھر میں بڑا تاجر اور مالدار ہو جاؤں گا پھر بڑا سا مکان بناؤں گا اور وزیرزادی یا بادشاہزادی کو نکاح کا پیغام دوں گا۔ وہ فوراً میرے مال ودولت کو دیکھ کر پیغام منظور کر لیں گے اور

نکاح ہو جائے گا پھر اولاد ہوگی۔ اور بچہ بڑا ہوگا تو مجھ سے پیسے مانگے گا۔ میں کہوں گا ہشت! اس کہنے کے ساتھ آپ کا سر ہلا۔ گھڑا گر کر ٹوٹ گیا۔

تیل والے نے کہا ابے یہ کیا کیا۔ کہا میاں جاؤ۔ تمہارا تو دو روپیہ کا تیل ہی گیا۔ میرا تو سارا خاندان برباد ہو گیا۔

تو دیکھئے اس تجویز کی کوئی حد ہے ہم لوگ اس قصہ پر تو ہنستے ہیں مگر افسوس! اپنے حال پر نہیں ہنستے کہ ہم سب ایسی حماقت میں گرفتار ہیں کہ ہر وقت خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں جن میں اکثر تو ناکامی ہی ہوتی ہے اور یہی جڑ ہے رنج کی۔ اگر کامیابی بھی ہو جائے تو وہ کامیابی بھی ہزاروں ناکامیوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوتی ہے۔

چنانچہ اگر اس شخص کی تجویز کا وقوع ہو جاتا تو انجام یہ ہوتا کہ ایک شخص تو امیر ہو جاتا۔ مگر اسی کے ساتھ بہت سے غریب برباد ہی ہو جاتے ہیں اور بہت چنانچہ شب و روز یہی حالت دیکھی جاتی ہے کہ ایک شخص امیر ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے دس غریب ہو جاتے ہیں اور بہت سے آدمیوں کے غریب ہونے کے بعد ایک آدمی امیر بنتا ہے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص گاؤں کا رہنے والا کہیں پردیس میں جا کر پانچ سو روپے کا نوکر ہو گیا۔ اس نے اپنی ترقی کی اطلاع گھر بھیجی تو سارے گاؤں میں خط کا پڑھنے والا صرف ایک میاں جی تھا جو اس شخص کے مکان پر بچوں کو پڑھاتا تھا گھر پر خط پڑھنے کے لیے اس کو بلایا گیا تو وہ خط دیکھ کر رونے لگا۔ بیوی نے کہا میاں جی خیر تو ہے کیا لکھا ہے کہا بتلاؤں گا مگر پہلے تو بھی رو وہ رونے لگی۔ اس شور و غل کو سن کر محلہ والے جمع ہو گئے۔

سب نے پوچھا کیا بات ہے کیوں رو رہے ہو۔ میاں جی نے کہا بتلاؤں گا تم بھی روؤ۔ وہ سب بھی رونے لگے۔ آخر کہا گیا میاں خط تو سناؤ۔ یہ تو معلوم ہو کہ اس میں کیا لکھا ہے کہا اس میں لکھا ہے کہ میری ترقی ہوگئی اور میں پانچ سو روپے کا ملازم ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کم بخت پھر یہ بات رونے کی تھی یا خوشی کی۔ میاں جی نے کہا یہ بات رونے ہی کی ہے میرے لئے تو اس واسطے کہ اب وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائے گا جس کے لئے میں کافی نہیں اس لئے مجھ کو ملازمت سے جدا کر دے گا کوئی انگریزی دان ماسٹر بچوں کے واسطے بلایا جائے گا اور بیوی کے لئے اس واسطے کہ اب وہ اتنے بڑے عہدہ پر پہنچ کر اس گاؤں کی دیہاتن پر کیوں کفایت کرے گا۔ اب وہ

کسی تعلیم یافتہ عورت سے نکاح کرے گا۔ اور تمہارے لئے اس واسطے کہ اب وہ ہزاروں روپے جمع کرلائے گا۔ اور اپنا مکان عالی شان بنانے کی فکر کرے گا اور محلّہ کے غریب آدمیوں کے مکانات خرید کر کسی کے مکان کو اصطبل بنائے گا کسی کو بیٹھک۔ کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ۔

ممکن ہے یہ حکایت کسی نے گھڑی ہو۔ مگر دنیا کی حالت ہے یہی جو اس حکایت میں ظاہر کی گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمام کلفتوں کا مدار تجویز پر ہے اگر اس کو قطع کردیا جائے تو پھر کوئی کلفت نہیں۔ کسی رنجیدہ واقعہ کے پیش آنے سے کلفت اس لئے ہوتی ہے کہ ہم نے اس کا خلاف ذہن میں تجویز کر رکھا تھا۔ اور اگر انسان پہلے سے اس کیلئے آمادہ رہے بلکہ اس سے زائد کیلئے بھی آمادہ رہے تو پھر کچھ بھی کلفت نہیں۔

جیسے ایک شخص کی حکایت ہے جس کا لقب مرزا لیموں تھا۔ کیونکہ اس کا معمول یہ تھا کہ ایک لیموں ساتھ لے کر سرائے میں چلا جاتا اور جب کسی متمول مسافر کو دیکھتا کہ کھانا کھانے بیٹھا ہے۔ تو جیب سے لیموں نکال کر سالن میں ذرا سا نچوڑ دیتا کہ لیجئے اس سے کھانا بہت لذیذ ہوتا ہے پھر اکثر تو ایسا ہوتا کہ کھانے والا خود ہی اس کی تواضع کرتا کہ آپ بھی کھالیجئے اور اگر وہ تواضع نہ کرتا تو یہ خود کھانے میں شریک ہو جاتے۔ پر دستر خوان پر سے کسی کو اٹھانا عرفاً معیوب ہے۔ اسلئے کوئی کچھ نہ کہتا۔ اور اسی طرح اپنا پیٹ بھر لیتے۔ مگر سب آدمی یکساں نہیں۔

ایک شخص کے ساتھ اس نے ایسی ہی حرکت کی کہ بدوں کہے کھانے میں شریک ہو گئے تو اس نے کان پکڑ کر اس کو باہر نکلوا دیا تو آپ نے بہت جھک کر اسے فرشی سلام کیا۔ اس نے کہا یہ سلام کیسا۔ کہا! حضور کا شکریہ ادا کرتا ہوں کیونکہ مجھے تو ایسے موقع پر جوتا کھانے کی عادت ہے آپ نے بڑا اکرم کیا کہ کان پکڑ کر نکلوا دینے ہی پر کفایت کی۔

خیر! یہ حکایت تو کسی ذلیل نامعقول مسخرہ کی ہے مگر اس میں اتنا سبق قابل اخذ ہے کہ جو شخص بڑی مصیبت کے لئے آمادہ ہو اس کو چھوٹی مصیبت غنیمت معلوم ہوگی۔ پس تمام تر کلفت کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ہم پہلے سے اپنے لئے ایک خاص تجویز کر لیتے ہیں مثلاً اپنے متعلقین سے کچھ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور اگر پہلے ہی سے اس توقع کو قطع کر دیا جائے تو پھر زیادہ کلفت نہ ہو۔

راضی برضا رہنے کی ضرورت

یہی وہ بات ہے جو اہل اللہ کو حاصل ہے وہ کسی مخلوق سے توقع نہیں رکھتے نہ کوئی تجویز اپنے لئے قائم کرتے ہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک بار اپنے خدام کو اسی بات کی وصیت کی کہ اگر راحت چاہتے ہو تو مخلوق سے توقع کو قطع کردو۔ پھر فرمایا کہ تم مجھے کیسا سمجھتے ہو۔ خدام نے عرض کیا کہ ہم آپکو اپنی ذات سے زیادہ اپنے حال پر مہربان سمجھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم مجھ سے بھی امید نہ رکھو۔ تا کہ تم کو کلفت نہ ہو اگر نفع یا ارشاد میں کچھ کوتاہی اور کمی ہو تو تم کو رنج نہ ہو۔ غالب نے اسی مضمون کو خوب بیان کیا ہے۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب — پھر کسی سے کوئی گلہ نہ رہا

مگر آج کل حالت یہ ہے کہ ہر شخص اپنے لئے ایک خاص تجویز قائم کئے ہوئے ہے جس میں بعض کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ جہلا دین موت کے متعلق بھی مفتی بننا چاہتے ہیں کہ ملک الموت اول ان سے فتوی حاصل کرے کہ چہ فرمائیند جہلاء دین دریں مسئلہ کہ برشما کدامی وقت موت آوردہ شود، پھر جان قبض کرنے کو آیا کرے چنانچہ جس کے دو چار بچے ہوں وہ یوں چاہتا ہے کہ ان کی شادی وغیرہ سے فراغت ہو جائے تب موت آئے اس سے پہلے نہ آئے۔

صاحبو! ان تجویزوں کو قطع کرو۔ کیونکہ تم کو تجویز کا کوئی حق نہیں بلکہ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط يُحْيٖ وَيُمِيْتُ۔ (پ ۱۱)

آسمان وزمین کی سلطنت اللہ ہی کے لئے زندہ کرنا مارنا ان ہی کے اختیار میں ہے۔

وہ جب چاہیں جس حالت میں چاہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں تم کو اس میں دخل در معقول کا کوئی حق نہیں۔ یہی تعلیم ہے جو اس آیت میں دی گئی ہے اس پر عمل کرنے سے غم کی جڑ کٹ جائے گی۔ ہاں طبعی غم ہے ہوگا مگر وہ دیرپا نہیں ہوتا۔ اور طبعی غم بھی اس لئے ہوتا ہے کہ اس میں حکمتیں ہیں۔ ہمارے لئے بڑی حکمت یہ ہے کہ غم سے شکستگی کی شان پیدا ہوتی ہے جس سے تکبر وغرور وغیرہ کا علاج ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت حکمتیں ہیں۔

یہ میں نے اسلئے کہہ دیا کہ آپ کو دھوکا نہ ہو کہ آپ یہ سمجھ لیں کہ میں طبعی غم کی نفی نہیں کرتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر قرآن پر عمل کرنے والا کون ہوگا۔ مگر طبعی غم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہوا۔ چنانچہ اپنے صاحب زادے کے انتقال پر آپؐ نے فرمایا:

انا بفراقک یا ابرھیم لمحزونون. کہ اے ابراہیم! ہم کو تمہاری جدائی کا غم ہے۔

(المصنف لابن ابی شیبة ۳: ۲۹۳، جامع المسانید ۲: ۵۷٦)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق وحقانیت کی بڑی دلیل ہے کہ حضورؐ نے اپنے غم کو ظاہر فرمادیا۔ بناہوا صوفی ایسے موقع پر کبھی یہ نہ کہے گا کہ مجھے غم ہوا بلکہ تکلف وتصنع کر کے غم کو چھپائے گا۔ مگر صادقین کی یہ شان نہیں وہ تو حضورؐ کا اتباع کرے گا۔

اتباع سنت کی برکت

چنانچہ مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب نے ایک بار فرمایا کہ ایک دفعہ ہم بیمار ہوئے ہم بڑے گھبرائے۔ ہم کو موت سے بہت ڈرلگتا ہے۔ (اس کو بے تکلف ظاہر کر دیا کہ ہم کو موت سے ڈرلگتا ہے کیونکہ طبعاً تو ہر شخص کو موت سے خوف ہے ہی) حالانکہ مولانا مرحوم صاحب جذب تھے اور اہل جذب واستغراق کو موت سے ڈر نہیں لگتا۔ مگر مولانا کو خوف تھا تو بے تکلف اس کو بھی ظاہر کر دیا۔

پھر فرمایا کہ ہم نے حضرت فاطمہ کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے ہم کو اپنے سینہ سے لگالیا۔ بس صبح کو ہم اچھے ہوگئے۔ اس واقعہ سے تو یہ معلوم ہوا کہ مولانا کو موت سے ڈر تھا۔ مگر اس کے ساتھ ان کے کمالات سنیئے۔ کہ مولانا نے خود مجھ سے ہی فرمایا کہ جب حوریں جنت میں ہمارے پاس آئیں گے (ایسی طرح کہا کہ جیسے یقین ہو کہ جنت میں تو جائیں ہی گے) تو ہم ان سے صاف کہہ دیں گے کہ بی اگر ہم کو قرآن سناؤ تو بیٹھو ورنہ لمبی بنو۔ قرآن سے مولانا کو بڑا عشق تھا۔

ایک بار فرمایا کہ سجدہ میں ایسا مزہ آتا ہے کہ جیسے خدا تعالیٰ نے پیار کرلیا ایک دفعہ فرمایا کہ ہم نے ایک جزامی کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا کیا ہے پھر فرمایا کہ اس اتباع سنت کی برکت یہ ہوئی کہ وہ جذامی اچھا ہوگیا۔

سبحان اللہ! اس کو اپنی کرامت نہیں سمجھے بلکہ اتباع سنت کی برکت سمجھے۔ کوئی ناقص ہوتا تو اس کو اپنی کرامت سمجھتا۔

تو یہ کمالات تھے مولانا کے۔ اب ان کمالات کے ہوتے ہوئے مولانا کا یہ فرمانا کہ ہمیں موت سے بہت ڈرلگتا ہے نقص کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ اس کا منشا صدق وخلوص تھا کہ جو حالت تھی صاف صاف ظاہر کردی۔ بناہوا صوفی بڑے بڑے دعوے کرتا ہے۔ صادقین وعادی سے بری ہوتے ہیں۔

توحید خالص

کانپور میں ایک صوفی میرے پاس آئے اور اپنی حاجت ظاہر کی کہ مجھے دس روپے کی

. بت ہے اس کا انتظام کر دو۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں کر کے کہنے لگے کہ مجھے کیا پرواہ ہے جنت
ں، ایا پرواہ ہے دوزخ کی۔ میں نے کہا۔ صوفی جی بس بیٹھو۔ تم سے دس روپیہ سے تو استغناء نہ
ہو سکا۔ جنت سے کیا استغناء کرو گے جنت کو دیکھا نہیں ہے اس لئے باتیں بناتے ہو۔

بہر حال تجویز کو قطع کرو کیونکہ تجویز سے کلفت ہوتی ہے اور یہ کلفت اور چیز ہے اور طبعی غم اور چیز ہے۔ تجویز کے قطع کرنے سے یہ کلفت اور پریشانی قطع ہو جاتی ہے۔ گو طبعی غم باقی رہے۔ مگر قطع تجویز کے بعد جو طبعی غم ہو گا اس سے کلفت و پریشانی نہ ہو گی۔ اہل دنیا کو مصائب میں اسی لئے کلفت زیادہ ہوتی ہے کہ وہ تجویزیں قائم کر لیتے ہیں۔

اور اہل اللہ کی تو یہ حالت ہے کہ وہ تو موت تک کے مشتاق ہوتے ہیں جو اکبر المصائب ہے
چنانچہ عارف فرماتے ہیں۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم   راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے   تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

''وہ دن بہت اچھا ہے کہ اس ویرانہ مکان (دنیا) سے جاؤں۔ جاں کا آرام مانگتا ہوں اور معشوق کے لئے جاتا ہوں۔ میں نے نذر مانی ہے جس دن یہ کام ہو جائے گا۔ شراب خانہ کے دروازہ تک خوش اور گاتا ہوا جاؤں گا۔''

ایک بزرگ نزع کی حالت میں تھے۔ سب لوگ رو رہے تھے اور وہ خوش ہو کر یہ شعر پڑھ رہے تھے

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم   جس بگذارم سراسر جاں شوم

''وہ وقت قریب آ گیا ہے کہ میں ننگا ہو جاؤں گا۔ جسم کو چھوڑ کر صرف جاں ہو جاؤں گا۔''

اور یہ فرما رہے تھے

چیست توحید آنکہ از غیر خدا   فرو آئی در خلا و در ملا

توحید کی شان کیا ہو سکتی ہے کہ خدا کے سوا تنہائی اور ملاقات کے وقت جھکا رہے۔

اس توحید کا پورا ظہور موت کے وقت ہوتا ہے کیونکہ توحید خالص تو یہ ہے کہ غیر حق سے تعلقات منقطع ہو جائیں اور تعلقات ماسوی اللہ کا انقطاع کلی موت سے ہوتا ہے۔ اس لئے اہل اللہ جو توحید خالص کے عاشق ہیں وہ تو موت کے مشتاق ہیں۔ کوئی طبعاً مشتاق کوئی عقلاً مشتاق۔ مگر اہل اللہ اسی کے ساتھ دعا اور دوا بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے جمع بین الاضداد کر کے

دکھلایا ہے۔ وہ تجویز کو بھی قطع کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی دعا بھی الحاح سے کرتے ہیں کیونکہ حدیث میں حکم ہے۔

لیعزم المسئلة و ان الله یحب الملحین فی الدعا (فتح الباری لابن حجر ۱۱:۹۵)

اور دوا کے ساتھ پرہیز بھی کرتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوا کی ہے۔ تو ظاہر میں تفویض وقطع تجویز کے ساتھ اس کا جمع ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً دعا بالالحاح کا۔ کیونکہ دعا میں تو طلب ہے اور طلب تجویز ہے مگر محقق کی نظر وسیع ہے وہ سب کو جمع کر لیتا ہے اس لئے کہ دعا الحاح سے کرتا ہے۔ مگر دل سے ہر شق پر راضی رہتا ہے کہ جو کچھ ہوگا ہم اس پر راضی ہیں۔ اس کو یہ فکر اور سوچ و بچار نہیں ہوتا کہ اب کیا ہوگا۔ اس کے بعد کیا ہو جائے گا۔ وہ دل سے ہر شق پر راضی رہتا ہے کہ جو چاہے ہو جائے جو کچھ ہوگا عین حکمت ہوگا۔ پس اس فکر اور سوچ ہی کا قطع کرنا مطلوب ہے اور یہی قطع فکر مدلول ہے اس آیت کا

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ. فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ (پ ۲۰)

اس میں حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو حکم دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈال کر بے فکر ہو جانا۔ خوف وحزن نہ کرنا۔

درجات خوف وحزن

اب یہاں سوال ہوتا ہے کہ کیا عدم خوف وعدم حزن اختیاری ہے ظاہر میں تو غیر اختیاری معلوم ہوتا ہے پھر غیر اختیاری کے ساتھ امر نہی کا تعلق کیسا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو خوف وحزن کا ابتدائی درجہ ہے وہ تو غیر اختیاری ہے اور ایک وہ درجہ ہے جو اس سوچ بچار سے پیدا ہوتا ہے کہ ہائے وہ بچہ میرے پاس کھیلتا تھا مجھے لپٹتا تھا۔ اب میری گود سے الگ ہو گیا نہ معلوم کس حال میں ہوگا۔ نہ معلوم کس نے پکڑا ہوگا۔ یہ درجہ اختیاری ہے اس سے ان کو ممانعت کی گئی کہ بس دریا میں ڈال کر بے فکر ہو جاؤ۔ ہمارے سپرد کر کے پھر کچھ نہ سوچو کہ اب کیا ہوگا۔

اسی سے سمجھ لو کہ بعض لوگوں کو جو خوف خدا نہ ہونے کی شکایت ہے اس میں یہ لوگ غلطی کرتے ہیں کیونکہ جو خوف مامور بہ ہے وہ اختیاری ہے جو فکر اور سوچ سے پیدا ہوتا ہے اور جس کے فقدان کی شکایت ہے وہ غیر اختیاری ہے اور وہ مامور بہ نہیں۔ پس غیر مامور بہ کے فقدان

سے غم کیوں ہے ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ سوچ اور فکر قطع کرو کہ ہائے وہ بچہ ایسا تھا ویسا تھا اس کے قطع کرنے سے ان شاء اللہ غم کو ترقی نہ ہوگی۔

اس پر شاید یہ شبہ ہو کہ بعض لوگ کچھ سوچتے بھی نہیں پھر بھی ان کا غم کم نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ مگر میرے دل میں ابھی اس کی وجہ آئی ہے۔ وہ یہ کہ لوگ جس طرح اس واقعہ کو نہیں سوچتے جس سے غم بڑھتا۔ اسی طرح اسباب تسلی کو بھی نہیں سوچتے جس سے کم ہوتا۔ اس وجہ سے غم میں کمی نہیں ہوتی۔ اور بحالہ رہتا ہے۔

ان کو چاہئے کہ اسباب تسلی کو سوچا کریں مثلاً یہی کہ حق تعالیٰ کے افعال حکمت سے خالی نہیں ہوتے۔ اس میں ضرر حکمت ہے اور یہ کہ موت مسلمان کے لئے باعث راحت ہے وغیرہ وغیرہ۔

غرض حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی جو **لا تخافی ولا تحزنی** میں قطع خوف وحزن کا امر فرمایا ہے اس کا میرے نزدیک یہ مطلب ہے کہ خود مت سوچنا کہ ہائے اب کیا ہوگا۔ اب بچہ کس حال میں ہوگا۔ بلکہ ان کو دریا میں ڈال کر بے فکر ہو گئیں اور کچھ نہیں سوچا کہ اب کیا ہوگا۔

اس سے عجیب تر حضرت ہاجرہ کا واقعہ ہے کہ جب ان کے بطن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے اور حضرت ابراہیم کی توجہ حضرت ہاجرہ پر پہلے سے زیادہ ہوگئی تو حضرت سارہ کو یہ امر ناگوار ہوا اور انہوں نے کہا کہ ہاجرہ کو میری نگاہ سے غائب کردو مجھ سے اس رقابت کا تحمل نہیں ہوسکتا۔

اس پر وحی نازل ہوگئی کہ اے ابراہیم! اللہ تعالیٰ کو علاوہ سارہ کی خاطر منظور ہونے کے ہاجرہ کی مہاجرت میں کچھ حکمتیں بھی منظور ہیں۔ پس تم ہاجرہ کو مع اسمٰعیل کے زمین مکہ میں چھوڑ آؤ۔ جہاں ہمارا گھر ہے جس کو تم اور اسمٰعیل بناؤ گے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیل علیہما السلام کو سواری پر سوار کیا اور زمین مکہ میں لاکر ان کے پاس چھوڑ کر ملک شام کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس وقت زمین مکہ میں کسی قسم کی کچھ آبادی نہ تھی۔ لق ودق میدان تھا جہاں آدمی تو آدمی پرند و چرند کا بھی نام ونشان نہ تھا۔ کیونکہ یہاں نہ کھانے کی کوئی چیز تھی نہ پینے کے لئے پانی تھا۔

جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو چھوڑ کر جانے لگے تو حضرت ہاجرہ نے ان سے پوچھا کہ اے ابراہیم ہم کو یہاں چھوڑ کر چلے کیا یہ آپکی رائے ہے یا اللہ تعالیٰ نے آپکو اس کا حکم دیا ہے۔ فرمایا ہاں حکم دیا ہے۔ بس یہ سن کر حضرت ہاجرہ کو اطمینان ہو گیا اور فرمایا اذا **لا یضیعنا** کہ اگر خدا کا حکم ہے تو وہ ہم کو ضائع نہ کرینگے۔

ہائے کیسا کلیجہ تھا۔؟ کیسا خدا پر بھروسہ تھا کہ حضرت ہاجرہ نے یہ سن کر کہ خدا کی مرضی یونہی ہے کچھ نہیں سوچا کہ اب کیا ہوگا؟ صاحبو! حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کمال ایمان تو اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہی ہے مگر حضرت ہاجرہ کا ایمان گو ان سے اکمل نہ ہو مگر عجیب تر ضرور تھا۔ کیونکہ حضرت ابراہیم تو مرد تھے پھر مرد کامل کیونکہ نبی تھے۔ اور نبی بھی بڑے درجہ کے کہ ہزاروں انبیاء ان کے متبع ہوئے۔ ان کا ایمان گو اکمل ہو۔ مگر ایسا عجیب نہیں جیسا حضرت ہاجرہ کا ایمان عجیب تھا کہ ان کو باوجود عورت ہونے کے اور نبی نہ ہونے کے ذرا بھی تشویش نہیں ہوئی۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت ہاجرہ کا ایمان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایمان سے بڑھا ہوا تھا کیونکہ عجیب ہونے سے افضل واقویٰ ہونا لازم نہیں آتا۔ پس ہر چند کہ حضرت ہاجرہ کا ایمان اعجب تھا مگر اقویٰ واکمل وافضل حضرت ابراہیمؑ کا ایمان تھا۔

اور یہی جواب ہے اس حدیث کا جس میں وارد ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے پوچھا کہ بتلاؤ کس کا ایمان عجیب تر ہے صحابہؓ نے عرض کیا ملائکہ کا ایمان۔ فرمایا ملائکہ کا کیا ہوا کہ وہ ملکوت سموت وارض کا مشاہدہ کر کے بھی ایمان نہ لاتے۔ صحابہؓ نے کہا پھر حضرات انبیاء علیہم السلام کا ایمان عجیب ہے فرمایا ان کا کیا ہوا کہ وحی کے نزول اور معجزات کے عطا ہونے کے بعد بھی ایمان نہ لائیں۔ صحابہؓ نے کہا پھر حضرات انبیاء علیہم السلام کا ایمان عجیب ہے فرمایا تمہیں کیا ہوا کہ میں تمہارے سامنے ہوں۔ رات دن تم میرے معجزات دیکھتے ہو۔ نزول وحی کا مشاہدہ کرتے ہو پھر بھی ایمان نہ لاؤ۔ صحابہؓ نے عرض کیا پھر حضورؐ ہی بتلائیں کس کا ایمان عجیب ہے فرمایا عجیب تر ایمان ان لوگوں کا ہے جو میرے بعد آئیں گے جو صرف چند اوراق قرآنیہ کو دیکھ کر مجھ پر ایمان لائیں گے اور یہ تمنا کریں گے کہ کاش ان کا سب مال و متاع لے لیا جائے اور ایک نگاہ سے مجھ کو دیکھ لیں۔ تو ان لوگوں کے ایمان کے عجیب ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کا ایمان انبیاء ملائکہ وصحابہؓ کے ایمان سے اکمل وقویٰ ہے ہرگز نہیں عجیب ہونا اور بات ہے۔ کامل وقوی ہونا اور بات ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ طبعی غم اور چیز ہے اور فکر کرنا۔ سوچنا اور چیز ہے اول غیر اختیاری ہے اور دوسرا درجہ اختیاری ہے۔ اسی کے قطع کرنے کا حکم ہے کہ تم نہ سوچو کہ ہائے اب کیا ہوگا۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت ہاجرہ نے نہیں سوچا۔

حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد

افسوس ہے کہ عقلمند آدمی کا دل پریشان رہے

فکر عذاب آخرت

شاید اس پر یہ سوال ہو کہ کیا عذاب آخرت کا سوچنا بھی برا ہے کہ ہائے میرا کیا انجام ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عذاب آخرت کا سوچنا دوسری خاصیت رکھتا ہے وہ تو منجی ہے کہ تمام پریشانیوں سے نجات دینے والا ہے۔ اس سے کلفت و کدورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس فکر سے قلب میں نورانیت وانشراح ہوتا ہے جس کا راز یہ ہے کہ اس فکر سے قلب کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور تعلق ہوجاتا ہے اور تعلق مع اللہ تمام پریشانیوں سے نجات دینے والا ہے۔ حدیث میں ہے

من جعل الهموم هما واحداً هم الاخرة كفى الله همومه ومن تشعبت همومه فى الدنيا لايبال الله به باى وادٍ هلك (سنن ابن ماجه: ۲۵۷) (اوکما قال)

یعنی جس نے اپنے سب فکروں کو ایک فکر میں مدغم کردیا۔ یعنی آخرت کے فکر میں اللہ تعالیٰ اس کے سارے افکار کو دور کر دیتے ہیں اور جس نے دنیا کے اندر افکار کو منتشر کر رکھا ہے خدا کو اس کی پرواہ نہیں کہ وہ کہیں جا کر ہلاک ہو۔ اسی لئے شریعت نے فکر آخرت کی تعلیم تاکید کے ساتھ کی ہے کیونکہ یہ فکر تمام مضر افکار کو قطع کرنے والا ہے حدیث میں ہے

يا عبد الله عد نفسك من اهل القبور اذا اصبحت فلا تحدث نفسك بالمساء واذا امسليت فلا تحدث نفسك بالصباح (لم أجد الحديث فى "موسوعة أطراف الحديث") (او كما قال)

اے عبداللہ بن عمر اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرو۔ جب صبح ہو تو شام کی امید نہ کرو۔ جب شام ہو تو صبح کی امید نہ کرو۔

بتلائیے جس شخص کی یہ حالت ہوگی۔ وہ کیونکر مشوش و پریشان ہوسکتا وہ تو یہ سمجھے گا کہ کوئی مصیبت باقی رہنے والی نہیں۔ کیا خبر صبح سے شام اور شام سے صبح بھی ہوگی یا نہیں۔

اب سب اشکالات رفع ہو گئے اور ثابت ہوگیا کہ پریشانی کی جڑ تجویز ہے اور طبعی غم اس سے بڑھتا ہے کہ لوگ اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ ہائے اب کیا ہوگا کیونکر ہوگا کبھی مستقبل کو سوچتے ہیں کبھی ماضی کو سوچتے ہیں کہ ہائے وہ بچہ مر گیا وہ یوں کھیلتا تھا۔ اس طرح باتیں کرتا تھا۔ یوں آ کر لپٹتا تھا۔ پس تم دنیا کے مصائب کو از خود سوچ سوچ کر نہ بڑھاؤ نہ کسی تجویز کو طے کرو بلکہ خدا کی تجویز میں اپنی تجویز کو فنا کر دو۔

ابتداء میں تو اہل اللہ کو یہ حالت تکلف کے ساتھ حاصل ہوتی ہے خدا تعالیٰ کی حکمت وقدرت کو سوچ سوچ کر اپنے ارادہ اور تجویز کو فنا کرنا پڑتا ہے پھر یہ حالت ان کے لئے امر طبعی بن جاتی ہے۔

چنانچہ حضرت بہلول نے کسی عارف سے پوچھا کہ مزاج کیسا ہے فرمایا! اس شخص کا مزاج کیا پوچھتے ہو کہ عالم میں کوئی فعل اس کی خواہش کے خلاف نہیں ہوتا کہا یہ کیونکر؟ فرمایا کہ میں نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہے اور خدا کی خواہش کے خلاف عالم میں کچھ بھی نہیں ہوتا تو میری خواہش کے خلاف بھی کچھ نہیں ہوتا۔

صاحبو! یہ کچھ مشکل کام نہیں کہ اپنے ارادہ کو دوسرے کے ارادہ کا تابع کر دیا جائے۔ ایک بچہ بھی ایسا کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایک لڑکا کانپور میں زبردستی ایک شخص کا امام بن گیا۔ اس نے یہ کیا کہ اس کے آگے کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگا۔ اور گوشہ چشم سے دیکھتا رہا کہ وہ کیا کرتا ہے جب وہ رکوع میں جانے کو ہوتا یہ اس سے پہلے رکوع کر دیتا۔ جب وہ سجدہ کرنا چاہتا یہ اس سے پہلے سجدہ میں چلا جاتا۔ اسی طرح ساری نماز میں اس کا امام بنا رہا۔

تو جب ایک بچہ نے اپنے ارادہ کو دوسرے کا تابع کر کے دکھلا دیا تو کیا آپ خدا کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے کہ اپنے ارادہ کو اس کے ارادہ کا تابع کر دیں کہ جو کچھ ہوگا ہم اس پر راضی ہیں۔ اس پر عمل شروع کر دیجئے اور برابر کرتے رہئے۔ ان شاء اللہ ایک دن ملکہ راسخہ پیدا ہو جائے گا۔ اور اسی سے راحت حاصل ہوگی۔ بدوں اس کے راحت نہیں مل سکتی۔ اور یہ کچھ مشکل نہیں کیونکہ کثرت تکرار سے سب کام آسان ہو جاتے ہیں۔

دیکھئے! آج کل جو لوگ پختہ حافظ ہیں وہ پہلے ہی دن سے پختہ نہیں ہوئے بلکہ کثرت تکرار سے پختہ بنے ہیں۔ آج جو خوشنویس ہے وہ کثرت مشق ہی سے خوش نویس ہوا ہے۔ اسی طرح آپ بھی کثرت تکرار سے تفویض کو حاصل کر لیں گے۔ اور یہ کوئی بزرگی نہیں کہ عوام اپنے کو اس کا اہل نہ سمجھیں بلکہ یہ تو عبدیت اور بندگی ہے۔ غلام کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔

تقلید شخصی

صاحبو! اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ تعلق کیونکر نہ پیدا کیا جائے حالانکہ شیخ کے ساتھ بھی جو ایک مخلوق ہے اسی معاملہ کی ضرورت ہے۔ شیخ سے جس کام کے لئے تعلق پیدا کیا جاتا ہے وہ بدوں تفویض کے نہیں ہوسکتا کو جو حالت پیش آئے۔ اس کو شیخ سے عرض کر کے بے فکر ہو جائے۔ اس کے بدوں کام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ تسلی کی یہی صورت ہے کہ ایک شخص پر اعتماد کر کے جو وہ کہے اس

کے موافق کام کرتے جاؤ بے فکر ہو جاؤ۔ اور یہی حکمت ہے تقلید شخصی میں۔ واللہ بدوں تقلید کے غیر مجتہد کو۔ بشرطیکہ خدا کا خوف اس کے دل میں ہو کبھی چین نہیں مل سکتا۔ جب چاہو تجربہ کر کے دیکھ لو۔ پس اگر شیخ تمہاری تسلی کرے تو تم تسلی رکھو اور فکر میں نہ پڑو۔

یہاں تھانہ بھون میں ہی ایک حافظ صاحب تھے۔ وہ مولانا گنگوہیؒ سے بیعت تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے کچھ حالات مجھ سے بیان کئے میں نے تسلی کی کہ یہ حالت بری نہیں بے فکر رہو۔ کہنے لگے کہ میں نے حضرت مولانا گنگوہی سے بھی عرض کیا تھا۔ انہوں نے بھی تسلی کی تھی۔ میں یوں سمجھا کہ ویسے ہی میرا دل بہلانے کو تسلی کر رہے ہیں۔ میں نے کہا حافظ صاحب توبہ کیجئے۔ مولانا کو جھوٹی تسلی کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کسی کے نوکر ہیں ان کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے۔ جو بلاوجہ آپ کی تسلی کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو حضرت پر اعتماد نہیں۔ اب ان کی آنکھیں کھلیں اور چین سے بیٹھے۔

میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر شیخ کی تسلی غلط بھی ہو جب بھی تم کو وہی نافع ہے۔ اگر تم اس کو غلط سمجھو گے تم کو نقصان ہوگا۔ تو جب شیخ کے ساتھ بھی اسی معاملہ کی ضرورت ہے تو حیرت ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ تفویض کا تعلق نہ ہو۔

روح اور عقل

اسی کو اللہ تعالیٰ اس مقام پر بیان فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہ خدا ہی کی سلطنت آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ پس ہر قسم کا تصرف کا حق اسی کو ہے دوسروں کو کسی تجویز کا حق نہیں۔ گو اس میں یہ احتمال تھا کہ تصرفات تشریعیہ کا حصر مراد ہو۔ مگر آگے یحی ویمیت بھی مذکور ہے جو میرے مقصود کے مناسب ہے بلکہ اس میں تصریح ہے کہ مراد تمام تصرفات تکوینیہ کو بھی عام ہے کیونکہ احیاء وامانت امور تکوینیہ سے ہے اور یہ بات تو کل ہی سمجھ میں آئی ہے کہ یحی ویمیت سے کوئی تصرف خارج نہیں بلکہ تمام تصرفات کا حاصل احیاء وامانت ہی ہے۔

شاید تم کہو کہ کیا کھیتی کا اگانا اور پکانا بھی اس میں داخل ہے تو میں کہوں گا ہاں وہ بھی احیاء کا ایک فرد ہے۔ اسی لئے ارشاد ہے کہ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (جان لو کہ اللہ تعالیٰ مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کرتا ہے)۔ (پ ۲۷) محاورات میں احیاء نفخ روح کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ عام ہے اور ہر شے کا احیاء الگ ہے۔

دوسرے میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ ہر چیز میں روح بھی ہے۔ صوفیاء کو تو اس کا کشف ہوا

ہے اور فلاسفہ دلائل سے اس کے قائل ہوئے ہیں اور میری رائے تو یہ ہے کہ حیوانات میں علاوہ روح کے عقل بھی ہے کیونکہ بعض حیوانات کے افعال اس پر مجبور کرتے ہیں کہ ان کو ذی عقل مانا جائے۔ لیکن اس سے ان کا مکلّف ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ عقل کا ہر درجہ تکلیف کے لئے کافی نہیں۔ دیکھئے صبی مراہق میں بھی عقل کا ایک درجہ موجود ہے۔ مگر مراہق مکلّف نہیں۔ تو اگر ایسا ہی درجہ حیوانات میں تسلیم کرلیا جائے تو اس پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

یہیں سے سمجھ لیا جائے کہ بعض مجذوبین کے متعلق جن میں بظاہر کچھ عقل بھی معلوم ہوتی ہے شبہ نہ کیا جائے کہ عقل کے ساتھ ان سے افعال واقوال غیر مشروعہ کا صدور کیونکر ہوتا ہے۔ تم ان کو کافر نہ کہو کیونکہ ممکن ہے وہ صبی کے مثل ہوں کہ باوجود کسی قدر عاقل ہونے کے مکلّف نہ ہوں۔ بلکہ حیوانات سے تجاوز کر کے ممکن ہے کہ نباتات میں بھی عقل کا ایک درجہ موجود ہو جو عقل حیوانی سے کم ہو۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ آج کل بعضے اس کے قائل ہیں کہ نباتات میں روح ہے۔ اور قدما فلاسفہ میں بھی بعض اس کے قائل ہوئے ہیں۔ سو ہم کو اس کے انکار کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ جمادات میں بھی عقل وروح موجود ہو اور ان کی عقل نباتات سے بھی کم ہو۔ اسی لئے جمادات کا نطق ممکن ہے اور جن احادیث میں حجر وشجر کی شہادت کا ذکر ہے وہ اس کی مؤید ہیں اور جب ہر چیز میں روح ہے تو احیاء وامانت سے کوئی تصرف خالی نہ ہوا۔

شاید تم کہو کہ ابراد ماء میں احیاء امانت کہاں ہے تو میں کہتا ہوں کہ اس میں ایجاد برودت ہے اور ایجاد ہی کا نام احیاء ہے اب اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہ کام تو بندہ بھی کرسکتا ہے چنانچہ پنکھا کر کے یا شورہ ملا کر پانی کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بندہ صرف اسباب کو اختیار کرتا ہے جن پر برودت کے وجود کو اللہ تعالیٰ مرتبہ فرماتے دیتے ہیں۔ اگر تم کو ایجاد برو پر قدرت ہے تو ذرا ان اسباب کو اختیار کر کے برودت کو روک دو۔ جب یہ نہیں کرسکتے تو معلوم ہوا کہ تم برو کو ایجاد نہیں کرتے ورنہ اس کے روکنے پر بھی قادر ہوتے کیونکہ قدرت کا تعلق ضدین سے ہوا کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم اور نمرود مردود

خلاصہ یہ کہ ابراد حقیقی اسباب برد اختیار کرنے کا نام نہیں بلکہ ایجاد برد کا نام ہے اور یہ تمہارا کام نہیں کیونکہ تم اسباب ومسببات کے ایجاد پر قدرنہیں صرف ان کو اختیار کرتے ہو اور اختیار کے بعد ان کے اثر کو نہیں روک سکتے۔

یہی وہ بات ہے کہ نمرود بوزن مردود گدھے نے نہیں سمجھی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ربی الذی یحی ویمیت (پ۳) کہ میرا خدا احیاء و اماتت کرتا ہے تو اس نے کہا یہ کام تو میں بھی کرسکتا ہوں۔ اسکے بعد قید خانہ سے دو قیدیوں کو بلاکر ایک کو مار ڈالا ایک کو رہا کر دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ یہ تو محض گدھا ہے اس پر گھوڑے کا پالان کیوں لادا۔ تو آپ نے دوسری دلیل بیان فرمائی کہ میرا خدا تو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال دے اس پر وہ مبہوت ہو گیا اور کوئی جواب نہ بن پڑا۔

اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ نمرود اس کے جواب میں کہہ سکتا تھا کہ مشرق سے تو میں نکالتا ہوں اگر خدا کوئی ہے تو اس سے کہو کہ مغرب سے نکالے۔

اس کا جواب ہمارے بعض اساتذہ نے یہ دیا ہے کہ ہاں اس کو اس کہنے کی گنجائش تھی۔ مگر خدا تعالیٰ نے یہ جواب اس کے دل میں نہیں ڈالا کیونکہ اگر وہ یہ جواب دیتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا تعالیٰ سے دعا کرتے اور آفتاب مغرب سے طلوع ہو جاتا۔ اور یہ علامت قیامت سے ہے تو اسی وقت قیامت قائم ہو جاتی۔ مگر اللہ تعالیٰ کو ابھی عالم کا بقاء مقصود تھا۔ اس لئے نمرود کے دل میں یہ سوال نہیں ڈالا۔

خارق رد شمس کو طلوع الشمس من المغرب پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ رد شمس ایک ساعت کے لئے اس طرح ہوا کہ کسی کو معلوم ہوا کسی کو معلوم نہیں ہوا۔ اور طلوع من المغرب مثل طلوع من المشرق کے تمام آفاق کو عام ہوگا۔

پس آیت کے عظیم ہونے کے سبب اس کا اشراط ساعت سے ہونا مناسب ہے۔

وہی میرے استاد یہ بھی فرماتے تھے کہ بھت الذی کفر (پ۳) میں بھت بصیغہ مجہول اسی لئے لایا گیا کہ اس کافر مجہول کو حیران بنا دیا گیا۔ اس لفظ میں اشارہ ہے کہ اس کو سوال کی گنجائش تھی مگر اس کو حیران بنا دیا گیا مگر یہ نکتہ اس وقت صحیح ہوسکتا ہے جب کہ بھت معروف بھی متعدی حیرت میں ڈالنے کے معنی میں مستعمل ہو۔ میرا خیال[1] یہ ہے کہ بھت مجہول ہی تحیر کے معنی میں ہے اور اس کا معروف متعدی مستعمل نہیں۔

اس مقام پر ایک علمی اشکال ہے۔ میں اس کو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ علم مناظرہ میں یہ طے ہو چکا ہے کہ مناظر کو ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال جائز نہیں ورنہ مناظرہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسری دلیل کی طرف کیوں انتقال کیا۔

---

[1] ثم رایت تائیدہ من القاموس ۱۲

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال اپنی مصلحت سے ممنوع ہے اور مخاطب کی مصلحت سے جائز ہے جب کہ وہ بلاوت فہم کی وجہ سے دلیل اول کو نہ سمجھ سکے۔ نمرود احمق تھا وہ سمجھا نہیں کہ احیاء وامات کے معنی ایجاد حیات وایقاع موت کے ہیں اور ابقاء حی کو احیاء نہیں کہتے نہ قتل کو امات کہتے ہیں کیونکہ قتل عین موت نہیں۔ بلکہ سبب موت ہے اور بعض دفعہ قتل سے موت کا تخلف بھی ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ایک معتبر شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک پادری پر کچھ تہمت لگ گئی تھی۔ اس نے غلبہ حیاء میں کمرہ میں بند ہو کر خودکشی کر لی۔ اس طرح آئینہ سامنے رکھ کر استرے سے گلا کاٹ دیا۔ اور گلا کٹ کر کمر کی طرف لٹک گیا صرف تھوڑی سی کھال الجھی ہوئی رہ گئی۔ نوکروں کو جو کمرہ سے خون بہتا ہوا نظر آیا انہوں نے فوراً ڈاکٹر اور پولیس کو اطلاع دی۔ ڈاکٹر آیا اس نے دیکھا کہ ابھی نبض و جسم میں حرارت موجود ہے۔ اس نے فوراً سر کو اپنی جگہ پر رکھ کر ٹانکے لگا دیئے اور دوا لگا دی۔ چند گھنٹوں کے بعد اسے ہوش آ گیا اور بے حیاء اچھا خاصا ہو کر بہت عرصہ تک زندہ رہا۔ البتہ آواز ذرا گنگنی ہو گئی تھی۔

پس ایسے واقعات اس کی دلیل ہیں کہ قتل اور قطع حلقوم عین موت نہیں۔ بلکہ محض اسباب میں سے ہے۔ جیسے سنکھیا کھانا اسباب میں سے ہے عین موت نہیں۔ اسی لئے بہت سے سنکھیا کھا کر بچ بھی جاتے ہیں۔ پس نمرود کی یہ حماقت تھی کہ اس نے قتل کو امات سمجھا اور ایک مجرم کو رہا کر دینے کو احیاء اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دقیق دلیل کو چھوڑ کر ظاہر دلیل اختیار کی۔

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ اسباب برد اختیار کرنے کا نام ابراد نہیں۔ جیسا کہ نمرود نے اسباب قتل کو امات اور ترک اسباب موت کو احیاء سمجھا تھا۔ بلکہ ابراد میں حقیقت ہے۔ ایجاد برد جیسا کہ احیاء کی حقیقت ہے ایجاد حیات اور یہ بجز خدا تعالیٰ کے کسی کے قبضہ میں نہیں۔ پس۔ محی و ممیت کا حاصل یہ ہوا کہ تمام تصرفات اللہ تعالیٰ کے قبضہ ہی میں ہیں۔

مسئلہ تقدیر کی حکمت

رہا یہ کہ اس عقیدہ کے بتلانے کی کیا حکمت ہے۔ سو اس کو بھی ایک نص میں خود ہی بیان فرما دیا ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ط اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۲۷)

(کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں (یعنی لوح محفوظ میں) لکھی ہے قبل اس کے کہ ہم ان جانوں کو پیدا کریں یہ اللہ)

یہاں تک تو مسئلہ تقدیر کا بیان تھا۔آگے اس کی حکمت بتلاتے ہیں

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ . (پ ۲۷)

(یہ بات) (بتلا اس واسطے دی ہے تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر (رنج) اتنا مت کرو اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں)

کہ یہ مسئلہ تم کو اس لئے تعلیم کیا گیا تاکہ تم کو کسی فوت ہونے والی شئے پر رنج نہ ہو۔ اور کسی حاصل ہونے والی شے پر فرح نہ ہو کیونکہ فرح مطلقاً محمود نہیں بلکہ فرح شکر ا ہو وہ محمود ہے اور اسی کا ذکر ہے اس آیت میں۔ **قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا** (پ ۱۱)

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہہ دیجئے کہ لوگوں کو خدا کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیے) اور جو فرح بطراً ہو وہ محمود نہیں بلکہ مذموم ہے چنانچہ قارون کے قصہ میں ارشاد ہے۔

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ (پ ۲۰)

(جبکہ اس کو اس کی برادری نے (سمجھانے کے طور پر) کہا کہ تو اس (مال وحشمت پر) اترا مت۔ واقعی اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا)

اسی تقسیم کی بناء پر حدیث میں ہے **من اعطى لله ومنع لله فقد استكمل الايمان**

(سنن الترمذی:۲۵۲۱،مسند احمد ۳:۴۳۸) (اوکما قال)

(جس نے اللہ ہی کے لئے دیا اور اللہ ہی کے لئے روکا اس کو ایمان کامل نصیب ہوا)

اس میں اعطاء ومنع دونوں کے ساتھ للہ کی قید ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت مطلقاً محمود نہیں نہ بخل مطلقاً مذموم بلکہ اگر خدا کے لئے ہوں، تو دونوں محمود ورنہ دونوں مذموم۔

اب آپ کو حاجی صاحب کی ایک تحقیق کی قدر ہوگی۔ فرماتے تھے کہ اخلاق رذیلہ فی نفسہا مذموم نہیں۔ بلکہ خاص مصرف کے اختیار سے مذموم ہیں اور اگر ان کو طاعات میں صرف کیا جائے تو یہ محمود ہیں۔ اسی طرح اخلاق حمیدہ بھی افضائی طاعت الحق کی وجہ سے محمود ہیں۔ پس اگر سخاوت وغیرہ معاصی کی طرف مفضی ہوجائے تو محمود نہیں بلکہ مذموم ہیں۔

غرض! اخلاق سب فطری اور جبلی ہیں اور درجہ فطرت میں کوئی خلق نہ مذموم نہ محمود۔ بلکہ مواقع استعمال سے ان میں مدح وذم آجاتی ہے۔ اسی کی نوع سے فرح بھی ہے یہ مطلقاً محمود نہیں بلکہ بعض افراد اس کے مذموم بھی ہیں۔ جن کا ترجمہ عجب اور پندار اور اترانا ہے۔

تو مسئلہ تقدیر اس لئے بتلایا گیا تاکہ مصائب میں کسی شے کے فوت ہونے سے رنجیدہ نہ ہو اور نعمت وراحت پر اترائے نہیں کیونکہ قائل تقدیر یہ سمجھے گا کہ جو کچھ حاصل ہوا میرے کسب وکمال سے نہیں بلکہ تقدیر میں یوں ہی تھا۔ اور آئندہ کی خبر نہیں کہ تقدیر میں کیا ہے تو وہ کبھی نہ اترائے گا نہ دنیا سے دل لگائے گا۔ اور یہ راحت کی چیز ہے کیونکہ مشاہدہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو دنیا سے زیادہ خوشی ہوتی ہے زوال کے وقت ان کو اسی قدر رنج بھی ہوتا ہے۔ اور اگر خوشی نہ ہو یا اعتدال سے ہو تو رنج بالکل نہ ہو یا اعتدال سے ہو۔

حضرت! میں سچ کہتا ہوں کہ قلب کو جتنی قوت اعتقاد تقدیر سے ہوتی ہے اور کسی چیز سے نہیں ہو سکتی۔ کفار چاہے لاکھ یاقوتیاں کھائیں۔ مگر اس اکسیر کے سامنے سب گرد ہیں۔ بخدا تقدیر کا اعتقاد دل کو نہایت مضبوط کر دیتا ہے۔ یہ شخص کسی حالت میں متزلزل نہیں ہوتا جو مصیبت سامنے آئے گی یوں کہے گا کہ یہ تو مقدر تھی ٹلنے والی نہ تھی خواہ میں راضی ہوں یا ناراض۔ پھر خدا کی تقدیر سے ناراض ہو کر عاقبت بھی کیوں خراب کی۔

نیز اسی کیساتھ اس کے دل میں یہی آتا ہے کہ اس میں ضرور کوئی حکمت ہے۔ یہ تو حکمت کا علم اجمالی ہے۔ پھر اس کے بعد یہ چاہئے کہ احادیث میں جو تفصیلی حکمتیں مصائب وحوادث کی مذکور ہیں۔ نیز ان پر ثواب بتلایا گیا ہے ان کو پیش نظر رکھیں تو ان شاء اللہ غم بہت کم ہو جائیگا۔

بچپن کی موت کی اہمیت

چنانچہ چھوٹے بچوں کی موت میں ایک بڑی حکمت ہے۔ اگر وہ پیش نظر رہے تو چھوٹے بچوں کے مرنے پر غم کے ساتھ خوشی کا بھی ایک پہلو سامنے ہوگا لوگوں کو اولاد کے بڑے ہونے کی خوشی محض اس لئے ہے کہ ان کا نفس یوں ہی چاہتا ہے۔ ورنہ ان کو کیا خبر کہ بڑے ہو کر یہ کیسا ہوگا۔ باعث راحت والدین ہوگا یا وبال جان ہوگا۔ پھر وہ بڑا ہو کر مرے تو یہ خبر نہیں کہ وہ والدین کو آخرت میں کچھ نفع دے گا یا خود ہی سہارے کا محتاج ہوگا۔ اور بچپن میں مرنے والے بچے بہت زیادہ کار آمد ہیں۔ ان میں یہ احتمال ہی نہیں کہ دیکھئے آخرت میں یہ خود کس حال میں ہو کیونکہ غیر مکلف تو یقیناً مغفور الہ ہے وہ آخرت میں والدین کے بہت کام آئے گا۔

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے جوانی میں نکاح نہ کیا تھا۔ اور مجرد ہی رہنے کی نیت کی تھی۔ ہر چند مریدوں نے عرض بھی کیا۔ مگر آپ نے منظور نہ کیا ایک دفعہ دوپہر کو سو کر اٹھے تو اسی وقت تقاضا کیا کہ جلدی میرا نکاح کرو۔ مریدوں نے فوراً تعمیل کی۔ ایک مرید نے اپنی لڑکی سے نکاح کر دیا۔ آپ نکاح کے

حقوق ادا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔ اور کچھ دنوں کے بعد مر گیا۔ تو آپ نے فرمایا الحمدللہ مراد حاصل ہو گئی۔ اور بیوی سے کہا کہ اب مجھے تیری ضرورت نہیں میرا جو مقصود تھا پورا ہو گیا۔ اب اگر تو نکاح کا لطف حاصل کرنا چاہے تو میں طلاق دے کر کسی جوان صالح سے تیرا نکاح کر دوں اور اگر میرے پاس رہنا چاہے تو کھانے پہننے کی تیرے واسطے کمی نہیں مگر حقوق نکاح کا مطالبہ نہ کرنا۔ وہ لڑکی بھی نیک تھی۔ اس نے کہا مجھے صرف آپ کی خدمت مقصود ہے اور کچھ مطلوب نہیں۔

مگر خدام کو یہ بات سن کر حیرت ہوئی کہ یا تو اس تقاضے سے نکاح کیا تھا یا اب طلاق کو آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ میں نے نکاح کا تقاضا کسی نفسانی ضرورت کی وجہ سے نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس کا منشا یہ تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میدان قیامت برپا ہے اور لوگ پل صراط سے گزر رہے ہیں جو دوزخ کے اوپر بچھایا گیا ہے۔ پھر میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ پل صراط سے گزرتے ہوئے اس کے قدم ڈگمگائے اور قریب تھا کہ جہنم میں جا گرے دفعتاً ایک بچہ نے آ کر اس کو سنبھالا اور مضبوطی کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ کر بجلی کی طرح پل صراط سے پار کر کے لے گیا۔ میں نے دو فرشتوں سے پوچھا کہ یہ کون بچہ تھا کہا اسی شخص کا بیٹا تھا جو بچپن میں انتقال کر گیا تھا آج اس کا شفیع ہو گیا۔ خواب سے بیدار ہو کر مجھے فکر ہوئی کہ میرے پاس آخرت کی اور جائیدادیں تو ہیں نماز، روزہ وغیرہ یہ جائیداد نہیں۔

زمیندار کو ہر قسم کی جائیداد جمع کرنی چاہئے۔ کیونکہ بعض دفعہ ایک جائیداد میں پیداوار نہیں ہوتی۔ دوسری میں ہو جاتی ہے کبھی نیشکر میں نفع ہو گیا اور گیہوں کے کھیت میں نقصان۔ دونوں مل کر اوسط برابر ہو جاتا ہے کبھی باغ میں فائدہ ہو گیا۔ جانوروں میں خسارہ ہو گیا تو ہر قسم کی جائداد والا فائدہ ہی میں رہتا ہے۔ اس لئے ان بزرگ نے چاہا کہ یہ جائداد بھی پاس ہونا چاہئے۔ چنانچہ نکاح ہوا اور بچہ پیدا ہو کر مر گیا۔ تو ان کا مقصود حاصل ہو گیا۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچے جنت میں بھی بچے ہی رہیں گے۔ اور ان کی خصلتیں بھی بچوں کی سی رہیں گی۔ وہی ضد کرنا اور اپنی بات پر اڑ جانا۔ سر ہو جانا۔ مگر یہ حالت دخول جنت سے پہلے ہو گی پھر جنت میں پہنچ کر باپ بیٹے سب برابر ایک قد کے ہو جائیں گے۔ حدیث میں آیا ہے کہ یہ بچے اڑ جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم جنت میں نہ جائیں گے جب تک ہمارے ماں باپ کو ہمارے

حوالے نہ کیا جائے۔ ہم تو ان کو اپنے ساتھ ہی لے کر جنت جائیں گے تو حق تعالیٰ فرمائیں گے:

ایها الطفل المراغم ربه ادخل ابویک (المصنف لابن ابی شیبة ۳:۳۵۴)

کہ اے ضدی بچے اپنے خدا سے ہٹ کرنے والے، جا اپنے والدین کو بھی جنت میں لے جا۔

اس وقت یہ خوش خوش جنت میں اپنے ماں باپ کے ساتھ جائیں گے تو یہ بے گناہ بچے اللہ میاں سے بھی آپ ہی بخشش کے لئے ضد کریں گے اور اگر بچہ بڑا ہو کر مر جائے تو حضرت خضر کا واقعہ یاد کر کے دل کو یہ سمجھالو کہ نہ معلوم اس میں کیا حکمت ہوگی۔ شاید اگر یہ اور زندہ رہتا تو دین کو بگاڑ لیتا یا دنیا میں وبال جاں ہو جاتا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

آں پسر راکش خضرؑ ببرید حلق		سر آں در نیابد عام خلق

''جس لڑکے کو حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کر دیا اس کا بھید عام لوگ نہ پا سکے۔''

اولاد نہ ہونے کی حکمت

اگر کسی کے بالکل ہی اولاد نہ ہو وہ یوں سمجھے کہ میرے لئے یہی حکمت ہے نہ معلوم اولاد ہوتی تو کن کن مصائب کا سامنا ہوتا۔ چنانچہ خدا نے مجھے اولاد نہیں دی۔ میں اس کو اپنے واسطے عین حکمت سمجھتا ہوں۔

حضرت حاجی صاحب سے میرے گھر میں خالہ نے دعا کے واسطے عرض کیا تھا کہ اشرف علی کے اولاد ہو جائے۔ حاجی صاحب مجھ سے فرمانے لگے کہ بھائی تمہاری خالہ اولاد کے لئے دعا کرنے کو کہتی تھی۔ دعا سے کیا انکار ہے لیکن میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ جیسا میں ہوں ایسے ہی تم رہو۔ میں نے دل میں کہا کہ بس تو خیر صلا ہے اگر آپ دعا بھی کریں گے جب بھی اولاد نہ ہوگی کیونکہ دلی منشا تو یہ ہے اور

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں		مید ہد یزداں مراد متقیں

''تو ایسا چاہتا ہے اور خدا ایسا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کی مراد پوری فرماتا ہے۔''

میں نے کہا حضرت بس! میں وہی چاہتا ہوں جو آپ چاہتے ہیں۔

اولاد نہ ہونے میں بعض کے لئے ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ اس شخص کے تعلقات دنیا میں نہیں بڑھتے۔ اور اولاد والے کے تعلقات بہت بڑھ جاتے ہیں چنانچہ ہماری پھوپھی صاحبہ میرے لئے اس طرح دعا کیا کرتی تھیں کہ اے اللہ! میرے بھتیجے کا بھی ساجھا دنیا میں رلا دے (یعنی اولاد دیدے) میں غصے ہوتا تھا کہ تم مجھے کوستی ہو دنیادار بنانا چاہتی ہو مگر یہ عنوان بتلا رہا ہے کہ اہل عرف کے نزدیک دنیا کے اندر وہی پھنستا ہے جو صاحب اولاد ہو اور اس سے خود سمجھ لو کہ جو

صاحب اولاد نہ ہو وہ کیا[1] ہوگا۔ وہ دنیا سے بے تعلق و بے لوث ہوگا۔ بلکہ یوں کہئے کہ اللہ والا ہوگا۔ اب تم خود سمجھ لو کہ اللہ والا ہونا اچھا یا دنیا والا ہونا اچھا۔ مگر یہ بعض کے اعتبار سے ہے ورنہ بعضے اولاد والے بے تعلق رہتے ہیں اور بعض بے اولاد دنیا دار ہوتے ہیں۔

چنانچہ اگر میرے اولاد ہوتی تو شاید میرے لئے تکلیف کا سبب ہوتی کیونکہ مجھے تعلقات سے پریشانی ہوتی ہے۔ نیز مجھے انتظام کا ہیضہ ہے بدانتظامی سے مجھے سخت الجھن ہوتی ہے۔ اور اولاد کا انتظام سب سے زیادہ دشوار۔

اولاد اور امانت

بس حاصل یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ دیں۔ اس کے لئے ہی اچھا اور جس کو نہ دیں اس کے لئے یہی اچھا اور جس کو دیں دے کر چھین لیں اس کے لئے یہی مصلحت ہے لله ما اخذو لله ما اعطی کا یہی مطلب ہے جو حدیث میں مصائب کی تسلیہ کے لئے وارد ہے اور یہی مطلب ہے انا لله کا اور اس اعتقاد کو صبر کے پیدا کرنے میں بڑا دخل ہے اور یہ قرآن کا طرز خاص ہے کہ ہر چیز کا طریقہ ساتھ ساتھ بتلا دیا جاتا ہے۔ یہاں صبر کا حکم تھا تو صبر کا طریقہ ساتھ ساتھ ہی بتلا دیا جیسا کہ سہولت نماز کا طریقہ بتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے انها لكبيرة کہ بے شک نماز گراں ہے۔ آگے طریق سہولت مذکور ہے۔ الی علی الخشعین جس سے معلوم ہوا کہ خشوع کے بعد نماز سہل ہو جاتی ہے۔ آگے خشوع کا طریقہ ارشاد ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (پ ۱)

جس میں خشوع کا طریقہ یہ بتلایا کہ لقاء رب اور یوم آخرت کا دھیان رکھے اسی طرح یہاں انا لله الخ۔ کے مضمون کو تحصیل صبر میں بڑا دخل ہے اور یہی وہ مضمون ہے جس کی وجہ سے حضرت ام سلیم صحابیہ نے کامل صبر فرمایا اور اپنے خاوند کو بھی صابر بنایا۔

ان کا قصہ حدیث میں اس طرح ہے کہ ان کا ایک بچہ بیمار تھا۔ حضرت طلحہ باہر سے آ کر اس کا حال دریافت کیا کرتے۔ ایک دن اس کا انتقال ہو گیا اور شام کو حضرت طلحہؓ آئے تو حضرت ام سلیم نے ان پر ظاہر نہیں کیا کہ بچہ کا انتقال ہو گیا تا کہ سن کر پریشان نہ ہوں اور پریشانی میں کھانا نہ کھا سکیں۔ بلکہ جب انہوں نے دریافت کیا کہ بچہ کیسا ہے تو یہ جواب دیا کہ اب سکون ہے۔ (یہ

---

[1] قلت واکمل الاحوال ما کان علیه النبی صلی الله علیه وسلم و کذلک الا نبیاء کانت لهم ازواج وذریة ودعا ابراهیم وزکریا علیهما السلام ان یولد لهما واستجیبا وعیسیٰ علیه السلام یو لدلهٗ بعد النزول وفی الحدیث تز وجو الودود الولود فانی اباهی بکم الا مم فینبغی ان یراعی جانت ذالک فی الکلام ۱۲ ظ۔

جھوٹ نہ تھا کیونکہ موت سے بڑھ کر کیا سکون ہوگا جس کے بعد حرکت کی امید ہی نہیں) یہ سن کر انہوں کھانا کھایا اور رات کو بیوی کی طرف میلان بھی ہوا۔ بیوی نے بے انتہا صبر کیا کہ اس سے بھی انکار نہ کیا جب صبح ہوئی تو کہا کہ میں تم سے ایک مسئلہ پوچھتی ہوں۔

بھلا اگر کسی نے ہم کو کوئی چیز بطور امانت کے دی ہو پھر بعد میں وہ اپنی امانت کو واپس لینا چاہے تو کیا کرنا چاہئے۔ حضرت طلحہؓ نے جواب دیا کہ یہی چاہئے کہ جب مالک اس کو واپس لینا چاہے تو بڑی خوشی کے ساتھ واپس کر دیا جائے۔ حضرت ام سلیم نے کہا تو اپنے بچہ کو صبر کرو اور خوشی کے ساتھ اس کے دفن کا سامان کرو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے اپنی امانت لے لی ہے۔

حضرت طلحہؓ بڑے جھلائے کہ تم نے رات ہی کو کیوں نہ خبر کی۔ کہا کیا ہوتا رات کو دفن کرنے میں مصیبت ہوتی اور رات بھر پریشان رہتے۔ کھانا بھی نہ کھاتے اس لئے رات خبر نہیں کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت طلحہؓ گئے تو آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو ام سلیم کا فعل بہت پسند آیا اور میں امید کرتا ہوں کہ آج رات تم دونوں کو خدا نے مبارک اولاد عطا فرمائی ہے۔ (چنانچہ عبداللہ بن طلحہؓ پیدا ہوئے جو بڑے عالم بڑے سخی اور صاحب اموال واولاد تھے)

تو حضرت ام سلیمؓ نے سچ فرمایا کہ یہ اولاد اللہ کی امانت ہے اس کو جب وہ لینا چاہیں خوش ہو کر خدا کے حوالے کر دینا چاہئے۔

اس پر شاید یہ سوال ہوگا کہ یہ امانت ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی محبت کیوں دی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے تا کہ پرورش ہو سکے کیونکہ بدوں محبت کے اس پاخانہ کے ڈھیر کی پرورش کرنا مشکل ہے۔ اسی لئے غیر کی اولاد پالنا بہت دشوار ہے اور جب بچہ کی پرورش ہو چکتی ہے تو محبت میں بھی کمی ہونے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بیٹے کے ساتھ ویسی محبت نہیں ہوتی۔ جیسی چھوٹے سے ہوتی ہے۔

غرض اولاد کو بھی خدا کی چیز سمجھو کہ اس کی امانت چند روز ہمارے پاس ہے پر اس کے فوت ہونے پر زیادہ ملال نہ ہوگا۔ کیونکہ پریشانی کی بنا تو یہی ہے کہ تم ان کو اپنی چیز سمجھتے ہو اور یہ سمجھ کر ان کے متعلق تجویزیں کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی مالک بھی وہی ہیں ملک بھی وہی ہیں یہاں ملک سے ملک کامل مراد ہے جس کے ساتھ ملک بھی جمع ہو کیونکہ بدوں اس کے ملک ناقص ہے اور خدا نقصان سے بری ہے۔ اسی لئے مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ بل مالکیت اور ملکیت دونوں کو جمع کیا گیا ہے دونوں قراءتوں میں۔ اور قراتین بمنزلہ آیتین کے ہیں۔

ہر ایک کا مفہوم ثابت کرنا لازم ہے کیونکہ ضرورت دونوں کی ہے ایک جہت سے ملکیت میں قوت اور ایک جہت سے مالکیت میں۔ اس لئے مقصود دونوں کو جمع کرنا ہے۔ اسی لئے میں نے کہا کہ یہاں ملک سے مراد ملک کا م ہے یا یوں کہو کہ لام دلہ میں) ملک کے لئے ہے تو مالک ہونا اس سے ثابت اور ملک ہونا لفظ ملک سے ثابت۔ اور ایک آیت میں دو قراءتوں کو ایک ساتھ عمل میں جمع کرنا فقہا کے عمل سے ثابت ہے۔ چنانچہ حتیٰ یطھرن میں فقہا نے دونوں قراءتوں کو جمع کر کے احکام مستنبط کئے ہیں۔ اسی طرح میں نے وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ میں دونوں قراءتوں کو جمع کیا ہے کہ دونوں کے مجموعہ کا مطلب یہ ہوا کہ پیروں کو مل مل کر دھویا کرو کیونکہ ان پر پانی بہالینا عموماً کافی نہیں ہوتا۔ اسی لئے فقہا نے دلک کو مطلقاً اور دلک رجلین کو خصوصاً مستحب کہا ہے۔ اسی طرح مالک یوم الدین میں دونوں کو جمع کیا گیا ہے مطلب یہ کہ وہ مالک بھی ہیں ملک بھی ہیں۔

ثواب جہاں اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ ملک مطلق آیا ہے وہاں یہی مجموعہ مراد ہوگا ورنہ محض ایک کے اعتبار میں نقص لازم آتا ہے اور یہی نکتہ ہے من ولی ولا نصیر میں دو لفظوں کے جمع کرنے میں ۔کیونکہ ولی دوست کو کہتے ہیں خواہ وہ نصرت پر قادر ہو یا عاجز ہو اور نصیر مددگار معاون کو کہتے ہیں خواہ دوست ہو یا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو تم سے تعلق بھی ہے اور وہ تمہاری نصرت داعانت پر بھی قادر ہیں اور اس مضمون کو صیغۂ حصر کیساتھ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارے کوئی مددگار نہیں۔ اس حصر میں اس طرف اشارہ ہے کہ بس اللہ تعالیٰ ہی سے تعلق رکھو اور کسی سے بالذات تعلق نہ رکھو۔

یہی خلاصہ ہے سارے سلوک کا۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے سوا کسی شے سے تعلق نہ ہوگا تو پھر کسی شے کے فوت ہونے سے زیادہ قلق وغم بھی نہ ہوگا۔ بلکہ اس وقت حق تعالیٰ کو خطاب کر کے یوں کہے گا۔

روز ہا گر رفت گو رو باک نیست　　　　تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

"زمانہ اگر گزرتا ہے گزرنے دے کوئی خوف نہیں ہے تو ٹھہر جا کیونکہ تیرے بغیر مجھے چین نہیں ہے۔"

سالکین کو تنبیہ

بس اب میں ختم کرنا چاہتا ہوں۔ البتہ اخیر میں سالکین کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس وقت جو مضمون میں نے بیان کیا ہے۔ جس طرح یہ مصائب دنیا کا خاتمہ کرنے والا ہے اس طرح سلوک کی تمام پریشانیوں کا بھی قلع قمع کرنے والا ہے۔ کیونکہ سلوک کی تمام تر پریشانیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ سالک کو ثمرات واحوال کی طرف زیادہ توجہ ہوتی ہے اور ان کے متعلق اپنی تجویزیں اور امیدیں قائم کر لیتا ہے۔ جب تجویز کے

خلاف ثمرات وکیفیات کے ظہور میں دیر ہوتی ہے تو پریشان ہوتا۔ اور شیخ سے شکائتیں کرتا پھرتا ہے اور اس وقت کے بیان کا حاصل یہی ہے کہ بندہ کو تجویز کا کچھ حق نہیں۔ اپنی تجویز کو قطع کرو۔

دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں تو اس کو چھوڑ کر دل لگانا غلطی ہے اور ثمرات وکیفیات غیر حق ہیں، اس لئے ان کا طالب نہ ہونا چاہیئے۔

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد از وغیر او تمنائی

جدائی اور ملاقات کیا ہوتی ہے دوست کی رضا طلب کر۔ بڑے افسوس کی بات ہے اس کا ہوتے ہوئے غیر سے آرزو رکھے۔

اور ثمرات سے مراد ثمرات غیر اختیاریہ ہیں ثمرات اختیاریہ نہیں۔ شاید کوئی عام سمجھ کر اختیارات کے فوت پر بھی راضی رہا کرے ہر گز نہیں۔ کیونکہ اختیاری امور میں اپنے اختیار کا صرف کرنا واجب ہے۔ ہاں ثمرات غیر اختیاریہ کے عدم حصول یا فوت سے غم نہ کرے۔ بس سمجھ لے کہ حق تعالیٰ کا تصرف ہے۔ ان کی یہی تجویز ہے مجھے اس پر راضی رہنا چاہیئے۔

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش   بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش

اے باغباں اگر تھوڑے دن کے لئے تجھ کو پھول کی صحبت نصیب ہو جائے سخت جدائی کے وقت تجھ کو بلبل جیسا صبر کرنا پڑے۔

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال   مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

اے دل اس کی زلف کی قید میں پریشانی سے مت رو۔ ہوشیار پرندہ جب جال میں پھنس جائے تو صبر کرنا چاہیے۔

سالکین کو بعض احوال ایسے پیش آتے ہیں کہ میں قسم تو نہیں کھاتا۔ گو غلبۂ ظن پر قسم کھانا بھی جائز ہے کہ اگر یہ حالات پہاڑ پر وارد ہوں تو پہاڑ پھٹ جائے اور وحی کے متعلق تو خود نص میں وارد ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (پ۲۸)

(اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو (اے مخاطب) تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا)

یہ تو پہاڑ کے متعلق ارشاد ہے کہ اگر اس پر قرآن نازل ہوتا تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تحمل مشاہد ہے کہ آپ نے تیئس سال تک نزول قرآن کا ثقل برداشت

فرمایا۔ اور وحی میں یہ اثر عالم ملکوت سے تعلق ہونے کی وجہ سے ہے۔ اسی پر دوسرے حالات کو قیاس کرلو۔ جو عالم ملکوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور پہاڑ تو کیا چیز ہے۔ عارفین نے تو اس امانت کا بار اٹھا رکھا ہے جس کے اٹھانے سے زمین و آسمان بھی عاجز تھے

آسماں بار امانت نتوانست کشید　　　قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

امانت کا بوجھ آسماں نہیں اٹھا سکا۔ فال کا پانسہ مجھ دیوانہ کے نام نکلا۔

تو سالکین پر اگر ایسے حالات طاری ہوں جن سے پہاڑ پھٹ جائے تو کیا تعجب ہے تو ان کو اس مضمون کی کہ کیفیات کے متعلق خود کچھ تجویز نہ کرو اور ہر کیفیت کو خیر سمجھو۔ بہت قدر ہوگی۔ اس وقت اس سے بہت سہارا ملے گا اور رنج و غم زائل ہو جائے گا۔

تعلق مع اللہ کی افادیت

صاحبو! واللہ اگر حق تعالیٰ سے تعلق ہو جائے تو سب کا فنا ہو جانا بھی سہل ہو جائے اور جس کو تعلق مع اللہ نصیب ہو گیا اور تفویض محض اختیار کرلی اس کے سامنے دنیا کے واقعات کیا چیز ہیں ان کو تو وہ چٹکیوں میں اڑا دیتا ہے۔ صاحبو تم اسی غرض سے سلوک اختیار کرلو کہ اس کے ذریعے سے حوادث و مصائب سہل ہو جائیں گے۔

سالک کے سامنے واقعات دنیویہ کی ایسی مثال ہے جیسے سلطان محمود سبکتگین کے لشکر میں نقارۂ جنگ اٹھانے والے اونٹ تھے یہ نقارے بہت بڑے بڑے اور بھاری تھے۔ ایک دفعہ لشکر جا رہا تھا اور نقارۂ جنگ کا اونٹ ایک کھیت میں سے گزرا۔ کاشتکار کے لڑکے نے ڈھپریا بجائی تاکہ اس کی آواز سے اونٹ بدک کر کھیت میں سے نکل جائے۔ ڈھپریا کو دیکھ کر اونٹ بہت ہنسا کہ میری کمر پر تو اتنا بڑا نقارہ بجتا ہے جس کی صدا سے زمین و آسمان گونج اٹھتے ہیں۔ اس سے تو میں ڈرتا ہی نہیں تیری ڈھپریا سے ضرور ڈروں گا۔

حضرت! جس کے کمر پر کوس محمودی رکھا ہوا ہو اس کو دنیا کی ڈھپریا کب پریشان کر سکتی ہے۔ بس انہوں نے ایک غم لے لیا ہے جس نے عصائے موسیٰ کی طرح غم کے تمام سانپوں کو نگل لیا ہے اور خوشی بھی ان کو ایسی ہے کہ بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں۔

اس لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں

لو علم الملوک بما عندنا لجادلونا بالسیوف۔

کہ اگر بادشاہوں کو اس دولت کی خبر ہوتی جو ہمارے پاس ہے تو وہ تلواریں لے کر ہم پر چڑھ آتے۔ اور اس دولت کو چھیننے کی کوشش کرتے۔

وہ ہر حال میں خوش کیوں نہ ہوں جب کہ جانتے ہیں کہ مصیبت وغم سب محبوب کا دیا ہوا ہے پھر خوشی کیوں نہ ہو

نا خوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

تیرا ستانا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے (یعنی جب تو مجھے ستاتا ہے) دل ایسے دوست کے قربان جو مجھے ستاتا ہے۔ محبوب اگر عاشق کو آغوش میں لے کر زور سے دبانے لگے تو کیا عاشق کو اس رنج ہوگا ہر گز نہیں۔ گو ہڈیاں پسلیاں ٹوٹنے لگیں اور گو اس کے منہ سے آہ و نالہ نکل جائے۔ مگر دل سے خوش ہوگا اور کہے گا

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کو نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو۔ دوستوں کا سر سلامت ہے کہ تو اس پر خنجر آزمائے۔ وہ آغوش سے نکلنا کبھی نہ چاہے گا۔ بلکہ آغوش یار ہی میں مرجانا چاہے گا اور یوں کہے گا

بجرم عشق تو ام می کشند وغوغائیست　　　تو نیز بر سر عام آ کہ خوش تماشائیست

تیرے عشق کے قصور میں تکلیف اٹھا رہے ہیں اور شور کر رہے ہیں۔ تو بھی کوٹھے پر آجا کہ بہت عمدہ تماشا ہے۔ اس وقت اس مراقبہ سے کہ محبوب مجھے دیکھ رہا ہے تمام کلفت آسان ہو جاتی ہے اور یہی مراقبہ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حوادث کے وقت تعلیم فرمایا ہے۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (پ ۲۷)

(اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی (اس) تجویز پر صبر سے بیٹھے رہیے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں)

خلاصہ علاج کا یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ سے تعلق بڑھاؤ اور غیر خدا سے حالاً وعملاً وقالاً تعلق کم کرو۔ پھر دنیا و آخرت کی راحت تمہارے ہی لئے ہے اگر فقر و فاقہ بھی ہوا جب بھی تم کو راحت وچین ہی ہوگا۔ اور اس شعر کے مصداق ہو جاؤ گے

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی　　　بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

"اے دل یہ بہتر ہے کہ سرخ شراب سے مست ہو جائے۔ بغیر روپیہ اور خزانہ کے تو بڑا مالدار ہو جائے۔" بدوں سرمایہ اور سامان کے تم سلاطین سے بڑھ کر سلطان ہو گے اور بادشاہوں کو خطاب کر کے تم یوں کہو گے

مبیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم　　　شہاں بے کمر و خسروان بیکلہ اند

"مفلس عاشقوں کو حقارت سے مت دیکھ کہ یہ قوم کمر کے لمبے شاہی کپڑے اور بغیر تاج کے بادشاہ ہیں۔"

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں — کہ ناز بر فلک وحکم بر ستارہ کنم

شراب خانہ کا فقیر ہوں لیکن بے خودی کے وقت آسمان پر ناز اور ستاروں پر حکم کرتا ہوں۔

یعنی آپکو حیات طیبہ حاصل ہوجائیگی۔ یہ تو زندگی کی حالت ہوگی اور مرتے ہوئے یہ حالت ہوگی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ. وَلَكُمْ فِیْهَا مَاتَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ (پ۲۴)

(بلاشبہ جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر مستقیم رہے ان پر فرشتے اتریں گے تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت پر خوش رہو جس کا تم سے وعدہ کیا جایا کرتا تھا ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رہیں گے، اور اس میں جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا موجود ہے اور نیز اس میں تمہارے لئے جو مانگو گے موجود ہے یہ بطور مہمانی کے ہوگا غفور رحیم کی طرف سے)

یعنی مرتے ہوئے فرشتے بشارتیں دیں گے خوش خبری سنائیں گے جس سے ہر نیک بندہ کو اپنے اصلی گھر کا اشتیاق وانتظار ہوجاتا ہے اسی لئے تعجیل جنازہ کا امر ہے۔

اب سمجھ لو کہ یہ موت کیسی خوشی کی ہوگی۔ اور قبر میں یہ ہوگا کہ جنت کی طرف کھڑکیاں کھل جائیں گی۔ وہاں بھی فرشتے بشارتیں سنائیں گے اور میدان حشر میں یہ حال ہوگا۔

لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (پ۱۷)

(اس کو بڑی گھبراہٹ غم میں نہ ڈالے گی اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے)

میں نے مولانا محمد فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا ہے

عاشقاں را با قیامت روز محشر کار نیست — عاشقاں را جز تماشائے جمال یار نیست

''عاشقوں کو محشر کی تکلیف سے کچھ مطلب نہیں۔ عاشقوں کو تو جمال یار نصیب ہونا چاہیے۔''

حدیث میں بھی تو آیا ہے کہ قیامت کا دن کافر کے لئے پچاس ہزار سال کا ہوگا۔ اور مومن کو ایسا معلوم ہوگا جیسے فرض نماز کا وقت اور پل صراط پر گزرتے ہوئے حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ یوں کہیگا:

جز یا مؤمن فان نورک اطفاء ناری

(لم أجد الحدیث فی ''موسوعة أطراف الحدیث'')

"کہ اے مومن جلدی پار ہو جا کہ تیرے نور کی برودت نے تو میری نار کی حرارت ہی کو بجھا دیا۔"
بتلایئے یہ پاکیزہ زندگی اچھی ہے یا یہ کتا خسی جس میں ہم پھنسے ہوئے ہیں۔ پس تعلق مع اللہ حاصل کرو۔ جس کا تفصیلی طریقہ اس طرح معلوم ہوگا کہ کسی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدو یعنی اپنے کو اس کے سپرد کردو۔ بس پھر جنت ہی جنت ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اب میں ختم کر چکا۔ دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اپنے ساتھ تعلق عطا فرماویں
اور فہم سلیم اور عمل نصیب ہو۔ آمین!

وصلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و علیٰ الہٖ و اصحابہ اجمعین. و اخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین.

سلوۃ الحزین

فضائل صبر کے متعلق یہ وعظ ۱۲ شوال المکرم ۱۳۳۵ھ کو جلال آباد میں عبد الرحیم طالب علم کی بیمار پرسی کے دوران میں بیٹھ کر فرمایا جو تین گھنٹہ ۲۳ منٹ میں ختم ہوا۔ سامعین ۱۲۵ کی تعداد میں تھے مولوی اشفاق الرحمٰن کاندھلوی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدً عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ .

اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡہِ. فَاِذَا خِفۡتِ عَلَیۡہِ فَاَلۡقِیۡہِ فِی الۡیَمِّ وَلَا تَخَافِیۡ وَلَا تَحۡزَنِیۡ اِنَّا رَآدُّوۡہُ اِلَیۡکِ وَجَاعِلُوۡہُ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ (پ ۲۰)

(ترجمہ: اور ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام کیا کہ تم ان کو دودھ پلاؤ پھر تم کو جب ان کی نسبت (جاسوسوں کے مطلع ہونے کا) اندیشہ ہو تو ان کو (بے خوف وخطر) دریا (نیل) میں ڈال دینا اور نہ تو (غرق سے) اندیشہ کرنا اور نہ (مفارقت) پر غم کرنا کیونکہ ہم ضرور ان کو پھر تمہارے پاس واپس پہنچا دیں گے اور پھر (اپنے وقت پر) ان کو پیغمبر بنا دیں گے)

تمہید

یہ ایک آیت ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام کا قصہ۔ مذکور ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد جو ان کی والدہ ماجدہ کو خطاب ہوا تھا۔ وہ اس آیت میں مذکور ہے۔ ہر چند کہ اس مضمون کی خود فی نفسہٖ بھی ضرورت ہے کیونکہ مفید ہے لیکن اس وقت اس کے اختیار کرنے کی

زیادہ وجہ یہ ہے کہ یہ مضمون کیرانہ میں بیان کیا گیا تھا۔ اور چونکہ وہ بیان عمدہ عمدہ مضامین اور تقاریر مناسبہ پر مشتمل تھا اور ضبط ہوا نہ تھا اس لئے اس کا اعادہ مناسب معلوم ہوا۔ اور گو کیرانہ میں خاص موقع اور خاص ضرورت تھی مضمون خاص کی۔ اس لئے بعض مضامین تو اسی موقع کے لئے مخصوص تھے اور اس وقت کوئی ضبط کرنے والا نہ تھا۔ اس لئے ان مضامین کے نہ ہونے کا افسوس رہا۔ سو آج اس کا اعادہ کرتا ہوں کیونکہ ضبط کا سامان موجود ہے۔

نیز جن ایام اور تاریخوں اور جس دن میں وہاں بیان ہوا تھا وہ زمانہ یہاں بیان کے لئے موعود تھا۔ مگر اتفاق سے وہ زمانہ وہاں صرف ہو گیا۔ سو اس وجہ سے بھی کہ وہ بیان اور تاریخ اور زمانہ یہاں موعود تھا۔ اس کا یہاں بیان کر دینا مناسب ہے۔ اعادہ مضمون کے لئے ایک نکتہ یہ بھی مرجح ہو گیا۔ اور اصل وجہ تو یہ ہے کہ مضامین پسند آئے۔ جی چاہا کہ ضبط ہو جائیں۔ باقی یہ ضروری نہیں کہ اس کا بعینہ اور بالفاظہ اعادہ کروں جو باتیں بیان کردہ یاد آجاویں گی ان کا اعادہ کر دوں گا۔ اور جو نئی باتیں اس وقت ذہن میں آجائیں گی ان کو بھی بیان کر دوں گا۔ کیونکہ یہ پہلے سے ذہن میں نہ تھا کہ اس مضمون کے اعادہ کی حاجت ہوگی۔

غرض خدا کے نام پر شروع کرتا ہوں جتنے یاد آگئے ان کو بیان کر دوں گا ورنہ اور جس قدر مضامین ہوں گے وہ بھی انشاء اللہ مفید ہوں گے وہاں پر اس مضمون کے بیان کی ایک وجہ تو خاص یہ تھی کہ وہاں پر اس گھر میں موت کا واقعہ ہو گیا تھا۔ اس ضرورت سے یہ مضمون اختیار کیا گیا تھا اور اسی وجہ سے بیان بھی کیا گیا تھا۔

دوسری حقیقی وجہ اس کی عام ضرورت تھی اس لئے کہ یہ مضمون سب کی ضرورت کا ہے۔ کوئی شخص ایسا نہیں جس کو اس کی ضرورت نہ ہو۔ قرآن مجید میں دونوں قسم کے احکام ہیں۔ وہ بھی ہیں جن کی شان نزول واقعہ خاصہ ہے اور حکم بھی اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ بھی ہیں جن کی شان نزول گو خاص ہے مگر حکم خاص نہیں بلکہ عام ہے اور زیادہ حصہ قرآن کا ایسا ہی ہے۔ جس کا حکم شان نزول کے ساتھ خاص نہیں اور یہ بیان بھی ایسا ہی ہے۔ لہٰذا اس معنی کر اس کا اعادہ یہاں پر بے ربط بھی نہ ہوگا۔ اب مضمون سنئے۔

ضرورت صبر و شکر

اس آیت میں صبر کے متعلق مضمون ہے اور صبر کی سب ہی کو ضرورت ہے اس لئے ثابت ہو گیا کہ یہ مضمون سب کی ضرورت کا ہے۔ وجہ یہ کہ دنیا میں واقعات دو قسم کے ہوتے ہیں ملائم اور مخالف۔ یعنی بعضے واقعات وہ پیش آتے ہیں جو طبیعت کے مناسب اور موافق ہوتے ہیں اور بعضے واقعات طبیعت کے موافق اور مناسب نہیں ہوتے۔ غرض ہر شخص کو دونوں قسم کے حالات پیش آتے

ہیں۔ جب مناسب طبیعت کے واقعات پیش آویں اس وقت شریعت کی تعلیم شکر ہے اور جب ناملائم اور مخالف طبیعت کے واقعات پیش آویں اس وقت شریعت مقدسہ نے ضبط کی تعلیم فرمائی ہے اور اسی کا نام صبر ہے اور چونکہ عام طور پر بہ نسبت ملائم واقعات کے ناملائم اور غیر مناسب طبیعت کے واقعات کا ظہور بکثرت ہوتا ہے یعنی ہر شخص کو مخالف طبع واقعات بکثرت پیش آتے ہیں اس لئے مضمون صبر کی ضرورت عامہ کی اور زیادہ ہوئی۔ پس مناسب ہوا کہ یہ مضمون ضرور بیان کیا جائے۔

طلب دنیا و آخرت

انسان کی ہر خواہش کا پورا نہ ہونا جس کا ابھی ذکر ہوا مشاہد بھی ہے اور منصوص بھی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰی (پ ۲۷)

کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے (سو ایسا نہیں ہے) کیونکہ ہر تمنا خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ آخرت کی بھی اور دنیا کی بھی۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (پ ۱۵)

جو شخص دنیا کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے جسکے واسطے چاہیں گے فی الحال دیدیں گے۔

تو ظاہر ہے کہ آیت میں دو قیدیں ذکر فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ جتنا چاہیں یعنی ہر شخص کو اس کی مقدار طلب پر نہ دیں گے اور دوسرے یہ کہ جس کے واسطے چاہیں گے اس کو دیں گے ہر شخص کو نہ دیں گے۔ دنیا کے طالب کے ساتھ تو حق تعالیٰ کا یہ معاملہ ہے اور آخرت کے طالب کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے۔ آگے اسی آیت کے متصل فرماتے ہیں۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰی لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (پ ۱۵)

یعنی جو شخص آخرت کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی سعی کرنا چاہیے ویسی سعی بھی کرے گا بشرطیکہ شخص مومن بھی ہو سو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی۔ ان لوگوں کی سعی کی قدر کی جاویگی۔

حاصل یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان کی سعی کے مطابق ثمرہ ملے گا۔ بلکہ سعی سے زیادہ ملے گا جس کا دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ

الدُّنيَا نُؤْتِهِ مِنهَا وَمَالَهُ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ (پ ۲۵)

"جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے (اس میں زیادہ دینے کی تصریح ہے) اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دنیا دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔"

غرض! دنیا ہماری خواہش پر اور جتنی ہم چاہیں نہیں مل سکتی۔ بلکہ حق سبحانہٗ کی مشیت کے مطابق اور جس قدر وہ چاہیں ملتی ہے۔ اور آخرت جس قدر ہم چاہیں اسی قدر ملتی ہے۔ بلکہ اور زیادتی اور ترقی کے ساتھ ملتی ہے۔ دنیا کی عجب خاصیت ہے۔ بہر حال ان نصوص سے معلوم ہوا کہ دنیا کے مقاصد بہت کم پورے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہوا کہ امور ملائمہ کم پیش آتے ہیں اور امور نا ملائمہ زیادہ۔

نعمت اور مصیبت کی مقدار

اس پر ظاہر میں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ایک آیت سے تو نعم غالب معلوم ہوتی ہے اور مصائب مغلوب۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (پ ۱۳)

اور اللہ کی نعمتیں اگر شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لا سکتے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نعم بے شمار ہیں۔ نعم کی بابت تو یہ ارشاد ہے اور دوسری جگہ مصائب کی نسبت فرماتے ہیں۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (پ ۲۵)

"اور تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے آتی ہے۔ اور بہت سے تو اللہ تعالیٰ درگذر کر ہی دیتا ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصائب قلیل ہیں تو امور نا ملائم کا بکثرت پیش آنا کیسے صحیح ہوا؟ جواب یہ ہے کہ یہ بالکل صحیح ہے کہ نعم بکثرت ہیں مگر ہماری حالت یہ کہ ہم حق تعالیٰ کی نعمتوں کو بھی پسند نہیں کرتے یعنی حق تعالیٰ کی نعمتیں بھی ہماری ملائم طبع نہیں۔ گو واقع میں اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں بے شمار ہیں مثلاً بیماری میں، ہمارے لئے دوائیں اور مکانات کا مہیا کرنا اور ہر وقت ہر طریقہ سے ہماری مدارات ہونا حتیٰ کہ غیر مہربان دشمن کا مہربان ہو جانا یہ کیا تھوڑی نعمت ہے۔ بلا بودے اگر ایں ہم نبودے (اگر یہ بھی نہ ہو تو بڑی مصیبت ہے)

چنانچہ جنگ میں بکثرت آدمی زخمی ہوتے ہیں۔ اپنے آدمی تو اٹھا کر ان کو آرام دیتے ہی ہیں لیکن اگر اپنے آدمی شکست کھا کر فرار ہو جاتے ہیں اور میدان میں زخمی رہ جاتے ہیں تو غنیم بھی ان کے ساتھ بد معاملگی سے پیش نہیں آتے بلکہ ان کی مرہم پٹی کرتے ہیں اور راحت پہنچاتے ہیں۔ یہ کتنی بڑی رحمت ہے اسی طرح غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مصیبت میں بھی حق تعالیٰ کی طرف سے متعدد نعمتیں ہمارے اوپر ہوتی ہیں۔ بیماری ہونا ظاہر میں مصیبت ہے لیکن طبیب اور دوا اور تیمارداروں کا ہونا کتنی عظیم نعمت ہے۔

ان تمام واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ واقع میں تو مصائب بہت کم پیش آتے ہیں۔ اور نعم بکثرت پیش آتے ہیں جیسا ابھی مذکور ہوا کہ ہمارے ضعف و جہل سے وہ نعم بھی ناملائم طبع ہوتے ہیں۔

انسان کی ناشکری و ناقدری

یہ عجیب جمع بین المتنافیین ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان ہر نعمت کو اپنے موافق نہیں سمجھتا۔ بلکہ بہت سی نعمتوں کو خلاف طبع اور ناگوار سمجھتا ہے اور انسان تو ایسا ناشکرا ہے کہ جو مزاج کے موافق نعمتیں ہیں بسا اوقات اُن کو بھی پسند نہیں کرتا۔ عجیب نخرہ باز ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہٗ تو نعمتیں دیتے ہیں اور انسان ناک منہ چڑھاتا ہے۔

مثلاً اللہ میاں کھانا دیتے ہیں تو کھانا اس کے موافق مزاج نہیں ہوتا۔ کہ یہ تو اچھی طرح بھنا نہیں۔ اس میں تو ہلدی زیادہ ہے، ہلدی کی بو ہے۔ بالکل ہی خشک ہے۔ گھی نہیں ہے۔ حالانکہ اصل یہ ہے کہ ہم تو اس کے بھی مستحق نہیں ہیں۔ مگر انسان کو پھر بھی اس قدر نخرہ ہے جس کی حد نہیں۔ یہ ہر نعمت کی ناشکری اور ناقدری کرتا ہے۔ ہر وقت ناک منہ چڑھاتا ہے۔ اور یوں چاہتا ہے کہ نعمت بھی ملے تو اس طرح ملے جس طرح میں چاہتا ہوں۔

چنانچہ اگر کبھی اس کو روپے کی ضرورت ہو تو خواہش یہ ہوتی ہے کہ قرض نہ لیں کوئی ہدیۃً دیدے۔ مثلاً میرے پاس اسی واسطے کہ میں کسی کا قرض کرنا نہیں چاہتا۔ حق تعالیٰ کتنے ہدایا بھجواتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی شاذ و نادر قلیل مقدار بھی قرض کرنا پڑے تو گراں ہوتا ہے۔

بتلایئے اس میں ہمارا کون سا استحقاق تھا۔ پھر جب ہمارا کوئی استحقاق نہیں اور حق تعالیٰ بدوں استحقاق کے نعمتیں دیتے ہیں تو کیا پھر بھی ہم کو ذرا سی خلاف تجویز بات پر ناک منہ چڑھانا چاہیئے؟ ہرگز نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت شریف تھی کان لا یعیب شیئاً (اتحاد

السادۃ المتقین ۵: ۲۱۸) کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی چیز میں عیب نہیں نکالا کرتے تھے۔ دین یہ ہے۔ دین محض نوافل اور تسبیح کا نام نہیں۔ ایک مقام پر ایک واعظ تھے۔ ان کی عادت یہ تھی کہ اگر کوئی دعوت کرتا اور گھی کم ڈالتا تو کھانا نہ کھاتے کہ اس میں گھی کم ہے یا متعدد کھانے نہیں ہیں افسوس مصلحین دین کی یہ حالت۔ تعجب ہے۔ مگر یہ حالت دوسروں ہی کے گھر پر ہے۔ اپنے گھر شاید ایسا نخرہ نہ کرتے ہوں۔ کیونکہ گھر کا خرچ ہوگا۔

آجکل کے واعظین

بعض احباب نے دہلی میں ایک جلسہ میں مجھ کو مدعو کیا۔ اور چلتے وقت پچیس روپیہ تھانہ بھون کی زادِراہ کے لئے دینے لگے۔ میں نے کہا کہ تھانہ بھون دور نہیں صرف چار روپیہ کا تقریباً صرفہ ہوگا۔ وہ کہنے لگے کہ کل پرسوں ایک مولوی صاحب تشریف لائے تھے وہ ایک دن میں گیارہ روپے کے پان کھا گئے۔ بکری کو بھی مات کر دیا مگر آبرو کی بکری ہوگئی۔ اور خود تو کیا کھاتے بس جو آیا تو اضع پر تواضع کی کہ آپ بھی کھایئے اور آپ بھی کھایئے۔ کیونکہ مفت کا مال تھا۔ مالِ مفت دلِ بے رحم۔ ایک واعظ صاحب کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ رخصت کے وقت ساٹھ روپے کرایہ کیلئے۔ کیونکہ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ اسی کے قریب ہوگا۔ گو سفر کیا ہو تھرڈ ہی میں۔ آج کل یہ امور بھی بزرگی کے خلاف نہیں۔ آج کل کی بزرگی بھی بی بی تمیزہ کا وضو ہے کہ کسی طرح نہیں ٹوٹتا۔

ی بی تمیزہ کا قصہ یہ ہے کہ وہ ایک فاحشہ عورت تھی۔ اس کو ایک مولوی صاحب نے نماز کی نصیحت کی اور وضو کرا کے نماز پڑھوائی۔ لباس وغیرہ بدلوایا۔ سال دو سال کے بعد پھر مولوی صاحب کا آنا ہوا تو مولوی صاحب نے بی بی تمیزہ سے دریافت کیا کہ بی نماز بھی پڑھتی ہو۔ کہا حضرت پانچوں وقت۔ پوچھا کہ وضو بھی کر لیتی ہو۔ کہا جب آپ نے نماز پڑھوائی تھی اس وقت تو آپ نے وضو کرا دیا تھا اسی سے پڑھ لیتی ہوں۔ بندی خدا کا وضو اجابت سونے سے بھی نہ گیا اور حیض ونفاس سے بھی نہ ٹوٹا۔ بدکاری سے بھی باطل نہیں ہوا۔ عجیب وضو تھا۔

ایسی ہی آجکل کی بزرگی ہے کچھ ہی کرلو۔ مگر بزرگ کے بزرگ اور ارزاں اتنی کہ علم تک کی ضرورت نہیں۔ پس مثنوی کے کچھ اشعار یاد کر لئے مجلس کے گرم کرنے کو ذرا خوش آوازی سے اشعار موقع بے موقع پڑھ دیئے جیسے تھیٹر کی مجلس ہوتی ہے۔ بس سامعین کی طبیعت خوش ہوگئی۔ یہ حقیقت ہے۔ آجکل کے واعظین کے وعظ کی۔

مجھے ایک مرتبہ الہ آباد میں بیان کرنے کا اتفاق ہوا۔ اول تو میری آواز کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ مزید برآں زکام کی بھی شکایت تھی تو ایک صاحب نے فرمایا کہ وعظ تو اچھا ہے مگر آواز اچھی نہیں۔ مجھے معلوم ہوا۔ میں نے کہا کہ میرا باپ ڈوم نہ تھا۔ نہ میں نے آواز صاف کرنے کی کوئی تدبیر کی۔ نہ خارجی تدبیر کہ حلوہ وغیرہ باندھتا۔ نہ داخلی تدبیر کی کہ کوئی ایسی چیز کھاتا اور نہ اس کی کوئی حاجت تھی کیونکہ مقصود تو کام چلانا ہے چلا لیا۔

افسوس ہے کہ آجکل خوش آوازی کی بناء پر میراثی بھی واعظ ہو گئے یہ مطلب نہیں کہ کم ذات ہونے کی وجہ سے وعظ نہ کہنا چاہیئے تھا کیونکہ اگر کوئی میراثی عالم محقق بن جائے تو اس کو وعظ کہنا بجا ہے۔ میرا مقصود یہ ہے کہ آجکل میراثیوں نے بھی دو چار اردو کی کتابیں یاد کر کے وعظ گوئی شروع کر دی۔ مضمون تو خاک نہیں ہوتا۔ بس اشعار کو گا کر اچھی آواز بنا کر پڑھ دیتے ہیں لیجئے بس واعظ ہو گئے۔ اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ ایسے جُہلا آج کل مقتدائے دین شمار کئے جاتے ہیں۔ لوگوں کو قابل و نا قابل کا بالکل امتیاز ہی نہیں رہا۔ یہ تو جاہلوں کی حالت ہے کہ اشعار پڑھ کر واعظ بن جاتے ہیں اور جو واقعی پڑھے لکھے مولوی ہیں ان میں یہ کسر ہے کہ اُن میں بجائے شانِ علم کے ریاست اور نوابی کی شان آ گئی کہ وہ جہاں جاتے ہیں ساتھ میں دو چار خادم ہوتے ہیں اور جُبہ عمامہ اور قیمتی کپڑے پہنتے ہیں حالانکہ یہ بھی نقص کی دلیل ہے۔

بزرگی کی علامات

ہم نے اپنے بزرگوں کی سادگی دیکھی ہے اور یہ بزرگ ایسے تھے کہ اگر کوئی ان کے علم و فضل کا حال سنے اور ان کا نام نہ لیا جائے تو ضرور کہے گا کہ یہ لوگ متقدمین علماء کی جماعت سے ہیں۔ مگر سادگی ایسی کہ جناب مولانا فتح محمد صاحبؒ کے مکان پر ایک بار ایک نائب تحصیلدار ملنے کی غرض سے آئے۔ اس وقت مولانا تشریف فرما نہ تھے گنگوہ تشریف لے گئے تھے۔ یہ معلوم کرنے کے بعد انھوں نے ایک طالب علم کو ایک شعر چلتا ہوا پرچہ میں لکھ کر دے دیا کہ جب مولانا تشریف لاویں تو یہ شعر دکھا دیں اور آپ جلال آباد چلے گئے۔ شعر یہ تھا۔

چو غریب مستمندے بدرت رسیدہ باشد چہ قدر تپیدہ باشد چو تُرا نہ دیدہ باشد

جب ایک غریب حاجت مند آپکے در پر پہنچا ہوگا تو آپ کو نہ دیکھ کر وہ کس قدر تڑپا ہوگا اتفاق سے مولانا اسی دن مغرب کے وقت تشریف لے آئے۔ اس طالب علم نے وہ پرچہ پیش کر

دیا۔ مولانا دیکھ کر بے چین ہو گئے کہ ان صاحب کو میرے نہ ملنے سے بہت قلق ہوا ہوگا۔ اپنے اوپر قیاس فرمایا۔ چنانچہ فوراً اسی وقت جلال آباد تشریف لائے جو تھانہ بھون سے دو میل ہے اور ان صاحب سے مل کر فوراً واپس ہوئے۔ یہ ہے بزرگی۔!

عجیب بات یہ ہے کہ یہ بزرگ جن کی یہ حکایت ہے اپنے عہد میں مشہور بزرگوں کے کسی درجہ میں شمار نہیں کئے جاتے تھے۔ چاہے وہ عند اللہ سب سے افضل اور مقدم ہوں۔ مجھے تو ان حضرات کے حالات پیش نظر کر کے یہ شعر یاد آ جاتا ہے

اولئک ابائی فجئنی بمثلھم   اذا جمعتنا یاجریر المجامع

''یہ میرے باپ دادا ہیں۔ ان جیسے باپ دادا لے آ اے جریر جب کہیں مجمع میں اکٹھے ہونے کا موقع ملے تو ایسے باپ دادا کا ذکر سنانا۔''

یہ ہیں بزرگ جن پر تمام دنیا کو فخر ہے۔ محض نام کے درویش نہیں کہ موٹے موٹے دانوں کی تسبیح ہاتھوں میں لٹکالی ہو۔ تسبیح کی تسبیح اور ہتھیار کا ہتھیار یہ لوگ ایسے درویش نہیں تھے۔

یاد رکھو بزرگی تسبیح سے نہیں ہے بلکہ اس کے لئے بزرگوں کے سے اخلاق ہونے چاہئیں۔ صرف یہ بھی کافی نہیں کہ کسی کھانے میں عیب نہ نکالیں اور وہ محض اس غرض سے لوگ کہیں کہ کیسے بے نفس ہیں کہ کسی بات پر کچھ نہیں فرماتے۔ سو یہ تو کچھ بزرگی نہیں بلکہ تکبر اور جاہ طلبی ہے۔ اصل یہ ہے کہ نہ افراط مناسب ہے اور نہ تفریط شایاں ہے۔ اعتدال کی ضرورت ہے اور یہی بزرگی ہے اور یہی اعتدال مشکل ہے۔ کیونکہ اعتدال میں کمال مخفی ہو جاتا ہے ایسے شخص کو لوگوں کی نظروں میں امتیاز حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے تعریف نہیں ہوتی۔ اور بدوں امتیاز و تعریف کے شہرت دشوار ہوتی ہے۔ اس لئے آجکل گزر کردہ امور اختیار کرتے ہیں جن میں شہرت ہو۔ مثلاً کھانا چھوڑ دیں گے۔ غلہ اور اناج ترک کر دیں گے۔ مگر غذا میں آدھ پاؤ بالائی۔ چھٹانک بھر مغز بادام اور دوسرے میوہ جات وغیرہ وغیرہ۔ غرض تین پاؤ وزن کا سامان کھالیں گے اور کہنے کو یہی رہے گا کہ حضرت کھانا نہیں کھاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اور کیا کھاویں گے۔ بس اب تو یہ کسر باقی رہ گئی کہ مجھے اور تمہیں کھالیں۔ صاحبو! جو لوگ کھانا کھانے والے سمجھے جاتے ہیں یہ غذا تو ان کو بھی نہیں ملتی۔

یہ نہ کھانا تو ایسا ہو گیا جیسے ایک طبیب کے پاس ایک مریض امیر آیا اور ضعف معدہ کی شکایت کی۔ حکیم صاحب نے کہا کہ ایک دن میرے سامنے کھاؤ۔ چنانچہ مریض ایک دن طبیب کے

سامنے کھانے بیٹھا۔ طبیب نے ایک خالی برتن پاس رکھ دیا کہ جس قدر کھاتے جاؤ اسی قدر اس میں جمع کرتے جاؤ۔ چنانچہ جتنا اس نے کھایا اتنا ہی اس برتن میں جمع کر دیا۔ جو بعد میں تولا گیا تو سیر بھر تھا۔ طبیب نے کہا کہ میاں اگر اس پر بھی ضعف معدہ ہے تو کیا دستر خوان اور برتن کھاؤ گے۔ پیٹ کیا ہوا داستان امیر حمزہ کی زنبیل ہو گئی۔ اسی طرح آجکل بزرگی کیا ہوئی نوابی ہو گئی۔

صاحبو! بزرگی کا کمال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم ہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے امتیازات کبھی نہیں فرمائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کمبل بھی زیب تن فرمایا ہے اور سنہری گھنڈیاں بھی لگانا ثابت ہیں۔ جیسے کمبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تھا۔ سنہری گھنڈی بھی عزیز و مرغوب تھی۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ میرے ماموں صاحب ایک برات میں کمبل اوڑھ کر گئے اور میرے والد صاحب دوشالہ اوڑھے ہوئے تھے تو والد صاحب نے ان سے کہا کہ میاں شادی میں تو کمبل اتار دیا ہوتا۔ وہ کہنے لگے کہ آپ نے دوشالہ اتار دیا ہوتا۔ آپ کو دوشالہ جیسا مرغوب و پسند ہے مجھے کمبل اس سے کم مرغوب نہیں۔

خیر! یہ ان کا حال تھا ورنہ ایسی پابندی کرنا اس میں بھی ایک شان امتیاز پیدا ہوتی ہے تو یہ کمال نہیں۔

شان بندگی

بلکہ کمال یہ ہے کہ نہ کمبل کا پابند ہو نہ دوشالہ کا۔ کیونکہ بندہ تو سرکاری ملازم اور غلام ہے۔ جو پہنایا پہن لیا اور جو اڑھایا اوڑھ لیا۔ ملازم کا تو یہ کام ہے

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ۔۔۔ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

"تو اگر زندہ کرے تو تیرا عطیہ اور اگر قتل کرے تو میں تجھ پر قربان۔ دل تمہارا مبتلا ہوا ہے تم جو چاہو وہی میری رضا ہے۔"

ایک بزرگ تھے کمبل اوڑھے ہوئے بیٹھے تھے کہ اچانک کمبل اتار کر پھینک دیا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص دوشالہ لے کر حاضر ہوا جس کے پلوں پر زری کا کام چار انگشت بقدر جواز لگا ہوا تھا۔ آپ نے قبول فرما کر اسے زیب تن کیا اور ہنسے۔ کسی نے دریافت کیا کہ حضرت یہ کیا بات تھی۔ فرمایا کہ میں کمبل اوڑھے ہوئے بیٹھا تھا۔ حکم ہوا کہ اس میں اچھے نہیں لگے۔ اس کو پھینک دو۔ ہم دوشالہ پہنا کر دیکھیں گے۔ میں نے کمبل اتار کر پھینک دیا۔ اور دوشالہ پہن لیا۔ غرض غلام کی یہی شان ہونا چاہئے کہ آقا جس حال میں رکھے اسی میں خوش رہے۔ جیسے ایک شخص نے ایک غلام خریدا

تھا۔ خریدنے کے بعد دریافت کیا کہ میاں تمہارا کیا نام ہے۔ اس نے جواب دیا کہ حضور آج سے تو وہی نام ہے جس نام سے آپ پکاریں۔ دریافت کیا کہ کیا کھایا کرتے ہو کہنے لگا کہ حضور آج سے خوراک بھی وہی ہے جو آپ کھلاویں۔ دریافت کیا کہ پہنا کیا کرتے ہو کہنے لگا کہ آج سے پوشاک بھی وہی ہے جو حضور پہناویں۔ تو حقیقی آقا کے سامنے بندہ کی یہ شان ہونا چاہئے۔

عبادت وطاعت کا فرق

حضرت حاجی صاحب کے سامنے آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا) پر اشکال کیا گیا کہ اس میں جن وانس کی تخصیص کی کیا وجہ ہے۔ خدا تعالیٰ کی عبادت تو ساری ہی مخلوق کرتی ہے کچھ جن وانس کی تخصیص نہیں۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ایک تو عبادت ہے اور ایک طاعت ہے اول ایک مثال سے ان دونوں مفہوموں میں فرق سمجھ لو۔ وہ یہ کہ ایک تو نوکر ہے اور ایک غلام۔ نوکر کا کام تو معین ہوتا ہے خواہ ایک یا متعدد مثلاً باورچی ہے کہ اس کیلئے کھانا پکانے کی خدمت معین ہے یا سپاہی ہے یا مکان پر بازار اور گھر کام کرنے کے واسطے کوئی نوکر ہے تو جس خدمت کے واسطے یہ لوگ نوکر ہیں ان سے وہی خدمت لی جاسکتی ہے۔ خود آقا بھی اس کا لحاظ رکھتے ہیں۔

حتیٰ کہ اگر باورچی سے آقا کہے کہ یہ خط لے کر گنگوہ چلے جاؤ تو نوکر ضابطہ میں انکار کر سکتا ہے۔ اور غلام کی کوئی خدمت معین نہیں ہوتی۔ بلکہ تمام خدمات اس کے ذمہ ہیں جس کا بھی حکم ہو جاوے۔ چنانچہ ایک وقت اس کو آقا کا پاخانہ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ اور ایک وقت میں آقا کی پوشاک پہن کر آقا کا قائم مقام اور نائب بن کر جلسہ میں یا دربار میں جانا پڑتا ہے۔ غرضیکہ غلام کو کسی وقت بھی کسی خدمت سے انکار نہ ہوگا۔

اسی طرح جن وانس کے تمام مخلوق کی طاعت معین ہے ہر شے مخلوقات میں سے ایک خاص کام پر معین ہے کہ اس کے سوا دوسرا کام اس سے نہیں لیا جاتا۔ مگر انسان کی کوئی خدمت معین نہیں۔

چنانچہ ایک وقت میں انسان کا سونا عبادت ہے۔ ایک وقت میں پاخانہ پھرنا بھی عبادت ہے مثلاً جماعت تیار ہو اور پیشاب پاخانہ کا زور ہو تو اس وقت پیشاب وغیرہ سے فراغت حاصل کرنا واجب ہے اور نماز پڑھنا اس وقت حرام ہے اگر پیشاب پاخانہ سے فراغت حاصل نہ کی تو حرام فعل کا مرتکب ہوا۔ اس وقت اس کا بیت الخلاء میں جانا عبادت ہے۔

ایک وقت تو انسان کی یہ حالت ہے اور ایک وقت انسان کی یہ شان ہے کہ مظہر حق بنا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے مردہ دل زندہ ہوتے ہیں۔

غرض جو شان غلام کی ہوتی ہے وہی شان انسان کی ہے۔ عبد شدن کے لئے انسان ہی ہے باقی تمام مخلوق ذاکر شاغل ہے۔ مگر عابد صرف انسان ہی ہے۔ یہ کسی خاص حالت اور خاص کام کو اپنے لئے تجویز نہیں کرسکتا بلکہ حضرت حق جس حالت میں رکھیں اس میں اس کو رہنا چاہیئے۔ کمبل اوڑھائیں تو کمبل اوڑھے دوشالہ اوڑھائیں تو دوشالہ اوڑھے۔ بھوکا رکھیں تو بھوکا رہے۔ گھی دودھ کھلائیں تو گھی دودھ کھائے یہی شان تھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔

آج کل کی بزرگی کا معیار

مگر آجکل اس کے خلاف لوگوں نے تجویز اور امتیاز کا نام بزرگی رکھ لیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص بہت بزرگ ہیں گھی نہیں کھاتے۔ بس یہ معیار رہ گیا ہے بزرگی کا۔ کوئی کہتا ہے کہ فلاں بزرگ گائے کا گوشت نہیں کھاتے۔ بڑے رحمدل ہیں کہ قربانی نہیں کرتے۔ جانور کے گلے پر چھری رکھنے کو اچھا نہیں سمجھتے حالانکہ قربانی میں جانور کو خدا کے نام پر فدا کرنا ہے اور اس وقت وہ جانور ہماری جانوں کے قائم مقام ہوتا ہے۔

اگر حق تعالیٰ ہماری جاں طلب فرماتے تو ہمیں اس میں بھی دریغ نہ ہونا چاہیئے تھا۔ چہ جائے کہ وہ ہماری بجائے جانوروں کی جانیں طلب کرتے ہیں اور حکم فرماتے ہیں کہ ہمارے نام پر قربانی کرو جس سے اس شعر کی مصداق واقع ہو جائے۔

آنکہ جاں بخشد اگر بکشد روا است　　　نائب است و دست او دست خداست

جس نے جاں بخشی ہے وہ اگر قتل بھی کرے جائز ہے۔ وہ اللہ کا نائب ہے اسکا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔

ایک ہندی مثل ہے گھی کہاں گیا کھچڑی میں۔ کھچڑی کہاں گئی پیٹ میں تو گھی بھی پیٹ میں گیا۔ اصل یہ ہے کہ جانور تمہارے لئے ہیں اور تم خدا کے لئے ہو کہ خدا کی عبادت کرو اور اپنی چیزوں کو خدا کے نام پر قربان کرو۔ تو وہ جانور بھی خدا کے لئے ہوا۔ سو اس صورت میں قربانی کا جانور تمہارے لئے فدا نہیں ہوا بلکہ خدا کے لئے فدا ہوا۔ پھر اس سے احتراز کرنا سخت حماقت ہے۔ غرض تفویض کلی عبدیت ہے اور اپنی تجویز سے امتیازی شان بنانا عبدیت کے بالکل خلاف ہے مثلاً خدا تعالیٰ کھانے پہننے کو اچھا دیں تو اس وقت خستہ حالت میں رہنا ناشکری اور نعمت کی نا

قدرنی اور خلاف اطاعت ہے کیونکہ جیسے شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ اپنے نوکروں کو تنخواہ دو اور کھانا کپڑا دو۔ ایسے ہی یہ بھی حکم دیا ہے کہ اپنی جان کو بھی راحت دو۔ پس جیسے نوکر خدا کی مخلوق و مملوک ہے تمہاری جان بھی خدا کی مخلوق و مملوک ہے اس لئے تم کو اپنے اندر بھی بدوں اجازت حق تعالیٰ کے کسی تصرف کا حق نہیں۔ اگر نوکر کو حکم الٰہی سے کھانا کپڑا دیتے ہو تو اسی آقا کے حکم سے تم اپنی بھی خدمت کرو کیونکہ تمہاری جان بھی خدا ہی کی ہے تمہاری ہرگز نہیں۔ اسی حقیقت پر نظر کر کے ایک عارف فرماتے ہیں۔

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است — افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

اپنی آنکھوں پر میں اس لئے نازاں ہوں کہ انھوں نے تمہارا جمال دیکھا ہے اور اپنے پاؤں پر میں اسلئے گرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے تیرے کوچے تک پہنچایا ہے۔

کہ مجھ کو اپنے اعضاء پر اس وجہ سے ناز ہے اور ان کی قدر ہے کہ آپ سے ان کا تعلق ہے۔

حقوق نفس

صاحبو! ہمیں اپنی آنکھ سے اس وجہ سے تعلق نہ ہونا چاہیئے کہ وہ ہماری آنکھ ہے بلکہ اس وجہ سے تعلق ہونا چاہیئے کہ حق تعالیٰ کی چیز ہے اور ان کی خدمت کرتی ہے اس نے ان کا جمال دیکھا ہے گو بواسطہ مظاہر ہی سہی۔ آگے فرماتے ہیں۔

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را — کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

ہر وقت اپنے ہاتھوں کو ہزاروں بوسے دیتا ہوں کہ انہوں نے تیرا دامن پکڑ کر اپنی طرف آپکو کھینچا۔

اس اعتبار سے عارف کو اپنے نفس سے بھی محبت ہوتی ہے اور اسی لئے حدیث میں ہے۔

ان لنفسک علیک حقاً (مسند احمد ۶:۲۶۸، مستدرک حاکم ۴:۶۰)

''کہ تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے''

تو عارف کو اپنے نفس سے اس لئے محبت ہوتی ہے کہ وہ سرکاری چیز ہے دیکھو اگر کوئی مشین سرکاری کسی کے سپرد ہو تو اس شخص کو اس کے آلات صاف کرنا اور تیل دینا ضروری ہوگا۔ البتہ اگر اپنی ملک ہے اس وقت اختیار ہے کہ چاہے صاف کر کے تیل دے چاہے نہ دے۔ مگر جب ملک سرکاری ہے اس کو صاف کرنا تیل دینا ضروری ہے ورنہ باز پرس ہوگی۔

اب یہاں پر لوگوں سے ایک غلطی تو یہ ہوا کرتی ہے کہ تیل نہیں دیتے اور اپنی جان کو اپنی ملک

سمجھتے ہیں۔اور ایک غلطی بعض سے یہ ہوتی ہے کہ تیل بہت دینے لگتے ہیں۔حاصل یہ ہے کہ بعضے دنیادار فقیر یا تو اسباب حفاظت نفس کو اختیار نہیں کرتے اور اس کو نفس کشی کہتے ہیں یا اختیار کرتے ہیں تو حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور نوابی رنگ کو شان محبوبیت سمجھتے ہیں۔صاحبو! سر میں تیل لگانا بھی اس اعتبار سے محمود ہے کہ یہ سرکاری چیز ہے میرا سر نہیں۔میں مالک نہیں۔یہ مضمون شاعرانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے مگر اس حقیقت تک رسائی تدریجاً ہوتی ہے ایک دن میں نہیں ہوتی اور ابتداء میں کسی قدر تکلف بھی کرنا پڑتا ہے۔مگر اخیر میں ملکہ ہو جاتا ہے۔غرض عارف اس اعتبار سے حقوق نفس ادا کرتا ہے تاکہ خدا کا کام کرے اسی طرح عارفین قربانی کے جانور کو خدا کے نام پر فدا کرتے ہیں اپنے اوپر فدا نہیں کرتے۔خواہ اپنے ہی کھانے کے لئے ذبح کریں۔یہ حقیقت ہے قربانی کی۔

بعضے بزرگ ترحم کے غلبہ سے قربانی نہیں کرتے تھے بلکہ بجائے قربانی کے دام ادا کر دیتے تھے۔اور یہ ان کی غلطی تھی۔انھوں نے خواب میں دیکھا کہ لوگ سواریوں پر بیٹھ کر پل صراط کو قطع کر رہے ہیں۔انھوں نے سواری کی درخواست کی۔مگر یہ جواب ملا کہ یہاں پر تمہارے لئے کوئی سواری نہیں ہے انھوں نے سوال کیا کہ یہ کون لوگ ہیں جو سواریوں پر گزر رہے ہیں انھوں نے جواب دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو قربانی کرتے تھے تم قربانی کرتے نہیں اس لئے تمہاری کوئی سواری نہیں۔پیادہ جا سکو تو چلے جاؤ۔جب بیدار ہوئے اپنی غلطی پر تنبہ ہوا۔توبہ کی اور قربانی شروع کر دی۔

شرعی چلہ

مگر آجکل جہلاء اس قسم کی درویشی کو دلیل ترحم اور بزرگی خیال کرتے ہیں جس کی خدا کے یہاں کچھ بھی قدر نہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص چلہ کھینچ رہا ہے اور چلہ میں گوشت سے پرہیز ہے سبحان اللہ۔بس وہ عورتوں کا چلہ ہوگا۔جس کو زچگی کہتے ہیں شرعی چلہ ہرگز نہیں۔کیونکہ شرعی چلہ میں گناہوں کے سوا کسی چیز کا پرہیز نہیں ہوا کرتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبل نبوت کچھ ایام کیلئے غار حرا میں بغرض خلوت تشریف لے جانا ثابت ہے۔مگر آپ نے کبھی گوشت سے پرہیز نہیں کیا۔پھر یہ کیسی بزرگی ہے کہ چلہ کی وجہ سے لوگ ایک ایک مہینہ تک گوشت چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ حدیث میں ہے **سید الطعام اللحم**۔(**کشف الخفاء للعجلونی ۱:۵۱۰، ۲:۲۲۶**) دست کا گوشت کھانا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے بلکہ آپ کو بہت مرغوب تھا۔یہ گوشت کا پرہیز حضور صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہیں۔ اس لئے اتباع سنت نہیں۔

حاجی صاحب کے سامنے ایک بڑے متبحر عالم نے کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ ترک حیوانات کے ساتھ چلہ کھینچوں۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ مولانا توبہ کیجئے بدعت ہے۔ حالانکہ یہ سائل بہت بڑے عالم اور محدث تھے۔ مگر ان کی نظر اس پر نہ پہنچی مگر حاجی صاحب نے فوراً فرمایا کہ یہ بدعت ہے۔ حالانکہ حاجی صاحب اصطلاحی عالم نہ تھے مگر عالم گر تھے

اسی لیے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمایا تھا کہ لوگ حضرت حاجی صاحبؒ کے مختلف کمالات سے معتقد ہیں۔ مگر میں علم کی وجہ سے معتقد ہوں۔ اصل یہ ہے کہ جب قوت حاسہ درست اور صحیح ہو تو کھانے میں کتنا ہی باریک بال کیوں نہ ہو محسوس ہو جاتا ہے۔ اسی طریق سے جب فہم درست ہو تو حق و باطل میں فوراً امتیاز ہو جاتا ہے۔ حضرت اپنے زمانہ میں صدیق اعظم تھے (جو بہت بڑا مرتبہ ہے مراتب ولایت میں سے) ہم لوگ اگر ترک حیوانات کو بدعت کہتے تو کچھ تعجب نہ تھا۔ کیونکہ رات دن درس وتدریس وافتاء کا شغل رہتا ہے۔ کتابیں دیکھ کر بدعت وسنت کا علم ہر ایک کو ہوسکتا ہے۔ مگر حضرت تو درسی عالم بھی نہ تھے حضرت نے محض نور قلب اور ذکاوت فہم سے فوراً اس کو بدعت فرمایا۔

پس قربانی سے احتراز اور گوشت وغیرہ سے پرہیز یہ کید ہے کیا دکا اور مکر ہے شیطان کا کہ عبادت کے رنگ میں دھوکا دیتا ہے۔ درحقیقت اس شخص کا مقصود اصلی شہرت ہے کہ کوئی جدید کام کیا جاوے تا کہ شہرت ہو اسی واسطے ایسے لوگ گوشت نہیں کھاتے کہ مشہور ہو جاویں۔ باقی کاملین تو شہرت سے بھاگتے ہیں۔ ان کی نظر ہر وقت عبدیت پر ہے۔ اس لئے وہ پلاؤ اور تنجن اور چٹنی ایک ہی رغبت سے کھاتے ہیں اور اگر وہ کسی مصلحت سے غذا میں تقلیل بھی کرتے ہیں تو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

ہمارے حاجی صاحبؒ ایک چپاتی یا دو چپاتی کھایا کرتے تھے مگر کھانے پر سے سب کیساتھ اٹھتے تھے۔ تا کہ دوسروں سے پہلے اٹھنے میں کسی کو پتہ نہ چل جائے۔ کہ بہت کم کھاتے ہیں اور چپاتی کی شمار کون کرتا ہے۔

شکر نعمت

صاحبو! کمالات حقیقیہ یہ ہیں کہ جن کی کوئی خاص امتیازی صورت نہ ہو اور مصنوعی صورت سے بالکل خالی ہو۔ غرض کمال بزرگی کی شان عدم امتیاز ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان یہی تھی کہ کوئی امتیاز نہ تھا۔ چنانچہ کھانے کی حالت یہ تھی کہ

لا یعیب شیئاً ان اشتھاہ اکلہ وان لم یشتھہ لم یا کلہ. (اتحاف السادۃ المتقین ۵:۲۱۸)

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شے میں عیب نہیں نکالتے تھے۔ اگر خواہش ہوتی تو تناول فرمالیا ورنہ چھوڑ دیا۔

یہ نہ تھا کہ اگر مرغوب طبع نہ ہوتو برائی بیان کرنا شروع کردیں نہ یہ تھا کہ زبردستی اس کو کھاویں۔ بلکہ اگر خواہش ہوئی تو تناول فرمالیتے ورنہ چھوڑ دیتے۔ یہ اعتدال ہے اور اعتدال ہی بہت مشکل ہے۔ اعتدال پر چلنا اور حالت معتدلہ پر قائم رہنا سخت کٹھن راستہ ہے کہ پل صراط کی طرح باریک ہے اس میں کسی قسم کا حظ نفس نہیں اور نہ کوئی خاص امتیازی حالت ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہ تو ہمیں کھانے کو دیتے ہیں اور ہم لوگ عیوب نکالنے میں مبتلا رہتے ہیں کہ اس میں نمک کم ہے یا مرچ زیادہ ہے۔ لذت نہیں ذائقہ درست نہیں۔ گرم مصالحہ کی خوشبو نہیں۔ ہلدی کی بو آتی ہے وغیرہ ذالک۔ حالانکہ ہمارے ذمہ یہ حق ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی نعمتوں کا ہر حال میں شکر ادا کریں اور جب ہمارے ذمہ یہ حق ہے تو پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہمارے عیوب نہ نکالنے پر اجر ملے۔ کیونکہ ہم نے اپنے ذمہ کے حق کو ادا کیا تو اس پر استحقاق اجر کیسا۔ پس مواخذہ سے بچ گئے۔ یہی بڑی بات ہے۔

اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص کسی کے گھر میں آ کر رہے اور مہمانی کے طور پر قیام کرے۔ رخصت کے وقت میزبان سے کہے کہ میرا شکریہ ادا کرو کہ میں نے تمہارے مکان میں آگ نہ لگائی۔ واقعی یہ شخص احمق ہے۔ اس کو آگ لگانے کا کیا حق تھا جو نہ لگانے پر شکریہ کا طالب ہے کس بات کا شکریہ ادا کیا جاوے۔ بلکہ مہمان کے ذمہ تو یہ ضروری ہے کہ میزبان کے مکان کو خراب نہ کرے۔ تو پھر حق واجب کے ادا کرنے پر شکریہ کا استحقاق کیسے ہوسکتا ہے۔

اسی طرح کھانے میں عیوب نہ نکالنے پر عقل کا مقتضا تو یہ ہے کہ ہم بھی ثواب کے مستحق نہ بنیں۔ مگر حق تعالیٰ کی عجیب رحمت ہے کہ باوجودیکہ ہمارے ذمے عیب نہ نکالنا ضروری اور لازمی ہے لیکن ہم کو اس پر بھی اجر اور ثواب عنایت فرماتے ہیں۔

چنانچہ ہمارے ایک استاد تھے ملا محمود صاحبؒ بہت سادہ اور پاک طینت بزرگ تھے۔ میں نے انتقال کے بعد ان کو خواب میں دیکھا دریافت کیا کہ حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ بخش دیا۔ میں نے پوچھا کہ کس بات پر بخش دیا۔ جواب دیا کہ میں ایک مرتبہ گھر میں آیا اور کھانا کھانے بیٹھا۔ کھچڑی میں نمک ٹھیک نہ تھا۔ مگر میں نے کچھ کہا نہیں اور کوئی عیب نہ نکالا۔ اسی طرح کھانا کھالیا۔ حق تعالیٰ کے یہاں میرا معاملہ پیش ہوا۔ اس پر میری مغفرت ہوگئی۔

اللہ اکبر! غور کیجئے کہ یہ بھی کوئی بڑی بات تھی جس پر مغفرت ہوئی حق تعالیٰ بڑے قدر دان ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مغفرت فرماتے ہیں۔ دیکھیے صرف کھانے میں عیب نہ نکالنے پر مغفرت ہوگئی۔ حالانکہ اس نعمت کا ہمارے ذمہ خود ہی یہ حق تھا کہ ہم اس میں عیب نہ نکالیں مگر حق سبحانہ کی قدر تو دیکھئے کہ اس پر بھی ہم کو ثواب عطا فرما دیتے ہیں اور ثواب اتنا کہ صرف اسی وجہ سے مغفرت فرما دی۔ حق تعالیٰ کی عجیب شان ہے۔

نعمتوں پر ناگواری

صاحبو! ذرا غور و خوض سے کام لیجئے تو صاف معلوم ہو کہ ہم پر ان کی کس قدر بے شمار نعمتیں ہیں مگر ہماری حالت یہ ہے کہ حق تعالیٰ تو ہم کو نعمتیں عطا فرماویں اور ہم عیوب نکالنے پر کمر بستہ ہیں چنانچہ ہمیں کپڑا پہننے کو ملتا ہے۔ مگر اس کی پسندیدگی میں بھی ہزار ہا قسم کے نخرے ہیں پھر سلواتے ہیں تو اس میں بھی شکن اور جھول کی شکایت ہے کہ اس میں تو جھول پڑ گیا۔

مگر افسوس اس کا اصلاً اور مطلقاً خیال نہیں کہ اس سے ہمارے دین میں جھول پڑا جاتا ہے۔ اسی طرح کہیں سے کھانا آیا تو اس میں عیب نکال کر واپس کر دیا۔ ایک شخص نے تو روپیہ خرچ کر کے بھائیوں کو کھانا کھلایا مگر ادھر یہ حضرت ہیں کہ اینٹھ گئے۔

چنانچہ میرے اعزہ میں ایک شخص ایک ممتاز عہدے پر مامور تھے یعنی سب انسپکٹر تھے۔ وطن آ کر ایک تقریب میں برادری کی دعوت کی مگر ایک شخص آنکھوں سے اندھے۔ کپڑوں سے میلے کچیلے روٹھ گئے اور تماشا یہ کہ وہ معزز رئیس دوپہر کے وقت دھوپ میں ان کے منانے اور راضی کرنے کے واسطے چلے گو دھوپ اور تپش کے باعث مسجد میں بھی نہیں جاتے تھے۔ مگر ان کے منانے کو دوپہر کو دھوپ میں بے تکلف چلے جا رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے منانے کو کبھی مسجد میں نہیں گئے۔ ہماری بھی عجیب حالت ہے۔ حالانکہ وہ صاحب اپنے عہدہ پر ایسے شکستہ حال اور کم حیثیت لوگوں سے بات بھی نہ کرتے ہونگے۔ مگر تقریب کی شان باقی رکھنے کو سب کچھ گوارا کیا۔

ایک شخص ذی ثروت کا ایسا ہی واقعہ ہے جو ہمارے وطن میں ہوا کہ شادی کی رسم میں کنبہ برادری کی دعوت کی۔ برادری میں ایک غریب آدمی کو بڑا حسد ہوا کہ اس کو اس قدر وسعت کیوں ہوئی جو اس نے دعوت کی آخر کار ایسے موقع کے منتظر رہے کہ اس موقع پر اس ذی ثروت کو ذلیل کیا جائے۔ حق تعالیٰ سب کی مرادیں پوری کرتے ہیں۔ شیطان جیسے لعین کی بھی مرادیں پوری کر دیتے ہیں۔ چنانچہ جب کھانا کھانے بیٹھے تو سقہ کارخانے میں پانی لینے جا رہا تھا۔ اتفاق سے اس کی مشک میں سوراخ تھا۔ اس

میں سے پانی کی پھوار ان پر جا پڑی۔ فوراً ہی بگڑ گئے۔ اور مجلس سے کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ کھانا کھلاتا ہے یا ذلیل کرتا ہے۔ اس سے خوش ہوتا ہے کہ لوگوں کو پانی میں نہلا دے۔ کھلانے کا سلیقہ نہیں اوچھوں کی طرح کھلانے کو تیار ہو گیا۔ ان کے اٹھنے سے اور دس پندرہ آدمی معیت میں اٹھ گئے صاحب دعوت نے معافی چاہی کہ بھائی صاحب خدا کے واسطے معاف کر دیجئے۔ بہت خوشامد درآمد کے بعد مزاج کی اصلاح ہوئی یہ تو مقصود ہی تھا کہ رئیس کی ہیٹی ہو۔ مگر رئیس کی کیا ہیٹی ہوئی۔ ان کی تو وعظ میں تعریف ہو رہی ہے۔ ہاں ان حاسد صاحب کی ہی ہیٹی ہوئی کہ وعظ میں ان کی تنقیص ہو رہی ہے۔

صاحبو! تکبر خدا کو پسند نہیں بالخصوص غریب آدمی سے تو بہت ہی زیادہ ناپسند ہے۔ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ تین شخصوں کو بہت مبغوض رکھتے ہیں۔

ایک وہ! جو بوڑھا ہو کر زنا کرے۔ دوسرے وہ جو بادشاہ ہو کر جھوٹ بولے۔ تیسرے وہ جو غریب ہو کر تکبر کرے۔ فرعون بے سامان ہو جاوے۔ ایک فرعون باسامان بھی تھا۔ لیکن اگر ان کے پاس سامان ہوتا تو ابلیس سے کم نہ ہوتے۔

غرض! بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ کی نعمتیں بھی ناگوار ہیں۔ وہ تو نعمتیں عطا فرماتے ہیں اور یہ اوپر سے نخرے کرتے ہیں۔ ہر چیز میں نخرہ ہے ناک مارے کوئی شے پسند ہی نہیں۔ ہر چیز میں عیب و شکوہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ گو حق تعالیٰ کی نعم کثیرہ اور بے شمار ہیں مگر زیادہ دو حالتیں پیش آتی ہیں جو موافق مزاج اور مناسب طبع نہیں۔ اس وقت ضبط و استقلال کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی معنی ہیں صبر کے۔ اسی واسطے اس آیت کو اختیار کیا گیا ہے کہ اس آیت میں مضمون صبر کو قصہ کے پیرایہ میں بیان فرمایا ہے اور قصص سے مقصود اصلی واقعات کا سنانا نہیں بلکہ ترغیب و ترہیب مقصود ہوتی ہے کہ ہم بھی اگلے لوگوں کی حالت محمودہ کو دیکھ کر عمل کی کوشش کریں اور مذمومہ کو دیکھ کر اس سے احتراز کریں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ كَانَ فِىْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ

ان کے قصہ میں سمجھداروں کے لئے عبرت ہے

اور عبرت کے معنی ہیں قیاس حال نفسه علی حالهم سواء كان محموداً او مذموماً۔[1]

حکمت ولادت حضرت موسےٰؑ

پس حق تعالیٰ اس آیت میں والدہ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے موسیٰ

---

[1] اپنے حال کو ان کے حال پر قیاس کرنا خواہ ان کا حال محمود ہو یا مذموم ہو۔ ۱۲

علیہ السلام کی والدہ کو الہام کیا کہ تم ان کو دودھ پلاتی رہو فرعون کو کاہنوں اور نجومیوں نے یہ خبر دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا۔

فرعون نے یہ پیشین گوئی سن کر بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہوتا اس کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اسی زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو حق تعالیٰ نے والدہ موسیٰ علیہ السلام کو شر فرعون سے محفوظ رہنے کی تدبیر بتلائی جو اس آیت میں مذکور ہے۔ ہر چند کہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ولادت موسویہ سے پہلے ان کی والدہ کو حق تعالیٰ کا الہام یوں ہو جاتا کہ سفر کر کے مصر سے باہر ایسی جگہ چلی جاؤ جہاں فرعون کی سلطنت نہ ہو اور جب موسیٰ علیہ السلام جوان ہو جاتے تب مصر میں تشریف لے آتے جیسا کہ جوان ہونے کے بعد موسیٰ علیہ السلام فرعون سے خائف ہوئے تو مدین کی طرف چل دیے اور شعیب علیہ السلام سے ملے۔

وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ. قَالَ لَا تَخَفْ. نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ

اور شعیب علیہ السلام سے تمام قصہ بیان کیا۔ تو شعیب علیہ السلام نے فرمایا اب خوف نہ کرو۔ قوم ظالمین سے تم نے نجات پالی۔

کیونکہ مدین میں فرعون کی سلطنت نہ تھی۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام سرحد قریب سے نکل گئے تھے۔

اسی طرح یہ بھی ایک طریق مفید تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو مصر سے سفر کرنے کا الہام ہو جاتا ہے کہ مدین چلی جاؤ اور موسیٰ علیہ السلام وہیں پر پیدا ہوتے۔ مگر خدا تعالیٰ کو یہ دکھلانا تھا کہ ہم خدا ہیں۔ مصر میں ایسی حالت میں پیدا کیا کہ فرعون ہر بچہ کے قتل پر کمر بستہ تھا۔ پھر فرعون کے ہاتھوں میں پلوایا۔ تو اپنی قدرت پر استدلال بتلایا ہے کہ اتنی بڑی قدرت ہے ظاہر ہونے پر بھی فرعون دعویٰ خدا سے باز نہ آیا۔ واقعی دل پر مہر ہی ہو چکی تھی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

اور فرماتے ہیں اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دینگے۔

الی قوله وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ (پ ۲۳)

اور اگر ہم چاہتے تو ان کی صورتیں بدل ڈالتے۔

چنانچہ قدرت عظیمہ کا ظہور اس طرح ہوا کہ موسےٰ کی پرورش فرعون کے ہاتھ سے کرائی۔ مخلوق میں کوئی کتنا ہی بڑا قاہر اور زبردست کیوں نہ ہو اپنے محبوب کو دشمن کے ہاتھ میں ہرگز نہیں دیتا۔ گو دشمن کو کیسا ہی اور کتنا ہی مغلوب و عاجز کر دے۔ مگر یہ اندیشہ ضرور ہوتا ہے کہ کہیں یہ

میرے بچہ کو قتل نہ کردے اذیت نہ پہنچائے۔ مگر یہ خدا ہی ہے۔ جس کو کسی قسم کا اندیشہ نہ ہو۔ جس کو اپنی قدرت کا علم جازم ہو کہ بدوں ہماری مشیت کے کسی کی مجال نہیں جو کچھ بھی کر سکے۔

چنانچہ حق تعالیٰ نے موسیٰ جیسے اپنے محبوب کو دشمن کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور ایسے وقت میں دیا کہ موسیٰ کچھ بھی نہ کر سکتے تھے اور ہاتھ پاؤں بھی نہ ہلا سکتے تھے۔ اور جب دو تین برس میں ہاتھ پاؤں چلانے کے قابل ہوئے تو ایسا فعل صادر کرایا جس سے خواہ مخواہ فرعون کو شبہ ہو جاتا کہ یہ لڑکا وہی ہے جو میرا دشمن ہوگا۔

چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک بار فرعون کی گود میں تھے وہ آپ کو پیار کر رہا تھا۔ تو آپ نے فرعون کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا اور اس کی داڑھی نوچ لی۔ فرعون کو اس کی سہار کہاں تھی۔ اس نے تو ہمیشہ وہی تعظیم و تکریم دیکھی تھی ہمیشہ نعمتوں میں رہا۔ اور انسان کے لئے ایسی نعمت بھی بلا ہے فرعون نے بلا نہ دیکھی تھی۔ اور جب تک انسان کو کچھ چرکہ نہ لگے۔ اس وقت تک اسے اپنی حقیقت کا پتہ نہیں چلتا۔ انسان کے واسطے چرکہ لگنا اور کسی مصیبت میں پڑنا جڑ ہے تمام محاسن اور خوبیوں کی۔ فرعون تو تمام عمر ناز و نعمت میں رہا تھا۔ اس نے کوئی رنج اور تکلیف نہ دیکھی تھی۔ اس لئے اپنے کو سب سے بڑا سمجھتا تھا جیسے بعض مسلمان بھی اپنے دل میں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم سب سے اچھے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ مومن مومن نہیں ہو سکتا جب تک کافر فرنگ سے اپنے کو بدتر نہ سمجھے۔ شاہ جی توکل شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اپنے کو کتے سے بھی بدتر سمجھنا چاہئے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کی توجیہ میں فرمایا کہ کتے میں اندیشہ بے ایمانی کا نہیں اور مسلمان کو بے ایمانی کا اندیشہ ہے اس لئے مسلمان کو چاہئے کہ اپنے کو کتے سے بھی بدتر سمجھے۔ حقیقت میں زندگی ختم ہونے تک انسان کو کچھ حق نہیں اپنے کو اچھا سمجھنے کا۔ رات دن تبدیل و تغیر ہوتی رہتی ہے۔ کوئی آج عابد و زاہد ہے اور کل کو شیطان ہو جاتا ہے۔ کوئی آج کافر ہے اور کل کو مسلمان ہو جاتا ہے اس لئے زندگی میں اپنے کو کسی سے اچھا سمجھنے کا کچھ حق نہیں۔ ہاں مرنے کے بعد اگر اسلام پر خاتمہ ہو گیا تو جو کچھ چاہے سمجھ لینا۔ اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

گہہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما گہہ خندہ زند دیو ز ناپاکی ما

ایمان چو سلامت بہ لب گور بریم احسنت بریں چستی و چالاکی ما

"کبھی فرشتہ ہماری پاک دامانی پر رشک کرتا ہے۔ اور کبھی شیطان ہماری ناپاکی پر ہنستا ہے۔ اگر سلامتی کے ساتھ ایمان قبر تک لے گئے تو ہماری اس چستی و چالاکی پر آفریں ہوگی۔"

یزیداورلعنت

ایک شخص نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ یزید پرلعنت کرنا کیسا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ مرنے کے بعد قبر میں جائز ہے۔ جب یہ اطمینان ہوجاوے کہ ہماری حالت یزید سے اچھی ہے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج اس پرلعنت کریں اور کل کو ہماری حالت اس سے بھی بدتر ہوجاوے تو یزید کہے گا کہ سبحان اللہ! آپ دنیا میں کس سرخروئی کی بناء پر مجھ پرلعنت کیا کرتے تھے۔ اب گریبان میں منہ ڈال کرتو دیکھو۔ کسی کو کانا وہ شخص کہے جس کو اپنے اندھے ہونے کا اندیشہ نہ ہو اگر یزید برا تھا تو اس کا کیا اطمینان ہے کہ ہم اس سے اچھے ہوکر مریں گے۔ میاں بس زندگی میں تو روتے ہی رہو۔

حضرت رابعہؒ بصریہ شیطان پر بھی لعنت نہ کرتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ جس قدر وقت لعنت میں صرف کیا جاوے اس سے بہتر یہ ہے کہ یہ وقت ذکر محبوب ہی میں صرف کیا جائے۔ ہر چند کہ شیطان پر تبرا جائز ہے مگر بزرگ اس کے درپے نہیں ہوتے۔ کیونکہ مرنے تک اپنا ہی کچھ پتہ نہیں۔ پھر ضروری ہی کام میں نہ لگے جیسا حضرت رابعہؒ نے فرمایا اس لئے اپنے کو اچھا سمجھنے کا کسی کو حق نہیں۔ اکثر یہ بلا اہل تنعم کو ہو جاتی ہے۔

امتحان حضرت موسیٰ علیہ السلام

چنانچہ فرعون کی حالت اسی لئے خطرناک تھی کہ اس نے بلا اور بے تعظیمی کبھی دیکھی نہ تھی اسی لئے اس نے انا ربکم الاعلیٰ کا دعویٰ کیا۔ جب موسیٰؑ نے اس کی داڑھی نوچ لی تو فرعون غصہ سے بے تاب ہوکر کہنے لگا کہ ہو نہ ہو یہ وہی بچہ ہے جو میری سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا اور اس قسم کی واہی تباہی باتیں ہانکنے لگا۔ اور آمادۂ قتل ہوگیا۔

حضرت آسیہؓ کہنے لگیں کہ تم تو بے وقوف ہو گئے ہو۔ یہ تو ناسمجھ بچہ ہے اس نے اپنے فہم کے مطابق ناسمجھی سے یہ فعل کیا ہے۔ بچہ میں کہاں سمجھ ہوتی ہے جو وہ کوئی کام سمجھ کر کرے۔ فرعون بولا ہرگز نہیں۔ یہ بچہ ناسمجھ نہیں ہے اس نے دانستہ یہ فعل کیا ہے۔ حضرت آسیہؓ نے اس کی نفی کی تو فرعون نے کہا کہ اچھا میں اس کی فہم و عدم فہم کا امتحان کرتا ہوں۔ ایک طشت آگ کا اور طشت جواہرات کا منگوایا۔ اور دونوں موسیٰؑ کے سامنے رکھ دیئے کہ اگر یہ ناسمجھ ہیں تو آگ اور جواہرات کو یکساں سمجھیں گے ورنہ جواہرات کی طرف میلان کریں گے۔

یہ بھی فرعون کی حماقت تھی۔ کیونکہ جب بچہ میں عقل نہیں ہوتی تو اتفاقاً جس طرف بھی چاہے متوجہ ہو جاوے مگر موسیٰ سمجھ دار تھے وہ سمجھ گئے کہ آگ قابل توجہ نہیں۔ چنانچہ جواہرات کے طشت کی طرف ہاتھ دوڑانا چاہا مگر جبرئیلؑ کو حکم ہوا کہ ان کا ہاتھ آگ کی طرف پھیر دو۔ چنانچہ حضرت جبرئیلؑ نے آگ کے طشت کی طرف منہ پھیر دیا۔ تو موسیٰ نے انگارے صرف ہاتھ ہی میں نہیں لئے بلکہ منہ میں رکھ لئے جس کی وجہ سے زبان میں لکنت ہو گئی۔

یہ قصہ مستدرک حاکم جلد ثانی کتاب التاریخ ذکر موسیٰ میں مفصل مذکور ہے من **قوله فبينا هو يلعب بين يدى فرعون الىٰ قوله۔ وكان امر بقتله ورواه مختصرا فى الدر المنشور سوره طه** بروایت عبد بن حمید و ابن المنذر و ابن ابی حاتم عن سعید بن جبیر اگر بقول مشہور بعد نبوت کے یہ لکنت جاتی رہی تھی۔ بعضوں نے کہا ہے کہ نبوت کے بعد بھی خفیف اثر باقی رہا تھا۔ اور زیادہ اثر زائل ہو گیا تھا۔ جس سے بات سمجھ میں آنے لگی تھی۔

اب فرعون کا اطمینان ہو گیا کہ بچہ نے میرے ساتھ بھی یہ حرکت نا سمجھی سے کی ہے اور پھر شفقت و محبت بدستور کرنے لگا۔ ایک حرکت تو بچپن میں یہ کی اور بڑے ہو کر یہ کیا کہ ایک قبطی آدمی کو مار ڈالا۔ فرعون نے اس قصہ کو سن کر وارنٹ گرفتاری کا نکال دیا۔ اشتہار دے دیا کہ موسیٰ جہاں ہوں پکڑ لئے جائیں۔ موسیٰ کو جب یہ معلوم ہوا تو مصر سے سفر شروع کر دیا۔ اور تن تنہا بلا کسی رہبر کے مصر سے روانہ ہو گئے۔

انبیاء علیہم السلام کو تمام امور من جانب اللہ سہل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ راستہ معلوم نہ تھا کبھی سفر نہ کیا تھا۔ مگر خدا تعالیٰ پر بھروسہ کر کے چل پڑے اور کامیاب ہو گئے۔ توکل کی یہی برکت ہے۔ متوکل کے ساتھ بے دست و پا بچوں کا سا معاملہ کیا جاتا ہے۔ جس کو مولانا فرماتے ہیں۔

طفل تا گو یا وتا پویا نہ بود | مرکبش جز گردن بابا نہ بود

"بچہ جب تک بولنے نہ لگے اور چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو اسکی سواری بابا کی گردن پر ہوتی ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا توکل

جب آدمی خدا تعالیٰ کے بھروسہ پر کام شروع کرتا ہے تو حق تعالیٰ کی مدد ساتھ ہوتی ہے اس وقت موسیٰ نے دار الکفر سے ہجرت کی تھی۔ جاہل آدمی یہ سمجھے ہونگے کہ موسیٰ بھاگے بھاگے پھرے اور خلاف توکل کام کیا حالانکہ موسیٰ کا مصر سے چلا جانا خلاف توکل نہیں تھا۔ بلکہ واقع میں بہت بڑا توکل ہے۔

تقریر مقام کی یہ ہے کہ اختیار تدبیر کامل یا ترک تدابیر مطلقاً کے متعلق توکل کے اقسام و احکام تو قوم میں مشہور اور کتب قوم میں مفصلاً مذکور ہیں مگر تدبیر ناقص کے اختیار کرنے کا حکم اور درجہ غالباً کم معلوم ہے۔ اس لئے اس کے متعلق تحقیق کی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اس کو عام طور سے ظاہر نظر میں یہ دیکھ کر کہ تدبیر تو اختیار کی توکل نہیں سمجھا جاتا۔ اور یہی منشاء شبہ بالا کا ہوا حضرت موسیٰؑ کی نسبت۔ مگر واقع میں تدبیر کے ضعیف اور ناکافی ہونے کی صورت میں ایسی تدبیر کے ترک کی نسبت اس تدبیر کے اختیار کرنے میں زیادہ توکل ہے عنقریب اس کی توجیہ آتی ہے۔ یہاں موسیٰؑ نے جس تدبیر کو اختیار کیا ہے وہ اس لئے ناکافی تھی کہ ظاہر الفاظ آیت

فَخَرَجَ مِنۡهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِىۡ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ۔ (پ ۲۰)

''پس موسیٰؑ وہاں سے نکل گئے خوف اور دہشت کی حالت میں کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار! مجھ کو ان ظالموں سے بچایئے۔'' اور آیت۔ وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلۡقَآءَ مَدۡيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّىۡۤ اَنۡ يَّهۡدِيَنِىۡ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ۔ (پ۲۰)

''اور جب موسیٰؑ مدین کی طرف ہو لئے کہنے لگے کہ امید ہے کہ میرا رب مجھ کو سیدھے راستے پر چلائے گا۔''

سے مفہوم ہوتا ہے کہ آپ کو راستہ مدین کا معلوم نہ تھا۔ کسی سے پوچھنا منقول ہے۔ محض حق تعالیٰ سے دعا اور کسی مامن کا راستہ مل جانے کی رجاء پر سفر شروع فرما دیا۔ جس کی برکت سے مدین کی طرف قدرتی طور پر رخ ہو گیا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں یہ تدبیر نجات کی محض ناکافی تھی۔

اب حسب وعدہ ایسی تدبیر کے اختیار کرنے میں زیادہ توکل ہونا بیان کرتا ہوں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو عام لوگ اس کو توکل نہیں سمجھتے جیسا شروع تقریر میں مذکور ہوا تو بوجہ خفی ہونے کے اس میں زیادہ اخلاص ہے اس کا اختیار کرنا محض عبدیت ہے کہ باوجود ناکافی ہونے کے امتثال امر سمجھ کر اس کو اختیار کیا۔ طبع وعادت کی مزاحمت پر عمل نہیں کیا۔ تیسرے اس صورت میں حق تعالیٰ کی قدرت کے مؤثر ہونے پر یہ نظر ہونا (کہ وہ غیر مؤثر کو مؤثر کر سکتے ہیں) عجیب ہے بخلاف ترک کے کہ اس صورت میں اگر قدرت پر نظر نہ ہوگی تو کسی چیز پر ہوگی۔ اس لئے یہ توکل اکمل واقویٰ ہے۔

غرض موسیٰؑ کا ایسی حالت ناواقفی میں بلا دریافت کئے سفر کرنا ظاہراً تو تدبیر پر عمل ہے مگر واقع میں نہایت کامل اور دقیق توکل ہے اگرچہ ظاہر میں تدبیر کی تھی مگر یہ تدبیر بھی جبکہ راستہ وغیرہ معلوم نہ تھا ناقص

تھی اسلئے یہ تدبیر محض برائے نام تھی ورنہ حقیقت میں پورا توکل تھا۔ البتہ آپ نے عام مذاق کے موافق توکل نہیں کیا کہ وہاں سے سفر ہی نہ کرتے بلکہ اپنی امکانی تدبیر بھی گو نام ہی کی تدبیر تھی اور توکل بھی کیا۔

حضرت یوسف علیہ السّلام کا توکل

یہ سخت مشکل ہے کہ ایسی حالت میں تدبیر اور کوشش بھی کرے جب کہ تدبیر کی بظاہر کافی صورت نہ ہو ورنہ ایسی حالت میں طبعی اقتضاء مطلقاً ترک تدبیر ہے تو حق تعالیٰ کی قدرت پر نظر کر کے طبیعت کو مغلوب کرنا بڑا مجاہدہ ہے۔ اسی کی نظیر حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ ہے کہ جب وہ زلیخا کے ہاتھ میں آگئے اور مکانات میں مقفل ہو گئے اور مکان بھی سات درجوں کا تھا تو اس وقت توکل ظاہری تو یہ تھا کہ وہاں سے نہ اٹھتے اور تدبیر کامل یہ تھی کہ کنجی پاس ہوتی تو بھاگ کر کھول لیتے۔ کیونکہ وہ قفل کوئی معمولی قسم کے نہ تھے کہ ہاتھ کے زور سے ٹوٹ جانے کی توقع ہوتی غایت درجہ کے مضبوط قفل تھے۔ اس صورت میں ظاہر بیں کو خواب میں بھی تدبیر کا خیال نہیں آسکتا۔ کیونکہ کنجیاں پاس نہیں اور قفل معمولی کمزور نہیں۔ اب تدبیر کرے تو کس بھروسہ پر کرے۔

مگر یوسف علیہ السلام کو ہم سوالوں کی طرح وساوس نہ آتے تھے کہ قفل کس طرح کھلے گا۔ بس انھوں نے یہ سوچا کہ مجھ کو یہاں سے بھاگنا چاہیے۔ میرا اتنا ہی کام ہے آئندہ قفل کھولنا حق تعالیٰ کا کام ہے۔ مگر یہ ظرف یوسف علیہ السلام کا تھا اور یہ نبوت کی قوت تھی جوان کو یہ خیال آیا کہ میں تو یہاں سے بھاگوں میرا کام اتنا ہی ہے آئندہ حق تعالیٰ شانہ کا کام ہے قفل کا کھولنا نہ کھولنا غیر نبی کو اس حالت میں بھاگنے کا کبھی خیال نہ آسکتا تھا۔ یہ کام نبی ہی کا تھا۔ چنانچہ اس خیال کے ذہن میں آنے ہی پر دروازے کی طرف دوڑ پڑے اور قفل ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ زلیخا دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ مولانا مثنوی میں اسی مضمون کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

"اگرچہ دنیا میں کسی قسم کا راستہ نہیں مگر یوسف علیہ السلام کی طرح بھاگ دوڑ کرنا تو فرض ہے۔"

مقصود مولانا کا یہ ہے کہ قیود نفسانیہ سے نکلنے کی اپنی قدرت بھر کوشش کرو آئندہ حق تعالیٰ مالک ہیں ان کے سپرد کردو۔

والدہ موسیٰ علیہ السلام اور توکل

اسی طرح موسیٰؑ کا کمال دیکھئے کہ بے خبری ہی کی حالت میں مصر سے نکل کر مدین کی طرف روانہ ہو گئے اور رحمت حق سے مایوس نہیں ہوئے اور نہ راستہ کی ناواقفیت سے پریشان ہوئے۔ ہم سوالوں کا تو یہ حشر ہوتا کہ ناامید ہو کر رہ جاتے کہ کدھر جائیں۔ مگر موسیٰؑ سیدھے ایک طرف کو روانہ ہو گئے اور فرعون کے قبضہ سے نکل گئے۔ جس پر فرعون ساری عمر دانت پیستا رہا کہ میرے قبضہ سے کیونکر نکل گئے۔ اس وقت فرعون کی ایسی مثال ہو گئی کہ

در بہ بست و دشمن اندر خانہ بود　　　حیلہ فرعون زیں افسانہ بود

یعنی دروازہ بند کر دیا کہ چور نہ آئے اور چور اندر گھر کے موجود ہے فرعون نے ہزار ہا تدابیر کیں مگر دشمن کا پتہ ہی نہ چلا۔

غرض! عمر بھر فرعون کے ہاتھ میں رہنے کے بعد مہالک سے اس طرح نجات پائی۔ اور فرعون کے ہاتھ میں آنے سے پیشتر مہالک سے جس طریق سے نجات پائی تھی وہ بھی اسی طریق سفر مدین کے ہم رنگ تھی۔ کیونکہ کسی بچہ کی نجات کی یہ شکل کہ اس کو صندوق میں بند کر کے دریا میں پھینک دیا جائے بظاہر نہایت ہی ضعیف و ناکافی تدبیر ہے۔ معلوم ہوتا ہے حضرت موسیٰؑ کی شان اسی معاملہ کے مناسب ہے۔ اس کا قصہ اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے جس کی میں نے خطبہ میں تلاوت کی۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ آخر آیت تک

(اور ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام کیا کہ تم ان کو دودھ پلادو)

یعنی ہم نے موسیٰؑ کی ماں کی طرف وحی کی یعنی الہام کیا کہ موسیٰؑ کو دودھ پلاؤ آگے ان کے چھپا دینے کے لئے دریا میں ڈال دینا مذکور ہے۔ اور اسی اخفاء کے لئے یہ سامان فرمایا گیا کہ جب پیدا ہوئے تو موسیٰؑ روئے نہیں تا کہ اخفاء کی ظاہری تدبیر بھی پوری ہو جائے۔

حق تعالیٰ کی بھی عجیب شان ہے کہ کہیں تو ظاہری اسباب اور تدبیر بھی استعمال فرماتے ہیں اور کہیں استعمال نہیں فرماتے اور ہر ایک میں حکمتیں ہوتی ہیں۔ غرض! یہ وحی ہوئی کہ دودھ پلادیں اور جب اندیشہ ہو کہ فرعون کو بچہ کا پتہ چل جاویگا اس وقت اس کو دریا میں ڈال دینا۔ بچاؤ کی تدبیر بھی ایسی بتلائی کہ اس کو کوئی تدبیر ہی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اگر دریا سے فرعون کے ہاتھ آجاویں تو اندیشہ قتل ورنہ دریا میں ڈوب جائیں۔

اور دریا ڈالنے کی صورت یہ فرمائی کہ صندوق میں رکھ کر پھینکنا چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ (پ ۱۶)

(ایک صندوق میں رکھو پھر ان کو دریا میں ڈال دو)

غرض جب تک دریا میں رہے اس وقت تک مہالک ہی کے ذریعہ سے دریا میں نجات دی یعنی مہالک کو سبب نجات بنا دیا۔ اور والدہ موسیٰؑ کی تسلی کے لئے یہ فرمادیا کہ دریا میں ڈال کر رنجیدہ اور خائف نہ ہونا۔ ہم بے شک موسیٰؑ کو پھر تمہارے پاس بھیج دیں گے اطمینان رکھو۔

یہ بھی ظاہر میں بہت بعید بات تھی اور اسی رنگ کی تدبیر تھی جو صورۃ عدم تدبیر تھی کیونکہ کہاں تو محل فرعون اور کہاں موسیٰؑ کی والدہ۔ بھلا فرعون کے ہاتھ میں موسیٰؑ کے پہنچ جانے پر بھی یہ خیال کیونکر ہو سکتا ہے کہ ان کی والدہ بھی محلات فرعون میں بلالی جائیں گی پھر ارشاد ہے۔

وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اور ہم موسیٰؑ کو رسول بنادیں گے

اس آیت میں بشارت ہے موسیٰ علیہ السلام کی درازی عمر کی کہ ۴۰ سال سے کم نہ ہوگی۔ کیونکہ بعادت غالبہ رسول چالیس سے کم میں نہیں ہوتے۔ یہ حاصل ہے آیت کا۔

چنانچہ موسےٰ علیہ السلام کی والدہ نے اسی طرح سے صندوق میں بستر بچھا کر اور موسےٰؑ کو اس میں لٹا کر بند کر کے دریا میں ڈال دیا۔ یہاں حضرت موسےٰ علیہ السلام کا ایک عجیب کمال ثابت ہوتا ہے کہ ماں کو اولاد سے ظاہر ہے کہ بے حد محبت ہوتی ہے کہ اذیت کے احتمال بعید بلکہ غیر واقعی سے بھی وہم پیدا ہوتا ہے۔

نسائی کی حدیث میں ہے کہ ایک بچہ کو غسل کے وقت غسال سے حضور اقدس کے سامنے اس کی ماں نے یہ کہا تھا کہ میرے بچہ پر زیادہ ٹھنڈا پانی نہ ڈال دینا کبھی سردی سے تکلیف ہو۔ جیسے زندہ بچے کی حفاظت کی جاتی ہے ایسے ہی وہ مرنے کے بعد اس کی حفاظت کرتی ہے۔

مگر باوجود اس کے والدہ موسیٰؑ ان کو صندوق میں رکھ کر اور صندوق بند کر کے بسم اللہ کہہ کر دریا میں چھوڑ آئیں۔ خدا کے اوپر کیسا وثوق تھا۔ یہ سوال بھی نہیں کیا کہ دریا میں کیا ہوگا۔ اور حق تعالیٰ نے جو کچھ مجملاً فرما بھی دیا تھا۔

يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ کہ اس کو میرا اور اس کا دشمن پکڑ لے گا۔

اس پر انہوں نے یہ سوال نہیں کیا کہ وہ دشمن پکڑ کر کیا کرے گا اور جو کریگا بہتر ہوگا یا شر۔ کیسا انقیاد ہے۔ بس جان لیا کہ یہ میری چیز نہیں مجھے اس قسم کے سوالات کا کوئی حق نہیں۔ جیسے کوئی بادشاہ اپنے

خازن سے کہے کہ اس الماری کی اشیاء کو اس میں سے اٹھا کر اس الماری میں رکھ دو تو خازن کو یہ منصب نہیں کہ یہ کہے کہ جناب کیوں رکھ دوں۔ بلکہ بادشاہ جس طرح چاہے اس کو اسی طرح کرنا چاہئے۔

حضرت آدم علیہ السلام اور ایاز

جیسے بادشاہ محمود غزنوی کے ایک حکم کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا تھا۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ وزراء نے سلطان محمود سے شکایت کی کہ آپ کو ایاز کے ساتھ تعلق زیادہ ہے اور حضور ایاز کو زیادہ چاہتے ہیں۔ اس وقت تو محمود اس کا سن کر ٹال گیا۔ اور دل میں خیال کیا کہ کسی موقع پر بتلاؤں گا کہ ایاز کے ساتھ زیادہ تعلق کیوں ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ دربار عالم کیا اور خزانہ میں جو ایک بہت بڑا اور بیش بہا قیمتی موتی تھا کہ اس کے ساتھ کا اور کوئی موتی خزانوں میں نہ تھا اس کو منگوا کر دربار میں رکھا اور وزیر اعظم کو حکم دیا کہ اس موتی کو توڑ دو۔ وزیر نے سوچا کہ شاید اس وقت بادشاہ نے کسی حالت کے جوش میں ایسے ہی کہہ دیا ہے بعد میں پشیمان ہوگا۔ ادب سے عرض کیا کہ حضور یہ تو بے نظیر موتی ہے۔

بادشاہ نے وزیر دوم سے کہا کہ تم توڑ دو۔ وزیر دوم نے بھی یہی سوچ کر کہ جب وزیر اعظم نے نہیں توڑا تو میں کیسے توڑ دوں۔ وزیر اول کی طرح اس کے بیش بہا اور بے مثل ہونے کا عذر کر دیا۔

بادشاہ نے ایاز کی طرف نظر اٹھائی کہ تم توڑو۔ ایاز نے فوراً دو پتھر اوپر نیچے رکھ کر دو ٹکڑے کر دیئے۔ جب وہ ٹوٹ گیا تو بادشاہ نے نظر غیظ و غضب سے ایاز کی طرف دیکھا اور کہا کہ یہ کیا کیا؟ ایاز نے کہا حضور قصور ہوا۔ وزراء خوش ہوئے کہ آج ایاز پر بھی خفگی ہوگی اور ہم بڑے عقلمند تھے کہ باوجود امر شاہی کے اپنی عقل سے رک گئے۔ کیونکہ ہم جانتے تھے کہ بعد میں بادشاہ کو رنج ہوگا۔

ایاز نے جو یہ عرض کیا کہ بندہ سے قصور ہوا حضور معاف فرماویں۔ یہ اس کے مشابہ ہے جیسا حضرت آدم علیہ السلام نے جب گیہوں کھا لیا تھا اور حق تعالیٰ کی خفگی ہو کر جنت سے جدا کر دیئے گئے۔ تو انہوں نے بھی یہ فرمایا تھا۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (پ۸)

اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ فرمائیں گے تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جاویگا۔

تو حضرت آدم علیہ السلام نے خطا کی نسبت اپنی طرف کی اور اپنے نفس کو خطاوار بنا کر معافی کی درخواست کی بر خلاف شیطان کے کہ اس نے خطا کی نسبت اپنی طرف نہیں کی بلکہ رب بما

اغویتنی (پ ۸) کہہ کر خدا تعالیٰ کی طرف نسبت کی اور ادب کو ملحوظ نہ رکھا۔ اگر ادب کو ملحوظ رکھ کر اپنی طرف نسبت کرتا تو اس کی بھی معافی ہو جاتی۔ اسی مضمون کا عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

گناہ گرچہ نبود اختیار ما حافظ　　　　تو در طریق ادب کوش گیں گناہ من ست

اگر گناہ ہمارے اختیار میں نہیں مگر ادب میں کوشش کرنا تو ہمارا فرض ہے جو ادب کو ملحوظ نہیں رکھتا یہ اس کا گناہ ہے۔

غرض حضرت آدم علیہ السلام نے ادب کو ملحوظ رکھ کر معصیت کی نسبت اپنی طرف کی اور شیطان نے ادب کو پس پشت ڈال کر خدا تعالیٰ کی طرف نسبت کی ادب کی یہ برکت ہوئی کہ حضرت آدم علیہ السلام مقبول ہوئے اور شیطان مردود ہوا شیطان نے تو یہ قول شرارت سے کہا تھا۔ اگر غلبہ حال میں کہتا تب بھی معافی ہو جاتی۔ مگر اس نے جیسا بعض اہل سیر نے لکھا ہے۔ یہی سبب بیان کیا کہ میں نے جو کچھ کیا آپ کے لکھے ہوئے کے موافق کیا۔ مخالفت کا دعویٰ کرتا ہے۔ تو نے تو معصیت اور سرکشی ہی کی وجہ سے سجدہ سے انکار کیا۔

آج کل بھی اکثر آدمی نماز نہیں پڑھتے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ ہماری قسمت میں نماز پڑھنا نہیں ہے۔ تو نہ پڑھنے کا یہ سبب ہے۔

غرض! حضرت آدم علیہ السلام سے جب خطا ہو گئی تو معافی چاہی۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ایاز نے بھی آدم علیہ السلام کی سنت پر عمل کیا کہ جب موتی توڑنے پر بادشاہ خفا ہوا تو بولا کہ حضور خطا ہوئی۔ اور اس کے قبل جب وزراء نے موتی توڑنے پر ملامت کی تو ان سے مخاطب ہو کر یوں کہا میں نے تو موتی ہی توڑا تم نے بادشاہ کا حکم توڑا۔ اور موتی کا توڑنا بادشاہ ہی حکم کے توڑنے سے سہل ہے۔

نقض امراز کسر دردشوار تر　　　　لاجرم بستم با مراد کمر

موتی توڑنا شاہی فرمان کے توڑنے سے کم دشوار تھا۔ اس لئے میں نے حکم کی تعمیل کی۔

ایاز نے امر کے بعد جو عمل کیا یہی مذاق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا تھا کہ موتی کے وہ مالک ہیں جہاں چاہیں رکھوائیں۔ مجھے چون و چرا کا کیا حق ہے۔ چنانچہ جس الماری میں رکھنے کا امر کیا گیا۔ انہوں نے اسی الماری میں رکھ دیا جس کا ذکر آئندہ آیت میں ہے

فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ (پ ۲۰)

(جب ان کی نسبت (جاسوسوں) کا خطرہ ہو تو ان کو دریا میں ڈال دینا)

محققین کا مذاق

محققین کا مذاق جامع الاضداد ہوتا ہے۔ ان کو اس طرح جامع بنایا گیا کہ تھوڑی سی تدبیر بھی بتلائی کہ تو کل کا نام نہ ہو۔ اور ظاہر میں ناقص و ناکافی تھی۔ اسلئے توکل بھی کامل ہوا۔ جیسا اوپر بیان ہوا ہے جب دو چیزیں متضاد مجتمع ہوتی ہیں۔ تو محققین دونوں پر عمل کرتے ہیں اور وہ صورتاً متضاد ہوتی ہیں نہ کہ حقیقتاً توکل محض میں تو ایک شان امتیازی کی ہے اور تدبیر محض میں صورۃً توکل کی مخالفت ہے۔ اس لئے عارفین ایسے موقع میں تدبیر و توکل دونوں متضاد کو جمع کرتے ہیں۔ البتہ جمع بین المتضادین کا لون ہر جگہ جدا ہوتا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کا جب انتقال ہوا تو حضورؐ سے رونا اور آنکھوں سے آنسو بہانا ثابت ہے اور آپؐ نے عبدالرحمٰن بن عوف کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ یہ رحمت ہے یعنی جو کہ حق ہے اولاد کا دیکھئے! یہاں صبر اور ظہور حزن دونوں جمع ہو گئے۔ اور بعضے بزرگ جو اولاد کے مرنے پر ہنس پڑے۔ یہ دلیل کمال نہیں۔ کیونکہ یہ دلیل ہے عدم تعلق با لاولاد کی۔ بلکہ آنسوؤں کا بہنا ہی کمال ہے کہ اس میں جمع ہے دونوں حقوق کا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا کمال توکل تو اسی سے معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے حکم فرمادیا کہ ان کو دریا میں ڈال دو۔ اور انہوں نے خدا پر بھروسہ کر کے فوراً ڈال دیا۔ اب اس کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ دریا میں ڈال دیتیں اور ڈال کر مایوس ہو کر اور صبر فرما کر فارغ القلب ہو کر بیٹھ جاتیں مگر حق...... سبحانہ نے یہ حکم دیکر موسیٰ علیہ السلام سے ان کے قلب کا تعلق قطع نہیں ہونے دیا۔ بلکہ واپسی کی خوش خبری رَآدُّوْہُ اِلَیْکِ (ہم ان کو ضرور تمہارے پاس واپس پہنچادیں گے) میں سنا کر آتش شوق کو تیز کر دیا۔

غرض ایسے سخت مایوس کن حکم کے بعد ان کے اشتیاق کو بھی باقی رکھا اور ان کو ترساں و ہراساں بھی نہ ہونے دیا۔ یہ ایسا مشکل ہے جیسا میرٹھ میں ایک شخص تلوار کی دھار سے آنکھوں میں سرمہ لگایا کرتا تھا۔ جب ان سے تلوار سے سرمہ لگانے کا کمال ظاہر کیا تو کسی نے خوف کی وجہ سے سرمہ نہ ڈلوایا اور یہ کہا کہ پہلے اپنے لڑکے کے سرمہ ڈالو۔ چنانچہ اس نے اپنے لڑکے کو کھڑا کر کے تلوار میں سرمہ لگا کر پینترا بدلتے ہوئے صاف دونوں آنکھوں میں سرمہ ڈال دیا۔ خدا جانے کیا غضب کیا دونوں آنکھوں میں صاف سرمہ لگا گیا۔ اور آنکھوں پر کچھ ضرب نہ آئی۔

یہ تو ظاہر کمال ہے کہ حسی تلوار سے سرمہ لگا دیا۔ اور یہ حقیقی کمال ہے کہ باطنی تلوار سے سرمہ لگانے کی یہ صورت کی کہ دریا میں بچہ کو ڈلوا کر واپسی کا وعدہ کر کے ترساں و ہراساں نہ ہونے دیا۔

سو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے باطن میں بھی سرمہ لگا دینا۔ اسی کو فرماتے ہیں انار آ دوہ الیک جس سے اشتیاق کی تلوار کا پیدا ہونا معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی باوجود ایسی دھاردار تیز تلوار کے از جا رفتہ نہ ہوئیں۔ جیسے وہ لڑکا نہیں ہچکچایا اور سرمہ لگوالیا۔ اور ایسے وقت میں جب کہ شوق کا غلبہ ہو مستقل رہنا اور اس کا اخفا کرنا سخت مشکل ہے۔ مایوس ہو کر صبر کر لینا سہل ہوتا ہے مگر جب ملنے کی امید بھی وابستہ ہو جاوے ادھر اولاد کا تعلق بھی ہو اس وقت ضبط دشوار ہے مگر والدہ موسیٰ علیہ السلام کامل بشر تھیں۔ اس وقت بھی ضبط فرما گئیں۔ ناقص نہ تھیں کہ قلبی حالت ظاہر ہو جاتی۔ چنانچہ صندوق میں رکھ کر صندوق کو دریا میں چلتا کر دیا۔ اور جب سب کام پورا کر لیا تو آرام سے بیٹھ گئیں۔

کمال انسانی

آگے اسی مضمون کو فرماتے ہیں

وَاَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰى فٰرِغًا ط اِنۡ كَادَتۡ لَتُبۡدِىۡ بِهٖ لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّبَطۡنَا عَلٰى قَلۡبِهَا لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (پ ۲۰)

اور موسیٰ کی والدہ کا دل بے قرار ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ موسیٰ کا حال ظاہر کر دیتیں۔ اگر ہم اس کے قلب کو اس غرض سے مضبوط کئے رہیں کہ یہ یقین کئے رہیں۔

کسی ظاہر پرست کو اس پر یہ وسوسہ ہو سکتا ہے کہ اس میں والدہ موسیٰ کا کیا کمال ہوا۔ تمام اطلاعی امور وحی کے ذریعہ سے حق تعالیٰ نے القاء فرما دیئے اور حق تعالیٰ ہی کے مضبوط کرنے سے وہ حالاً مضبوط ہو گئیں پھر ان کا کیا کمال ہوا؟

جواب یہ ہے کہ بشر کے کمال کے تو معنی یہی ہیں کہ خدا کے مضبوط کرنے سے مضبوط ہو جاوے یعنی خدا تعالیٰ نے کامل کر دیا وہ کامل ہو گیا۔ بغیر مدد خداوندی انسان کوئی کام بھی نہیں کر سکتا۔ جب کمال انسانی کی حقیقت یہی ہے پھر موسیٰ کی والدہ کے کمال میں کیا شبہ رہا۔ بہر حال یہاں تک تو شان توکل کا غلبہ ظاہر ہوا۔ اس کے بعد تدبیر شروع کی گئی۔

وَقَالَتۡ لِاُخۡتِهٖ قُصِّيۡهِ (پ ۲۰)

انہوں نے موسیٰ کی بہن سے کہا کہ ان کا سراغ تو لگا۔ ۱۲

موسیٰ کی والدہ نے ان کی ہمشیرہ سے کہا کہ تلاش کرو کہ وہ صندوق کہاں گیا۔ وہ تلاش کے لئے نکلیں۔ دریا میں سے نہر کٹ کر فرعون کے محل کو گئی تھی۔ خدا کی قدرت نہر کو حکم ہوا کہ صندوق کو تو اپنے

اندر لے جا۔ دریا میں سے صندوق نہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب فرعون کے محل میں پہنچا فرعون نے نوکروں سے کہا کہ یہ صندوق جو سامنے سے بہہ رہا ہے پکڑو۔ چنانچہ صندوق فرعون کے سامنے لایا گیا۔ موسیٰؑ کی ہمشیرہ محل میں آتی جاتی تھیں۔ فرعون نے صندوق کھلوایا۔ اس میں موسیٰؑ کو دیکھا جو شان خداوندی یعنی محبت کے جوان میں حق تعالیٰ نے رکھی تھی آرام فرماتے تھے جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ (پ ۱۶)

اور میں نے تمہارے اوپر ایک اثر اپنی محبت کا ڈال دیا۔

جس کا یہ اثر تھا کہ جو شخص دیکھتا تھا عاشق و فریفتہ ہو جاتا تھا۔ اس وقت موسیٰؑ صندوق میں لیٹے ہوئے اپنے انگوٹھے کو چوس رہے تھے۔ انگوٹھے میں حق تعالیٰ نے وہ غذا پیدا فرمادی جو ماں کے پستان میں تھی اس لئے دودھ پئے ہوئے جس طرح بچہ خاموش پڑا رہتا ہے یوں ہی موسیٰؑ خاموش پڑے ہوئے تھے۔

فرعون دیکھتے ہوئے فریفتہ ہو گیا۔ مگر ظاہر داری کو بولا کہ کہیں یہ وہی بچہ نہ ہو جو میرا دشمن ہوگا۔

اس خطرہ میں بھی حق تعالیٰ نے حقیقت سے غافل نہیں رکھا بلکہ متنبہ کر دیا جو بڑی قدرت کی دلیل ہے کہ باوجود کھٹک کے ان پر قادر نہ ہو۔ جس کا ظاہری سامان یہ ہوا کہ فرعون کی بیوی نے کہا کہ باؤلے ہوئے ہو۔ اس درجہ کا بنیاسرائیل میں انتظام کر رکھا ہے کوئی بچہ زندہ نہ رہنے پائے تو وہ بنیاسرائیل والا بچہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نہ معلوم کہاں سے بہتا ہوا آرہا ہے۔ یہ بنیاسرئیل کے خاندان سے نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ان کے بچوں پر تو پولیس کا پہرہ ہے اس لئے وہم نہ کرو۔ ہمارے اولاد نہیں۔ اسکو بیٹا بناویں گے۔

فرعونؔ بھی بوجہ محبت مذکور کے یہی چاہتا تھا۔ بات سمجھ میں آگئی رضامند ہو گیا۔ حکم دیا کہ اچھا اس کے واسطے اناؤں کو بلاؤ کہ دودھ پلاویں چنانچہ انائیں بلائی گئیں۔ موسیٰؑ مچل گئے اور کسی کا دودھ نہیں پیا۔ محل کو سر پر اٹھالیا۔ موسیٰؑ کی ہمشیرہ چونکہ محل شاہی میں آمد و رفت تھی وہ موقع پا کر محل میں گئیں تو دیکھا کہ موسیٰؑ کسی کا دودھ نہیں پیتے۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ (پ ۲۰)

اور ہم نے پہلے ہی موسیٰؑ پر دودھ پلائیوں کی بندش کر رکھی تھی۔ ان کی ہمشیرہ بولیں کہ:

هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ (پ ۲۰)

''کیا میں تم لوگوں کو کسی ایسے گھرانے کا پتہ بتادوں جو تمہارے لئے اس بچہ کی پرورش کریں اور وہ اس کی خیر خواہی کریں۔''

یعنی کیا میں تم کو ایسا خاندان بتلا دوں جو اس بچہ کی کفالت کرلیں اور وہ خاندان اس کا خیر خواہ بھی ہو۔ فرعون بولا کہ وہ بچہ کے خیر خواہ کیوں ہیں اور ان سے انہیں کیا علاقہ۔ یہ گھبرائیں۔ مگر خدا تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوئی اور جواب ان کی سمجھ میں آ گیا کہ لہ کی ضمیر سرکار کی طرف ہے یعنی وہ لوگ سرکاری خیر خواہ ہیں۔ اچھا لہ میں لہو چٹا دیا۔ فرعون کو چکر میں لے لیا۔ انبیاء کے خاندان کے عالی دماغ اور ذکی ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔ فرعون سمجھا کہ یوں ہی ہوگا بولا کہ اچھا ان کو بلاؤ۔ یہ دوڑی دوڑی اپنی والدہ کے پاس آئیں۔ والدہ نے ان کو دیکھا۔ اول تو اس لحاظ سے کہ خبر لے کر آئی ہوں گی۔ ثانیاً چہرہ سے مسرت نمایاں تھی۔ اس لئے دیکھ کر والدہ کی جان میں جان آ گئی۔ انہوں نے سارا قصہ بیان کیا تو والدہ وہاں گئیں اور بچہ کو چھاتی سے لگایا تو موسیٰؑ فوراً دودھ پینے لگے۔ پھر تنخواہ کی بات چیت شروع ہوئی تو انہوں نے لمبی چوڑی تنخواہ کہی اور یہ کہا کہ بچہ کو بھی میں اپنے گھر رکھوں گی۔ میرا یہاں رہنا نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ فرعون نے اس شرط کو اس لئے منظور کرلیا کہ دیکھ لیا کسی اور کا دودھ نہیں پیتے۔ اگر وہ فرعون کے گھر رہنا منظور نہ کریں تو دودھ کا کچھ انتظام نہیں اور شرط منظور کر کے کہا کبھی کبھی ہمیں دکھلا جایا کرو۔

انہوں نے اپنے دل میں سوچا کہ اپنے گھر پر جی بھر کر بچہ کو دیکھوں گی تنخواہ کی تنخواہ ہوگئی۔ بچہ کا بچہ اپنے پاس آ گیا۔ اور عزت وحرمت الگ حاصل ہوگئی کہ بادشاہ کے گھر کا شاہزادہ آ گیا۔ یہ عجیب قدرت ہے سبحان اللہ ایسی صنعتیں ہیں حق تعالیٰ کی اب اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْکِ کا مضمون پورا واقع ہوگیا۔ موسیٰؑ کی ساری باتیں عجیب وغریب ہی ہوئیں۔ مجاہدہ وریاضت بھی عجیب ہوا کہ دریا میں ڈالے گئے۔ دشمن کے ہاتھ میں دیئے گئے مگر کوئی ضرر نہیں ہوا۔ نبوت بھی عجیب طرز سے ملی۔ سردی کا زمانہ تھا۔ مدین سے مصر کو اپنے گھر میں سے ساتھ لے کر آ رہے تھے کہ راستہ میں ان کو دردزہ شروع ہوگیا۔ اور موسیٰؑ آگ لینے کو چلے تا کہ حالت دردزہ میں حرارت سے آرام ملے۔ مگر وہ تو نور حق تھا۔ وہاں جا کر نبوت عطا ہوئی ہادی حق بنے۔

اسی طرح سے موت بھی عجیب وغریب طور سے آئی جس کا ابھی بیان کرتا ہوں۔ بنی اسرائیل کے ساتھ بھی آپ کے نئے نئے قصے اور معاملات ظہور میں آئے۔

حضرت موسیٰؑ اور عزرائیل

وہ موت کا واقعہ یہ ہوا کہ عزرائیلؑ آپ کے پاس قبض روح کے واسطے تشریف لائے آپ نے ان کے ایک طمانچہ مارا۔ بعض ملاحدہ نے اس قصہ سے انکار کیا ہے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ یہ لوگ انبیاء کے مراتب سے واقف نہیں موسیٰؑ کے طمانچہ سے عزرائیلؑ کی آنکھ پھوٹ گئی۔ تو عزرائیل حق تعالیٰ کے حضور میں پہنچے اور عرض کیا انہ لا یرید الموت کہ موسیٰؑ تو موت سے گریز کرتے ہیں اور انہوں نے مجھے اس طرح مارا۔

یہاں پر اشکال یہ ہے کہ کیا موسیٰؑ کو خدا کے حکم سے انکار تھا جواب یہ ہے کہ موسیٰؑ نے ان کو پہچانا نہیں کیونکہ اس وقت عزرائیلؑ بہ شکل بشر آئے تھے۔

انبیاء کا ادب یہی ہے کہ فرشتے ان کے پاس اپنی قاہرانہ صورت میں نہ آویں۔ بلکہ کسی بشر کی صورت میں آویں۔ اس لئے عزرائیلؑ بشر کی صورت میں آئے تھے۔ موسیٰؑ نے پہچانا نہیں اور ایک طمانچہ رسید کیا۔

اگر یہ شبہ کیا جاوے کہ فرشتوں میں تو بڑی قوت اور طاقت ہوتی ہے موسیٰؑ کے طمانچہ سے ان کی آنکھ کیسے پھوٹ گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ میں قوت زیادہ تھی۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ مسلم ہے کہ فرشتوں میں قوت زیادہ ہوتی ہے مگر اصل اور غالب یہ ہے کہ جس نوع کی صورت میں وہ آتے ہیں اس وقت اسی نوع کے برابر قوت ہوتی ہے۔ جب فرشتہ شکل بشر میں ہوگا تو اس وقت اس میں بشر سے زیادہ قوت نہ ہوگی۔ اسی طرح جنات بھی جس شکل میں ہوں گے اسی جیسی قوت ہوگی۔

ہمارے یہاں کا واقعہ ہے کہ ایک شخص مشرف خاں تھے وہ رات کو اپنے گھر میں دیر سے آتے تھے۔ دیوان خانہ کا قصہ ہے کہ ایک رات اس کے نیچے سڑک پر بہت دھما دھمی کی آواز ہوئی اور اس میں مشرف خاں نظر آئے۔ صبح کو لوگوں نے مشرف خاں سے دریافت کیا کہ میاں رات کیسی آواز تھی۔ انہوں نے بیان کیا کہ میاں رات کو میں دیر میں آیا کرتا تھا۔ دو ایک روز ہوئے مجھے ایک جن ملا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ سویرے آجایا کرو۔ رات کو دیر کر کے آنے میں ہمیں تکلیف ہوتی ہے کیونکہ اس وقت ہم باہر نکلتے ہیں میں نے کہنا نہیں مانا۔ رات وہ پھر مل گیا۔ اس نے مجھے جانے نہ دیا میری اور اس کی خوب کشتی ہوئی۔ میں نے اسے پچھاڑ لیا۔

غرض جن بھی جس کی شکل میں ہوگا اسی جیسی طاقت ہوتی ہے۔ مثلاً سانپ کی شکل میں ہو تو سانپ سی طاقت ہوگی۔ اور کتے کی شکل میں ہو تو کتے کی سی طاقت ہوگی۔

کتے پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شخص بیان کرتے تھے کہ ہم اور ہمارے ایک رفیق سرائے میں کھانا کھا رہے تھے کہ ایک کتا سامنے سے آگیا تو وہ رفیق صاحب اسے جھک کر سلام کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ کیا واہیات حرکت تھی۔ کہنے لگا کہ ہم نے سنا ہے کہ جن اکثر کتے کی شکل میں

آتا ہے۔تو شاید یہ جن ہو اور جنوں کا بادشاہ ہو اور ہمیں خوش ہو کر روپیہ دے جاوے۔ حالانکہ اہل فن کے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ بادشاہ کتے کی شکل میں نہیں آتا۔اس قسم کی شکلوں میں غریب جن ہوتے ہیں۔اس لئے یہ امید بھی غلط نکلی۔بادشاہ تو پاکیزہ جانوروں کی شکل میں آتے ہیں۔

غرض موسیٰ علیہ السلام نے عزرائیل کو بشر کی صورت میں دیکھ کر طمانچہ مارا اور پہچانا نہیں۔دوبارہ پھر عزرائیل بھیجے گئے اور آ کر انہوں نے حق تعالیٰ کا پیام پہنچایا اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو کسی بیل کی پشت پر ہاتھ رکھ دو جتنے بال ہاتھ کے نیچے آ جائیں گے اتنے ہی سال کا عمر میں اضافہ ہو جائے گا۔موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا پھر کیا ہوگا۔جواب ملا کہ پھر موت آوے گی فرمایا کہ پھر میں ابھی چلتا ہوں۔اب موسیٰ علیہ السلام راضی ہو گئے۔

غرض وفات بھی عجیب و غریب طریقہ سے ہوئی اور وادی تیہ میں وفات ہوئی۔موسیٰ کی تمنا یہ تھی کہ بیت المقدس میں مدفون ہوں جہاں پر اور انبیاء کی قبریں ہیں تو خدا کے حکم سے زمین کی طنابیں کھنچ گئیں اور نعش بیت المقدس میں پہنچ گئی۔

قصہ الکلیم والحنیف

غرض موسیٰ کے قصے سب ہی عجیب و غریب ہیں۔اسی غرابت کی وجہ سے ان کے واقعات قرآن پاک میں جابجا مذکور ہیں۔

تفسیر بیان القرآن لکھتے وقت اتفاقاً خیال ہوا کہ ان واقعات کو یکجا جمع کر کے ان کو مرتب کر دیا جاوے ورنہ تفسیر کے وقت ان واقعات کا مرتب سمجھنا دشوار ہوگا اور تفسیر میں دشواری ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مجھے قرآن پاک حفظ ہے اس لئے ایک جگہ ان سب آیات کا جمع ہونا سہل ہو گیا۔پس آیات کو ایک جگہ جمع کر کے پھر ان میں غور کر کے ترتیب دے دی تاکہ قرآن کی تفسیر میں سہولت رہے پھر جی میں آیا کہ ان آیات کا ترجمہ کر کے اس کا ایک مجموعہ تیار کیا جاوے تاکہ بجائے ناولوں کے اس کا دیکھنا مفید ہو۔اور تفسیر میں چونکہ یہ مضامین مختلف جگہ ہیں۔اس لئے متفرق مقامات سے ان کو مرتب کرنا عوام پر سخت دشوار ہوتا۔لہٰذا یہ مجموعہ مستقل مرتب کر کے شائع کر دیا گیا۔مگر وہ محض تفسیر سے تیار کیا گیا ہے۔سیر کی روایات اس میں بالکل نہیں ہیں اور اس مجموعہ کے ساتھ ایک اور قصہ ابراہیمؑ کا بھی اضافہ کیا گیا کہ وہ بھی بعض وجوہ سے عجیب و غریب اور قرآن مجید میں کثیر الدور قصہ تھا اور اس سارے مجموعہ کا نام الترتیب اللطیف فی قصہ الکلیم و الحنیف رکھا گیا۔یہ اطلاع تفریح کے لئے کر دی گئی۔یہاں تک تو آیت کا ترجمہ مقصود تھا۔

خوف وحزن کا فرق

اب صبر کا مضمون جو پہلی بار کے بیان میں زیادہ مقصود تھا وہ ان دو جملوں سے یعنی لا تخافی اور لا تحزنی سے مستنبط ہوتا ہے یعنی والدہ موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد ہوا کہ

فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ (پ ۲۰)

یعنی جب تم کو یہ اندیشہ ہو کہ موسیٰ دشمن کے ہاتھ آ جاویں گے اور وہ ان کو قتل کر دے گا تو ایسے وقت میں ان کو دریا میں ڈال دینا اور نہ اندیشہ کرنا نہ غمگین ہونا یعنی ضبط کرنا اور صبر سے کام لینا۔

ایسے موقع پر دو چیزوں کا احتمال ہوسکتا تھا یعنی خوف کا اور حزن کا۔ حق تعالیٰ نے ان دو جملوں میں دونوں احتمالوں کو دفع فرمادیا۔ اور خوف وحزن میں فرق یہ ہے کہ خوف کہتے ہیں اس کو کہ کسی آنے والے مضر واقعہ کا احتمال ہو اور حزن کہتے ہیں اس کو کسی گزشتہ نا ملائم واقعہ پر ناگواری اور افسوس ہو۔

یہاں واقعہ گزشتہ تو یہ تھا کہ ہائے میں نے بچہ کو اپنے ہاتھوں دریا میں ڈال دیا۔ اس کو یاد کر کے حزن ہوسکتا تھا اور واقعہ آئندہ کا خوف یہ تھا کہ دیکھئے کس کے ہاتھ آوے اور وہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے۔ غرض یہاں دو چیزوں کا احتمال تھا۔ حق تعالیٰ نے دونوں کے متعلق فرمایا کہ تم نہ تو دریا میں ڈال کر اپنے فعل پر پچھتانا اور نہ ڈالنے کے بعد آئندہ کا اندیشہ کرنا۔ دونوں باتوں سے دور رہنا اور ایسے وقت ضبط اور صبر سے کام لینا۔

ضبط نفس کی تعلیم

صاحبو! اس موقع پر صبر کرنا صبر علی الموت سے بھی اشد ہے کیونکہ موت تو ایسا واقع ہے جہاں صرف حزن ہی ہوتا ہے اور خوف نہیں ہوتا اور یہاں پر دونوں جمع ہیں خوف بھی حزن بھی۔

غرض اکثر واقعات یا موجب حزن ہوتے ہیں یا موجب خوف اور یہ واقعہ خوف اور حزن دونوں کو متضمن ہے اس لیے ایسے واقعہ پر صبر سخت مشکل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ایسا واقعہ شدیدہ پیش آنا اور پھر عورت ہو کر اس قدر صبر کرنا تعجب خیز امر ہے۔ ایسے وقت میں مردوں کے بھی قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور صبر کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور چونکہ جب یہ دونوں امر مجتمع ہوں یعنی خوف بھی ہو حزن بھی ہو پھر عورت کا جگر۔ اس کا تحمل کرنا اور اصلاً دوسری طرف جنبش نہ کرنا عجیب بات تھی۔ اس لیے حق تعالیٰ نے تسلی کے لیے

اس موقع کے مناسب نہایت حکیمانہ مضمون ارشاد فرمایا کہ ہر ہر پہلو سے پوری تسلی فرمادی۔

آدمی کے طبائع اور جذبات اولاد کے متعلق مختلف ہوتے ہیں یہاں سب کی پوری رعایت ہے۔ اس لئے صبر کی تعلیم کے لئے واللہ یہ مضمون کافی ہے۔ کوئی عقلمند آدمی بھی ایسا نہ ہوگا کہ اس قسم کی حکیمانہ تسلی سن کر رنجیدہ رہے۔ بلکہ یہ سن کر کہ بچہ سے پھر ملنا ہوگا۔ قلب سے ملال بالکل رفع ہوکر کلیجہ میں ٹھنڈک پڑ جاویگی چنانچہ موسیٰؑ کی والدہ کے قلب میں جو وساوس پیدا ہوئے سب کو علماً و عملاً دونوں طرح رفع فرما کر مضمون کو کامل کردیا چنانچہ اول

اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْکِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ

(ہم ان کو تمہارے پاس واپس پہنچادیں گے اور اپنے وقت پر رسول بنادیں گے)

سے عقلی لم بیان فرمائی کہ تم غمگین نہ ہونا کیونکہ ہم ان کو تمہارے پاس واپس لاویں گے یعنی موسیٰ اس وقت دریا میں بھی ہلاک نہ ہونگے جو باعث غم ہو۔ اور آئندہ بھی ہلاک نہ ہوں گے جو باعث خوف ہو۔ بلکہ ان کی عمر اتنی دراز کریں گے کہ چالیس سال کے بعد ان کو رسولوں میں سے بناویں گے۔

غرض مصیبت کے وقت یہی دو باتیں پیش آتی ہیں خوف اور حزن۔ یہی دو امر اکثر واقع ہوتے ہیں مثلاً بیٹے کا مرجانا۔ اس وقت ایک تو اپنے اعتبار سے رنج ہوتا ہے کہ ہائے ہم سے جدا ہوگیا۔ اور ایک اس کے اعتبار سے رنج ہوتا ہے کہ ہائے وہ ہمارے پاس کھاتا پیتا تھا۔ اب ان باتوں سے روک دیا گیا۔ اب کی مرتبہ آم سے محروم رہا۔ اور آئندہ کے لئے اپنے اعتبار سے اندیشہ ہوتا ہے کہ دیکھئے اس کی مفارقت میں ہمارا کیا حشر ہو۔ تو حق تعالیٰ حزن و خوف دونوں کو اس جگہ رفع فرماتے ہیں کہ ہم موسیٰ کو تمہارے پاس واپس لاویں گے اور ان کو پیغمبر بناویں گے۔ تو آئندہ ہلاک بھی نہ ہونے دیں گے۔ عمر دراز ہوگی اس سے خوف کو رفع فرمادیا۔ نیز تم سے پھر ملیں گے لہٰذا یہ غم بھی نہ کرنا کہ میری آنکھوں سے غائب ہوگئے۔

غرض آیت لَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ سے دونوں قسم کے واقعوں پر ضبط نفس کی تعلیم معلوم ہوگئی جس کا نام صبر ہے تو اعد شرعیہ کس قدر جامع مانع ہیں کہ دونوں قسم کے اثر کا ازالہ فرمادیا۔

اسی قسم کے مضمون کو ایک بدوی نے حضرت عباسؓ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا کی وفات کے وقت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے بیان کیا تھا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عباسؓ کا جو کچھ غم تھا اس پر کسی کے قول سے اتنی تسلی نہیں ہوئی جتنی ایک گنوار آدمی کے قول سے مجھے تسلی ہوئی وہ مضمون تسلی بخش یہ تھا

اصبر نکن بک صابرین فانما　　　صبر الرعیة بعد صبر الراس

یعنی آپ صبر کیجئے ہم بھی آپ کی وجہ سے صبر کریں گے کیونکہ کہ چھوٹوں کا صبر بڑوں کے صبر کے بعد ہوتا ہے۔ آپ بڑے ہیں پہلے آپ صبر کیجئے۔

خیر من العباس اجرک بعده　　　واللہ خیر منک للعباس

یعنی اس واقعہ میں نہ تمہارا کچھ نقصان ہوا بلکہ نفع ہی ہے اور وہ نفع یہ ہے کہ تم کو ثواب ملا اور ثواب تمہارے لئے حضرت عباس سے بہتر ہے اور نہ حضرت عباس کا کچھ نقصان ہوا۔ اس لئے کہ وہ خدا تعالیٰ سے مل گئے اور اللہ تعالیٰ عباس کے لئے تم سے بہتر ہیں۔

یعنی تمہارے رہنے سے ان کا اللہ کے پاس رہنا زیادہ بہتر ہے تو کسی کا بھی نقصان اور گھاٹا نہ ہوا۔ دونوں نفع میں رہے پھر غم کیسا۔ عجیب مضمون بیان کیا۔ ایک اعرابی (بدوی) ایسا مضمون بیان کرے تعجب خیز امر ہے نہ علم نہ صحبت پھر ایسا مضمون۔

بدوؤں کی حالت

بدوؤں کی تو اکثر یہ حالت تھی کہ علم ان کے پاس کو نہیں گزرا تھا۔ چنانچہ نماز میں ایک بدوی شریک ہوا۔ امام نے یہ آیت پڑھی۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ (پ ۱۱)

دیہاتی لوگ کفر و نفاق میں بہت ہی سخت ہیں اور ان کو ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ ان کو احکام کا علم نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں جس میں بعض بدوؤں کی مذمت تھی۔ آپ بہت خفا ہوئے اور بگڑے جب دوسری آیت پڑھی۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (پ ۱۱)

اور بعضے دیہاتی ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔

جس میں بعض بدوؤں کی تعریف تھی جب ذرا خوش ہوئے کہ خیر تعریف بھی کردی۔ اسی طرح ایک بدوی نے چوری کی اور چوری کر کے روپیہ داہنے ہاتھ میں لے کر نماز کی نیت ایک امام کے پیچھے باندھ لی۔ اتفاق سے اس کا نام موسیٰ تھا اور جہری نماز تھی امام نے پڑھا۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى یعنی اے موسیٰ تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے

تو آپ فوراً کہتے ہیں۔ قاتلک اللہ ما اسحرک تجھے خدا غارت کرے تو کتنا بڑا جادوگر ہے بدوی تو اب بھی اکثر ایسے جاہل اور ناواقف ہوتے ہیں کہ پانی موجود اور تیمم کر کے نماز پڑھ لی۔ امام کے آگے کھڑے ہوگئے اور اقتدا کرلیا یہ حالت ہے۔ بدووں کی۔

ایک مولوی صاحب مکی بیان کرتے تھے کہ ایک بدوی حراج (منڈی) میں اپنے کام کو بکثرت آتا تھا۔ ایک دفعہ وہ سوال کرتا ہے کہ لوگ چہار طرف سے مکہ میں کیوں آتے ہیں مکہ میں کیا بات ہے۔ اسکو یہ خبر نہ تھی کہ یہاں بیت اللہ کوئی چیز ہے مگر باوجود ان امور کے اور اس قدر جہالت کے ان کا دل بے حد صاف ہے کچھ غل وغش نہیں۔

چنانچہ وہی مولوی صاحب مدینہ طیبہ کی حکایت بیان کرتے تھے کہ ایک بدوی مدینہ طیبہ میں آیا اور روضہ اقدس پر آ کر کھڑا ہو کر کہتا ہے یا محمد یا محمد۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کو امت پر بہت شفقت کی نظر ہے اور آپ پیغمبر ہیں۔ اگر یہ بات سچی ہے تو میرے گاؤں میں بارش نہیں ہوتی اور قحط ہو رہا ہے دعا کیجئے! اگر میرے گاؤں میں بارش ہو جائے تو میں ایک مشکیزہ گھی کا آپ کو دوں گا۔ خادموں نے اس کی یہ گستاخانہ گفتگو سن کر اسکو ڈانٹا۔ وہ وہاں سے باہر کو بھاگا۔ تو گاؤں کی سمت کو کیا دیکھتا ہے کہ بادل گھرا ہوا ہے، بارش ہو رہی ہے۔ فوراً ایک مشکیزہ گھی کا خریدا اور پھر روضہ شریف پر یہ کہتا ہوا حاضر ہوا کہ آپ بالکل سچے ہیں اور وہ مشکیزہ گھی سے بھرا ہوا لے کر روضہ مبارک پر کھڑا ہو گیا اور موقع دیکھتا رہا جب خادموں کی نظر بچی فوراً مشکیزہ کا دھانہ کھول کر جالی شریف میں ڈال نکل کر بھاگ گیا۔

اس وقت اتفاق سے ایک سالک فقیر بھی مسجد نبوی میں موجود تھا۔ جو ایک مدت سے مزار پر پڑا ہوا تھا۔ اور اس کا کوئی باطنی مقام اٹکا ہوا تھا جو حل نہ ہوتا تھا۔ وہ اس بدوی کی گفتگو سن رہا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے بارش کا واقعہ دیکھ رہا تھا۔ یہ قصہ دیکھ کر خفا ہو گیا۔ اور گستاخانہ بکنے لگا کہ آپ کو بھی حمیت قومی کا خیال ہوا۔ آخر تو یہ بدوی عرب تھا۔ اس لئے اس کی درخواست پر کیسی توجہ کی اور ہم اتنے دنوں سے محروم ہیں۔ نعوذ باللہ!

غرض وہ بدوی گو مخلص تھا مگر تھا تو جاہل۔ اور ایک بدوی یہ تھے کہ ابن عباسؓ کو نصیحت کی تھی۔ اور تسلی دی تھی جو اس آیت سے ماخوذ تھی۔ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَاللّٰهِ بَاقٍ (پ ۱۴)

"اور تمہارے پاس جس قدر چیزیں ہیں فنا ہونے والی ہیں اور خدا تعالیٰ کے پاس جس قدر چیزیں ہیں۔ باقی رہنے والی ہیں۔" اور ایک ہم پڑھے لکھے لوگ ہیں کہ ہم کو یہ باتیں سوچ کر بھی تسلی نہیں ہوتی۔

مومن اور دوزخ

غرض! اعزہ واقربا کی موت سے ہمیں اجر ملے گا اور مردہ کو خدا کا قرب میسر ہوگا اور دونوں کا انحصار تسلی بخش یہ چیز ہے۔ اگر یہ شبہ کیا جاوے کہ مردہ کو قرب خدا کا ملنا جب ہے کہ یہ یقیناً معلوم ہو کہ مردہ مرحوم و مغفور تھا اور جب یہ معلوم نہیں تو عذاب کا بھی احتمال ہے۔ اس صورت میں تو دنیا ہی میں رہنا بہتر ہے۔ پھر اس استحضار کی گنجائش کہاں رہی؟

تو جواب یہ ہے کہ یہاں ذکر مومنین کا ہے اور مومن اگر فاسق بھی ہو تو آخرت اس کے واسطے دنیا سے ہر حال میں اچھی ہے۔ اس لئے کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے دو شخص ہوں۔ ایک تو باغ میں اور عیش میں ہو اور دوسرا تکلیف اور زحمت میں ہو۔ مگر جو عیش میں ہے وہ دو گھنٹہ کے بعد تکلیف میں پڑنے والا ہے اور اس کو معلوم بھی کرا دیا ہے۔ مثلاً پھانسی پر چڑھنے والا ہے اور تکلیف اس کے واسطے ہمیشہ کے لئے مقدر اور مقرر ہے تو اس وقت کا عیش بھی اس کے لئے عیش نہیں بلکہ اس سوچ اور اندیشہ کی وجہ سے کہ گھنٹہ کے بعد کیا ہوگا۔ اس عیش کی راحت اور چین اسے معلوم بھی نہیں ہوگی۔ کہ اس میں کیا راحت اور چین ہے اور جو شخص تکلیف میں ہے مگر دو گھنٹہ کے بعد آرام میں جانیوالا ہے اور اس کو بھی معلوم کرا دیا گیا ہے۔ اسے وہ تکلیف نہیں معلوم ہوگی۔ بلکہ بعد کی راحت کی خوشی میں وہ تکلیف کو کچھ بھی نہ سمجھے گا۔

غرض جس عیش کے فوت کا اندیشہ ہو وہ عیش عیش نہیں اور ایسے ہی جس مصیبت کے ختم ہونے کی امید ہو وہ مصیبت مصیبت نہیں۔ پس ایمان کے ساتھ اگر مومنین دوزخ میں بھی ہوں تب بھی وہ مصیبت مصیبت نہیں کیونکہ وہ ختم ہونے والی ہے۔ اس لئے اس کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ تکلیف میں ہے بلکہ یہی کہیں گے کہ راحت میں ہے۔ وجہ یہ کہ مومن دوزخی واقع میں دوزخی نہیں۔ بلکہ وہ جنتی ہے اور اس وقت زبان حال سے وہ یہ کہہ رہا ہے

اگرچہ دور افتادم بایں امید خورسندم کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

''اگرچہ میں دور ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا ہاتھ میرا محبوب پھر پکڑے۔''

اس کو یہ امید ہر وقت رہے گی کہ اب بھی ہاتھ پکڑ لیں۔ اب دوزخ سے نکال لیں گے۔ بر خلاف کافر کے کہ وہ ابدالآباد کے لیے جہنمی ہوگا اور کوئی اس قسم کا دقیقہ بھی باقی نہ رکھا جاوے گا جس کی وجہ سے وہ امید کر سکے۔

اس گفتگو پر کسی قسم کا شک وشبہ نہ کیا جاوے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مومن دوزخی بھی اچھے حال میں ہوگا۔ اور نیز یہ شبہ بھی نہ کیا جاوے کہ اس قسم کے مضامین کا اظہار بیان میں بھی مناسب نہیں۔

جواب یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان باتوں کو خود بیان فرمایا ہے تو ہمیں کوئی منصب اخفا کا نہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جس کو مسلم نے روایت کیا ہے کہ اہل ایمان کو دوزخ میں ایک قسم کی موت آجاویگی یعنی نیند کی سی کیفیت طاری ہوگی جس سے ادراک الم کا کافر کے برابر نہ ہوگا۔ اور حضرت حق جل وعلا شانہ کافروں کے حق میں فرماتے ہیں لا یزکیھم اور وعید میں مفہوم مخالف معتبر ہوتا ہے تو اس سے صاف لازم آ گیا کہ مومنین کا تزکیہ کیا جاوے گا۔ پس تعذیب ان کے حق میں تہذیب ہوگی۔ اور دوزخ ان کے لئے بمنزلہ حمام کے ہوگا۔

جیسے کوئی آدمی کسی حکم سے ملنے کو جاتا ہے تو سفر کا جو کچھ میل کچیل ہوتا ہے اس سے پاک صاف ہو کر نہا دھو کر غسل کر کے اس کو جانا چاہیئے اگر کوئی ایسا نہ کرے اور شاہی انتظام سے اس کو حمام کرا دیا جائے تو وہ عنایت ہے کہ اس کو حاضری دربار کے لائق بنا دیا گیا۔ اسی طرح مومنین میں جو کچھ میل کچیل ہوگا جو مانع ہے دخول جنت اور لقاء رب سے۔ اسکو حق تعالیٰ دوزخ میں داخل فرما کر صاف فرماویں گے۔ گو یہ شخص اپنے لئے اس کو تجویز کرے پس یہ حالت اس کی ایسی ہوگی

طفل مے لرزد زنیش احتجام ‌ ‌ ‌ ‌ مادر مشفق ازاں غم شاد کام

"بچہ خون نکالنے والے کے نشتر سے لرز اٹھتا ہے اور شفیق ماں خوش ہوتی ہے۔"

دوزخ کا حمام

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک راجہ کے لڑکی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی سے اس کا عقد کرے مگر کسی کو اپنا کفو نہ سمجھتا تھا۔ اتفاق سے ہوا بگولہ میں ایک چمار کا لڑکا اڑ کر اس کی چھت پر آ پڑا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ غیبی لڑکا ہے جو کہ عقد کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اور واقع میں تھا وہ غیبی۔ ان لوگوں نے اس کا سامان شروع کیا۔ اور حمام میں نہلانے کو لے گئے۔ گرم پانی سے نہلانا چاہا۔ وہ بہت چلایا بہت کچھ بہلایا کسی طرح بہلتا ہی نہ تھا۔ جواہرات سامنے لائے گئے تو آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس کو عمدہ کپڑے پہنائے گئے اور زیادہ چلایا پھر لڑکی کو زیورات وغیرہ پہنا کے سامنے لایا گیا تا کہ اس کے حسن وجمال سے مانوس ہو تب تو بہت ہی پریشان ہوا۔

آخر یہ رائے ہوئی۔ یہ غیبی مخلوق ہے ناسوت سے مانوس نہیں۔ چند روز کے لئے اس کو آزاد

چھوڑ دیا جائے۔ آخر ایسا ہی کیا گیا۔ مگر اس کی کسی طرح کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اتفاق سے اس کا دروازہ کی طرف جانا ہو گیا۔ نکل کر بھاگا۔ گھر پہنچ کر ماں سے مل کر بہت رویا کہ اے اماں! تجھے خبر بھی ہے کہ میرے ساتھ کیا کیا سلوک ہوا۔ میرے اوپر تپتا پانی ڈالا کہ میں مر جاؤں جب بھی میں نہ مرا میا۔ پھر میرے سامنے کفن لایا گیا جب بھی میں نہ مرامیا۔ پھر جلتی جلتی آگ سامنے لائے جب بھی میں نہ مرامیا۔ پھر ایک ڈائن کو میرے سامنے لائے کہ وہ مجھ کو کھا جائے جب بھی میں نہ مرامیا۔

تو جیسے یہ لڑکا حمام کو بلا سمجھا ایسی ہی ہماری حالت ہے کہ ہم بھی دوزخ کے حمام سے گھبراتے ہیں۔ صاحبو! دنیا کی مثال بھی حمام کی ہے۔ جس میں مومن کو مجاہدات و ریاضت سے صاف ہونے کا حکم ہے۔ تو جو شخص یہاں کے حمام میں طاعات اور بلیات پر صبر کر کے اپنے کو پاک صاف کر کے نہ گیا وہ دوزخ کے حمام میں ڈال کر پاک صاف کیا جائے گا۔ تاکہ لقاء خداوندی کے قابل ہو۔

کفار سے اسی کو منفی فرمانے کے لئے ارشاد فرمایا ہے ولا یزکیھم یہ کفار کے حق میں ہے کہ حق تعالیٰ کفار کو پاک صاف نہ کریں گے۔ اس سے مفہوم ہوا کہ مسلمانوں کو پاک صاف کریں گے اور ان کو دوزخ میں پاک صاف کرنے ہی کو لے جاویں گے۔ پس دوزخ حمام اعظم ہے بقدر میل کچیل کے وہاں رہنا ہوگا۔ دوزخ میں لے جا کر میل کچیل اتاریں گے غسل دیں گے مگر چونکہ آخر آگ ہے۔ اس لئے مومنین کو بھی (باوجود یکہ مقصود وہاں رہنا نہ ہوگا۔ صرف صفائی کے لئے جانا ہوگا)۔ اس حمام کی تکلیف کا تحمل نہ ہو سکے گا۔ اس تکلیف کو برداشت نہ کر سکیں گے۔ اس لئے یہ مضمون سن کر کسی کو جرأت کی گنجائش نہ ہوگی۔ لیکن ہر حال میں مومن کا دوزخ میں رہنا عذاب کے ساتھ بھی یہاں کے عیش و آرام سے اچھا ہے۔

اب وہ شبہ جاتا رہا کہ آخرت میں جانا اسی کے واسطے بہتر ہے جسے دوزخ میں جانے کا خوف نہ ہو کیونکہ اوپر ثابت کر دیا گیا کہ مومن ہر حال میں یہاں کی حالت سے وہاں آرام ہی میں ہوں گے کیونکہ وہ ایک دن جنت میں واپس ہونے والے ہیں اور ان کو معلوم بھی کرا دیا جاوے گا۔ پس جس مفارقت کے بعد وصال کی امید ہو۔ وہ بحکم وصال ہی ہے۔

موت سے تعلیم

اس مضمون کو اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ سے بھی بطریق قیاس صحیح ثابت کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں بھی واپسی ہی سے تسلی کی گئی تھی کہ ہم موسیٰ کو پھر تمہارے پاس لوٹا دیں گے۔ تاکہ تم پھر مل لو اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا کر اطمینان قلبی حاصل کر لو۔ اس وجہ سے حزن نہ کرو۔ یہی علت دونوں جگہ مشترک ہے اور

یہی تسلی کی وجہ واقعہ غم میں ہمارے لئے بھی ہوسکتی ہے کہ مردہ گو ہمارے پاس دنیا میں واپس نہ ہوگا۔ لیکن جب ہم جاویں گے اور اس سے ملیں گے تو یہ بھی واپسی ہی کے حکم میں ہے کیونکہ مقصود جو کہ ملاقات ہے وہ اس صورت میں بھی بدرجہ اتم حاصل ہے کیونکہ اس ملاقات کے بعد پھر مفارقت کا اندیشہ ہی نہیں۔ اس لئے ہمیں بھی حزن زیبا نہیں کیونکہ سب کا اجتماع خدا کے یہاں ہوگا۔

چنانچہ حق تعالیٰ اسی کو دوسرے الفاظ میں فرماتے ہیں۔ انا الیہ رٰجعون (ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں) کہ ہم سب یعنی مردہ اور اس کے سب متعلقین ان ہی کے پاس جانے والے ہیں۔ وہاں سب مل لیں گے اسی لئے کسی عزیز کی موت کے وقت ہمیں اس کی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کے مضمون کو سوچا کریں۔ خدا تعالیٰ کے یہاں سب کا اجتماع ہوگا۔ اور سب آپس میں ہمیشہ کے لئے ملتے جلتے رہیں گے۔ آخرت تو کسی قدر شاید دور بھی سمجھی جاوے۔

روایات سے تو معلوم ہوتا کہ مرنے کے ساتھ ہی سب مل جل لیتے ہیں چنانچہ حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ جب کوئی مر کر یہاں عالم ارواح میں پہنچتا ہے تو روحیں بہت خوش ہوتی ہیں جیسے کوئی عزیز سفر سے آتا ہے اور اس سے مل کر ہم خوش ہوتے ہیں سب کی خیریت دریافت کرتی ہیں کہ ہمارا بھائی اچھا ہے۔ فلاں شخص اچھا ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص کو دریافت کرتی ہیں کہ وہ اچھا ہے یہ مردہ جواب دیتا ہے کہ وہ تو مر گیا۔ تو وہ کہتی ہیں کہ وہ شاید دوزخ میں گیا ہوگا۔ وہ یہاں نہیں آیا۔ پھر کہتی ہیں کہ بھائی یہ تھکا ماندہ آیا ہے۔ اسے آرام لینے دو۔ پھر پوچھ پاچھ لینا پس جب مردہ سے ایک دن ہم کو ملنا نصیب ہوگا۔ تو یہ مفارقت محض عارضی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص حیدرآباد جا کر ملازم ہو جاوے تو اس کی جدائی پر جب کہ وہ حیدرآباد میں یہاں سے زیادہ آرام میں ہو کون اس قدر روتا اور رنج کرتا ہے بلکہ تمنائیں کرتے ہیں کہ وہ حیدرآباد ہی میں ملازم رہے۔ باقی ہم کسی نہ کسی دن مل لیں گے۔ اس استحضار میں عارفین کی یہی شان ہے۔

ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک شخص روتا ہوا آیا۔ اور عرض کیا کہ میری بیوی مر رہی ہے۔ دعا کیجئے کہ تندرست ہو جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ افسوس ایک شخص جیل خانہ سے چھوٹتا ہے اور دوسرا روتا ہے اور فرمایا کہ تم بھی اسی طرح چھوٹ جاؤ گے۔ پھر وہ بولا کہ حضرت میری روٹی کون پکائے گا۔ ارشاد فرمایا کہ ہاں بھائی جب تم ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے وہ بھی تمہارے ساتھ روٹی پکاتی ہوئی آئی تھی۔ حضرت نے یہ باتیں اس طرح فرمائیں کہ جیسے یہ مشاہدہ و استحضار حضرت

کا حال ہو۔ پھر وہ شخص کہنے لگا کہ حضرت ایک شخص مجھے مدینہ طیبہ ہمراہ لے چلنے کو کہتا تھا۔ اب انکار کرتا ہے۔ دعا کیجئے کہ وہ مدینہ طیبہ لے چلے حضرت خفا ہو گئے کہ ہم سے ایسی شرک کی باتیں نہ کرو۔

ظاہر بینوں کے نزدیک تو یہ بات بگڑنے کی نہ تھی۔ مگر جس نے سوئی دیکھی ہو کہ پتلی پتلی چمکتی چمکتی ہے مگر اس کی نوک نہ دیکھی ہو اسے کیا خبر۔ وہ تو سوئی کو یہ سمجھے گا کہ یہ خوب صورت تنکا ہے۔ مگر جس کو نوک کا بھی احساس اور ادراک ہو۔ وہ واقعی اسے معمولی چیز نہ سمجھے۔ اس لئے اس واقعہ میں ہمارے نزدیک بگڑنے کی کچھ بھی بات نہیں۔ مگر عارفین کو جن باتوں سے شرک کی بو آتی ہے۔ جیسے اس میں غیر اللہ پر نظر ہونے کا حضرت کو احساس ہوا۔ وہ تو ان کی نشتر سے بھی زیادہ ایذا وہ سمجھیں گے۔ دوسروں کو احساس نہ ہو۔

عتاب الٰہی

ایک ایسا ہی اور قصہ ہے کہ ایک مرتبہ بارش ہونے پر ایک بزرگ کے منہ سے نکل گیا کہ بڑے موقع پر بارش ہوئی۔ اسی وقت عتاب ہوا کہ او بدتمیز بے موقع بارش کب ہوئی تھی جو آج کی بارش کو بے موقع کی کہتا ہے۔

واقع میں وہ خلاف مصلحت کب کرتے ہیں۔ اللہ میاں تو حکیم ہیں ان کا کوئی فعل خلاف حکمت نہیں ہوتا۔ دیکھئے ظاہر میں یہ بات معمولی تھی۔ مگر سخت گرفت ہوئی۔ اسی طرح عارفین بھی بعض دفعہ طالبین پر معمولی بات پر عتاب کرتے ہیں کیونکہ واقعہ میں وہ معمولی نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ کے یہاں بھی جو باتیں ہمارے نزدیک ذراسی اور چھوٹی ہیں اور ہم ان کو خفیف سمجھتے ہیں بعض اوقات ان پر پکڑ ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ واقع میں بڑی باتیں ہیں۔

ایک عالم شخص کا قصہ میں نے اپنے ابتدائی کتابوں کے استاد سے سنا تھا۔ وہ بواسطہ شیخ دہان مکی کے نقل فرماتے تھے کہ ان کا مکہ میں انتقال ہوا۔ کسی ضرورت سے قبر کھولی گئی تو دیکھا کہ قبر میں اس کی صورت مسخ ہو گئی۔ اس کی بیوی سے دریافت کیا کہ یہ ایسا کیا عمل کرتا تھا۔ معلوم ہوا کہ بیوی سے مشغولی کے وقت نہاتا ہوا گھبراتا تھا۔ اور اس مسئلہ پر عیسوی مذہب کی مدح کرتا تھا کہ ان کے یہاں غسل جنابت فرض نہیں۔ تو ممکن ہے کہ کسی کی ظاہری نظر میں یہ ذراسی بات ہو۔ مگر فی الواقع ایسی ذراسی بات ہے جیسی شیطان کی ذراسی بات تھی کہ

ءَ اَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا (پ ۱۵)

کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں جس کو آپ نے مٹی سے بنایا۔

اور اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (پ ۸)

''میں آدمؑ سے بہتر ہوں مجھے تو آپ نے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔''

مطلب یہ ہے کہ آپ نے مجھے آگ سے پیدا فرمایا اور آدمؑ کو مٹی سے۔ اور ظاہر ہے کہ آگ افضل[۱] ہے مٹی سے اور افضل کے سامنے مفضول کو سجدہ کرنا چاہیے نہ کہ افضل کو۔

دیکھئے بعض کے نزدیک تو یہ بھی ذرا ہی سی بات تھی جو شیطان نے کہی تھی کہ خدا کے حکم کو خلاف حکمت کہا تھا۔ مگر واقع میں کتنی بڑی بات تھی اسی وجہ سے ابدالآباد کے لئے جہنمی ہو گیا۔

یہ بیچ کا مضمون تو حضرت حاجی صاحب کے اس ارشاد کی مناسبت سے کہ ہمارے سامنے شرک کی باتیں نہ کرو استطراداً آ گیا۔ اصل مضمون یہ تھا کہ حضرت نے اس دعا کرانے والے سے فرمایا کہ ایک شخص جیل خانہ سے چھوٹ رہا ہے اور دوسرا افسوس کر رہا ہے۔

جنت میں قیام کا عرصہ

حقیقت میں دنیا جیل خانہ ہی ہے جس کے ختم ہوتے ہی باغ و بہار ہے ہاں! جو لوگ یہاں سے پاک صاف ہو کر نہیں گئے وہ کچھ دنوں کو حمام اعظم (دوزخ) میں جاویں گے۔ کوئی ہزار برس کوئی دو ہزار برس۔ مگر ہزار دو ہزار برس گو ظاہر نظر میں بہت زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر واقع اور حقیقت میں خلود جنت کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں۔ بہت تھوڑی مدت ہے کیونکہ یہ زمانہ مومنین کے دوزخ میں رہنے کا محدود ہے اور جنت کا قیام غیر محدود ہے۔ پس کوئی مسلمان شخص آخرت میں نقصان میں نہیں۔ اسی طرح اس کے مرنے کے بعد دنیا میں بھی کسی کا نقصان نہیں۔ نہ مردہ کا کہ وہ یہاں سے اچھی جگہ چلا گیا نہ زندوں کا۔ ان کو مردہ سے اچھی چیز مل گئی۔ یعنی ثواب اور چند روز میں خود وہ مردہ بھی مل جاوے گا۔ جیسا مفصل بیان ہوا۔ اور یہاں جو لاتخافی ولاتحزنی ارشاد ہے اس کے متعلق ایک نہایت ضروری اور مفید مضمون قابل بیان ہے۔

پیدائش عالم کی غایت

وہ یہ ہے کہ لاتحزنی کا یہ مقصود نہیں کہ مطلق غم نہ کرو کیونکہ وہ تو امر طبعی غیر اختیاری ہے اس کے ساتھ امر و نہی متعلق نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ تم اپنے اختیار سے غم نہ کرو۔ باقی جس قدر خود ہوا سے ہونے دو۔ یہاں دو سوال و جواب ضروری ہیں۔ دوسرے سوال کے جواب میں اس

---

[۱] کیونکہ آگ عنصر خفیف ہے اور مٹی عنصر ثقیل۔ اور عنصر خفیف ثقیل کی طرف نہیں مائل ہوتا۔ بلکہ ثقیل کا ہی ہمیشہ خفیف کی طرف میلان ہوتا ہے اور ثقیل ہمیشہ پست رہتا ہے خفیف سے۔ ۱۲۔ جامع

کی توضیح ہو جاوے گی کہ اختیار سے غم کرنے کی ممانعت ہے۔ اضطراری سے ممانعت نہیں۔

ایک سوال تو یہ ہے کہ اللہ میاں نے غم کو گو اضطراراً ہو۔ پیدا ہی کیوں فرمایا۔ جب مرنے کے بعد ہر شخص کو اپنے وطن پہنچنا ہے اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ کسی چیز پر غم نہ ہو تو جس طرح یہ مقتضا عقلی ہے اسی طرح طبعی و تکوینی بھی رکھا جاتا۔ اور اضطراری غم بھی پیدا ہی نہ کیا جاتا۔ ایسے وقت بظاہر مناسب یہ تھا کہ حق تعالیٰ بندہ کی مدد فرماتے کہ غم ہی نہ ہونے دیتے۔

دوسرا سوال جو اسی پر متفرع ہے یہ ہے کہ جب اضطراراً غم پیدا کر دیا گیا تو پھر غم سے ممانعت ہمیں کیسی ہے۔ اضطراری کا رفع اختیاری کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ دو سوال عجیب و غریب ہیں۔ پہلے سے علم میں نہ تھے یعنی اصل اور عمود تو ذہن میں تھا۔ مگر ان شاخوں کی طرف ذہن منتقل نہ ہوا تھا۔ اسی وقت اس طرف ذہن منتقل ہوا اور ساتھ ساتھ جواب بھی القا ہو گیا۔
سنئے غم کے پیدا کرنے میں حکمت یہ ہے کہ تمام عالم کا قیام غم پر ہے آپ کو تعجب ہوگا کہ عالم کا قیام غم پر کیونکر ہے۔ ظاہراً تو خوشی پر معلوم ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مدار تکوین مخلوق انسان ہے یعنی عالم کے پیدا کرنے سے اصل مقصود انسان کی پیدائش ہے۔ باقی مخلوقات اصل مقصود نہیں گو باقی مخلوقات انسان سے پہلے پیدا ہوئی ہے۔ مگر ان کا پہلے پیدا ہونا بھی اسی کی دلیل ہے کہ انسان مقصود ہے۔

اس لئے کہ جب کوئی شخص کہیں مہمان جاتا ہے تو میزبان سب سامان مہمانی کا پہلے جمع کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ ڈھیلے استنجے کے بھی مہمان کے آنے سے پہلے رکھ دیئے جاتے ہیں تا کہ وہ تلاش نہ کرے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے گائے بیل۔ مکان۔ زمین پانی وغیرہ غرض تمام ضروری سامان انسان سے پہلے جمع کر دیا۔ تا کہ سکونت ارضی کے وقت اس کو دشواری نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے سامان پیدا کیا اور آدمؑ بعد میں اترے۔

یہاں پر ایک حکایت یاد آئی۔ میری بھتیجی مجھ سے تفسیر پڑھا کرتی تھی ایک مرتبہ اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ اگر آدمؑ گیہوں نہ کھاتے تو زمین میں اترتے یا نہ اترتے اگر نہ اترتے تو فی الارض خلیفۃ کے کیا معنی اور اگر اترتے تو یہ گیہوں کھانے کا الزام کس بناء پر ہے۔

میں نے یہ شق اختیار کی کہ ضرور اترتے تا کہ خلافت کی تکمیل کی جاوے مگر اس صورت میں اکرام کے ساتھ اترتے۔ اب الزام کے ساتھ اترے جیسے اسکول میں کوئی طالب علم بھیجا جائے۔ اگر وہ قانون کے موافق چلا آیا تو عزت سے آیا۔ اگر نافرمانی کر کے آیا تو گو آیا تو اس

وقت بھی۔ مگر عزت سے نہیں آیا۔ وہ لڑکی یہ جواب سن کر بہت خوش ہوئی۔

ایک بچی کے دل میں یہ اشکال ہونا عجیب ہے جواب تک کسی طالب علم سے بھی نہیں سنا گیا۔ اگر کسی غیر طالب علم سے پڑھتی۔ مثلاً ملانی سے تو جواب میں دشواری ہوتی۔ اور یہ شبہ ہمیشہ کے لئے کھٹکتا رہتا۔ اب وہ چونکہ مجھ سے پڑھتی تھی۔ اس لئے یہ شبہ رفع ہو گیا۔ اگر جواب میری سمجھ میں نہ آتا تو میں کسی عالم سے دریافت کر کے اس کو بتلاتا۔

بہر حال تمام مخلوقات انسان کے لئے پیدا ہوئی ہے جس کی ایک لطیف دلیل یہ آیت بھی ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (پ ۲۲)

"یعنی اگر اللہ تعالیٰ آدمیوں سے اعمال پر مواخذہ فرماتے تو روئے زمین پر کسی دابہ کو نہ چھوڑتے۔"

اس قضیہ شرطیہ کے مقدم اور تالی میں بظاہر علاقہ سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ انسان پر مواخذہ کا مقتضا ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ روئے زمین پر انسان کو نہ چھوڑا جاتا۔ اب علاقہ ظاہر ہو گیا کہ چونکہ مخلوق کی پیدائش سے مقصود بالذات انسان ہے پس جب انسان ہی نہ رہتا تو اور مخلوق کو باقی رکھ کر کیا کرتے۔ وہ سب تو انسان ہی کے لئے پیدا ہوئی ہے وہ سب بھی فنا کر دی جاتی۔ پس علاقہ واضح ہو گیا۔ اور اس سے مقصودیت مذکورہ پر دلالت ثابت ہو گئی۔

بقائے انسانی کا مدار

اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ انسان کی بقا کس شے پر موقوف ہے تو بالکل ظاہر ہے کہ تمام دار و مدار تمدن پر ہے کہ سب آدمی جمع ہو کر ایک دوسرے کی مدد کریں کوئی گھر بنا دے۔ کوئی کھیتی کرے وغیرہ وغیرہ۔ اگر تمدن نہ ہو تو کام اتنے ہیں کہ ایک آدمی سے انصرام سخت دشوار ہے۔ غرض! بقاء کا مدار اجتماع پر ہے اور اجتماع کا تعاون پر اور تعاون کا ترحم پر۔ ترحم کے بغیر کون کسی کی مدد کرتا۔ اب اہل قصبہ جو اس کی مدد کر رہے ہیں محض ترحم کی بنا پر۔ اور ترحم بدوں کسی کی مصیبت میں پڑے ہوئے پیدا نہیں ہوتا۔ تو ترحم کا سبب غم ہوا اور ایک دوسرے کی اعانت جس کی وجہ سے دنیا کا قیام ہے ترحم پر موقوف ہے تو دنیا کا قیام بھی غم پر ہوا۔ جب غم ایسی چیز ہے تو اگر خدا تعالیٰ کسی کو غم دے تو سمجھو کہ بڑی نعمت دی یہ حکمت ہے غم کی پیدائش میں۔

اضطراری اور اختیاری غم

اب رہا دوسرا سوال کہ پھر شریعت کا یہ حکم کیوں ہے کہ غم نہ کرو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے مطلق غم سے جس کا ایک درجہ اضطراری ہے ممانعت نہیں کی۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو غم خود ہو جاوے اسے ہونے دو۔ اپنے اختیار سے نہ بڑھاؤ۔ پس ممانعت اختیاری غم ہے اس کا پتہ خود قرآن سے چلتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ امر ونہی اعمال اختیاریہ پر ہوتی ہے اگر غم بالکل غیر اختیاری شئے ہے تو لاَ تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ میں یہ لانہی کا کیسا۔

پس حاصل یہ ہے کہ کچھ غم تو اضطراری ہے اس میں تو حکمت ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ اور کچھ ہم لوگ تدبیروں پیدا کر لیتے ہیں۔ بس اس کی ممانعت ہے کیونکہ یہ ضرر رساں۔

وہ تدبیریں غم بڑھانے کی یہ ہیں کہ واقعہ کو قصداً سوچتے ہو۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اس سے غم بڑھتا ہے اور سوچنا اور بلا ضرورت تذکرہ کرنا جو کہ سبب ہے غم کا وہ اختیار میں ہے تو جب ان اسباب کو بند کر دو گے اور اس طرف سے توجہ اٹھا لو گے تو اتنا غم نہ ہوگا۔ یہی راز ہے اس کا کہ شریعت نے مواقع غم میں ذکر اللہ کی تعلیم کی ہے جس سے توجہ دوسری چیز کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور دوسری چیز بھی ایسی جس کی شان یہ ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (پ ۱۳) اور جس کی نسبت یہ ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (پ ۲۴)

''جن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر مستقیم رہے ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم تو اندیشہ کرو اور نہ غم کرو۔''

یہاں اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا انشاء بمعنی خبر ہے اور دوسری آیت میں لا خوف علیکم فرمانا اس کا قرینہ ہے یہاں لا خوف علیکم میں حقیقت مراد ہے وہیں اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا میں مجاز۔

الحمدللہ مدلول آیت کے بیان سے فراغت ہوئی سبحان اللہ۔ اللہ اکبر کیسی جامع تعلیم ہے کہ قلت صبر کے دو سبب جدا جدا بیان فرمائے حزن وخوف پھر ان دو سببوں سے نصاً ممانعت فرمائی اور اِنَّا رَآدُّوْہُ اِلَیْکِ میں اپنی اور مرنے والے کی بھلائی کے مراقبہ کی قیاساً تعلیم فرمادی۔ جیسے

اس قیاس کی تقریر جس جگہ اعرابی کے اشعار مذکور ہیں اصبر نکن بک صابرین بیان کی گئی ہے آپ نے دیکھا کہ قرآن مجید کی کیسی جامع تعلیم ہے اور کیسے عنوانات ہیں جن سے وہ تعلیم عقلی بھی۔ اسی جامعیت پر کسی نے خوب کہا ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را بو ارباب معنی را

''اس کے حسن کی بہار دل و جان کو تازہ رکھتی ہے۔ رنگ کے ساتھ ظاہر بینوں کو اور بو کے ساتھ حقیقت پانے والوں کو بھاتی ہے۔''

خصوصیت کے ساتھ یہ مراقبہ یعنی تمام واقعات' مصیبت میں بھلائی کا سوچنا بہت ہی نافع ہے۔ اس سے غم کافور ہو جاتا ہے اور وہ بھلائیاں فرضی نہیں۔ بلکہ واقعی ہیں کیونکہ ہر مصیبت میں یقیناً منافع ضرور ہوتے ہیں۔ وقت نہیں رہا۔ ورنہ مصیبت کے ایک ایک واقعہ کو تفصیل وار بیان کرتا۔ ان واقعات کا اور ان کے منافع کا اجمالاً ایک دوسرے موقع پر ذکر فرمایا گیا ہے چنانچہ ان واقعات کا ذکر تو اس آیت میں ہے۔

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ (پ۲)

اور ہم تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف اور فاقہ سے اور مال و جان اور پھلوں کی کمی سے۔۱۲

اور ثمرات کا ذکر اس آیت میں ہے۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ. قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (پ۲)

''آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجیے! کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ تعالیٰ ہی کی ملک میں ہیں اور ہم سب اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں۔''

اور کافی تعلیم صبر کے متعلق اس آیت میں بھی مذکور ہے جس کا بیان اس وقت کیا گیا۔ مگر ضمن میں ایک قصہ کے جو اس کا مصداق ہے۔

خوش تر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

اچھا تو یہ ہے کہ محبوبوں کا راز دوسروں کی بات میں بیان فرما کر اس کے ضمن میں جو مقصود ہو اور مطلوب عمل تھا وہ ہم پر ظاہر فرمایا کہ دیکھو جن لوگوں نے اس عمل کو کیا ہے ان کو کس قدر ثمر ملے ہیں۔ تم بھی اگر ایسا کرو گے تم کو بھی اس طرح ثمرات ملیں گے۔

قرآن شریف بڑی نعمت ہے اس کی تعلیم کی طرف علماً و عملاً توجہ کرو۔ ہمارے ذمہ حق ہے کہ قرآن نے جو تعلیم کی ہے اس پر عمل کریں۔ بالخصوص جس چیز کا اس وقت بیان کیا گیا ہے یعنی صبر۔ گو بعض وقت بعض عمل اور بعض احکام مثلاً صبر ہی ہے نفس کو ناگوار ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے

فہم میں اس کے مصالح نہیں آتے۔ مگر واقع میں اس میں مصالح ہوتے ہیں۔

جیسا کہ میرے بچپن کا قصہ ہے کہ مجھے اس وقت کنکوے کا شوق تھا گو اڑانا نہ آتا تھا اور کتابیں بھی پڑھتا تھا۔ جہاں مدرسہ سے آیا کنکوا لے کر باہر چل دیا۔ اپنی تائی صاحبہ کے پاس رہتا تھا۔ سر پر بال تھے ان کو سر دھونے کا خیال تھا۔ مگر میں جہاں مدرسہ سے آیا کنکوا لے کر چل دیا۔ کسی طرح ان کے ہاتھ نہ آتا تھا کہ وہ سر دھوویں۔

ایک روز انھوں نے کھلی کٹورے میں بھگو کر پہلے سے رکھ لی۔ جب میں مدرسہ سے آیا تو فوراً میرے سر میں ڈال دی۔ پھر میں تو مجبور ہو گیا اور سر دھلوانا پڑا گو اس وقت ان کا یہ عمل مجھے ناگوار ہوا۔ مگر انہوں نے بسبب محبت کے مآل کار پر نظر کر کے میرے نفع کے واسطے ایسا کیا۔

اسی طرح حق تعالیٰ بھی بندہ کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں۔ تو اس پر راضی ہو۔ خصوص جب تم کو دعوٰی محبت کا ہے تو ذرا سے چرکہ سے بھاگنا نہ چاہیئے اگر بلا اختیار کچھ منافع فوت ہو جاویں خواہ ظاہری یا باطنی۔ حتّٰی کہ اگر باطنی حالات وکیفیات بھی چلے جاویں تو اس میں خدا کی حکمت ہے گھبراؤ نہیں، وہ حال یا اس کا بدل پھر لوٹے گا ورنہ یہی کہا جاوے گا۔

تو بیک زخمے گر یزانی زعشق   تو بجز نامے چہ میدانی زعشق

تم جو عشق کے ایک زخم سے بھاگتے ہو۔ تم عشق کے نام کے سوا اس کا کچھ بھی نہیں جانتے۔

بس یوں سمجھ لیا کرو کہ اس وقت اس کے فوت ہی میں تمہارے لئے مصلحت ہے۔ اگر باقی رہنا ہمارے حق میں مناسب ہوتا تو کبھی بھی زائل نہ ہوتا۔ ہمیں خدا سے محبت کر کے اس قدر نازک مزاجی مناسب نہیں۔ بس اب ختم کرتا ہوں دعا کیجئے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولٰنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین. واٰخر دعوانآ ان الحمد للہ رب العٰلمین. برحمتک یا ارحم الرّٰحمین.

تحریم المحرم

یہ خطبہ ۸ محرم الحرام بعد خطبہ ہوم الجمعہ ۱۳۳۶ھ کو ارشاد فرمایا جسے
مولوی اشفاق الرحمن صاحب کاندھلوی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ۔

زمانہ فضیلت:۔ آج ۸ محرم ہے۔ کل نو پرسوں دس ہوگی کل اور پرسوں بجز روزہ کے اور کوئی عمل مسنون نہیں اور کسی عمل کا جو فی زمانہ رائج ہیں کوئی ثواب اور اجر نہیں۔ البتہ حدیث میں نویں[۱] دسویں کے روزوں کی فضیلت آئی ہے کہ اس سے سال بھر کے گناہ معاف ہوتے ہیں لہٰذا اس طرح سے یہ زمانہ فضیلت کا ہے اور اس زمانہ میں فضیلت خاصہ روزہ کی ثابت ہوئی ہے باقی اور کسی عمل کی فضیلت نہیں ثابت ہوئی اور اتفاق سے دن بھی ٹھنڈے اور چھوٹے ہو گئے تو ایسے موقع کو غنیمت جان کر جانے نہ دیجئے۔ مگر روزہ کے متعلق فقہا نے لکھا ہے کہ ایک دن کا یعنی صرف عاشورہ کا روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ پہلے یہ جزئیہ میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ اس لئے میں محرم

---

[۱] دسویں محرم کا روزہ تو حدیث فعلی سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے رکھا ہے اور نویں کا حدیث قولی سے کہ اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو نویں کا روزہ رکھوں گا۔ (اشفاق)

کے ایک روزہ کو مکروہ نہیں کہتا تھا۔ اب چونکہ یہ جزئیہ میری نظر سے گزرا تھا۔ اس لئے میں محرم کے ایک روزہ کو مکروہ کہتا ہوں۔ اب چونکہ یہ جزئیہ میری نظر سے گزرا ہے اس لئے میں اپنے قول سے رجوع کرتا ہوں اور محرم کے صرف ایک روزہ رکھنے کو مکروہ کہتا ہوں۔

باقی یہ جو مشہور ہے کہ ایک روزہ رکھنا مطلقاً مکروہ ہے سو یہ شہرت خلاف اصل ہے۔ ایک روزہ رکھنا مطلقاً مکروہ نہیں۔ اس کراہت میں صرف عاشوراء کی تخصیص ہے۔ تمام زمانوں کو عام نہیں۔ یہ تو روزہ کے متعلق تحقیق تھی۔

تکثیر جماعت کا اثر

دوسری بات یہ سمجھئے کہ جس زمانہ میں طاعت کی فضیلت زیادہ ہوتی ہے اس زمانہ میں معصیت کی عقوبت بھی سخت ہوتی ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں بدعات وغیرہ سے سخت احتراز لازم ہے۔ مثلاً بعض لوگ اس زمانہ میں تعزیہ کی رسمیں کرتے ہیں جو بے اصل ہیں۔ اور بعضے لوگ جو ذرا مہذب ہیں وہ اس سے تو بچتے ہیں مگر مجالس میں جو کہ اس زمانہ میں ہوتی ہیں شرکت کرتے ہیں۔ میں اس وقت ان لوگوں کو نہیں کہتا جن کے مشرب اور مذہب میں یہ مجالس محبوب ہیں میرا خطاب صرف اہل سنت والجماعت سے ہے۔ اور گو اس شرکت میں اہل سنت والجماعت کے عقائد تو عام طور سے وہ نہیں ہوتے جو شیعہ کے ہوتے ہیں بلکہ کوئی تماشہ کی نیت سے چلا جاتا ہے کسی کو وہ لوگ خود بلاتے ہیں۔ اس لئے مروت سے چلا جاتا ہے بعضوں کی اور خاص غرضیں بھی ہوتی ہیں۔ مگر سب صاحب خوب سن لیں حدیث میں صاف موجود ہے۔ **من کثر سواد قوم فھو منھم** (**کنز العمال : ۲۴۷۳۵، إتحاف السادة ۶ :۱۲۸**)

کہ جس نے کسی قوم کی جماعت کو زیادہ کیا (خواہ عقیدۃً اسے برا سمجھتا ہو) قیامت کے دن وہ انہی کے ساتھ ہوگا۔ اس پر مجھے ایک بزرگ کی حکایت یاد آئی کہ ہولی کا زمانہ تھا سب جانوروں پر رنگ لگا ہوا تھا۔ وہ بزرگ جا رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک گدھا بیٹھا ہے اور اس پر رنگ نہیں ہے اور بچارے گدھے پر کون رنگ لگاتا۔ دیکھ ان بزرگ نے مزاحاً فرمایا کہ تو ہی خالی ہے۔ تجھے کسی نے نہیں رنگا یہ کہہ کر پان کھا رہے تھے پیک اس پر تھوک دی کہ لا تجھے میں رنگ دوں بعد مرنے کے عذاب میں گرفتار ہوئے اور اس کی پوچھ ہوئی کہ تم ہولی کھیلے تھے تو کسی جماعت کی تکثیر کرنا اور اس کی زیادتی کرنا سرسری بات نہیں ہے اور پکڑ سے خالی نہیں۔

غرض تکثیر جماعت خواہ استہزاء ہو یا بطور تماشہ یا دل جوئی وغیرہ کے ہو غرض کسی صورت

سے ہو ہر صورت میں بروئے قانون قیامت کے دن پوچھ ہوگی اور قیامت میں انہی کے ساتھ حشر ہوگا اس لئے نہ خود مجلس کرنا جائز ہے نہ کسی کی مجلس میں جانا جائز ہے۔

بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ ان ایام میں امام حسینؓ کی شہادت کا قصہ کوئی کتاب لے کر پڑھتے ہیں اور دوسروں کو سناتے ہیں یہ فعل بھی تخصیصاً ان ایام میں کرنا جائز نہیں اس لئے کہ شریعت میں غور اور تدبر کرنے سے شریعت کا مقصود واقعات مصیبت میں ازالہ غم اور رفع غم معلوم ہوتا ہے اور یہ قصہ پڑھ کر اور سن کر یا سنا کر غم کا تازہ کرنا مقصود ہے تو یہ اچھا خاصا شریعت کا مقابلہ ہے اسی قسم کی باتوں کی جس کی شریعت میں کچھ اصل نہ ہو بدعت کہتے ہیں شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔

ولیکن میفزائی بر مصطفیٰ   حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات پر کچھ مت بڑھا۔

اختراع فی الدین

تو ان ایام میں شہادت نامہ کا پڑھنا بھی ایک فضول رسم ہے۔ غرض ان ایام میں ان دنوں کی تخصیص سے ایصال ثواب کوئی زیادتی اجر ہے بلکہ اس خیال کے ہوتے ہوئے اس کے بدعت ہونے میں کلام ہی نہیں اور کوئی صاحب خلاصہ نکال کر مجھ پر یہ الزام نہ لگادیں کہ میں ایصال ثواب کو رو کتا ہوں ہرگز نہیں البتہ اتنا ضرور کہتا ہوں کہ عاشورہ کی تخصیص کرکے ایصال ثواب کرنا اور یہ خیال کرنا کہ آج زیادہ ملے گا ضرور بے اصل اور اختراع فی الدین ہے۔ الغرض اس دن میں کوئی ایسا عمل جس پر اجر ملے بجز روزہ کے ثابت نہیں ہوا۔

زیادت فی الدین

البتہ صرف دنیاوی برکت کے بارہ میں ایک اور عمل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور وہ بھی بروایت ضعیف[1] ثابت منقول ہے جس کا ضعف من جبر بھی ہوسکتا ہے۔ حدیث میں ہے:

من وسع علیٰ عیاله واهله یوم عاشوراء وسع الله علیه سائر سنته.

کہ جس نے عاشوراء کے دن اپنے اہل وعیال پر فراخی کی تو حق تعالیٰ اس پر تمام سال فراخی رکھیں گے۔

---

[1] قلت کلا بل هو ثابت صحیح اخرجه البیهقی فی الشعب من حدیث ابی سعید و ابی هریرة وابن مسعود و جابر قال اسانیده کلها ضعیفة ولکن اذا ضم بعضها الی بعض افاده قوة و قال الحافظ ابو الفضل العراقی فی امالیه حدیث ابی هریرة ورد من طرق صحیح بعضها ابو الفضل بن ناصروا وره ابن الجوزی فی الموضوعات من طریق سلیمان بن ابی عبد الله عنه وقال، سلیمان مجهول و سلیمان ذکره ابن حباب فی الثقات فالحدیث حسن علی رایه وقال و له طریق عن جابر علی شرط مسلم اخرجه ابن عبد الرفی الاستذکار من روایة ابی الذبیر عنه وهوا صح طرقه قال و قدور وایضاً من حدیث ابن عمر اخرجه الدار قطنی فی الافراد و موقوفاً علی عمر اخرجه ابن عبد البربسند جید اه کذافی الدر المنثور للسیوطی ۱۲

تو صرف دنیاوی برکت کے واسطے یہ عمل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک درجہ میں ثابت ہوا اور اگر اس سے ایصال ثواب کی کوئی اصل نکالے تو وہ بھی نہیں بنتی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف اہل وعیال پر وسعت کرنے کو فرمایا ہے لینے دینے کو نہیں فرمایا۔ تو اس دن میں تخصیصاً کچھ دینا زیادت فی الدین ہے اور یہ ضروری نہیں کہ جو کام اطلاق کے ساتھ اچھا ہو وہ تقید کے ساتھ بھی اچھا ہو مثلاً محض خدا واسطے دینا تو، ہر زمانہ میں اچھا ہے اور بعض زمانہ میں اچھا ہے اور بعض زمانہ میں خصوصیت سے اور اچھا ہے جہاں دلیل ہو مگر عاشوراء کے دن خصوصیت کے ساتھ کسی دلیل سے ثابت نہیں۔

پس اس دن میں ایصال ثواب کی تخصیص کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص بجائے چار رکعت کے پانچ رکعت پڑھے۔ تو ہر شخص اس کا ممنوع ہونا تسلیم کرتا ہے تو نماز باوجود یہ کہ اچھی چیز ہے مگر پانچ رکعت پڑھنا زیادت فی الدین ہے اس وجہ سے ہر شخص اس کو برا سمجھتا ہے تو ایسے ہی خاص محرم کے دن ایصال ثواب کی تخصیص مکروہ ہے۔ اسی طرح کھچڑا وغیرہ پکانا بھی از قبیل التزام مالا یلزم ہے۔

غرض سوائے دو عمل کے ایک دینوی ہے یعنی وسعت عیال پر اور ایک اخروی ہے یعنی نویں دسویں کا روزہ باقی اور کوئی عمل ثابت نہیں تو فضول اپنے نفس پر کسی قسم کا بار ڈالنا اور اپنے کو خلجان میں ڈالنا ہے لہٰذا ان امور سے اجتناب ضروری ہے اور وسعت عیال کو دنیاوی برکت کا عمل میں نے اس واسطے کہا کہ اس پر وسع اللہ علیہ کو مرتب فرمایا جس سے ظاہر ہے کہ دنیاوی برکت ہوگی۔ اخروی برکت یعنی ثواب وغیرہ کا ذکر نہیں۔

یوم عاشوراء کی فضیلت

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے بلکہ اکثر عوام کا یہی خیال ہے کہ عاشوراء کے دن کی فضیلت بوجہ شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ ہے تو یہ خیال بالکل غلط ہے عاشوراء کے دن کی فضیلت اس وجہ سے نہیں بلکہ عاشوراء کا دن پیشتر سے شرائع سابقہ میں افضل ہے جیسے روایات سے معلوم ہوتا ہے پھر شریعت محمدیہ مقدسہ میں بھی اس کی فضیلت وارد ہے جب کہ اس شہادت کا وقوع بھی نہ ہوا تھا سو اس کی فضیلت اس شہادت سے نہیں بلکہ خود یہ شہادت اس یوم میں اس لئے واقع ہوئی کہ یہ فضیلت کا دن تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس مقدس دن کو اپنے مقبول بندہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واسطے منتخب فرمایا غرض اس دن کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے قصہ سے کوئی فضیلت نہیں ہوئی بلکہ خود حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو اس دن میں شہید ہونے سے فضیلت ہوئی۔

بحمد اللہ تم